

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع

نومبر 2012

عید تیرا

پاک سوسائٹی

www.paksociety.com



مستقل سلسلے

264	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پہ	266	رضیہ جمیل	خط آپ کے
283	خالہ جیلانی	موسم کے یگان	259	صباح سحر	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے	280	تبصیر نشاط	ایتنے خالے میں
			261	شگفتہ جاہ	یا لول سے خوشبو لے
			287	امت الصبور	تاریخ کے جھروکے
			273	آئینہ زرین	سیر و جہاں

نومبر 2012
جلد 27 شمارہ 3
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل، خاتونِ حسن پر نشنگ پر لیس سے چھپوا کر شائع کیا - مقابلاً: پی ایچ ای سی پریس ایسوسی ایشن کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ناولٹ

236	فائزہ افتخار	مسٹر ڈیرلا
74	مہوش مغل	دل ہے کہ
200	صباح سحر	میکے سنگ

افسانے

60	سعدیہ رئیس	چھری تلے
68	سردار المنتہی	بے رخی
144	سردار سحر عمران	مین شرالو سوس
230	نسرین خالد	خوابِ مراب
224	صبیحہ اقبال	نازک دور میں
96	صباح جاوید	نیست

نظمیں، غزلیں

257	سراج اورنگ آبادی	غزل
257	نصیر الدین نصیر	غزل
258	ظفر جاوید	نظم
258	حمیدہ شاہین	غزل

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	نعمان فاروق	حمد
11	محمد زبیر	نعت
12	ادارہ	بٹی کی باتیں

انٹرویو

27	تبصیر نشاط	عید برائ اوریم
22	نعیمہ گرج	بندھن
17	شاہین رشید	دستک

ناول

36	آئینہ ریاض	ستارہ مشا
----	------------	-----------

مکمل ناول

152	نمرا احمد	جنت کپتے
104	سائرہ رضا	پہلی بار ملے

اعتبار: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پیش کردہ تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما کی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



امتوں کے امام ہو تم
پیغمبر ذی احترام ہو تم
محبتوں کا پیام ہو تم
آمارا خدا نے کلام تم پر

درد و دم پر سلام تم پر
رحمتیں ہوں مدام تم پر

فیض دنیا و دین ہو تم
دین حق کے امین ہو تم
داعی دین مبین ہو تم
سلام ہر خاص مدام تم پر

درد و دم پر سلام تم پر
رحمتیں ہوں مدام تم پر

رؤف ہو تم، رحیم ہو تم
فہیم ہو تم، کریم ہو تم
صاحب خلق عظیم ہو تم
ختم رسالت کا کام تم پر

درد و دم پر سلام تم پر
رحمتیں ہوں مدام تم پر

غم زدوں کی تسکین ہو تم
یقین بے یقین ہو تم
حیات قلب حزیں ہو تم
کرے رشک ماہ تمام تم پر

درد و دم پر سلام تم پر
رحمتیں ہوں مدام تم پر

ہے نرغہ اعدا میں کہ تنہا بھی بہت ہے
دل کو تری رحمت پر بھروسا بھی بہت ہے

ہے کسی غیر کی چاہت کا ٹھکانہ بھی دلوں میں
اور ان کو ترے عشق کا دعوا بھی بہت ہے

دے اُن کو مگر کوئی بشارت ہی کا موسم
دکھ جن کے مقدر میں لکھا بھی بہت ہے

کیوں کر وہ سمجھ پائیں ترے حن کو یارب
دل جن کا ہوس گرد سے میلا بھی بہت ہے

رُک جائے قلم حرفِ بشتا پر مرا آ کر
ہر چند سخن کا یہ سلیقہ بھی بہت ہے

سمجھو نہ تو دریا و سمندر نہیں کافی
گر سمجھو تو مکڑی کا یہ جالا بھی بہت ہے

بخشش کہ یہ لائق نہیں تو پھر بھی کرم کر
نعمان اکیلا بھی ہے پیاسا بھی بہت ہے

نعمان فاروق

شعاع کا نومبر کا شمارہ عیدِ غمیر لے حاضر ہیں۔
غلط فیصلوں کے اثرات سامنے آرہے ہیں۔ بے اعتباری، بے بسی، بے چینی اور اضطراب سے یقین و اعتماد کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ انسانی قدروں کا احساس مٹ جائے تو انسانی زندگی کی قدر و قیمت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں رائج ذہنی معیار، رویوں کے تضاد اور سوچ و فکر کی قوت سے محروم و مایوس ہو کر لوگوں کو کھلا کر رہے ہیں۔ معلومات تک عام آدمی کی رسائی جو آج ہے، وہ کبھی نہ ملتی لیکن یہ باخبری ہمارے فہم و شعور میں اضافہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ہماری نظریں وہ کشادگی اور گہرائی نہیں پیدا ہو سکی ہے جو پس پردہ حقائق کا اور اک کر سکے۔ ہماری فکری صلاحیت آج بھی محدود ہے اور معاملات کی طرح ہم یہاں بھی مغرب کے محتاج ہیں۔

حال ہی میں پیش آنے والا ملا لکھنؤ کا واقعہ اور اس پر ملکی اور بین الاقوامی میڈیا کا ردِ عمل ہمیں بہت کچھ سونچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ بات اتنی سادہ نہیں ہے جتنی نظر آرہی ہے۔

عید الاضحیٰ کی مبارک باد قبول کیجیے۔
یہ مذہبی تہوار قربانی کے ایک عظیم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے اور اس کے پس پشت ایک ہی فلسفہ کار فرما ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے پوری آماجگی سے تسلیم کرنا۔ اس کے حکم پر اپنی قیمتی سے قیمتی چیز قربان کر دینا، دراصل قربانی کی اصل روح ہے۔ اسلام محض بے عقلی سے تقلید کا نام نہیں ہے۔

اس شمارے میں،

- ، سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ پہلی بار طے،
- ، غمزدہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے،
- ، فائزہ افتخار کا ناول "ایک نئی سندھیل"۔
- ، صبا سحر اور مہوش مغل کے ناول،
- ، سعدیہ رئیس، سدرۃ المنتہی، صباحت جاوید، صبیحہ اقبال، نسreen خالد اور سدرہ سحر عمران کے افسانے،
- ، عید الاضحیٰ کا خصوصی سروے۔ عید الاضحیٰ اور ہم،
- ، نعیم گرج اور فیاض احمد کا بندھن،
- ، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- ، شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- ، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیثِ نبوی کا سلسلہ،
- ، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- آپ کے خط و ادائی میسلز ہمارے لیے آپ کی دلٹے جانے کا بہت اہم ذریعہ ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیں تاکہ ہم آپ کی دلٹے جان سکیں۔

ظلم کے حرام ہونے اور مظالم کے دفع کرنے کے حکم کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات مانی جائے۔“
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ظلم کرنے سے بچو! اس لیے کہ ظلم قیامت والے دن اندھیروں کا باعث ہوگا۔ اور بخل سے بچو! اس لیے کہ بخل ہی نے ان لوگوں کو ہلاک کیا جو تم سے پہلے تھے۔ اس بخل نے انہیں اپنیوں کا خون بہانے پر اور حرام چیزوں کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔“ (مسلم)

بخل مال کی شدید محبت کو کہتے ہیں، جب انسان کے دل میں دنیا اور دنیا کے مال و اسباب کی محبت حد سے تجاوز کر کے شدید ہو جائے تو پھر انسان حرام حلال کے درمیان تمیز بھی نہیں کرتا اور دوسرے انسانوں کا خون بہانے سے گریز بھی نہیں کرتا، جیسے آج ہمارے معاشرے کا حال ہے اور یہ حالت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس معاشرے کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں ہے، یہ دیر یا سویر ہلاکت سے دوچار ہو کر رہی رہے گا۔

بدلہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”تمہیں قیامت والے دن حق والوں کے حق

ضرور ادا کرنے ہوں گے حتیٰ کہ سینک والی بکری سے بغیر سینکوں والی بکری کو بدلہ دلویا جائے گا۔“ (مسلم)
فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ قیامت والے دن بے لاگ بدلہ ہو گا حتیٰ کہ جانوروں نے بھی ایک دوسرے پر ظلم کیا ہو گا تو اللہ تعالیٰ مظلوم جانور کی داد رسی فرمائے گا۔ اس میں انسانوں کے لیے سخت تنبیہ ہے کہ جب بے شعور جانوروں کو معاف نہیں کیا جائے گا تو عقل و شعور سے بہرہ ور ظالم انسانوں کی کس طرح معافی ہو سکتی ہے اگر انہوں نے دنیا میں ظلم سے توبہ کر کے اس کی تلافی نہ کی ہوگی۔

انسانی جان کی حرمت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حجۃ الوداع کے بارے میں گفتگو کرتے تھے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے اور ہم نہیں جانتے تھے کہ حجۃ الوداع کیا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنائیں فرمائی، پھر مسح و جلال کا ذکر فرمایا اور اس میں تفصیل سے کام لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس نبی کو بھی اللہ نے بھیجا اس نے اپنی امت کو اس (دجال) سے ضرور ڈرایا۔ نوح علیہ السلام نے اس سے ڈرایا اور ان کے بعد آنے والے نبیوں نے ڈرایا۔ اور اگر وہ تم میں نکلے تو تم پر اس کا حال پوشیدہ نہ رہے (تاکہ اسے آسانی سے پہچان لو) تم پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ تمہارا رب کا نام نہیں ہے (جب کہ) اس (دجال) کی باتیں آنکھ کانی ہوگی گویا کہ اس کی آنکھ ابھرا

ہوا انگور ہے۔
خبردار! یقیناً اللہ نے تمہارے خون اور تمہارے مال حرام کر دیے ہیں، تمہارے اس شہر، تمہارے اس مہینے (ذوالحجہ) تمہارے اس دن (دس ذوالحجہ) کی حرمت کی طرح۔ سن لو! کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے؟“
لوگوں نے کہا۔

”ہاں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے اللہ! تو گواہ ہو جا۔“ تین مرتبہ فرمایا۔
پھر فرمایا۔ ”تمہارے لیے ہلاکت ہے یا تم پر افسوس ہے، دیکھو! تم میرے بعد کافر بن جانا کہ تم ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔“
(اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے بھی

اس کا کچھ حصہ روایت کیا ہے۔)
فوائد و مسائل :

1۔ اس میں قرب قیامت کی ایک بڑی علامت، مسیح دجال کی بعض علامات کا بیان ہے تاکہ اہل ایمان اس کے مکر و فریب سے بچ کر رہیں۔ یہ کانی آنکھ والا ہے اور دجال، دجل (فریب) سے مبالغہ کا صیغہ ہے کیونکہ یہ بہت سے لوگوں کو اپنے دجل و فریب سے گمراہ کر لے گا۔

2۔ مسلمانوں کی جان و مال، آپس میں ایک دوسرے پر حرام ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت و آبرو کا محافظ ہے نہ کہ ان کا دشمن۔

3۔ مسلمانوں کے مابین خون ریزی نہایت قبیح جرم ہے اور اس سے کفر تک کا اندیشہ ہے۔

زمین پر قبضہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس نے ایک بالشت کے برابر زمین ہتھیا کر کسی

پر ظلم کیا تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت والے دن) اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم)
فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں تھوڑا سا ظلم بھی کسی کا معمولی سا حق بھی مار لینا قیامت والے دن عذاب شدید کا باعث ہوگا۔

ظالم کی پکڑ

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، لیکن پھر جب اس کی گرفت فرماتا ہے تو اسے نہیں چھوڑتا۔“
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ترجمہ ”اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ ہے جب وہ بستیوں (والوں) کو پکڑتا ہے جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں یقیناً اس کی پکڑ نہایت دروناک (اور شدید ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ تعالیٰ اپنی حسب مشیت و مصلحت، ظالم اور گناہ گار کو مہلت دیتا ہے لیکن جب مواخذہ فرماتا ہے تو پھر اس کی گرفت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی، اس لیے ہر شخص کو ظلم و معصیت سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہیے۔

2۔ مہلت سے دھوکے کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پتا نہیں کب اس کی مدت مہلت ختم اور گرفت کا آغاز ہو جائے۔

مظلوم کی بددعا

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یمن کے علاقے میں) بھیجا تو فرمایا۔

”تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب سے ہیں۔ چنانچہ تم (سب سے پہلے) انہیں اس بات کی دعوت دینا کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا اقرار کر لیں۔ اگر وہ یہ بات مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ نے ان پر رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اسے بھی مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر تقسیم کر دی جائے گی۔ اگر وہ اسے مان لیں تو (زکوٰۃ وصول کرتے وقت) ان کے عمدہ مال لینے سے اجتناب کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا اس لیے کہ اس کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔“ (بخاری و مسلم)

- فوائد و مسائل :**
- 1- کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے اگر جہاد کی نوبت آئے تو قتال سے پہلے انہیں قبول اسلام کی دعوت دی جائے اور پھر انہیں نماز، زکوٰۃ اور دیگر احکام و فرائض کی تعلیم دی جائے۔
 - 2- زکوٰۃ جس علاقے کے اغناء سے وصول کی جائے اسی علاقے کے فقراء پر تقسیم کی جائے۔ اگر بچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔
 - 3- عاملین زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کی وصولی میں ظلم کرنے سے گریز کریں اور لوگوں کی بددعا کے مستحق بن کر اللہ کے غضب و عتاب کے اہل نہ بنیں۔

سرکاری ملازم کو تحفہ

حضرت ابو حمید عبد الرحمن بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازد قبیلے کے ایک آدمی کو جسے ابن لُبیبہ کہا جاتا تھا زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عامل مقرر فرمایا۔ چنانچہ جب وہ (زکوٰۃ وصول کر کے واپس) آیا تو کہنے لگا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے (یعنی بیت المال کا حق ہے) اور یہ مجھے ہدیے میں ملی ہوئی چیزیں ہیں۔“

تو (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے۔ اللہ کی حمد و ثناء بیان کی پھر فرمایا۔ ”اما بعد! میں تم میں سے کسی آدمی کے لیے عامل مقرر کرتا ہوں جن کا والی و سرپرست اللہ نے مجھے بنایا ہے تو وہ (واپس) آتا ہے اور کہتا ہے یہ تمہارے لیے ہے اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے لوگوں کی طرف سے دیا گیا ہے۔ یہ اپنے باپ یا ماں کے گھر کیوں نہ بیٹھا رہا حتیٰ کہ اس کا ہدیہ اس کے پاس آئے اگر وہ سچا ہے۔“ (مطلب یہ تھا کہ جس کو یہ ہدیہ کہہ رہا ہے وہ ہدیہ نہیں یہ اس سرکاری منصب کا نتیجہ ہے جس پر اسے مقرر کیا گیا تھا اگر یہ ہدیہ ہوتا تو اسے گھر بیٹھے بھی ملتا۔)

اور فرمایا۔ ”اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص کوئی چیز اس کے حق کے بغیر لے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ قیامت والے دن وہ اسے اٹھائے ہوئے ہو گا۔ چنانچہ میں تم میں سے کسی شخص کو نہ دیکھوں کہ وہ اللہ سے ملاقات کے وقت (ناجائز طریقے سے حاصل کردہ) اونٹ کو اٹھائے ہوئے ہو جو بلبلارہا ہو یا گائے کو جس کی آواز ہو یا بکری کو جو میاں رہی ہو۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا؟“

تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس حدیث میں سرکاری اہل کاروں اور منصب داروں کے لیے بڑی تنبیہ ہے۔ آج کل سرکاری عہدوں سے بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور لوگ ان عہدوں کی وجہ سے ان اہل کاروں اور عہدے داروں کو کثرت سے ہدیے اور تحفے پیش کرتے ہیں۔ اس حدیث کی رو سے یہ تمام مال جو سرکاری عہدوں کی وجہ

سے حاصل ہو یا حاصل کیا جائے حرام ہے اور رشوت کے زمرے میں آتا ہے جس کا لینا اور دینا دونوں ناجائز امور ہیں۔

حق ادا کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جس آدمی پر بھی اسے (مسلمان) بھائی کا اس کی عزت و آبرو سے متعلق یا کسی اور چیز سے متعلق کوئی حق ہو (یعنی اس کی بے عزتی کر کے یا کوئی اور زیادتی کر کے اس پر ظلم کیا ہو) تو اسے چاہیے کہ آج ہی (دنیا میں) اس کا ازالہ کر کے اس حق سے عمدہ برآ ہو جائے قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں (ازالے کے لیے) کسی کے پاس دینار و درہم نہیں ہوں گے۔ (اور وہاں ازالے کی صورت یہ ہوگی کہ) اگر اس کے پاس عمل صالح ہوں گے تو وہ اس کے ظلم کے بہ قدر لے لیے جائیں گے (اور مظلومین میں تقسیم کر دیے جائیں گے) اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو اس کے ساتھی (صاحب حق) کی برائیاں لے کر اس پر لاد دی جائیں گی۔“ (بخاری)

فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کی گئی دست و درازیاں اگر انہیں دنیا میں معاف نہیں کروا لیا گیا یا ان کی تلافی نہ کی گئی تو آخرت میں اس کا معاملہ نہایت خطرناک ہو گا جیسا کہ اس کی تفصیل اس حدیث میں ہے۔ اس لیے حقوق العباد میں کوتاہی جس کی انسان پروا نہیں کرتا سخت ہلاکت کا باعث ہے۔

مسلمان کون ہے

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی

منع کردہ چیزیں چھوڑ دے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

- 1- اس سے معلوم ہوا کہ کامل مسلمان وہ ہے جو دوسروں کو (ظاہری یا باطنی) کسی بھی قسم کی اذیت نہ پہنچائے اور حقیقی مہاجر وہ ہے جو اللہ کی نافرمانیوں سے باز رہے۔
- 2- اگر کسی نے ہجرت (ترک وطن) کے باوجود اللہ کی معصیت سے اجتناب نہ کیا تو ایسی ہجرت کا کیا فائدہ؟ ہجرت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ اللہ کی رضا کی خاطر ہر چیز کو چھوڑ دیا جائے۔ اب انسان اپنا وطن مالوف، خویش واقارب اور جائیداد و کاروبار تو چھوڑ دے لیکن ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب سے وہ باز نہ آئے تو عند اللہ اس کی ہجرت ایک مذاق ہی سمجھی جائے گی۔

جنم کا مستحق

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان پر ایک آدمی مقرر تھا جسے کرکہ کہا جاتا تھا وہ مر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”وہ جہنم میں ہے۔“ (یہ سن کر) لوگ اسے دیکھنے لگے (کہ آخر کیا بات ہے) تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے پاس ایک عبا (سیاہ دھاریوں والی چادر) پائی جسے اس نے (مال غنیمت سے) چرا لیا تھا۔ (بخاری)

حرمت

حضرت ابو بکرہ نفیع بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بے شک زمانہ گھوم گیا ہے اپنی اسی حالت پر جس میں اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ (یعنی روز آفرینش سے جس طرح سال اور مہینے تھے اب پھر وہی ہیئت قدیمہ لوٹ آئی ہے اور مشرکین عرب اپنی

دستک دستک

شاہین رشید

”محنت اور محبت تو ہوتی ہی ہے۔ قسمت پر کتنا یقین ہے؟“
”قسمت پر بھی بہت یقین ہے اور میرا تو یہ یقین ہے کہ جب قدرت کوئی کام کروانا چاہتی ہے تو پھر راستے بھی خود ہی بناتی چلی جاتی ہے اور قسمت ہی انسان سے محنت بھی کرواتی ہے۔ میری بھی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے اس ذریعے سے شہرت اور رزق لکھا جو کہ مجھے مل گیا اور مل رہا ہے۔“

”کس گانے نے آپ کو بہت زیادہ شہرت دی اور وہ آپ کی پہچان بنا؟“
”شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ”شاہ جو کلام“ سنایا تو لوگوں نے بہت پسند کیا اور یوں میری شہرت کا آغاز شروع ہو گیا اور جو کلام میں نے گایا اس پر مجھے ”شاہ لطیف ایوارڈ“ بھی دیا گیا۔ پھر جب میں ٹی وی پر پروگرام کرتی تھی تو علاقائی موسیقی میں ایک سندھی گانا ”ماہی یار دی گھڑولی“ گایا۔ بس مت پوچھیں کہ اس نے مجھے کتنی شہرت دی۔ آج بھی جب میں کسی محفل میں گاتی ہوں تو لوگ اس گانے کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔“

”ٹی وی پر کس نے متعارف کرایا؟“
”ٹی وی پر مجھے سلطانہ صدیقی نے متعارف کرایا۔ وہ ایک پروگرام کرتی تھیں ”آواز و انداز“ جس میں مختلف گلوکار شرکت کرتے تھے۔ سلطانہ صدیقی نے ایک سہ ماہی کا پروگرام مجھے دے دیا۔ اس پروگرام سے بھی مجھے بہت شہرت ملی۔“
”فلم کے لیے کیوں نہیں گایا؟“

عابدہ پروین
”اللہ تعالیٰ نے آپ کو عالمگیر شہرت سے نوازا ہے۔ اپنے خاندان میں یہ عزت و شہرت آپ کو ہی ملی یا کسی اور کو بھی ملی ہے۔“
”اللہ تعالیٰ نے یہ مہمانی صرف مجھ پر ہی کی ہے۔ میری اور بہنیں بھی ہیں مگر کسی کو موسیقی سے لگاؤ نہیں ہے۔ حالانکہ اگر وہ کوشش کرتیں تو وہ بھی بہت اچھا گانے لکھتی تھیں۔“
”آپ کو شوق کیسے ہوا؟“

”بس اللہ نے شوق بھی ڈالا اور صلاحیت بھی دی۔ جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ سروں کی دنیا تھی۔ میرے والد بہت اچھا گاتے تھے اور میں ان سے بہت متاثر تھی اور میرا زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ جب میں تین یا چار سال کی تھی تو میں نے گانا اور گنگنا شروع کر دیا تھا۔“
”اچھا۔ مگر آپ جس فیملی سے تعلق رکھتی ہیں، سنا ہے وہاں لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم دینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔“

”جی آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے مگر میری خوش قسمتی تھی کہ میرے والد اس بات کو برا نہیں سمجھتے تھے اور انہوں نے نہ صرف مجھے گانے کی اجازت دی بلکہ مجھے باقاعدہ موسیقی کی تربیت بھی دلوائی۔ شروع میں میرے والد نے میری تربیت کی بجن کا نام غلام حیدر ہے اور پھر سلامت علی خان صاحب نے میری تربیت کی اور ان ہی کی محنت اور محبت کا نتیجہ ہے کہ میں آج اس مقام پر ہوں۔“

”کیا یہ قربانی کا دن (10 ذوالحجہ) نہیں ہے؟“

ہم نے کہا ”کیوں نہیں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بے شک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں (تمہارے درمیان آپس میں) اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن کی حرمت، تمہارے اس شہر میں اور تمہارے بس مینے میں ہے۔ اور عنقریب تم اپنے رب سے ملو گے، وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق باز پرس کرے گا۔ خبردار! تم میرے بعد کافرنہ بن جاؤ کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارو! سن لو! جو یہاں حاضر ہے، وہ غائب کو (یہ باتیں) پہنچا دے، اس لیے کہ شاید وہ شخص جسے یہ باتیں پہنچائی جائیں، ان سے زیادہ یاد رکھنے والا ہو جنہوں نے (براہ راست مجھ سے) سنا ہے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
”خبردار (میری بات سنو اور بتاؤ)! کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”ہاں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اے اللہ! گواہ ہو جا۔“ (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل :

1۔ سالوں اور مہینوں کی یہ تعین (کہ مہینہ 30 یا 29 دن کا اور سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے وغیرہ) اس دن سے ہے جب آسمان و زمین کی تخلیق کی گئی اور اس کی وضاحت سے مقصد اہل جاہلیت کے طریقہ ”نسیی“ کا بطلان ہے۔

2۔ آپس میں ایک دوسرے کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی تاکید اور ان کی حرمت کا بیان۔
3۔ قیامت والے دن بارگاہ الہی میں باز پرس کی یاد دہانی۔

صلوات

طرف سے جو مہینوں میں تقدیم و تاخیر کر لیا کرتے تھے، جسے وہ نسیی کہا کرتے تھے، اب اسے ختم کر دیا گیا ہے۔ (سال کے بارہ مہینے ہیں ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ تین بے درپے : ذالقعده، ذوالحجہ، محرم اور (چوتھا) مضر قبیلے کا رجب جو جمادی (الثانیہ) اور شعبان کے درمیان ہے۔ (پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا : ”یہ کون سا مہینہ ہے؟“)
ہم نے کہا ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ اور نام سے اسے پکاریں گے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟“
ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”یہ شہر کون سا ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے اسے پکاریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا یہ شہر (مکہ) نہیں ہے؟“
ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پھر) پوچھا ”یہ دن کون سا ہے؟“

ہم نے کہا ”اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے اسے پکاریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا؟



”میرا مزاج“ میری موسیقی فلم سے بہت مختلف ہے۔ بہت آفرز آئیں مگر میں نے انکار کیا۔ میں جو گا رہی ہوں اس سے میں بہت مطمئن بھی ہوں اور بہت خوش بھی ہوں۔“

”جب لوگ گائیکی کی فیلڈ میں آتے ہیں تو مہدی حسن، نور جہاں جیسے بڑے فنکاروں کے گانے گا کر اپنے آپ کو منواتے ہیں پھر اور بچل کلام گاتے ہیں۔ آپ نے ایسا کیا؟“

”نہیں۔ میں نے ایسا نہیں کیا اور میں کرنا بھی نہیں چاہتی، کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ میڈم نور جہاں نے جو گادیا ہے اس کا کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ ان کی گائیکی کا انداز بالکل مختلف تھا۔ میں ان کی کاپی کرنے کی جسارت نہیں کر سکتی۔“

”کم عمری سے ہی آپ کو موسیقی سے دلچسپی رہی ہے۔ کس کو زیادہ سنتی تھیں آپ؟“

”سب کو سنتی تھی۔ اس زمانے میں کیسٹوں کا رواج تھا تو میں سب کی کیسٹ منگوا کر سناتی تھی اور بہت غور سے سنتی تھی۔“

”صوفیانہ کلام گانا۔ تربیت کا حصہ ہے یا طبیعت کا حصہ ہے؟“

”میرے خیال میں دونوں کا۔ بچپن سے ہی جو

بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے وہ آہستہ آہستہ پختہ ہو جاتی ہے۔ تربیت تو بعد میں آتی ہے، پہلے طبیعت ہوتی ہے، میرا شروع سے ہی رجحان صوفیانہ کلام کی طرف تھا۔ لہذا پھر میں نے تربیت بھی اس کی حاصل کی۔“

”صوفیانہ کلام کو پاکستان سے باہر کتنی مقبولیت حاصل ہے؟“

”بہت زیادہ مقبولیت ہے۔ آپ یقین کریں ساری دنیا میں صوفیانہ کلام کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہے۔ اب لوگ ہمیں ”ملکوں ملکوں“ بلاتے ہیں تو اس وجہ سے کہ لوگ ہمیں سننا پسند کرتے ہیں۔“

”اچھا ایک بات بتائیں آپ اپنی سادگی پسند کیوں ہیں؟“

”میں بچپن سے ہی سادگی پسند ہوں۔ بناؤ سنگھار سے مجھے کبھی بھی لگاؤ نہیں رہا ہے اور سادگی میں جو حسن ہے۔ وہ بناؤ سنگھار میں نہیں ہے۔ ویسے بھی صوفیانہ کلام گانے والے سادہ لباس اور سادہ طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں۔“

”ایوارڈز کتنے ملے؟“

”یوں تو کافی ایوارڈز مل چکے ہیں، لیکن جو اہم ایوارڈز ہیں ان کا ذکر کروں گی۔ سب سے پہلے مجھے ”شاہ لطیف ایوارڈ“ ملا جو کہ میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ 1982ء میں مجھے ”ٹرائیڈ آف پرفارمنس“ ملا تھا اور 2005ء میں مجھے ”ستارہ امتیاز“ ملا تھا اور یہ سب ایوارڈز میرے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔“

توقیر ناصر

سینئر فنکاروں میں ایک بہترین فنکار ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کا سیریل ”تھکن“ بہت مقبول ہوا۔ حسب معمول ان کی اداکاری بھی نہایت عمدہ تھی۔ توقیر ناصر نے ہمیشہ اینگریٹنگ مین کے رول کیے۔ تھکن میں بھی ان کا رول کچھ ایسا ہی تھا۔

ہم نے ان سے پوچھا کہ ”آپ ہمیشہ غصے والے کردار کیوں کرتے ہیں؟“

تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ”آپ اگر یہ کہیں کہ سنجیدہ کردار ہی کیوں کرتے ہیں تو اس کا میں یہ جواب دے سکتا ہوں کہ میں فطرتاًًً ایک سنجیدہ انسان ہوں اور مجھے ہلے گلے والے کردار پسند نہیں، اس لیے میں زیادہ تر سنجیدہ کردار کرتا ہوں۔“

”ویسے حقیقتاًًً آپ غصے کے تیز ہیں؟“

”ہاں مجھے غصہ جلدی آتا ہے مگر مزاج نہ نہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرورت ہوتی ہے جس کی وجہ سے مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میری اپنی ایک طبیعت ہے۔ ایک مزاج ہے۔ میں لوگوں میں جلدی گھٹاتا نہیں ہوں۔ مجھے لوگوں میں کس ہونے میں ٹائم لگتا ہے۔“

”بہت محدود کام کرتے ہیں آپ۔ وجہ؟“

”میں ہمیشہ وہ کردار کرتا ہوں جو میرے دل کو بھاتا ہے۔ جو مجھے اچھا لگتا ہے اور ویسے بھی بطور ڈائریکٹر جنرل پاکستان ٹیلی ویژن کونسل آف آرٹس میری ذمہ داریاں بہت اہم ہیں۔ ان ہی سے فرصت نہیں ملتی جب کبھی اچھا کردار آفر ہوتا ہے تو میں انکار نہیں کرتا۔“

”فیلڈ میں اپنی مرضی سے آئے یا حادثاتی طور پر آئے؟“

”وحید مراد میرے پسندیدہ اداکار تھے ان ہی کو دیکھ کر مجھے اس فیلڈ میں آنے کا شوق ہوا میں نے پھر آؤیشن دیا اور کامیاب ہو گیا۔“

”آپ کا پہلا ڈراما سیریل ”پرواز“ تھا کافنی شہرت ملی اس ڈرامے کو۔“

”جی ہاں بالکل۔ یہی سیریل میری شناخت بھی بنا۔ مگر اس سے بھی زیادہ مشہور میرا لونگ پلے ”کالنج“ مشہور ہوا۔ یوں کہہ لیں کہ یہ دونوں ڈرامے میری شہرت کا باعث ہیں۔“

”بہت سارے چینلز آجانے سے ڈراما کہاں تک پہنچا۔ ترقی اور معیار دونوں کے بارے میں بتائیں!“

”پہلے ہمارے جو ڈرامے ہوتے تھے کن کا مقابلہ



”آپ ماشاء اللہ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ارتخ میرج کا نتیجہ ہے یا باہمی انڈر اسٹینڈنگ کا؟“

”شاید باہمی انڈر اسٹینڈنگ کا۔ در گزر کا اور کمپرومائز کا۔ ضروری نہیں کہ ارتخ میرج ہے تو کامیاب اور لومیرج ہے تو ناکام۔ ناکامی کا تناسب میرے خیال میں تو برابر ہی ہوتا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا انحصار دونوں فریقین پہ ہوتا ہے۔“

”لیٹی وی کے کن لوگوں کے ساتھ کام کیا؟“

”میرے خیال میں میں نے سب کے ساتھ کافی کام کیا ہے۔ چاہے وہ اداکار ہوں یا پروڈیو سر وغیرہ۔ سب ہی بہت محنت سے کام کرتے تھے۔ یا اور حیات قاسم

جلالی، کاظم پاشا، ساحرہ کاظمی، حیدر امام رضوی، عارف وقار، ثار حسین۔ ان سب نے ڈرامے کو نیا رنگ اور نئی زندگی دی تھی۔“



آج کے ڈراموں سے نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے لوگ بہت دل لگا کر محنت کے ساتھ اور پیسوں کی پروا کیے بغیر کام کیا کرتے تھے، مگر اب سب کچھ پیسہ ہے۔ جذبہ اور محنت ختم ہو گئی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اب ڈرامے اچھے نہیں بن رہے، بن رہے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تب ہی تو پرائیڈ آف پرفارمنس جیسے ایوارڈ بھی ملا کرتے تھے۔“

”بس محنت کا صلہ مل جائے تو سمجھیے کہ سب کچھ مل گیا ہے۔ مجھے بھی پرائیڈ آف پرفارمنس اور تمغہ امتیاز مل چکا ہے اور یہ سب لوگوں کی پسند اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

”کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں۔“

”جی۔ میری تاریخ پیدائش 1956ء ہے۔ میری دو بہنیں ہیں اور ہم تین بھائی ہیں۔ ماشاء اللہ سب اپنی اپنی زندگی میں بہت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ 1996ء میں میری میرج ہوئی۔ اور ماشاء اللہ میری دو بیٹیاں ہیں۔“



سب جانتے ہی ہیں کہ میں تھیٹر میں اور کبھی کبھار فی
وی میں کام کر لیا کرتی تھی۔
”آپ کے بچے کتنے ہیں؟“
”ماشاء اللہ! میرے تین بچے ہیں ایک بیٹی اور
دو بیٹے۔“

”بچوں کو اس فیلڈ میں لانا چاہیں گی؟“
”یہ بچوں کی مرضی پر ہے۔ اگر وہ آنا چاہیں گے تو
مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور اگر وہ کچھ اور کرنا چاہیں
گے تب بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ ابھی تو بچے پڑھ
رہے ہیں۔“

”آپ کی ”لوہاریج“ ہے۔ کیا محبت کے سہارے
زندگی گزار رہی جاسکتی ہے؟“
”ہرگز نہیں! شادی سے پہلے پیار محبت کی باتیں
اچھی لگتی ہیں۔ مگر شادی کے بعد انسان کی پریکٹیکل
لائف شروع ہو جاتی ہے۔ فیملی میں اضافہ ہو جاتا
ہے۔ تب پیار، محبت سے زیادہ پیسے کی اہمیت ہو جاتی
ہے۔ پیار، محبت کی باتیں بھی اس وقت تک ہی اچھی
لگتی ہیں جب پیٹ بھرا ہوا ہو۔“

”گماؤ پوت ہونا چاہیے؟“
”بالکل ہونا چاہیے کیونکہ جو لڑکی اپنے ماں باپ



کا گھر چھوڑ کر آرہی ہوتی ہے اس کی بھی بہت سی
خواہشات اور تمناؤں ہوتی ہیں اور ان خواہشات اور
تمناؤں کو وہی شخص پورا کر سکتا ہے جو صاحب
حیثیت اور اچھے روزگار والا ہوتا ہے۔ میں تو تمام
والدین سے کہوں گی کہ آپ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرتے
وقت یہ ضرور دیکھ لیں کہ لڑکا کتنا کماتا ہے۔ تاکہ آپ
کی بیٹی بھی سکھی رہے اور لڑکے کے والدین کو بھی کوئی
شکایت نہ ہو۔“

”چاند تارے توڑنے والی باتیں پرانی ہو گئیں کیا؟“
”قہر۔۔۔“ ”چاند تارے توڑنے والی باتیں ہمیشہ سے
کتابی رہی ہیں۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں
ہے۔ یہ باتیں کتابوں میں اور فلموں میں ہی اچھی لگتی
ہیں۔ وہ ایک تخیلاتی دنیا ہوتی ہے اور یہ حقیقت اور
پریکٹیکل کی دنیا ہے۔ یہ جو لڑکی اور لڑکا کہتے ہیں تاکہ تم
نہ ملے۔۔۔ تو ہم مرجائیں گے۔ بالکل غلط ہے۔ کم
سے کم آج کل کی لسل تو بہت عقل مند ہے۔ وہ اس
قسم کی باتیں تو بالکل نہیں کرے گی۔ آج کل تو پیٹ
بھر کھانا نہ ملے تو ایک دوسرے کی شکلیں بھی بری لگ
رہی ہوتی ہیں۔“

”آج کل کی بات کر رہی ہیں تو آج کل تو گھر کا خرچ
چلانے کے لیے لڑکی اور لڑکے دونوں کو کمانا چاہیے۔۔۔
کیا خیال ہے آپ کا؟“



— بندھن —

نعیمہ گرج ہوا فیاض احمد نعیمہ گرج

جہاں والدین نے کہا گردن جھکا دی؟“
”میری شادی میری پسند کی تھی اور اس میں والدین
کی مرضی بھی شامل تھی۔ اگر والدین راضی نہ ہوتے تو
میں اپنی محبت کی قربانی دے سکتی تھی۔“
”گلتے۔۔۔ کب کہاں ملاقات ہوئی تھی فیاض احمد
صاحب سے اور کتنے سال ہو گئے شادی کو۔؟“
”میری شادی کو تقریباً چوبیس سال ہو گئے ہیں اور
صحیح ڈیٹ مجھے یاد نہیں ہے اور ہاں! آپ ملاقات کا
پوچھ رہی تھیں تو فیاض صاحب سے میری ملاقات
ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ انہیں میں پسند آگئی۔ چند
ملاقاتوں کے بعد انہوں نے مجھے پروپوز کر دیا اور والدین
کی رضامندی سے میری شادی ہو گئی۔ اس وقت ان
کی ایک۔۔۔ دڈیو شاپ تھی اور میرے بارے میں تو

نعیمہ گرج۔۔۔ ایک معروف فنکارہ اور ماضی کے
نامور فنکار ”گرج بابو“ کی بیٹی ہیں۔ بچپن فلم انڈسٹری
کی بہاروں میں گزارا۔ اس کے آثار چڑھاؤ کو دیکھا اور
خوب بھی اس کا حصہ بنیں۔ جو لوگ بچپن سے ہی شہرت
حاصل کر لیتے ہیں وہ پھر اس کے عادی ہو جاتے ہیں
اور اسے سر پر سوار نہیں کرتے۔ نعیمہ گرج کو بھی ہم
نے ہمیشہ حلیم طبیعت کا ہی پایا ہے۔ ”بندھن“ کے
لیے جو گفتگو ہوئی آپ کی نذر ہے۔
”جی! نعیمہ جی۔۔۔ کیسی ہیں اور ازدواجی زندگی کیسی
گزر رہی ہے؟“
”اللہ کا شکر ہے۔۔۔ اور ازدواجی زندگی بھی اچھی گزر
رہی ہے۔“
”کتنے سال ہو گئے شادی کو اور پسند کی تھی شادی یا

”بالکل کمنا چاہیے۔ مجھے کام کرنے کی بہت عادت ہے اور میں تو تقریباً“ بچپن سے کماری ہوں۔ آج کے دور میں دونوں کو کمنا چاہیے اور دونوں کو گھر کا خرچ چلانا چاہیے۔ ورنہ گزارہ مشکل ہو جاتا ہے۔“

”اس موضوع پر مزید بات کرنے سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ اور کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں؟“

”جی! بالکل دھوم دھام سے ہوئی تھی اور تمام رسمیں بھی ہوئی تھیں۔ بہت انجوائے کیا تھا۔ شادی کی بھلا کسے خوشی نہیں ہوتی۔ شادی ہے ہی خوشی کا نام۔“

”اچھا۔ پھر تو ماں باپ کا گھر چھوڑنے کا بالکل بھی غم نہیں ہوا ہو گا آپ کو؟“

”نہیں! اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ والدین کا گھر چھوڑنے کا بہت دکھ تھا، کیونکہ ایک مدت گزارا ہوئی ہوتی ہے۔ مگر شادی تو ایک فریضہ ہے جو والدین کو ادا کرنا ہی ہوتا ہے اور لڑکی کے لیے بھی خوشی کی بات ہوتی ہے کہ وہ اپنا گھر بسانے جا رہی ہے۔ اگر شادی خوشی کا نام نہ ہوتی تو کیا دھوم دھام سے ہوتی؟“

”ہوں۔ یہ بات تو ہے۔ پھر بھی نئے ماحول میں جاتے ہوئے کچھ ڈر خوف تھا؟“

”ہاں! وہ تو ہر لڑکی کے دل میں ہوتا ہے۔ کیونکہ صرف میاں کے ساتھ تو نہا نہیں کرنا ہوتا۔ سسرال والوں کے ساتھ بھی کافی ٹائم گزارنا ہوتا ہے تو سوچیں تو آتی ہیں کہ بتا نہیں سسرال والے کیسے ہوں گے۔ شوہر مزاج کے کیسے ہوں گے۔ کیونکہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کے مزاجوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سو ایسے خدشات تو میرے ذہن میں بھی تھے۔“

”بندھن کی لاج رکھنے میں کس کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے لڑکی کا یا لڑکے کا؟“

”میرے خیال میں لڑکی کا، کیونکہ آپ جس گھر میں جا رہے ہوں۔ آپ کو اس ماحول میں ایڈجسٹ کرنا ہے۔ اپنے آپ کو بدلنا ہے نہ کہ دوسروں کو بدلنا ہے۔ اگر آپ یہ سوچ لیں کہ آپ کو سسرال جا کر سب کو

اپنے جیسا بنالینا ہے تو یہ غلط ہے۔ کوئی بھی آپ کو نہ اس کی اجازت دے گا نہ قبول کرے گا۔ ہاں! آپ اپنے آپ کو سسرال کے ماحول میں ڈھال لیں تو سب آپ سے خوش ہوں گے اور پھر آپ کے لیے بھی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔“

”آپ نے اپنی زندگی آسان بنائی؟ اور جوائنٹ فیملی میں آئیں آپ؟“

”بالکل بنائی۔ اور اپنی خدمت خاطر سے سب کو اپنا بنالیا اور جوائنٹ فیملی ہی سمجھ لیں۔ سب کی خدمت خاطر کی۔ ساس، سسر کو ماں باپ کا درجہ دیا۔ مندوں کو سگی بہنوں کی طرح سمجھا تو آج تک کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ میرے میاں سے زیادہ میرے سسرال والے میرے گن گنا کرتے تھے۔“

”سسرال والوں کو یہ بھی تو اچھا لگتا ہو گا کہ ہماری بہن نہ صرف مشہور ہے بلکہ بہت اچھا کماتی بھی ہے؟“

”ہاں۔ کیوں نہیں۔ یقیناً“ اچھا لگتا ہو گا۔ لیکن اگر میں صرف اپنے کام کو اولیت دیتی تو پھر شاید ان کو اچھا نہ لگتا۔ میری تو پوری کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ دوں اور کسی نے مجھ سے گلہ شکوہ بھی نہیں کیا کہ ان کو مجھ سے کوئی شکایت ہے بلکہ حیران ہوتے تھے میری فرماں برداری پر۔“

”کیوں؟“

”شوہر تو آج ایک پروفیشن بن گیا، مگر چوبیس پچیس سال پہلے ایسا نہیں تھا۔ اس وقت تو جو ڈراموں تھیٹر اور فلم میں کام کیا کرتے تھے ان کی بہت ویلیو ہوتی تھی اور بڑا غرور ہوتا تھا آرٹسٹوں میں کہ جی! ہم شوہر میں ہیں۔ جی! ہم فلم میں کام کرتے ہیں۔ مگر مجھ میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ تب ہی تو میری ساس بہت حیران ہوتی تھیں، مجھے گھر کے کام کاج کرتے ہوئے دیکھ کر اور میرے شوہر سے میری بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔“

”میاں کہتے نہیں تھے کہ تم باہر بھی کام کرتی ہو، پھر گھر داری بھی کرتی ہو، کوئی ایک ذمہ داری قبول کر لو؟“

”بہت کہتے تھے۔ مگر مجھے اچھا لگتا تھا سب کچھ کرنا۔ گھر کی خوش حالی کے لیے بھی اور گھر والوں کی خوشنودی کے لیے بھی۔“

”کیا گھر میں بڑی بہن کے آئیں؟“

”جی ہاں۔ اتفاق دیکھیں کہ میں بھی اپنے گھر میں بڑی ہوں اور میرے میاں بھی گھر میں بڑے ہیں۔ تو میں بڑی بہن کے آئی۔ اس لیے سسرال والوں کو مجھ سے بہت توقعات تھیں اور اللہ کا شکر ہے کہ میں ان کی توقعات پر پوری اتری۔“

”اچھا! یہ بتائیں کہ پہلے دن کا جوڑا کیسا تھا اور بیوٹی پارلر سے تیار ہوئی تھیں آپ؟“

”پہلے دن کا جوڑا سسرال والوں کی طرف سے تھا اور چٹائی کا غرارہ تھا، جو کہ بہت خوب صورت تھا اور میک اپ کسی بیوٹی پارلر سے نہیں کروایا تھا بلکہ میں نے خود ہی کیا تھا۔ کیونکہ مجھے خود اتنا اچھا میک اپ کرنا آتا تھا تو کیا ضرورت تھی کسی سے میک اپ کروانے کی۔ اور اس وقت تو بڑی سادگی ہوا کرتی تھی۔ ہلکا میک اپ اور لپ اسٹک سے ہی نکھار آ جاتا تھا۔“

”اور پھر دلہن کو تو قدرت روپ دیتی ہے۔ ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں اور کیا تحفہ دیا تھا پہلی بار؟“

”ہنی مون کے لیے؟ کہیں بھی نہیں۔ لیکن ویسے اللہ کا شکر ہے کہ بہت گھوڑے پھرے۔ اور تحفہ سے آپ کی مراد منہ دکھائی ہے تو انہوں نے مجھے انگوٹھی دی تھی۔“

”پھر بھی کھنوں کا تبادلہ ہوتا ہے کیا؟“

”بالکل ہوتا ہے۔ مگر ایک طرفہ (تقریباً) سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں تو تحفے دینے کا شوق ہی نہیں ہے اور نہ ہی انہیں تحفہ دینا یاد رہتا ہے۔ میں جب انہیں تحفہ دیتی ہوں تو انہیں بھی یاد آ جاتا ہے۔ ویسے سال میں ایک دو مرتبہ تحفہ دے ہی دیتے ہیں۔ انہیں پرفیوم پسند ہے تو میں زیادہ تر پرفیوم کا ہی تحفہ دیتی ہوں۔“

”جو کماتے ہیں آپ کے ہاتھ میں دیتے ہیں یا لگا بندھا دیتے ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ کھلا خرچ دیتے ہیں۔ لیکن مجھے

ان سے مانگنے کی عادت نہیں ہے۔ اتنے سال گزرنے کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے ان سے مانگنے کی ضرورت پڑی ہو۔ ویسے بھی بتا نہیں کیوں مجھے ان سے مانگتے ہوئے شرم اور جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔“

”شاید اس لیے کہ آپ خود کماتی ہیں اور آپ کے اپنے ہاتھ میں کھلا پیسہ ہوتا ہے؟“

”ہاں! ایسا بھی ہے، مگر میں نے تو اکثریت ایسی خواتین کی دیکھی ہے جو خود بھی کماتی ہیں، مگر پھر بھی اپنے میاں سے مانگتی ہیں۔ شاید وہ اس کو اپنا حق سمجھتی ہیں اور حق ہے بھی۔ لیکن شاید یہ میرے ماں باپ کی تربیت کا اثر ہے کہ مجھے مانگنے کی عادت نہیں ہے۔ ورنہ بیویاں تو اپنی کمائی کی ہوا نہیں لگنے دیتیں اپنے میاں کو۔“

”حقیقت تو یہ ہے کہ جن کو خود کمانے کی عادت ہو جائے وہ پھر کسی سے مانگ نہیں سکتیں۔“

”یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی۔ اور بچپن سے ہی کماری ہوں تو ہاتھ پاؤں چلانے کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ میں بے کار تو بیٹھ ہی نہیں سکتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے بچے چھوٹے تھے تو میں نے تھپڑے اور پی وی برکام کرنا تقریباً“ بند ہی کر دیا تھا۔ کیونکہ ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔ گھر سے نکلنے کا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے گھر میں جو تھوڑا بہت ٹائم مل جاتا تھا اس میں سلائی کڑھائی کا کام کر لیا کرتی تھی۔ مگر بے کار نہیں بیٹھتی تھی۔“

”مزاج کے کیسے ہیں؟ شادی کے بعد کیا تبدیلی دیکھی؟“

”مزاج کے بہت اچھے ہیں۔ اس وقت تک جب تک انہیں غصہ نہیں آتا۔ جب غصہ آتا ہے تو لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ خوش اخلاق بھی ہوں گے اور میں نے شادی کے بعد کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ تبدیلی کی بات تو تب ہوتی ہے جب شادی سے پہلے لمبے چوڑے تعلقات رہے ہوں۔ چونکہ ایسا کچھ ہوا نہیں اس لیے جو کچھ دیکھا شادی کے بعد ہی دیکھا۔“

”کوئی اچھی بُری عادت بتائیں۔ اور اپنے مزاج

کے بارے میں بھی بتائیں؟“
”اچھی عادتیں تو بہت ہیں۔ لیکن بُری عادت یہ ہے کہ غصے کے بہت تیز ہیں اور جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو پھر بات کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جہاں تک میرے مزاج کی بات ہے تو میرا غصہ بھی تیز ہے۔ مگر لڑائی جھگڑے والا نہیں بلکہ بہت معصوم سا غصہ ہے۔ مثلاً جھوٹ برداشت نہیں ہے۔ گھر میں گندگی برداشت نہیں ہے۔ بس بولتی ہوں یا پھر بس نہیں چلتا تو روئے لگتی ہوں۔“

”ایک دوسرے کو کس طرح بلاتے ہیں؟“
”میں تو پرانی ہوں۔ اس لیے آپ جناب۔۔۔ سینے وغیرہ کہہ دیتی ہوں۔ یہ جب موڈ میں ہوتے ہیں تو بہت محبت سے بلاتے ہیں اور ہنستے ہنساتے بھی ہیں لیکن جب غصے میں ہوتے ہیں تو پھر ”آپ جناب“ کہہ کر بلاتے ہیں اور بچوں کے لیے بھی ان کی باتوں میں طنز اور ادب والا لہجہ ہو جاتا ہے۔“

”بچوں کی تربیت میں کس کا ہاتھ ہے؟“
”ہم دونوں کا ہی ہے۔ لیکن پھر بھی ماں کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ماں بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی ہے۔ بیٹی ہو یا بیٹا اس کو سب کی فکر ہوتی ہے اور جس طرح میں نے ایک روایتی بیوی بن کر اپنے شوہر کے اور گھر کے سارے کاموں میں حصہ لیا۔ اسی طرح میں نے اپنی بیٹی کی تربیت کی ہے۔ ہر کام میں اسے ماہر کر دیا ہے۔ کیونکہ پتا نہیں کہ اس کو کیا سسرال ملے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری ساس مجھے کام کرتے ہوئے دیکھتی تھیں تو حیران ہوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم کس چیز سے بنی ہوئی ہو کہ تھکتی نہیں۔ گھر بھی سنبھالا ہوا ہے اور باہر بھی کام کرتی ہو اور بچوں کی تربیت بھی۔ بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔“

”اور میاں صاحب؟“
”وہ خوش نہیں ہوں گے تو کون خوش ہوگا۔ جب گھر سے نکلتی ہوں تو ان کی ہر چیز ریڈی کر کے نکلتی ہوں، حتیٰ کہ آج انہوں نے کون سا ریوم لگاتا ہے وہ تک ٹیبل پہ رکھ کر جاتی ہوں اور کبھی کبھی تو ایسا بھی

ہوتا ہے کہ میں گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہوں اور میاں صاحب نے کوئی کام کہہ دیا تو میں کبھی منہ نہیں بناتی بلکہ پہلے ان کے کام کو ترجیح دیتی ہوں۔ کیونکہ گھر کو بنانے سنوارنے میں اور اپنا بنانے میں بہت ٹائم لگتا ہے۔ لیکن بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ اس لیے مجھے اپنا گھر پہلے عزیز ہے اور شوہر کا کام بعد میں۔“

”بالکل۔۔۔ اپنا گھر ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں اور جس کی آپ جیسی بیگم ہو وہ تو بہت ہی خوش قسمت انسان ہے۔ میرے خیال میں تو آپ کی کبھی لڑائی بھی نہیں ہوتی ہوگی؟“

”لڑائی جھگڑا کس کے درمیان نہیں ہوتا۔ ہم میاں بیوی کے درمیان بھی لڑائی ہوتی ہے۔ لیکن سچ بتاؤں! اتنے برسوں میں میں نے کبھی لڑائی میں پہل نہیں کی۔ پہل ان کی طرف سے ہی ہوتی ہے اور بات چیت بھی وہی بند کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ دن کے بعد میں ہی متا لیتی ہوں کہ کیوں ناراض ہیں اب ناراضی ختم کریں۔“

”اتنے لڑاؤ اٹھاتی ہیں آپ اپنے میاں کے؟“
”تمہارے۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے میرا دل بہت نرم رکھا ہے۔ میں لڑائی جھگڑے سے بہت گھبراتی ہوں۔ مجھے ہر حال میں اپنا گھر عزیز ہے۔“

”مفضل خرچ کون ہے؟“
”ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ انہیں بھی گھر کی چیزیں بنانے کا شوق ہے اور بچت کا بھی شوق ہے اور مجھے بھی۔ تو ہم دونوں بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں اس منگائی کے دور میں۔۔۔“

”ہوں۔۔۔ گند۔۔۔“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نچھوڑنے سے اجازت چاہی۔



عید الاضحیٰ کی پر مسرت ساعتیں دستک دینے کو ہیں۔ خواتین کی عید جوڑی عہندی اور سنگھار کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ تاہم عید قربان کا اصل حسن لذت کا کام و دہن سے وابستہ ہے۔ حنائی ہاتھوں سے تیار ہونے والے پکوان کا ذائقہ عام دنوں سے کچھ زیادہ مزے دار ہوتا ہے۔

حب روایت ہم نے اس سال بھی آپ کے لیے ایک سروے کا اہتمام کیا ہے۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔
1- آپ کو کون سی عید پر زیادہ لطف آتا ہے عید الفطر یا عید الاضحیٰ؟
2- عید الاضحیٰ یا قربانی کے جانور کے حوالے سے کوئی یادگار واقعہ؟
3- کوئی خاص دُش جو آپ نے عید الاضحیٰ کے موقع پر بنائی ہو اور گھر والوں اور مہمانوں کو بے حد پسند آئی ہو؟

عید قربان اور ہم

تبصیر نشاط

محفوظ نہیں۔ البتہ بچپن میں قربانی کے جانوروں کی خدمت کرنا انہیں گھمانا پھرانے چارہ کھلانا اور پھر قربانی کے بعد اداس ہو کر بیٹھ جانا اکثر یاد آتا ہے۔ اب وہ بچپن کی عیدوں کا لطف کہاں۔



پروفیسر سحر انصاری۔ کراچی (شاعر، نقاد، ماہر تعلیم)
1- ویسے تو دونوں ہی تموار اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ تاہم اگر پسندیدگی کی بات کی جائے تو مجھے ذاتی طور پر عید الفطر زیادہ اچھی لگتی ہے۔ عید الاضحیٰ کے حوالے سے شہر میں آج کل ایک فقرہ گردش کر رہا ہے کہ۔
”محبوب کے خرے اور قربانی کے بکرے دونوں ہمیشہ مٹتے ہوتے ہیں۔“

تو عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے جانوروں کی آمد کے ساتھ ہی شہر بھر میں گندگی کا تناسب بھی بڑھ جاتا ہے۔ قربانی سے پہلے جانوروں کے چارے اور غلاظتیں بکھری نظر آتی ہیں۔ پھر سارا دن اور رات رات بھر جانوروں کی آوازیں آرام و سکون اور مطالعے میں خلل ڈالتی ہیں۔ قربانی کے بعد بھی کچھ دنوں تک شہر میں صفائی کا فقدان رہتا ہے۔ جگہ جگہ جانوروں کی آلائشیں نظر آتی ہیں جس سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔

2- اس حوالے سے کوئی خاص واقعہ تو ذہن میں

3۔ بچپن میں ہم نے اسکاوٹ کی ٹریننگ حاصل کی ہے تو اس تربیت کے دوران ہمیں کھانا پکانا بھی سکھایا گیا تھا۔ اب بھی کبھی بقر عید کے موقع پر پٹیجی فرائی کر لیتے ہیں جو سب کو بے حد پسند آتی ہے۔

عالمگیر امریکا (گلوکار)

1۔ دونوں ہی تہوار ہمارے لیے محترم ہیں لیکن مجھے عید الفطر زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ وہ رمضان کے بعد آتی ہے تو اس دوران ایک خاص ماحول بنا ہوا ہوتا ہے۔ روزوں کے بعد عید منانا بہت اچھا لگتا ہے۔ پھر عید الفطر میں دوست احباب اور رشتے داروں سے میل ملاقات کا سلسلہ بھی عید الاضحیٰ کی نسبت زیادہ رہتا ہے تو اس کی بھی خوشی ہوتی ہے۔ عید الاضحیٰ میں تو سب لوگ قربانی اور پھر گوشت کی تقسیم میں مصروف رہتے ہیں، لہذا میل ملاقات کی طرف رجحان کم ہی ہوتا ہے۔ عید الفطر کو پسند کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی خوشی اچانک حاصل ہوتی ہے یعنی چاند نظر آتے ہی اگلے دن عید ہو جاتی ہے، جبکہ عید الاضحیٰ کا چاند دس دن پہلے نظر آ جاتا ہے تو عید الاضحیٰ آنے



تک وہ چارم باقی نہیں رہتا۔
2۔ ہاں! ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ عید الاضحیٰ سے دو دن پہلے میں قربانی کے لیے بکرا خرید کے لایا۔ اسے گھر کے ایک کونے میں باندھ دیا۔ قربانی سے ایک دن پہلے جب میں سو کر اٹھا تو پتا چلا کہ بکرا غائب ہے۔ سب گھر والے حیران و پریشان ہو گئے کہ بکرا کہاں گیا، کیونکہ اگر کوئی چوری کرنے آتا تو بکرا کچھ تو آوازیں نکالتا ہی۔ خیر! فوراً بکرے کی تلاش میں دوڑ گئے۔ محلے والوں کو پتا چلا تو کچھ لوگ تلاش میں مدد کرنے لگے۔ خاصی دوڑ دھوپ کے بعد بکرا چند کلیاں چھوڑ کر ایک جگہ بیٹھا نظر آ گیا۔ صبح کسی وقت دروازہ کھلا ہوا گاؤں بکرا نکل گیا ہو گا۔ شاید وہ مارنگ واک کا عادی ہو۔ جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو یہ سوچ کر ہنسی آ جاتی ہے کہ ہم اوہرا دھروڑ دھوپ کرتے رہے اور بکرے صاحب مارنگ واک کے بعد مزے سے آرام کرتے رہے۔
3۔ میں کبھی کبھار شوقیہ کو کنگ کر لیتا ہوں۔ میرے ہاتھ کا آلیٹ، مشرپاؤ اور آلو گوشت سب کو بے حد پسند ہے اور سب مجھ سے ان ہی کی فرمائشیں کرتے ہیں۔

عائشہ گل۔ کراچی (اداکارہ)

1۔ مجھے دونوں عیدیں پسند ہیں۔ دونوں کو میں مذہبی فریضہ سمجھ کر مناتی ہوں۔ مسائل کے اس دور میں خوشیوں کے مختصر لمحات بھی غنیمت لگتے ہیں۔ میں خوشیوں کی بہت قدر کرتی ہوں۔ اپنی خوشیوں کا خیال رکھنا چاہیے اور دوسروں کی خوشیوں کا تو ہر لمحہ خیال رکھنا چاہیے۔ میں ان دونوں تہواروں پر اپنے ارد گرد کے ان لوگوں کا لازمی خیال رکھتی ہوں جو ظلم استطاعت رکھتے ہیں۔ عید الاضحیٰ تو ہمیں دیتی ہی قربانی کا درس ہے۔ قربانی کا مقصد صرف خود گوشت کھانا نہیں بلکہ اس موقع پر غریب غریاء کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ وہ سارا سال گوشت کھانے سے محروم رہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کا بھی بہت خیال رکھتی ہوں۔



2۔ بقر عید کے دن یا جانور کے حوالے سے تو نہیں لیکن ایک بہت خاص واقعہ بقر عید کی شاپنگ کے دوران پیش آیا تھا۔ جسے میں بقر عید والے دن بھی یاد کر کے اداس رہی تھی۔ یہ پانچ چھ سال پرانی بات ہے۔ اس وقت ہم دہلی میں رہتے تھے۔ میں عید کی شاپنگ کے لیے ایکلی کار میں جا رہی تھی۔ ہائی وے پر پہنچی تو میری گاڑی اچانک خراب ہو گئی۔ میں بہت پریشان ہوئی۔ پہلے گھر فون کر کے مطلع کیا۔ پھر شوروم فون کیا تاکہ وہ آ کے گاڑی لے جائیں۔ جب وہ گاڑی لینے آئے اور میں باہر سڑک پر نکلی تو میں بہت گھبرا گئی۔ دہلی میں بے تحاشا گرمی ہوتی ہے۔ گرمی میں وہاں سڑک پر کھڑے ہونا اپنی موت کو دعوت دیتا ہے اور میں چونکہ بہت نازوں کی پٹی ہوں تو اتنی گرمی مجھ سے کہاں برداشت ہونی تھی۔

ابھی میں گرمی سے گھبرا ہی رہی تھی کہ اچانک میری نظر اس طرف گئی جہاں اس سڑک پر تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ وہاں میں نے ان مزدوروں کو اتنی شدید گرمی میں سخت جانفشانی کا کام کرتے دیکھا تو مجھے بے حد شرمندگی ہوئی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت ڈانٹا کہ انہیں دیکھو! تم سے ذرا سی دیر گرمی برداشت نہیں ہو

رہی اور ایک وہ ہیں جو پیٹ کا ایندھن بھرنے کی خاطر اتنی گرمی میں اس قدر محنت کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ عید والے دن بھی مجھے وہ مزدور اور ان کی مشقت یاد آتی رہی۔ میں سمجھتی ہوں اللہ تعالیٰ نے وہ منظر شاید میری اصلاح کے لیے مجھے دکھایا تھا۔

3۔ بہت ساری ڈشز ہیں جو میں بناتی ہوں اور لوگ پسند بھی کرتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو دو آسان سی ڈشز بتاتی ہوں جو جھٹ پٹ تیار ہو جاتی ہیں اور بے حد لذیذ بھی ہوتی ہیں۔

تھوڑی سی املی، سارا ہر امسال، لیموں کارس اور وہی ملا کر پھینٹیں اور بکرے کے گوشت میں لگا کر رکھ دیں۔ ایک گھنٹہ بعد زیتون کا تیل گرم کر کے اس میں یہ مسالا ملا گوشت ڈال کر بھون لیں اور پھر دم پر رکھ دیں۔ نہایت لذیذ ہو گا۔

اسی طرح ایک اور آسان سی ترکیب ہے۔ ثابت دھنیا، زیرہ پیاز، لہسن اور ثابت لال مرچ تو بے پر بھون لیں۔ اسے وہی میں ملا کر بکرے کے گوشت پر لگا دیں۔ آدھ، ایک گھنٹہ بعد زیتون کا تیل گرم کر کے اس میں مسالا ملا یہ گوشت ڈال کر بھون لیں، پھر دم پر رکھ دیں۔ آپ چاہیں تو کوئی سا بھی تیل استعمال کر سکتی ہیں۔ میں چونکہ تمام کھانوں میں زیتون کا تیل استعمال کرتا پسند کرتی ہوں۔ لہذا وہی استعمال کرتی ہوں۔

عامر سلیم۔ کراچی (گلوکار)

1۔ مجھے دونوں عیدیں اچھی لگتی ہیں۔ کیونکہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں ہی ہمارے مذہبی تہوار ہیں۔ عید الفطر روزوں کے بعد انعام ہے، شکرانے کا دن ہے تو عید الاضحیٰ ہم عظیم قربانی کی یادگار کے طور پر مناتے ہیں۔ دونوں ہی کا اپنا الگ مزاج ہے اور میں دونوں ہی عیدیں بہت انجوائے کرتا ہوں۔

2۔ یہ چند سال پرانی بات ہے، میں عید کی نماز پڑھ کر



گھر واپس آیا۔ قصائی کے آنے میں ابھی وقت تھا تو میں نے سوچا تھوڑی دیر سو جاؤں۔ کیونکہ ہمیں اپنی مصروف زندگی میں سونے کا وقت کم ہی ملتا ہے تو ایسے

موقع ہمیں بہت غنیمت لگتے ہیں جب ہمیں اپنی نیند پوری کرنے کا وقت مل جائے۔ میں نے عید کا لباس تبدیل کیا اور ہلکی پھلکی فی شرٹ اور پاجامہ پہن لیا۔ مجھے رف سے حلیے میں نیند ذرا پرسکون آتی ہے۔ ابھی مجھے سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ گھر میں ہونے والے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سنا سب شور مچا رہے تھے کہ ”بکرا بھاگ گیا بکرا بھاگ گیا۔“ میں فوراً تیزی سے اٹھا اور باہر کی طرف لپکا۔ گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بکرا گلی کے کونے تک پہنچ چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔

اس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو بھاگتا ہوا دوسری گلی میں مڑ گیا۔ بکرا چونکہ محلے میں نیا آیا تھا سو راستوں سے ناواقف تھا۔ اسے اس بات کا پتا نہیں تھا کہ وہ ایک ”بند گلی“ تھی۔ مجھے اس بات کا علم تھا تو میں بکرے کو ادھر مڑتے دیکھ کر خوش ہوا کہ اب بکرے کو پکڑنا آسان ہو گا۔ میں تیزی سے اس گلی میں پہنچا تو

اس وقت تک بکرا گلی کے بند سرے کی طرف پہنچ چکا تھا۔ آگے راستہ بند نظر آنے پر اسے غصہ آ گیا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ سر جھکا کر میری طرف ایسے برہما جیسے بل فائننگ میں نیل اپنے مخالف فائٹر کی طرف برہتا ہے۔ یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں رک کر واپس پلٹا اور گلی سے باہر کی طرف بھاگنے لگا۔ اس دوران محلے کے کچھ لوگ بھی پہنچ چکے تھے۔ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر بکرا گھبرا گیا۔ سب سے مل کر اس پر بڑی مشکلوں سے قابو پایا اور میرے حوالے کیا۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے فوراً اپنے نامناسب حلیے کا خیال آیا۔ میں شرمندہ ہو۔ اور سب کا جلدی سے شکریہ ادا کر کے گھر کے اندر چلا گیا۔ آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بہت ہنسی آتی ہے۔

3۔ بقر عید کے موقع پر میں سب کے ساتھ مل کر بارہی کیو بہت اہتمام سے تیار کرتا ہوں۔ میرے ملائے ہوئے مسالے سب کو بے حد پسند آتے ہیں۔

عظمیٰ افتخار کراچی (مصنفہ)

1۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ آپ کو سال کے کون سے دو دن پسند ہیں۔ تو میرا جواب ہو گا ”عیدین کے دن۔ کیونکہ ہر سال جہاں عید الفطر روزداروں کے لیے اللہ کا انعام ہوتا ہے وہیں عید الاضحیٰ بھی ہر سال ایک ایسی عظیم قربانی کی یاد دلاتی ہے جس کی امت مسلمہ ہر سال پیروی کرتی ہے اور ان شاء اللہ رہتی دنیا تک کرتی رہے گی۔

خواتین کی زندگی میں انجوائے کا لفظ تب داخل ہوتا ہے جب انہیں فرصت کے لمحات میسر ہوں اور کام کے لحاظ سے عید الاضحیٰ زیادہ مصروف گزرتی ہے بہ نسبت عید الفطر کے اس لیے میں عید الفطر پر زیادہ انجوائے کرتی ہوں۔ دوست احباب سے ملنا ملنا، فون پر عیدوش کرنا، کوئی اچھی سی ڈش بنانا، چوڑی، مندی اور کپڑوں کی ڈیزائننگ پر باتیں کرنا۔ کیونکہ عید الاضحیٰ تو چاند سے زیادہ قصائی پر انحصار کرتی ہے۔ قصائی اگر وقت پر آجائے تو عید واقعی عید کہلاتی ہے،

ورنہ ہماری حالت بھی اس مثل کے مصداق ہو جاتی ہے کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی، کبھی تو چھری تلے آئے گی۔ یوں پورا دن چھری تلے گزر جاتا ہے۔

2۔ 2008ء کا سال اس لحاظ سے میرے لیے ہمیشہ یادگار رہے گا کہ میں اس سال حج بیت اللہ کے لیے گئی تھی۔ حاجی کے لیے تو گویا ہر دن عید کا دن ہوتا ہے، مگر یوم النحر (دس ذی الحجہ) کا دن اس لحاظ سے میرے لیے بہت خوب صورت اور یادگار رہا کہ اس دن میں قربانی کے بعد قنبرا حلق کروا کر احرام کی پابندی سے باہر آچکی تھی۔ منیٰ سے مکہ تک کا سفر کچھ پیدل اور کچھ بس کے ذریعے کیا تھا۔ دن کے بارہ بجے اپنے ہوٹل پہنچ کر نیا لباس زیب تن کیا اور پھر خانہ خدا کی طرف گامزن ہوئے۔ بس ایک لمحے کے لیے سوچیں! عید کا دن ہو، آپ مسجد الحرام میں موجود ہوں، طواف زیارت کر رہے ہوں، خدا سے قربت کا احساس دوچند ہو تو کیا کیفیت ہوگی۔ بس ابھی میری کیفیت تھی جو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

3۔ عید الاضحیٰ کا موقع ہو اور لذت کام و دہن کی بات نہ ہو، یہ تو ہو نہیں سکتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے، مگر جس رفتار سے ہمارے پی دی پر کوکنگ شوز آرہے ہیں، مجھے لگتا ہے دل تک براہ راست آنے والی سڑک ہی جام ہو چکی ہے۔

میں ”گولہ کباب ہانڈی“ بہت مزے دار بناتی ہوں۔ میرے اہل خانہ اور مہمانوں نے تو اسے پسندیدگی کی سند دے دی ہے۔

زینب منہاس۔ کراچی (شاعرہ، تحقیق نگار، ماہر تعلیم)

1۔ عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ، دونوں کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ رمضان کی عبادتوں کے بعد عید کی رونق، مٹھاس بھری ہوتی ہے اور عید الاضحیٰ میں



قربانی سے قبل کی رونق مجھے بہت پسند ہے۔ قربانی کے جانوروں سے بچوں اور بنوں کی دلچسپی کو میں بہت انجوائے کرتی ہوں اور عید سے پہلے کے یہ ہنگامے مجھے بہت دلفریب لگتے ہیں۔ قربانی کے بعد مختلف کھانوں کی تیاری کا خصوصی اہتمام بھی اس عید کی رونق میں اضافہ کرتے ہیں۔

2۔ میں اپنے بچپن سے دیکھتی آئی ہوں کہ ہماری فیملی میں قربانی کا جانور گھر کے مروجہ حضرات خود ہی مل کر ذبح کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے بھی عید کی رونق دوگلا ہو جاتی تھی۔ ایک عید پر میرے والد نے نیل کو ذبح کیا تو ذبح کیا ہوا نیل ایک دم ڈکڑا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی ٹھوک سے میرے ابو جی کا چھری والا ہاتھ ایک دم ان کے پیٹ کی طرف مڑ گیا۔ یہ دیکھ کر ہم سب کی بے اختیار جھنجھٹ نکل گئیں۔ تاہم ابو نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ انہوں نے فوراً ”چھری ہاتھ سے نیچے گرا دی اور خود اچھل کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئے تاکہ چھری ان کے پیروں پر گر کر ان کے پیر نہ زخمی کر دے۔

بعد میں نیل کو کسی طرح قابو پا کر ذبح کر دیا گیا مگر وہ چند لمحوں کا خوف میرے دل پر ہمیشہ محیط رہا۔ آج بھی یہ واقعہ یاد کرتی ہوں تو روتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

3 - میں ہر سال عید پر مسالے دار بریانی بڑے اہتمام سے تیار کرتی ہوں۔ کیونکہ سب لوگوں کو میرے ہاتھ کی بنی ہوئی بریانی بے حد پسند ہے۔ وہ بقر عید سے پہلے ہی مجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ بھیج! کچھ اور ہو یا نہ ہو، مسالے دار بریانی ضرور ہونی چاہیے۔ تو آپ اسے میری خاص ڈش کہہ سکتے ہیں۔
منیرہ عادل۔ کراچی (مصنفہ ماہر پکوان و آرٹس خانہ)

1 - دونوں ہی عیدوں کی اپنی اہمیت اور خوشی ہوتی ہے، لیکن عید الاضحیٰ پر گہما گہمی کچھ زیادہ ہی رہتی ہے۔ پہلے سے جانور آجاتے ہیں تو سب ان کے ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں۔ پھر جانوروں کی قربانی گوشت کے ہیکٹس بنانا، نئی نئی رسپیوں پکانا۔ باربی کیو میں بھی برا مزہ آتا ہے۔ سارا خاندان اکٹھا ہوتا ہے۔ بہت اچھی گید رنگ رہتی ہے۔ حالانکہ ویسے بھی ملتے رہتے ہیں، لیکن باربی کیو کا مزہ ہی الگ ہے نا۔ مطلب اس عید کی تو انجوائے منٹ ہی الگ ہے۔

2 - ہمارے محلے میں ایک فیملی اپنی گائے اپنی چھت کی بلڈنگ پر باندھا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ حسب معمول اپنی گائے کو چھت پر لے جا رہے تھے، تاہم گائے صاحبہ چھت پر جانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ سب نے زبردستی کی تو گائے رسی چھڑا کر بھاگ نکلی۔ راستے میں کچھ دکانوں کے باہر دکان داروں نے اپنا سامان سجایا ہوا تھا۔ گائے وہ سب توڑتی پھوڑتی برباد کرتی اور اپنے سامنے آنے والے لوگوں کو زخمی کرتی بہت دور تک بھاگتی رہی۔ سب اس کے پیچھے پیچھے تھے خیر! بڑی مشکلوں سے گائے پر قابو پایا گیا۔ کئی سال گزر گئے مگر یہ واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے۔

3 - ویسے! اس سوال کا جواب تو فیملی یا مہمانوں سے پوچھنا چاہیے۔ بلکہ آپ کو خود آکر کھا کر پھر خود اس سوال کا جواب لکھنا چاہیے۔

خدا کے فضل و کرم سے میرے کھانے سب کو پسند آتے ہیں، تاہم خاص طور پر بات کی جائے تو مسلم ران اور پائے بہت زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔
ران کو وہی اور مسالا لگا کر میز پر رکھ دیتی ہوں۔ پھر اسے پکا کر کبھی مسالا بھون لیتی ہوں۔ کبھی فرائی کرتی ہوں تو کبھی بیک بھی کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ سلاڈ، فریج، فراز، ابلے ہوئے انڈوں کے قتلے سجا کر پیش کرتی ہوں۔ مسلم ران کے ساتھ رائتہ، بھنا ہوا مسالا، نان، کلچے اور کوئلڈ ڈرنک بھی ہوتی ہے۔
یقین مانیں! مزہ آ جاتا ہے۔
مسلم ران اور پائے کے ساتھ اور ڈشز بھی بناتی ہوں، مگر تعریفوں کا زیادہ حصہ یہ دونوں ڈشز سمیٹ لیتی ہیں اور یہی سب کی اولین پسند ہوتی ہیں۔

نسیم سحر کراچی۔ (مصنفہ)

1 - مجھے تو عید پسند ہے چاہے کوئی سی بھی ہو۔ بقول شاعر ہر دن عید، ہر شب، شب برات ہو۔ ہر چند کہ شاعر کی یہ دعا مجھے لگی تو نہیں تاہم کوشش یہی ہوتی ہے کہ میرا ہر دن عید کی طرح خوشگوار گزرے۔
میٹھی عید چونکہ رمضان کے بعد آتی ہے اور رمضان بے شک بابرکت مہینہ سہی مگر خاتون خانہ کے لیے ڈبل مشقت لے کر آتا ہے۔ اس لیے مزہ تو بہر حال عید الفطر کا ہی ہے۔

2 - بقر عید کے حوالے سے یادگار واقعہ۔ اگرچہ میں خود بھی قربانی کے حوالے سے باسعادت ہوں مگر عزیزوں کے گھر سے گوشت آنے کا بھی الگ مزہ ہے۔ ہمارے ایک عزیز ہیں۔ ان کے گھر سے بہت سارا گوشت آتا ہے۔ ایک دفعہ میں ان کے گوشت کا انتظار کر رہی تھی مگر شام ڈھلنے لگی ادا ان کے گھر سے کوئی نہ آیا تو میں نے امی کے گھر جانے کا رخت سفر باندھا۔ میں پہلے دن قربانی کرتی ہوں۔ عزیز کے گھر سے دوسرے دن گوشت آتا ہے اور تیسرے دن میں امی کے گھر جاتی ہوں مگر ان عزیز کے گھر سے گوشت نہ آنے کا اتنا قلق ہوا کہ ساری پلاننگ پر خود ہی بانی پھیرا



اور مختصر سی تیاری کر کے آف موڈ کے ساتھ گھر سے نکل پڑے مگر۔۔۔ سیڑھیاں اترے ہی تھے کہ سامنے سے وہی رشتے دار آ رہے تھے۔ خوشی بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ دوبارہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ لاک کھولنے کے لیے پرس میں ہاتھ ڈالا، پھر سارا پرس کھنگال لیا۔ چابی نہیں ملی۔ جھکے سر کے ساتھ یاد آیا کہ چابی ڈاننگ ٹیبل پر رہ گئی۔ میاں صاحب کی خوشگلیں نگاہوں کے خوف سے چابی ڈھونڈنے کا عمل جاری رکھا۔ میاں صاحب نے مایوس کر سامنے والوں کی تیل بجا کر کہا۔ ہمارا گوشت رکھ لیں۔ انہوں نے ڈیپ فریزر بھرے ہونے کا عذر پیش کر کے معذرت کر لی۔ ہمارے عزیز گوشت لیے کھڑے ہیں، ہم چابی ڈھونڈ رہے ہیں۔ عجیب صورت حال تھی۔ منہمان کو دروازے پر کھڑے رکھنے کی شرمندگی گوشت آ جانے کی خوشی، میاں صاحب کی گھورتی نظریں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے، میں نے اس وقت کیا کیا برداشت کیا۔ ہمارے عزیز نے جب اپنی ایسی ناقدری دیکھی تو انہوں نے ایسا شرمندہ کیا کہ ہم آج تک نہیں بھول سکے۔ انہوں نے کہا کچھ نہیں بس۔ اپنا گوشت واپس لے گئے۔

3 - میری چھوٹی بہن کو میرے ہاتھ کے شامی کباب بہت پسند ہیں۔ میری بیٹی کو تقریباً ہر کھانا اور میاں صاحب کو ہمارے سب ہی کھانے ناپسند ہیں مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ میں قورمہ بہت اچھا بناتی ہوں۔ میرے اس خیال کو تقویت یوں ملتی ہے کہ جب بھی میں قورمہ بناتی ہوں۔ بے شک میرے میاں تعریف نہیں کرتے مگر اس دن دو روٹی زیادہ کھاتے ہیں۔

صدف آصف کراچی۔ (مصنفہ)

1 - عام طور پر خواتین عید الفطر کو زیادہ انجوائے کرتی ہیں، کیوں کہ اس میں کام کا کبھیڑا عید قربان کے مقابلے میں کم ہوتا ہے، تاہم مجھے شروع ہی سے عید الاضحیٰ پسند ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں سب سے پہلی اور بڑی وجہ سنت ابراہیمی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اللہ کی راہ میں دی جانے والی قربانی ہے۔ قربانی کا فریضہ ادا کرنے کے بعد دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ اس سال بھی اللہ نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اس کی راہ میں قربانی کر سکے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب سائٹ آپ کیلئے جاری رکھ سکیں۔

پاکستانیوں کی ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com

LIBRARY FOR PAKISTAN



دور دور سے ہی کرتی تھی۔ قریب جانے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ایک دفعہ ہمارے محلے میں بڑا مرکزہ بنل آیا۔ سارے بچوں میں بڑا شور مچ گیا کہ ارشاد بھائی کا نیل بڑا زور دار ہے۔ سوزوکی سے نیچے نہیں اتر رہا ہے جو بھی اس کے قریب جاتا ہے وہ سینگیں مارنے لگتا ہے۔ میں بھی اپنی دوستوں کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اس کو دیکھنے پئی۔ ہم سوزوکی سے تھوڑی دور سامنے سے کھڑے ہو کر اس کے اترنے کا نظارہ کر رہے تھے۔ نیل بہت خراٹ لگ رہا تھا کافی فوفال کر رہا تھا۔ مجھے تو اس کے بڑے بڑے سینگوں سے خوف آ رہا تھا۔ سوزوکی والے اسے چمکا کر اتارنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں نیل تیزی سے اپنی رسی تڑا کر سوزوکی سے اترا اور سیدھ میں بھاگنے لگا جہاں میں کھڑی تھی۔ بس پھر کیا تھا میں اتنا ڈر گئی کہ مت پوچھیں۔ اپنی ہم جوہلوں کا ہاتھ چھڑا کر پلٹ کر خود سڑک دوڑی تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ زندگی میں کبھی اتنا تیز نہیں بھاگی ہوں گی۔ پورے راستے مجھے لگتا رہا کہ نیل اب مجھے مارے کہ تب مارے، مگر کچھ نہ ہوا تو کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں رک کر دیکھا، میری ساری سہیلیاں دور کھڑی خوب قہقہہ مار کر ہنس رہی تھیں اور نیل تو ارشاد بھائی کے گھر کے اندر جا چکا تھا۔ بتا چلا کہ اس نے ایک رسی تڑائی تھی مگر دوسری ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے دور نہیں جاسکا اور ان لوگوں نے اس پر قابو پا لیا۔ بچپن بھی کتنا معصوم ہوتا ہے۔ مجھے یہ واقعہ آج بھی یاد آتا ہے تو ہنس پڑتی ہوں۔

3۔ ویسے تو یہ ”اپنے منہ میاں مٹھو“ والی بات ہو جائے گی مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ میرے پکائے ہوئے کھانوں کو لوگ عموماً پسند کرتے ہیں۔ بقر عید پر میری کوشش ہوتی ہے جھٹ پٹ کھانے پکالوں تاکہ عید کے خوشگوار لمحات کم سے کم باورچی خانے کی نذر ہوں۔

دوسرے اس دن جب گوشت کی وافر مقدار غریبوں میں تقسیم ہو رہی ہوتی ہے تو میں رات کو یہ بات سوچتی ہوں کہ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس منگائی کے دور میں جبکہ گوشت خریدنا ایک عام آدمی کے لیے ضرورت کی جگہ عیاشی بن گیا ہے تو اس دن کی برکت سے ہر غریب گھر میں گوشت کی برساتی آسان ہو گئی ہوگی۔

میں بچپن سے ہی عید قرباں کو بہت انجوائے کرتی ہوں۔ اب میری بیٹی ثانیہ آصف اس چیز سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ عید سے قبل ہی گائے بکریوں کا شور شروع ہو جاتا ہے۔ گلیوں میں رونق لگ جاتی ہے۔ بچے اپنے جانوروں کی رسیاں تھامے سڑکوں پر چل قدمی کر رہے ہوتے ہیں۔ جانوروں کی بال بال میں میں ہتھکڑوں کی چھن چھن، گلے میں بڑی گھنٹیوں کا شور۔ مجھے یہ سب آوازیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ آخر! یہ ہم مسلمانوں کا تہوار ہے۔ ہمیں اس سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونا چاہیے۔

2۔ عید قرباں کے حوالے سے میرے بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ میں شروع سے ہی بہت ڈر پوک واقع ہوئی ہوں۔ جب عید سے قبل پورے محلے میں قربانی کے جانور آجاتے تو ان کو دیکھنے جاتی تھی، مگر ان کا دہار

WWW.PAKSOCIETY.COM

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا گلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے، جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ یہودی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں دواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کا دن رات نوکری کی چکی میں تپے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت لی بی ان کی حراست میں ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیرو فرینڈ کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاش کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی اینکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال منسار اور مجتبیٰ خاتون ہیں۔ ولی، چولید اور ایذا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں ایذا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیمہ العباس طبعاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ



پچھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت ٹالاں ہے۔ شبیبہ تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو صلیبیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیبہ تنوی کا منگیتر ہے، وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی۔

ثروت و انیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر مکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ اندازہ ہے۔ وانیال حسن ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیبہ العباس ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیبہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایک سیڈنٹ ہوتا ہے تو بے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر بے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دے بغیر چلا جاتا ہے جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی بے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلائی ہیں۔ ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیبہ کو بے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، بس پر وہ بے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انیبال دل تو اہل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث وانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان، ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے، وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوس کے کہنے پر جنت کو عبیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پینے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت و انیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر مکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ اندازہ ہے۔ وانیال حسن ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیبہ العباس ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایبیبیسی حرکت میں آجائے گی۔ ثمینہ نے ماوی سے کہا، وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جاسکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ ماوی بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیبہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیبہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پہنچے۔ انبیا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔ ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملا زمین کے رویے میں عجیب پر سرارت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تسنیم سے دوستی کر لی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے خطر تھی، جب ہی ایک صبح اسے شبیبہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔ جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماوی کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماوی کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنہائی میں ماوی سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔ جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حرم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان ماوی کی پراسرار گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ثمینہ ان سے کہتی ہیں کہ ماوی پاکستان میں ہی ہے لیکن انبیا انہیں بتاتی ہے کہ ثمینہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال ماوی سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیبہ نے اسے وہاں سے نکلنے ہوئے دیکھ لیا۔ شبیبہ نے جلال سے باز پرس کی تو جلال نے اسے بتا دیا کہ وہ ماوی سے نکاح کر چکا ہے۔ جب وہ شبیبہ کو یہ بات بتا رہا تھا تو تنوی نے سب کچھ سن لیا۔ اس نے حرم اور نمل کو بھی بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ فیضان کو پتا چل گیا کہ ماوی حویلی میں ہے۔ فیضان، ثمینہ پر بے حد ناراض ہوئے۔

ماوی نے حویلی کی خاص ملازمہ تسنیم کو آمادہ کر لیا کہ وہ اسے حویلی کے تمام رازوں سے آگاہ کرے گی۔ حرم کی مندی تقریباً ہو رہی تھی۔ سب لوگ اس میں مصروف تھے جب تسنیم نے ماوی کو ملنے کا اشارہ کیا۔ ماوی حویلی کے عقبی حصے میں گئی تو وہاں اسے تسنیم کے بجائے ایک لاغر سا ڈھانچہ نما شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

وہ تسنیم کا باپ ہوتا ہے۔ تسنیم بتاتی ہے کہ جنت بی بی نے کئی سالوں سے اسے اس کال کو ٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔ برابر والے گاؤں کے چوہدری فیاض نے جنت بی بی کی زمینوں کا پانی بند کر دیا۔ یہ قضیہ نمٹانے کے جنت بی بی رجب علی اور رب نواز کو بھیجتی ہے۔ وہاں طیش میں آکر رب نواز پستول نکال لیتا ہے۔ رجب علی منع کرتا ہے اور اس سے پستول چھینتا ہے۔ اس چھینا چھٹی میں گولی چل جاتی ہے اور چوہدری فیاض کا آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ رب نواز یہ الزام رجب علی پر لگاتا ہے مگر ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنت بی بی کے سامنے اقرار جرم کر لیتا ہے۔ جنت بی بی اسے زبان بند رکھنے کا حکم دیتی ہے اور دونوں کو پھانسی دیتی ہے۔ تاہم رجب کے سر پر احسان ڈال دیتی ہے۔ انبیاء و انیال حسن سے ماں کو واپس لانے کو کہتی ہے۔ وہ سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ثروت بھی مصالحت

قسط 27

ماوی کو اپنے پیروں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ ثبوت تک پہنچنے کا یہ موقع بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ یہ بے کار چیز تم پھر کسی وقت پڑھ سکتی ہو۔“ جنت بیگم نے نخوت سے کہا۔

”آپ کسی اور وقت بھی بات کر سکتی ہیں۔“ ماوی نے سرعت سے خط ان کے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کسی کے کمرے میں آنے کا۔“

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، مجھے طور طریقے سکھانے کی کوشش نہ کرو۔ ایس باتیں انہیں زیب دیتی ہیں جنہوں نے خود کسی اصول کی پاس داری کی ہو۔“ جنت بیگم کا انداز ابھی بھی سابقہ تھا۔

”میں تم سے صرف اتنا کہنے آئی ہوں کہ مجھے انجان نہ سمجھو۔ بے شک میں حرم کی شادی کے سلسلے میں مصروف ہوں لیکن آنکھ اور کان کھلے ہیں میرے اور تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میری حویلی میں تم اپنی من مانی کرتی پھوگی اور مجھے کان بوکان خبر نہ ہوگی۔“

”اچھا ہو گا جو آپ کہنا چاہتی ہیں ذرا واضح الفاظ میں کہیں۔“

”اگلی بار تم مجھے تسنیم کے آس پاس بھی نظر آئیں تو نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔“ جنت بیگم نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”اوہ۔۔۔“ ماوی استہزائیہ ہنسی۔ ثبوت اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب بھلا مصلحت اختیار کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ”تو آپ تک خبر پہنچ ہی گئی۔ چلیں! اچھی بات ہے۔ اب آپ ذرا تیاری کر لیں کیونکہ آپ کے خلاف ثبوت مجھے مل ہی چکا ہے۔ حرم کی شادی ختم ہوتے ہی میں پولیس سے رابطہ کرنے والی ہوں۔“

جنت بیگم بری طرح جو گئی۔

”اچھا ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ ایسا کون سا ثبوت فراہم کر دیا تسنیم نے کہ تم مجھے دھمکا رہی ہو۔“

اس سے قبل کہ ماوی کوئی جواب دیتی۔ دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ ان دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

”اماں! آپ یہاں ہیں؟“ مستقیم نے اندر جھانکا۔ ان کے پیچھے منصور، شبیہ اور جلال بھی تھے۔

”ہم نے آپ کو ساری حویلی میں ڈھونڈ لیا اور آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ سب بات آنے والی ہے اماں۔!“

جنت بیگم نے ہاتھ اٹھا کر بیٹے کو بولنے سے روک دیا۔

”مجھے ذرا اس لڑکی کی بکواس سن لینے دو جو مستقل مجھ پر انگلی اٹھا رہی ہے اور میری اولاد میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اس کی زبان روک سکے۔“

جنت بیگم بری طرح تلملائی ہوئی تھی۔ جملہ افراد اپنی اپنی جگہ چوکے تھے۔

”آخر بات کیا ہے اماں!“

”اسی سے پوچھو۔“

”ٹھیک ہے، میں ہی ان لوگوں کو حقیقت بتا دیتی ہوں۔“ ماوی نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ میرے بابا کا قتل ہوا تھا۔ مستقیم بچا! میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ میں یہاں محض آپ لوگوں سے ملنے آئی ہوں۔ میں دراصل یہاں اپنے بابا کے قاتل کی تلاش میں آئی تھی۔ بلکہ قاتل کی تلاش کتنا غلط ہو گا۔ قاتل کا نام تو میں پہلے سے جانتی تھی میں تو یہاں ثبوت لینے آئی تھی اور وہ مجھے مل چکا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ میرا شک درست تھا۔ جنت بیگم ہی میرے بابا کی قاتل ہیں۔“

ان سب کے دماغ گویا بھک سے اڑ گئے تھے۔

”کیا بکواس کر رہی ہو تم۔“ شبیہ بری طرح غرایا۔

”میں بکواس نہیں کر رہی، یہ ہی حقیقت ہے۔“

ماوی نے اطمینان سے کہا۔ اس دوران وہ حتی المقدور جلال کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”اب اگر تم نے ایک بھی لفظ اور کہا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔“ وہ غراتا ہوا اس کی طرف لپکا تھا۔ اگر مستقیم اور منصور بھٹی نے اسے روک نہ رکھا ہوتا تو اب تک یقیناً ”وہ دو تین تھپڑ تو ماوی کو جڑ ہی چکا ہوتا۔“

”میری باتوں پر اس طرح سے ری ایکٹ کر کے تم لوگ خود کو سچا اور مجھے جھوٹا ثابت نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا ناں! میرے پاس ثبوت موجود ہے۔“

”اچھا۔۔۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں وہ ثبوت۔“

مستقیم بھٹی نے جیسے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ انہیں اس وقت ماوی کو حویلی میں ٹھہرانے پر اذہد افسوس ہو رہا تھا۔

”ضرور! کیوں نہیں۔۔۔“ ماوی نے بغیر کسی تامل کے وہ خط ان کی طرف بڑھا دیا تھا۔ ”لیکن یاد رہے! اس کی ایک کاپی میں آل ریڈی آئی جی پولیس کو بھجوا چکی ہوں۔“

اس نے ہوا میں تیر چلایا تھا۔ وہ بھی محض اس لیے تاکہ اس خط کو ان لوگوں کے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچا سکے۔

مستقیم بھٹی نے اس کے ہاتھ سے خط لیا اور ماتھے پر تیوریاں ڈالے اسے بڑھنا شروع کیا۔ سب اذہد تجسس بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ سوائے ماوی کے سب کے چروں پر پریشانی تھی۔ وہ تو کمال خوبی سے اپنے تاثرات چھپائے ہوئے تھے۔

”کیا لکھا ہے مستقیم!“ جوں ہی مستقیم بھٹی نے نظریں اٹھائیں۔ جنت بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

وہ خشمگین نگاہوں سے ماوی کو گھورتے رہے۔ خط تیزی سے ان کے ہاتھ سے شبیہ پھر جلال اور آخر میں

منصور بھٹی کے ہاتھ میں منتقل ہوا تھا۔

شبیبہ کا تو بس نہ چلتا تھا ماوی کی گردن ہی توڑ ڈالے۔

”یہ لڑکی مجھ پر بے بنیاد الزام لگا رہی ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی ثبوت ہے بھی تو اس کا خود کا تیار کیا ہوا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ جنت بیگم نے تقریباً ”گھگھاتے ہوئے“ اپنی صفائی دینا چاہی۔

”آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے اماں!“ مستقیم بھٹی نے کہا۔

”بالکل بی جان! آپ باہر چلیں۔ اس لڑکی سے ہم خود نمٹ لیں گے۔“ شبیبہ نے خون خوار لہجے میں کہا۔

”یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ حرم کی رخصتی کا انتظار کرنا چاہیے ہمیں۔“ جلال نے آہستگی سے کہا۔

”جلال بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ مستقیم بھٹی نے کہا۔

”چلیے اماں! بات پہنچ گئی ہوگی۔“

ماوی حیران تھی۔ ان سب کا رد عمل ماوی کی توقعات کے برعکس تھا۔

”تم سے تو بعد میں نمٹتے ہیں۔ کسی پرانگی اٹھانے سے پہلے کم سے کم ہوم ورک ضرور مکمل کر لینا چاہیے۔“

شبیبہ نے خط ماوی کے چہرے کی طرف اچھالتے ہوئے نفرت سے کہا۔ پھر وہ سب جنت بیگم کو لیے باہر نکل گئے۔

ماوی ایک بھی پل ضائع کیے بغیر خط کی طرف لپکی تھی۔

جب تک تمہیں یہ خط ملے گا میں بہت دور جا چکا ہوں گا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے مجھے اب اس زندگی سے رابطہ ختم کر لینا چاہیے گو کہ میں مانتا ہوں کہ میں بہت بڑی خود غرضی کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن یہ میری مجبوری ہے اور تم میری اس مجبوری سے واقف ہو۔ مجھ سے اب یہ الزامات اور طعنوں سے بھری زندگی نہیں گزاری جانی اس لیے میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کر رہا ہوں۔ میں حرام موت کو گلے لگا رہا ہوں۔ وہ بھی صرف اس امید پر کہ اللہ اپنے بندوں کی کوتاہیوں کو معاف کر سکتا ہے انسان نہیں۔ مجھے اس گناہ کی سزا دی جا رہی تھی جو میں نے کیا ہی نہیں ہے اور بغیر غلطی کے سزا بھگتنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جنت لی لی کے طعنے اب میری برداشت سے باہر ہو چکے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ عورت مجھے زہر دے دیتی نہ کہ اپنے طعنوں سے میری زندگی عذاب بناتی۔ اپنا اور ماوی کا خیال رکھنا اور ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ تمہیں اس مصائب بھری زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ کر جانے کا بوجھ ہمیشہ میری دوش پر رہے گا۔

فقط۔۔۔ رجب

ماوی کے ہاتھ میں وہ کاغذ کا ٹکڑا پھر پھڑپھڑا رہا تھا اور وہ گم صم تھی جیسے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ سہنے کے بعد کوئی بھی انسان ہو سکتا ہے۔ بے یقین دم، بخود اور مایوس۔۔۔

☆ ☆ ☆

انیسا ہکا بکا فیضان کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”آ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

اس نے حیرانی سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ بے چاری تو کسی کام سے باہر نکلی تھی گیسٹ پر فیضان سے ملے بھیر ہو گئی اور فیضان اتنے غصے میں تھے کہ ولید کا کارنامہ اس تک پہنچانے میں ایک پل بھی ضائع نہیں کیا۔

”یہ تم مجھ سے نہ پوچھو۔ جا کر اپنے بھائی سے پوچھو کہ اس نے یہ گھٹیا بگو اس کس بنیاد پر کی ہے؟“ فیضان بری

طرح خار کھائے ہوئے تھے۔

”میں تو اسے سینس ایبل سمجھتا تھا لیکن وہ۔۔۔ اور تمہیں کتنی بار منع کیا میں نے کہ اپنی فضول حرکتوں سے باز آ جاؤ لیکن تم۔۔۔“

”فضول حرکتیں۔۔۔ کون سی فضول حرکتیں؟“ انیسا کی رگوں میں جیسے شرارے سے دوڑنے لگے تھے۔

”آپ سے پسندیدگی کا اظہار کر دینے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ آپ میری فیلتنگز کو اس طرح کے الفاظ

دیں۔ میں مانتی ہوں کہ ولید نے غلط کیا ہے لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

”سارا قصور تمہارا ہی ہے۔“ فیضان کا غصہ کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔ ”نہ تم بھاگ بھاگ کر انیکسی کی طرف

آئیں نہ ولید کو بات بنانے کا موقع ملتا۔“

”میں بھاگ بھاگ کر صرف اس لیے آتی تھی کیونکہ مجھے آپ کی پروا تھی۔ آپ کو میرا آنا اتنا برا لگتا تھا تو منع

کر دیا ہوتا۔“ اس نے بھی دودھ دیا۔

”تم اور تمہارا بھائی دونوں پاگل ہو۔ پتا نہیں میں تم لوگوں کے درمیان کس طرح پھنس گیا۔“ فیضان جیسے غصے

سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

”ہاں! ہیں ہم پاگل۔ لیکن شکر ہے آپ کی طرح خود غرض نہیں ہیں۔ جنہیں صرف اپنی نیک نامی اور کاروبار

کی فکر ہے۔“ انیسا نے توہین سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ کہا۔

”آپ اپنے کاروبار کی فکر میں ہلکان نہ ہوں۔ ڈیڈی کی غلط فہمی میں دور کروں گی۔ آپ کو کسی قسم کا نقصان

برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔ اور ولید اور میری وجہ سے آپ کو جو پریشانی برداشت کرنا پڑی میں اس کے لیے

معذرت چاہتی ہوں اور۔۔۔“

اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا۔

”اور ماوی ٹھیک کہتی تھی آپ سے محبت کرنے سے بہتر تھا میں کسی پتھر سے سر پھوڑ لیتی۔ مجھے افسوس ہے

میں نے ایک پتھر کو چنا اور یہ افسوس مجھے ساری زندگی رہے گا۔ اب تو مجھے اس بات پر بھی حیرانی نہیں ہے کہ

آپ اب تک تنہا کیوں ہیں۔ جنہیں دوسروں کی فیلتنگز کی قدر کرنے کی عادت نہ ہو وہ ساری زندگی تنہا ہی رہتے

ہیں۔ آپ اس قابل ہی نہیں تھے کہ کوئی آپ کی زندگی کا ساٹھی بننا۔“

انیسا نے غم و غصے کے ساتھ کہا اور واپسی کے لیے پلٹ گئی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر فیضان کے تاثرات

دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ہاں اب یہ الگ بات تھی کہ مرکزی دروازے تک پہنچنے تک اس کی آنکھوں کے

کٹورے آنسوؤں سے لبالب بھر چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس رات دانیال حسن کی واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ انیسا ان کے انتظار میں جانے کب سے بیٹھی ہوئی تھی۔

”ڈیڈی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

دانیال حسن جلدی میں تھے اور سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔ انیسا کی بات سن کر انہوں نے پل بھر کے لیے اس کی

طرف دیکھا تھا۔

”میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ابھی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ جو بات کرنی ہے صبح کرنا۔“

”ڈیڈی۔۔۔!“ انیسا نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں لگتا تھا کہ فیضان کی

باتیں درست ہیں۔ ولید نے ضرور ان کے کان بھرے تھے۔

”ڈیڈی! میں ابھی بات کرنا چاہتی ہوں پلیز۔“

”میں تھکا ہوا ہوں انبیبا! ابھی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“ دانیال حسن نے سخت لہجے میں کہا۔

”آپ کے پاس ولید کی باتیں سننے اور ان پر یقین کرنے کے لیے وقت ہے، صرف میرے لیے وقت نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ دانیال حسن ٹھٹھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”کہو! کیا کہنا چاہتی ہو؟“ انہوں نے سرد مہری سے کہا۔

”ڈیڈی! یوں کھڑے ہو کر بات کرنا ضروری ہے، کیا ہم بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟“

”تمہیں جو کہنا ہے، یہیں کہو۔ میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔“

”ولید نے آپ سے کیا کہا ہے۔۔۔ میں یہی جانتا چاہتی ہوں۔“ انبیبا نے کسی قدر بد دل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”اور یہ بھی کہ آپ کو اس کی بات پر کتنا بھروسہ ہے؟“

”تمہیں کس نے بتایا کہ ولید نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟“

”ڈیڈی! ولید جھوٹ بول رہا ہے۔“ انبیبا نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دانیال حسن کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔ ان کی ساری سخت مزاجی ایک طرف، لیکن بیٹی کی آنکھوں میں آنسو برداشت کرنا مشکل تھا۔

”آپ کو اس کی باتوں پر یقین کرنے سے پہلے کم سے کم ایک بار مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔ کیا میں اتنی ناقابل بھروسہ ہوں ڈیڈی؟“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنا شروع ہو گئے تھے۔

”زیادہ ایموشنل ہونے کی ضرورت نہیں ہے انبیبا! ان کا لہجہ ابھی بھی سخت تھا۔“ ولید کی باتوں میں کتنی سچائی ہے، کتنی نہیں اس بات کا اندازہ لگانا تو یوں بھی مشکل نہیں ہے کہ تم تک خبر پہنچ چکی ہے۔“

”ڈیڈی۔۔۔!“ انبیبا نے روہانسی ہوتے ہوئے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا، لیکن دانیال حسن نے ہاتھ اٹھا کر فوراً اسے ٹوک دیا۔

”مجھے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنی۔ بہتر ہو گا تم اب اس بارے میں کوئی بات نہ کرو۔ ولید کی باتوں میں کتنی سچائی ہے، کتنی نہیں میں اس کا خود پتا لگا لوں گا۔“

دانیال حسن نے سرد مہری سے کہا اور تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ انبیبا جو یہ سمجھ رہی تھی کہ باپ کو قائل کر لے گی۔ اپنا سامنہ لے کر رہ گئی تھی۔

”دانیال! بہتر ہو گا، تم ایک بار فیضان کی بات سن لو۔ وہ اس وجہ سے بہت پریشان ہے۔“ توقیر صاحب نے فون پر کہا تھا۔

”میں خود کو اس کی بات سننے پر آمادہ نہیں کر پا رہا تو توقیر! میرے اعتماد کو بہت ٹھیس پہنچائی ہے اس نے۔ دل چاہتا ہے اب تو اس کی شکل بھی نہ دیکھوں۔“ دانیال حسن نے ناراضی سے کہا۔

”یار! فیضان ایسا لڑکا نہیں ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے ولید نے جھوٹ بولا ہے؟ وہ اپنی بہن کے بارے میں ایسی گھنیا بات کیوں کرے گا؟“

”تم ایک بار انبیبا کو اعتماد میں لے کر بات کرو۔ ممکن ہے وہ واقعی فیضان کے لیے کوئی فیلنگز رکھتی ہو اور اگر

ایسی بات ہوئی تو فیضان سے اس کی شادی میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ فیضان اچھا لڑکا ہے۔“

”ناگل تو نہیں ہو گئے؟ میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”کیوں اس میں آخر برائی کیا ہے؟ میں نے کہا ناں! فیضان اچھا لڑکا ہے انبیبا کو خوش رکھے گا۔ جہاں تک ولید کی باتوں کی سچائی کا تعلق ہے، تم اسے اعتماد میں لے کر بات کرو۔ مجھے یقین ہے اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔“

لیکن اس سے بھی پہلے تم انبیبا سے پوچھو۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو توقیر! بھلا میں بیٹی سے ایسی باتیں کیسے کر سکتا ہوں۔ فرینک نہیں اپنی جگہ، لیکن باپ بیٹی میں کوئی لحاظ بھی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم اتفاق نہ کرو، لیکن میرا ماننا ہے اس لحاظ کو ختم نہیں ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے! پھر تم ثروت۔۔۔ بھابھی سے کہو کہ انبیبا سے پوچھیں۔“

توقیر صاحب نے ایک اور راہ دکھائی۔ دانیال حسن چپ سے رہ گئے۔ اس سارے سلسلے میں ثروت کا خیال انہیں ایک بار بھی نہیں آیا تھا۔

”توقیر! وہ میں۔۔۔“ اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کر پاتے، باہر سے کسی غیر معمولی کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی۔

دانیال حسن چونک کر متوجہ ہوئے۔

”توقیر! میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔“ انہوں نے فون بند کیا اور باہر کی جانب لپکے تھے۔

”ہیلو۔۔۔!“ ولید نے انبیبا کو لاؤنج میں بیٹھے دیکھا تو وہیں چلا آیا۔ انبیبا نے اس کی آمد کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ ولید پر ایک خاموش نظر ڈالنے کے بعد وہ دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

ولید اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ انبیبا کے ہاتھ میں پکڑے اخبار پر نظریں دوڑاتا رہا، پھر اس نے اخبار چھین لیا۔

”اخبار واپس کرو ولید!“ اس کا انداز بے حد سرد مہر تھا۔

”کیوں؟“ ولید نے اس کے موڈ پر دھیان دینے لگا۔

”کیونکہ مجھے ایسی بد تمیزیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ انبیبا نے یکدم اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹتے ہوئے غرا کر کہا۔

”ارے! اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات ہے؟“ ولید نے حیرانی سے پوچھا۔

”جیسے تم تو نہیں جانتے۔“

ولید نے کندھے اچکا دیے۔

”کیا بکواس کی ہے تم نے ڈیڈی سے؟“

”بھئی! اس بارے میں بات کر رہی ہو؟“

”اتنے انجان مت بنو ولید! جیسے تمہیں تو کچھ پتا ہی نہیں۔“ انبیبا کا غصہ سے برا حال تھا۔ ”میرے اور فیضان کے بارے میں تم نے ڈیڈی سے کیا کہا ہے؟“

”تم یہ بتاؤ! کہا میں نے کچھ غلط کہا؟“ ولید نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے مزے سے پوچھا۔

”تم کس قدر گھٹیا انسان ہو ولید! اپنی سگی بہن کے بارے میں اتنی فضول باتیں کرتے ہوئے تمہیں ذرا سی بھی شرم نہیں آتی؟“

”لو اور سنو۔ ایک تو میں نے تمہاری مدد کی۔ اوپر سے تم مجھے ہی باتیں سنارہی ہو۔“ ولید نے ناراضی سے کہا۔
 ”ایسا گھٹیا الزام لگا کر تم نے کیا مدد کی ہے میری؟“ انیبہ نے تعجب سے پوچھا۔
 ”تمہارا اور فیضان بھائی کا معاملہ ڈیڈی تک پہنچا دیا، کیا یہ کم ہے؟“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”ورنہ تم تو کبھی یہ نہ کر سکتیں۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔“
 ”ہاں! مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تم نے ایک ذرا سی بات کو انتہائی فضول انداز اور الفاظ میں ڈیڈی تک پہنچا کر مجھے ان کی نظروں سے گرا دیا۔“
 ”اپنے امپریشن کی بڑی فکر ہے تمہیں۔ یہ بات میرے معاملے میں سوچی ہوتی تو ایسی نوبت ہی نہ آتی۔“
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب صاف ہے، میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میرے معاملات سے دور رہو، ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی، لیکن تم نے میری بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی اور می کو میری ایکٹوٹیز کے بارے میں بتا دیا۔ اب جب تم نے اچھی بن ہونے کا ثبوت دیا تو مجھے بھی تو خود کو اچھا بھائی ثابت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا، اسی لیے میں نے تمہارے اور فیضان بھائی کے بارے میں ڈیڈی کو بتا دیا۔“
 ”میں نے می کو تمہارے بارے میں اس لیے بتایا تھا، کیونکہ مجھے تمہاری فکر ہے۔“ انیبہ نے صدمے کی کیفیت میں کہا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے، مجھے تمہاری فکر نہیں ہے؟“ ولید نے کینگی کی حد کر دی تھی۔
 ”لیکن تم نے جھوٹ بولا ہے۔“ انیبہ تڑخی۔

”ہاں! اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ وہ مکاری سے ہنسا۔ ”جھوٹ بولنا میری مجبوری تھی۔ اسی لیے میں نے بہت سی باتیں اپنی طرف سے ایڈ کر کے ڈیڈی کو بتا دیں۔ تمہارے اور فیضان بھائی کے قصے میں خوب مریج مسالا لگانا پڑا مجھے۔ یار! واصل مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں تو می کو اتنی مشکلوں سے مطمئن کروں اور تم اتنی آسانی سے چھوٹ جاؤ۔“

”تو تم نے یہ سب مجھ سے بدلہ لینے کے لیے کیا؟“
 ”بالکل۔۔۔“ ولید نے ایک لفظ میں بات ختم کی تھی، لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ لاؤنج کے دروازے میں کھڑے دانیال حسن ان دونوں کی باتیں سن رہے ہوں گے۔
 ”تم نے جھوٹ بولا تھا؟“ دانیال حسن کی غصے اور صدمے سے چور آواز نے جہاں ان دونوں کو چونکایا تھا وہیں ولید کو بوکھلاہٹ میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر پلٹا تھا۔
 ”ڈیڈی! وہ۔۔۔ میں۔۔۔“ اس نے کنا چاہا، لیکن اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت اس کے جھوٹ کا پردہ فاش کرنے کے لیے کافی تھی۔ دانیال حسن نے اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ایک زوردار پھپھڑا سے دے مارا۔

صبح کا وقت تھا۔ دھوپ مٹی مٹی سی تھی اور موسم بے حد خوشگوار۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے اڑتے پھر رہے تھے اور ہوا بھی تروتازہ تھی۔
 ماوی ایک کونے میں نصب لکڑی کے بیچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ لباس ملگجا تھا اور کھلے ہوئے سیدھے بال کندھوں

پر دونوں طرف آگے آرہے تھے۔ وہ بڑی دیر سے وہاں بیٹھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے دوسرا کوئی کام ہی نہ ہو۔ وہ کبھی سر جھکا کر اپنے گھاس پر رکھے پیروں کو دیکھنے لگتی اور کبھی سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگتی۔ اس کا ذہن جیسے ہر سوچ سے خالی ہو چکا تھا۔

دوسری جانب حویلی کے دروازے پر بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔
 ”ماوی! ماوی! کل فون بجنے لگا۔ اس نے ناپسندیدگی سے اس بیپ کو سنا۔ وہ اس وقت کسی کی مداخلت نہیں چاہتی تھی۔

اس نے بے زاری سے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ماوی۔۔۔“ دوسری طرف ٹیمہ تھیں اور ان کی آواز میں بے قراری تھی۔
 ”جی می۔۔۔!“

”وہ خط جھوٹا ہے ماوی۔۔۔ جنت بیگم کی سازش ہے یہ۔۔۔ تم اس عورت کو نہیں جانتیں۔ وہ بہت شاطر ہے۔ ہونہ ہو، وہ خط اس نے تمہیں مس گائیڈ کرنے کے لیے خود تیار کروایا ہو گا۔“ ٹیمہ کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ماوی بے زار ہوئی۔

”می پلیز۔۔۔ اس طرح کی باتیں مت کریں اب۔ جنت بیگم لاکھ شاطر دماغی سہی، لیکن وہ خط انہوں نے تیار نہیں کروایا میں بابا کی رائٹنگ پہنچاتی ہوں۔“
 ”لیکن ماوی۔۔۔!“

”فار گاڈ سیک می! ایک ہی بات پر اصرار کرنا بند کریں۔“ اس نے مزید بے زاری سے کہا۔
 ”میں کل لاہور واپس چلی جاؤں گی اور جو بھی پہلی فلائٹ ملے گی اس سے ڈہلن آجاؤں گی۔ بہت رہ لیا پاکستان میں۔“ اس کی آواز میں مایوسی ہی مایوسی تھی۔

”نہیں! ایسا مت کرو ماوی! اس طرح ہمت ہار کر واپس نہ آؤ۔ تمہیں ابھی وہیں ہی رکنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اس عورت کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل جائے گا۔“

”فیضان ماما کو بتا دیجیے گا میں واپس آرہی ہوں۔ وہ حویلی آنے کی زحمت نہ کریں۔“ اس نے ٹیمہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”تم سنتی کیوں نہیں ہو میری بات۔“ یکدم ٹیمہ حلق کے بل چیختی تھیں۔
 ”میں اس بار آپ کی بات سننا نہیں چاہتی۔ آپ کی باتیں سن سن کر ہی اتنی شرمندگی اٹھانا پڑی ہے مجھے۔“
 ماوی نے بھی تیز لہجے میں کہا۔

”اگر تمہارے بابا نے خود کشی کی ہوتی تو جنت بیگم نے میرے سامنے انہیں قتل کرنے کا اعتراف کیوں کیا تھا؟ ایک بار یہ بھی تو سوچو۔“ ٹیمہ اب باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

ماوی چڑ کر کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن اس بات پر غصہ بھر کے لیے الجھ سی گئی۔ پھر اس نے اپنا سر جھٹک کر ہر بے زار کن خیال سے پیچھا چھڑانا چاہا۔

”میں فون بند کر رہی ہوں می! مجھے ابھی پیکنگ بھی کرنی ہے۔“

”ماوی۔۔۔ میری بات سنو۔“

لیکن ماوی نے ان کی بات سننے بغیر فون نہ صرف بند کر دیا، بلکہ سوچ آف ہی کر دیا تھا۔
 اس پر مایوسی طاری تھی، لیکن اس کا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔ اسی الجھن سے پیچھا چھڑوانے کے لیے وہ اٹھ

کھڑی ہوئی۔ اٹھتے ہی اس کی نظر دوربرآمدے کے ستون کے قریب کھڑے جلال پر پڑی۔ وہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے انداز سے لگتا تھا کافی دیر سے کھڑا ہے۔ ماوی اسے اپنی طرف دیکھتا پھر خفیف سی ہو گئی۔
جلال چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر مخالف سمت میں مڑ گیا۔
ماوی جزبزی ہو گئی۔ تب ہی اس نے اپنے پیچھے تسنیم کی آواز سنی۔
”ماوی بلی بلی! آپ میرے ساتھ چلیں۔“ وہ غلت میں تھی۔
”کیا بات ہے تسنیم!“

”آپ میرے ساتھ آئیں بلی۔ آپ کو ایک بات بتانی ہے۔“
”تسنیم۔ میں ابھی نہیں آسکتی مجھے پکنگ کرنی ہے۔“

”آپ کہیں جا رہی ہیں؟“

”ہاں! میں کل واپس جا رہی ہوں۔“

”لیکن ثبوت۔“

”اب کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماوی نے کہا۔ ”تمہارا شکریہ۔ تم نے میری اتنی مدد کی۔“
”ٹھیک ہے بلی! لیکن آپ آخری بار میرے ساتھ آئیں۔ بابا آج باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بار بار آپ کا پوچھ رہے تھے۔ یقیناً وہ آپ کو کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے میں آپ سے کہہ رہی ہوں ایک بار میرے ساتھ آئیں۔ ابھی بہت صبح ہے کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“ اس نے اصرار سے کہا تھا۔
”تسنیم! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پھر ابھی مجھے پکنگ بھی کرنی ہے۔ فرصت ملے گی تو تمہارے بابا سے ملنے آؤں گی۔“ اس نے ٹالتے ہوئے کہا تھا۔
”لیکن ماوی بلی بلی۔“ تسنیم نے کہنا چاہا، مگر ماوی اسے نظر انداز کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”تم گھٹیا انسان۔!“

”پلیز ڈیڈی! میری بات سنیں۔“ ولید نے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنا چاہا، لیکن دانیال حسن نے ایک کے بعد ایک اسے کئی پتھر رسید کیے تھے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا اسے قتل ہی کر ڈالیں۔
”بات سنوں۔۔۔ وہ بھی تمہاری۔۔۔ پہلے ہی تمہاری بات سن کر میں نے نقصان اٹھایا ہے۔ اپنی بیٹی کے کردار پر شک کیا۔ فیضان جیسے شریف النفس شخص پر شک کیا۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا۔“
”ڈیڈی۔۔۔ ڈیڈی پلیز۔۔۔ ولید کو چھوڑ دیں۔“ انبیبا روتے ہوئے انہیں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔
”تم دور رہو! میں اس کا حشر برا کروں گا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ اس طرح کا الزام لگائے۔“
وہ غصے سے بے حال ولید کو بری طرح پیٹ رہے تھے اور اس پر چلا رہے تھے۔ ولید نے دوبارہ ان کو نہیں روکا تھا۔

”ڈیڈی! پلیز ولید کو مت ماریں۔ وہ مرجائے گا۔“

”مر جانے دو۔ اس کا مرجانا ہی ٹھیک ہے۔“ دانیال حسن نے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا تھا۔
”ظاہر ہے! میرے مرنے سے آپ کو کوئی فرق بھی تو نہیں پڑے گا۔“ معا“ ولید نے ان کا خود کو پیٹتا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”میں تمہیں قتل کروں گا ولید!“

”آپ کر سکتے ہیں۔“ ولید نے ان کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس کا آنسوؤں سے بھگا ہوا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹ سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ دانیال حسن نے اسے بہت بری طرح پیٹا تھا۔
”بلکہ اچھا ہو گا آپ مجھے قتل کر ہی دیں۔ اور صرف مجھے ہی نہیں اپنے دونوں بچوں کو بھی۔ جنہیں اپنی ذات سے بہت زیادہ محبت ہو، انہیں اولاد کے جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔“
”کیا بکو اس کر رہے ہو؟“ دانیال حسن بری طرح غرائے۔

”اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے تم نے بہن پر الزام لگایا اور اب آنکھیں بھی دکھا رہے ہو۔“
”ہاں! تو میں کیوں نہ کرتا یہ۔ آپ نے اور می نے بھی تو اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہم لوگوں کو نظر انداز کیا۔“

ولید یکدم حلق کے بل چلایا تھا۔ دانیال حسن جیسے ایک دم ہی خاموش ہو گئے۔ لاؤنج میں سناٹا سا پھیل گیا۔ وہاں تین افراد موجود تھے لیکن جیسے کوئی بھی نہیں تھا۔

”تم پوچھ رہی تھیں نا انبیبا! میں سگریٹ کیوں پیتا ہوں۔ میں تمہیں بتاؤں۔ مجھے سکون ملتا ہے۔ کم سے کم نشہ آور سگریٹ پی کر مجھے یہ خیال نہیں آتا کہ میرے ماں باپ میں ہر وقت ناچاقی کیوں رہتی ہے۔ جب سب کے ماں باپ ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو ہمارے کیوں نہیں۔ ہمارے ماں باپ کو صرف اپنی پروا کیوں ہے۔ اور جب انہیں ہماری پروا نہیں ہے تو ہم ان کی عزت کی پروا کیوں کریں۔“
”ولید۔۔۔“ دانیال حسن نے صدے سے کہا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ولید ان سے انتہا بدگمان ہو گا۔

”بس کریں ڈیڈی! مجھے اب آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ اب جب سب آپ کو پتا چل ہی چکا ہے تو میں بھی کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میں سگریٹ پیتا ہوں، ڈرگز بھی لیتا ہوں، لیکن اس پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ یہ میری زندگی ہے۔ میں اس کے ساتھ جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ اگر آپ اور می ہمارے لیے اپنے اختلافات ختم نہیں کر سکتے تو مجھ سے بھی امید نہ رکھیں کہ میں آپ لوگوں کے لیے کچھ کروں گا۔“ وہ باہر کی طرف جاتے ہوئے رکا تھا۔

”سوری انبیبا! تم سے میں سچ سچ شرمندہ ہوں۔ لیکن میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم فیضان بھائی کو پسند کرتی ہو۔ میرا مشورہ مانو، تم بھی وہ کرو جس سے تمہارا دل خوش ہو۔ می ڈیڈی کے لیے اپنے دل کی خوشی سے دست بردار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”رکو ولید! تم کہاں جا رہے ہو؟“ انبیبا نے اس کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے کہا تھا مگر ولید تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

”ولید کو روکیں ڈیڈی! اتنی رات کو کہاں جائے گا وہ۔“ اس نے دانیال حسن سے کہا، لیکن وہ ابھی تک اس کی باتوں کے اثر سے ہی نہ نکل سکے تھے۔

چند منٹ بعد چونک کر سرعت سے باہر کی جانب لپکے، لیکن اتنی دیر میں ولید جا چکا تھا۔

”اگر اس لڑکی کو حولی میں رہنے کی اجازت دینے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا، لیکن اگر وقت تو سب کو اپنی عقل ثابت کرنے کا جنون چڑھاتا تھا۔“ جنت بیگم نے لہجے میں کہا۔

مستقیم اور شبیہ اس وقت جنت بیگم کے کمرے میں موجود تھے۔ حرم کی شادی کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا اور اس ہنگامے کے سرد پڑنے ہی یہ دلی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔
 ”میں شرمندہ ہوں اماں! مجھے واقعی آپ سے پوچھے بغیر ماوی کو نہیں ٹھہرانا چاہیے تھا۔“ مستقیم بھی نے کہا۔
 ”یہی بات پہلے سوچ لیتے تو آج یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔“ جنت بیگم نے نخوت سے کہا۔
 ”میں آپ کو الزام نہیں دے رہا۔“ منصور بھی نے بھی زبان کھولی۔ ”لیکن کوئی وجہ تو ہوگی جو شبیہ بھابھی آپ کے متعلق اتنی بڑی غلط فہمی کا شکار ہوئیں۔“
 ”تو تمہارا کیا خیال ہے میں نے سچ بچ رجب کا قتل کیا ہے؟“ جنت بیگم نے اچنبھے سے کہا۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے منصور!“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں!“
 جنت بیگم نے ناگواری سے سر جھٹکا، لیکن ساتھ ہی اسے وہ دن بھی یاد آیا تھا جب وہ اپنے ذہنی طور پر معذور بیٹے کا رشتہ لے کر شبیہ کے پاس گئی تھی۔ اس میں خود پسندی اتنی زیادہ تھی کہ اسے یقین تھا شبیہ اس کی بات ہرگز رو نہ کرے گی۔ تب ہی جب شبیہ نے انکار کیا تو اس کی انا کو بری طرح بھیس پہنچی تھی۔ محض اپنی ضد کو پورا کرنے کے لیے اس نے کہہ دیا کہ رجب کو اس نے قتل کیا ہے۔ مقصد صرف یہی تھا کہ شبیہ کو ذہنی اذیت پہنچا سکے اور ہوا بھی یہی۔ لیکن بات اتنی بڑھ جائے گی ایسا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔
 ”اب اس لڑکی کے حویلی میں رکنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں، یہاں سے چلی جائے۔“ مستقیم بھی نے کہا۔

”نہیں۔ اتنے آرام سے تو میں اسے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔“ جنت بیگم نے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ شبیہ چونکا۔
 ”اس لڑکی نے جو ذہنی اذیت مجھے پہنچائی ہے، جب تک اس کی سزا نہ دے لوں، مجھے سکون نہیں آئے گا۔“ جنت بیگم کے تاثرات کچھ عجیب سے تھے۔
 وہ تینوں بری طرح چونک گئے۔
 ”بات برہانے کی کیا ضرورت ہے بی جان!“ شبیہ نے کہا تھا۔ ”جو ہونا تھا ہو چکا، اب اس بات کو بھول جائیں اور ماوی کو جانے دیں۔“

”تم لوگوں میں غیرت ختم ہو چکی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اتنا تو ہونہ سکا، مجھ پر انگلی اٹھانے والے کی انگلی ہی توڑ دو۔ جو میں کرنا چاہتی ہوں، مجھے کر لینے دو۔ میں ایسے انسان کو معاف نہیں کر سکتی جو مجھ پر الزام تراشی کرے۔“ جنت بیگم نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
 اب کچھ بھی کہنا فضول تھا سو شبیہ نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔



”کیا بات ہے منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟“ شبیہ اپنے لپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ جلال کسی کام سے اس کے پاس آیا تھا، پھر اسی کے پلنگ پر لیٹ کر چھت کو گھورتے لگا تو شبیہ نے پوچھا۔
 جلال نے چونک کر اس کو دیکھا، پھر نفی میں سر ہلادیا۔
 ”نہ بتانا چاہو تو دوسری بات ہے، ورنہ تو جوابات ہے وہ تمہارے چہرے پر لکھی ہے۔“ شبیہ نے جتا کر کہا۔
 جلال چڑ گیا۔

”جب بتا ہے تو پوچھنے کی وجہ؟“ وہ جل کر بولا۔
 ”ہاں ہاں۔ اب اس طرح چڑنے کا کیا فائدہ۔ میں نے تو پہلے ہی تمہیں وارن کر دیا تھا کہ اس لڑکی پر بھروسہ نہ کرو۔ لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔“
 ”یار! یہ بات نہیں ہے۔“ جلال نے کہا۔ ”ماوی نے کون سا میرے اعتماد کو بھیس پہنچائی ہے۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اب بی جان میری بات بالکل ہی نہیں مانیں گی۔ وہ پہلے ہی ماوی کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس بات کے بعد تو ان کی ناراضی اور بڑھ گئی ہے۔“ اس نے پریشانی کی اصل وجہ اگلی۔
 ”تیری غلط فہمی ہے میرے بھائی بی جان، ماوی کو ”کچھ“ نہیں ”بالکل“ بھی پسند نہیں کرتیں۔ اور یہ غلط فہمی بھی دور کر لو کہ وہ پہلے تمہاری بات سنیں۔ ماوی کے معاملے میں وہ کبھی تمہاری بات نہ سنیں۔“ وہ صاف اس کا تسخیراڑا رہا تھا۔

”یار! میں مانتا ہوں ماوی بی جان کے متعلق غلط فہمی کا شکار تھی، لیکن اس بات سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بری تو نہیں ہے کہ اسے اتنا ناپسند کیا جائے۔ بلکہ اچھی ہے۔“
 ”ہاں! تمہاری نظر سے دیکھا جائے تو اچھی ہی ہے۔“ شبیہ نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ جلال چڑ گیا۔
 ”کیوں بھی کیا برائی ہے اس میں؟“ شبیہ ہنس پڑا۔
 ”ہاں! واقعی کوئی برائی نہیں ہے۔ بس کافی زیادہ بد تمیز اور بہت جھگڑالو ہے۔ بد زبان ہے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ تم اپنی آنے والی زندگی اس کے ساتھ گزارو گے تو مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ لیکن خیر! یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“ اس کا انداز خاصا شرارتی تھا۔

جلال اور جل بھن گیا۔ اس کی شکل دیکھ کر شبیہ نے قہقہہ لگایا۔
 ”مجھے ایسے مت دیکھو۔ میں صرف سچائی بیان کر رہا ہوں۔“
 ”اللہ خیر کرے! ہمیشہ جلتے بھنے رہنے والے شبیہ العباس صاحب کا موڈ بہت خوش گوار رہنے لگا ہے آج کل۔“
 ”جی ہاں! جلتے بھنے کی ڈیوٹی آپ نے جو لے لی ہے۔“ وہ پھر خوش گواری سے بولا۔ جلال اور بھی مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”بڑی مشکوک ادا میں ہیں جناب آپ کی سزا رو شنی ڈالیے کہ وجہ کیا ہے؟“
 شبیہ نے مسکراتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ چند لمحے سوچتا رہا، پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔
 ”تم اپنے اور ماوی کے بارے میں بی جان سے کب بات کرو گے؟“ جلال بری طرح چونکا۔
 ”کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”جنرل نانچ میں اضافے کے لیے۔“
 ”بڑا گھسا پٹا لطیفہ ہے۔“ جلال بد مزہ ہوا۔
 ”ہاں ہاں۔“ شبیہ دل کھول کر ہنسا تھا۔
 ”کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے۔“ جلال نے دو شوق بھرے انداز میں کہا۔
 ”میں سوچ رہا تھا، کیوں نہ تم اور میں ایک ہی دن شادی کریں۔ کیا کہتے ہو۔“ شبیہ پوری طرح اس کی طرف گھوا۔
 ”اچھا۔ تو یہ بات ہے۔“ جلال نے لطف لیتے ہوئے کہا۔



شبیبہ کھانا سا ہو کر نہیں دیا۔
 ”اب اس میں کیا ہے؟ تم شادی کر سکتے ہو تو کیا میں شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا؟“
 ”سوچیے سوچیے! بھلا ہم کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔“ جلال پھر سے لیٹ گیا۔
 ”وہ لے آئیڈیا برا نہیں ہے، لیکن۔۔۔ اس نے مدد طلب نظروں سے شبیبہ کو دیکھا۔
 ”کیا لیکن؟“

”تم میرے بی ہاف پر بی جان سے بات کرو گے؟“
 ”ہرگز نہیں۔“ شبیبہ نے ایک پل کا تامل کیے بنا کہا۔
 ”پلیز شبیبہ! میرا بھائی نہیں ہے۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ بی جان سے بات کر سکوں۔“
 ”جب بات کرنے کی ہمت نہیں تھی تو محبت جیسی بہادری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ شبیبہ نے آرام سے اس کے لتے لے ڈالے۔
 ”اب ہو گئی غلطی۔ کیا کروں۔“ وہ مسکینی سے بولا تھا۔ شبیبہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا پھر لپ ٹاپ کی طرف رخ پھیرتے ہوئے بولا۔
 ”میری طرف سے اس سلسلے میں بالکل معذرت۔ اپنے معاملات خود نمٹاؤ۔ بی جان کا پتا نہیں ہے۔؟ ایک منٹ میں مجھے بھی ڈانٹ کر رکھ دیں گی۔“
 ”اب مدد نہ کرنا چاہو تو اور بات ہے۔ سورنہ کون ہے جو یہ نہیں جانتا کہ تم بی جان کے کتنے لاڈلے ہو اور وہ تمہاری کوئی بات نہیں ٹالتیں۔ اس لیے یہ بہانے بازیاں کسی اور کے سامنے کرنا۔“
 ”میں بہانے نہیں بنا رہا۔ میں لاکھ بی جان کا لاڈلا سہی، لیکن اس وقت وہ اتنے غصے میں ہیں کہ میری بھی کوئی بات نہیں سنیں گی۔“ شبیبہ نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ماوی سے ناراضی چھوڑ دیں، مگر وہ بغض ہیں کہ جب تک اسے سزا نہیں دے لیتیں، آرام سے نہیں بیٹھیں گی اور تم ان کی ضدی طبیعت سے واقف ہی ہو، پھر تم نے لڑکی بھی تو ایسی پسند کی ہے جو بذات خود بہت بڑی مصیبت ہے۔ اب بتاؤ! میں ایسی سچویشن میں کیا کروں؟“
 ”تم صرف میرا مذاق اڑاؤ اور اپنی شادی کی تیاریاں کرو۔“ جلال نے جل کر کہا اور کمرے سے ہی باہر جانے لگا۔
 ”جیسے تمہاری خوشی۔ دیے میں آج کسی کام سے لاہور جا رہا ہوں۔ کچھ منگوانا ہو تو بتا دینا۔“ شبیبہ نے چڑانے والے انداز میں کہا اور مسکراتے ہوئے اپنا کام کرتا رہا۔

اگلے روز شام تک ماوی اپنی پیکنگ مکمل کر چکی تھی۔ وہ بار بار دروازے تک جا کر پلٹ آتی تھی یہ طے کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا کہ اسے جانے سے قبل کسی کو آگاہ کرنا چاہیے یا چپ چاپ نکل جانا چاہیے۔ گوکہ ایسا کرنا بھی ناممکن تھا، کیونکہ اتنے ملازمین کی نظروں سے بچ کر نکلنا محال تھا۔
 بڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ جانے سے قبل کسی اور سے نہیں تو اسے جنت بیگم سے ضرور معذرت کر لینا چاہیے۔ حالانکہ یہ بھی ایک وقت طلب کام تھا، مگر اخلاق کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اپنی ذات سے پہنچنے والی پریشانیوں پر معذرت کر لے۔ لیکن وہ کیوں معذرت کرے؟ بلا واسطہ ہی سہی، لیکن جنت بیگم اس کے بابا کے قتل کی ذمہ دار تو ضرور تھی۔
 گو کموں کی کیفیت میں وہ جنت بیگم کے کمرے کی طرف آگئی۔ دروازے پر دستک دینے سے قبل بھی وہ تذبذب

کا شکار تھی۔ پھر اس نے ابھی دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اچانک دروازہ کھل گیا۔ باہر آنے والی تسنیم تھی۔

”بی بی آپ!“

”ہاں! مجھے جنت بیگم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ ماوی نے کہا۔
 ”آپ نے کہا تھا آپ آئیں گی۔“ تسنیم نے اسے یاد دلایا۔
 ”میں آج ہی واپس جا رہی ہوں تسنیم! ویسے بھی تمہارے بابا کے پاس اب ایسا کچھ نہیں ہے جو میرے کام آسکے۔“

”آپ ایک بار آجائیں بی بی! یہ آپ کے لیے بہتر ہو گا۔“ تسنیم بہت اصرار کر رہی تھی۔ ماوی کو ماننا ہی پڑا۔
 ”چھا! ٹھیک ہے۔ میں جنت بیگم سے مل کر تمہارے پاس آؤں گی۔“
 تسنیم اس کے وعدے پر بھروسہ کر کے چلی گئی۔ تب ماوی اندر جانے کے بجائے لڑکیوں کے کمرے کی طرف چل دی۔ بہت کوشش کے باوجود وہ خود کو جنت بیگم سے بات کرنے پر آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔

”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ ماوی نے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔
 ”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔۔۔ آؤ ناں!“ نمل نے کہا۔

ماوی اندر آگئی۔
 ”اتنے وقت پر آئی ہو۔ میں اور تنوی چائے پینے کا سوچ رہے تھے۔ تم پیو گی؟“ نمل نے پوچھا۔ ماوی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ہاں! ضرور۔ لیکن صرف آؤھا کپ۔“
 ”اچھا! میں کہہ کر آئی ہوں۔“ نمل باہر نکل گئی۔
 ”کیا کر رہی ہو تنوی؟“
 ”کچھ نہیں! بس یہ میگزین دیکھ رہی تھی۔“ وہ میگزین پہلے ہی بند کر چکی تھی۔
 ”تم کالج کیوں نہیں جاتیں؟“ ماوی کو اتنے دن بعد خیال آیا تھا۔
 ”پہلے جاتی تھی، پھر شبیبہ۔۔۔ نے منع کر دیا۔“

”کیوں؟ اس نے کیوں منع کیا؟“

”بس! وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں مزید بڑھوں۔“ وہ اصل بات گول کر گئی۔ ”تو بی جان نے کہا، جیسا شبیبہ کہتا ہے، ویسا ہی کرو۔ زندگی بھی تو اسی کے ساتھ گزارنی ہے۔“
 ”ہوں۔۔۔“ ماوی نے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا کہ یہاں کے قوانین سمجھ ہی چکی تھی۔
 ”میں آج واپس جا رہی ہوں تنوی! تم لوگوں کو اللہ حافظ کہنے آئی تھی۔“
 ”ارے! اس طرح اچانک۔۔۔؟“

”ہاں! بس بہت رہ لیا۔ میں نے سوچا اب واپس جانا چاہیے۔“
 ”جلال بھائی سے پوچھ لیا؟“ تنوی نے قدرے شرارت سے پوچھا۔
 ”اس سے کیوں پوچھوں؟“ وہ حیران ہوئی پھر اس کی شرارت فوراً سمجھ گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب سائٹ آپ کیلئے جاری رکھ سکیں۔

پاکستانیوں کی ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



LIBRARY FOR PAKISTAN

”نہیں! میں نے جس پوچھا۔ نہ ہی اسے بتایا ہے۔ جاتے ہوئے بتاؤں گی۔“ پھر کچھ خیال آنے پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں چلتی ہوں تنوی!“

”ارے! بیٹھو ناں۔ محل دیر لگا رہی ہے تو وہ خود چائے بنا رہی ہوگی اور وہ بہت اچھی چائے بناتی ہے۔“

”اب چائے کا موڈ نہیں رہا۔ تم لوگوں سے ملنا تھا، مل لیا۔ اب ذرا تسنیم سے بھی مل لوں۔ اسے کوئی کام تھا مجھ سے۔“

وہ برہہ کر تنوی کے گلے لگی۔

”میں تمہیں مس کروں گی۔“

”میں بھی۔“ تنوی مسکرائی۔ ”جلال بھائی تو تمہارے جانے سے بہت خوش ہوں گے۔ کیونکہ تم جتنی جلدی جاؤ گی اتنی جلدی ہی تو وہ تمہیں واپس لانے تمہارے پیچھے آئیں گے۔ اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔“

ماوی اس کی بات پر بے ساختہ ہنس دی۔

”خدا حافظ تنوی!“ وہ کمرے سے باہر آگئی۔ اب وہ تسنیم کی تلاش میں تھی۔

رات سے صبح ہو گئی، لیکن ولید کی کوئی خبر نہ تھی۔ دانیال حسن اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے انہوں نے ہر اس جگہ اسے تلاش کیا جہاں اس کی موجودگی متوقع ہو سکتی تھی، لیکن سب بے سود رہا۔

دانیال حسن گھر واپس آئے تو ان کے کندھے ٹھکن اور ماوی سے جھگڑے ہوئے تھے۔

”ڈیڈی! ولید کا کچھ پتا چلا؟“ انبیبا انہیں دیکھ کر لپک کر آئی تھی، لیکن ان کا چہرہ اور جھگڑے ہوئے کندھے اس کے ہر سوال کا جواب تھے۔ انبیبا صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

”تم نے اس کے فریڈز سے پتا کیا؟“ دانیال حسن نے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جسید کو فون کیا تھا۔ اسی نے باقی سب دوستوں سے پتا کیا ہے، لیکن ولید کے بارے میں کسی کو بھی نہیں پتا۔“ وہ کارپٹ پر ان کے پیروں کے قریب بیٹھ گئی۔

”ولی کہاں ہے؟“

”زبردستی کھانا کھلا کر تھوڑی دیر پہلے سلایا ہے۔ بہت رو رہا تھا۔ آپ کے لیے کھانا لاؤں؟“

دانیال حسن نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”ٹھکن ان کے سارے وجود سے مترشح تھی۔ انبیبا کا دل بھر آیا۔ آنسوؤں کو اس نے مہارت سے چھپا لیا تھا۔

”تم نے کھانا کھایا؟“ اب کی بار انبیبا نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”تم تو کھالیتیں بیٹا! ولید کا پتا چل جائے گا۔“ انہوں نے انبیبا کا سر آہستگی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اتنی سی بات کرتے ہوئے ان کی آواز بری طرح بھرا گئی۔

”ڈیڈی! پلیز۔“ انبیبا تڑپ کر ان کی طرف پلٹی۔

”ولید جہاں بھی ہو گا، خیریت سے ہو گا۔ وہ گھر آجائے گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔“

”تم جاؤ! کھانا لگاؤ۔ بلکہ ایسا کرو، یہیں لے آؤ۔ ہم دونوں مل کر کھائیں گے۔“ گوکہ ان کا ہر گز دل نہیں چاہ رہا تھا، لیکن محض انبیبا کی خاطر انہوں نے کہا۔ انبیبا بھی ان کے خیال سے اٹھ گئی۔

”ڈیڈی!“ ”معا“ انبیبا کو خیال آیا۔ ”ولی نے مئی کو بھی کال کی تھی، ولید کے بارے میں بتا دیا ہے۔“ وہ ڈر

ی بول رہی تھی، مبادا وہ برا مان جائیں۔

دانیال حسن نے گردن موڑ کر اسے دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلادیا۔

”میں کیسے تمہارا سامنا کروں گا ثروت!؟“ نہیں کئی خیالات نے ایک ساتھ گھیرا تھا۔

ولید کی ہر بات جیسے ان کا دل چیر کر نکلی تھی۔ آج تک انہوں نے ہر معاملے میں ثروت کی غلطی نکالی تھی۔ اپنی کوتاہیاں بھی اسی کے کھاتے میں ڈالی تھیں۔ پہلی بار احساس ہوا تھا کہ بہت ساری غلطیاں تو ان کی اپنی ہی تھیں۔ ثروت نے تو ہر بار اپنا اور ان کا رشتہ سنبھالا ہی تھا، بلکہ یہ رشتہ اگر اب تک قائم تھا تو اس کا کریڈٹ ثروت کو ہی جاتا تھا، ورنہ انہوں نے تو کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ تو ہمیشہ ثروت کو قصور وار ہی ٹھہراتے رہے تھے۔

انہیں لگتا تھا، ثروت کی محبت اور وفاب تک مستقیم کے لیے ہے اور وہ ان کے ساتھ خوش ہی نہیں ہیں یا شاید وہ پر وہ ثروت کی توجہ اپنی طرف رکھنے کے لیے اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس سے یہ ہوا کہ ثروت کی توجہ تو ان کی طرف ہی رہی، لیکن اس سارے چکر میں وہ بھول ہی گئے کہ ان کے بچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ولید نے ان کے سامنے جو کچھ کہا، اس سے صاف پتا چلتا تھا وہ ان سے کتنا متنفر ہو چکا ہے، پھر جس ذہنی کیفیت میں وہ گھر سے نکلا تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ خود کو کوئی نقصان پہنچا لیتا۔ انیبا اگر سچ فیضان میں دلچسپی لینے لگی تھی تو یہ بھی بلاشبہ ان کی ہی کوتاہی تھی۔ ثروت اگر اسلام آباد نہ گئی ہوتیں تو وہ انیبا کو اعتماد میں لے سکتی تھیں۔ وہ اس پر نظر رکھتیں تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ اندیشے انہیں ہر اسال کر رہے تھے اور بچھتاوے پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ وہ بری طرح غم زدہ تھے۔

شبیبہ اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں شہر آیا تھا۔ ایک آدمی سے ملنا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ لنک روڈ آگیا۔ جلال نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔ خریداری کرتے ہوئے وہ ایک لیڈر بوتیک کے سامنے ٹھنک کر رک گیا۔

شوکیں میں ایک بہت خوبصورت سوٹ ڈھیلے کیا ہوا تھا۔ اس سوٹ کو دیکھتے ہوئے اسے بے ساختہ تنوی کا خیال آیا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے تنوی کے لیے کوئی چیز لینے کا سوچا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اپنے اندر آنے والی یہ تبدیلی اسے خود بھی اچھی لگ رہی تھی۔

بہر حال اس نے وہ سوٹ سٹیلز مین سے پیک کرنے کے لیے کہہ دیا اور دوسرے شوکیں کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ تب ہی اس کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے چند لڑکوں پر پڑی۔ ان میں سے ایک ولید تھا۔ وہ اپنے چلے سے کچھ بیمار سا دکھائی دیتا تھا اور اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات ضرور تھی جو محسوس تو ہوتی تھی، لیکن اسے کوئی نام دینا مشکل تھا۔

شبیبہ نے حسب توقع اسے نظر انداز کیا اور بے سبب ادھر ادھر کی چیزوں میں دلچسپی لینے لگا، لیکن یکایک اسے احساس ہوا، ایسا کرنا مشکل تھا، کیونکہ ولید کے ساتھ موجود باقی تین لڑکے اپنے حلیوں سے کچھ مشکوک سے دکھائی دیتے تھے۔ شبیبہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

وہ لوگ اس سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی آوازیں اس تک نہیں پہنچ رہی تھیں لیکن ان کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہ تھا کہ وہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔

چند منٹ کے بعد وہ سب باہر نکل گئے۔ شبیبہ نے بہت چاہا کہ ان سب کو نظر انداز کر دے، لیکن اس معاملے میں وہ کچھ لاچار ہی سی محسوس کر رہا تھا۔

بے منٹ کر کے وہ ان کے پیچھے ہی باہر نکل آیا، لیکن جب تک وہ پارکنگ میں پہنچا، وہ لوگ غائب ہو چکے تھے۔ شبیبہ کو مایوسی ہوئی، لیکن تھوڑی دور جا کر وہ چاروں اسے نظر آگئے۔ ان کے پاس دو اسپورٹس موٹر سائیکلیں تھیں، جنہیں اتنی بھیڑ میں وہ بہت بڑے ڈھنگے پن سے چلا رہے تھے۔

شبیبہ نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا، کیونکہ اپنی حرکات سے وہ اسے مشکوک نظر آتے تھے۔ اور اس کے مشکوک مگر کچھ ہی دیر بعد تصدیق ہو گئی۔ تین روڈ سے ہوتے ہوئے وہ لوگ یکدم موٹر سائیکل کی طرف مڑ گئے تھے۔ تھوڑا آگے جا کر ایک بار پھر وہ شبیبہ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

گوکہ یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی، لیکن اس نے گاڑی ایک مناسب جگہ کھڑی کر دی اور خود انہیں تلاش کرنے لگا۔ حالانکہ اسے ولید سے ایسی کوئی انسیت نہ تھی، لیکن اس کی چھٹی حس اسے مسلسل کوئی اشارہ دے رہی تھی۔

یہ علاقہ قدرے ویران تھا اور یہاں درختوں کی بھرمار تھی۔ ایک طرف جھاڑیوں میں اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف آیا۔

اور اس کے تمام اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ ولید جھاڑیوں میں اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ اسے بری طرح زرد کوب کیا گیا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نوکیلی چیز سے اس کے سر پر وار کیا گیا ہو۔

شبیبہ نے پھرتی سے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور خاصی تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسپتال لے آیا۔

فیضان نے کرائے پر ایک اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ وہاں شفٹ ہونے کے بعد اس نے توقیر صاحب کو فون کیا۔ ”میں نے انیکسی فارغ کر دی ہے اور چالی جو کیدار کے حوالے کر آیا ہوں۔ اب آپ دانیال بھائی کو میری طرف سے آگاہ کر دیں کہ انیکسی کی جانچ پڑتال کر لیں۔ کوئی نقصان ہوا تو میں پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”تمہیں وہیں رکنا چاہیے تھا فیضان! میں نے کہا تو تھا، دانیال کو تھوڑا وقت دو۔ وہ ساری صورت حال کو سمجھ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ، عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

لے گا۔“ تو قیر صاحب نے کہا۔
”معاف کیجئے گا تو قیر بھائی! لیکن میں اب وہاں رک کر اپنی مزید بے عزتی نہیں کروا سکتا۔“ فیضان نے دو ٹوک کہا۔

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔ جس طرح دانیال نے اصل حقائق کا علم ہوئے بغیر محض جذباتیت سے کام لیا تھا۔“
”آپ بھی مجھے ہی قصور وار ٹھہرا رہے ہیں؟“

”نہیں! میں تمہیں قصور وار نہیں ٹھہرا رہا۔ میں صرف تم دونوں کا موزانہ کر رہا ہوں جو خود کو بڑا عقل کل سمجھتے ہو، لیکن حقیقتاً جذباتیت کے مارے ہوئے ہو۔ دانیال کو ایک بات بتا چلی تو اس نے بنا سوچے سمجھے ری ایکٹ کرنا شروع کر دیا۔ تم نے تھوڑی بہت مصالحت کی کوشش کی۔ جب کوئی حل نہ نکلا تو بچوں کی طرح جذباتی ہو گئے۔ میں مانتا ہوں تم دونوں حق پر تھے، لیکن کبھی کبھار حق پر ہونے کے باوجود انسان کو دوسروں کی مجبوریوں کے متعلق سوچ لینا چاہیے۔ اور پتا نہیں! میں تمہیں یہ سب کیوں سمجھا رہا ہوں۔ تم کون سا دانیال سے کچھ کم ہو کہ عقل والی کوئی بات سمجھ سکو۔ بہر حال ولید اسپتال میں ہے اور دانیال اسی سلسلے میں مصروف ہے۔ جیسے ہی وہ فارغ ہوگا۔ میں اسے تمہارا پیغام دے دوں گا۔ میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ اگلی بار کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کروں گا۔ تم دونوں کو بزنس پارٹنر بنانے کی بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔“ تو قیر صاحب نے رکھائی سے کہا۔ فیضان کو زبردست جھٹکا لگا۔

”ولید اسپتال میں ہے؟“

”ہاں! میری ابھی کچھ دیر پہلے انیبا سے بات ہوئی ہے۔ اسی نے بتایا ہے۔“ تو قیر صاحب نے اتنا بتا کر فون بند کر دیا۔

فیضان شش و پنج میں پڑ گئے۔ جس وقت وہ اپنے اپارٹمنٹ کے لیے نکل رہے تھے انہوں نے انیبا کو برآمدے کی سیڑھیوں پر روتے دیکھا تھا اور دانیال حسن پھرتی سے گاڑی نکال رہے تھے، لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی ایسا خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اسپتال جا رہے ہوں گے۔ فیضان کو یکدم اپنی جذباتیت پر غصہ آیا۔ کاش! وہ رک کر ایک بار انیبا سے اس کے رونے کی وجہ پوچھ لیتے تو کچھ نہ کچھ ضرور ان کی مدد کرتے، لیکن جب انہیں انیبا کے رونے کی وجہ معلوم بھی تب انہوں نے کیا کر لیا تھا جواب ایسا سوچ رہے تھے انہیں شرمساری نے گھیر لیا تھا۔

”بظاہر چھوٹے چوہدری کی موت میں بڑی چوہدرائیں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن اگر میں یہ کہوں کہ وہی چوہدری کی موت کی ذمہ دار ہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔“

تسним کا باپ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ اس کا بیمار وجود گو کہ اسے اتنا بولنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، مگر پھر بھی وہ اپنی ساری ہمت صرف کر کے بول رہا تھا۔ ماوی کو اس کی بات سمجھنے میں خاصی وقت کا سامنا تھا۔

”مجھے تو چوہدرائیں نے اس سارے معاملے سے بچانے کا لالچ دے کر خاموش کر دیا تھا، لیکن چھوٹے چوہدری کو وہ اتنے پیٹھے طعنے دیا کرتی تھیں۔ پھر جب میں نے ضمیر کی آوازوں سے پریشان ہو کر سچائی ظاہر کرنے کی ٹھانی تو چوہدرائیں نے تسنیم کو اپنے پاس رکھ کر مجھے اس کو ٹھڑی میں ڈلوادیا۔ میرے پاس ایسا کوئی راستہ نہیں تھا کہ

کسی طرح یہاں سے باہر نکل سکوں۔ ہاں! کبھی کبھار کسی ملازم کے ساتھ باہر نکلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک بار میری ملاقات چھوٹے چوہدری سے ہو گئی۔ اس وقت اتفاق سے ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے ہمت کر کے ساری حقیقت چھوٹے چوہدری کو بتادی۔ لیکن سارے حقائق سے واقف ہونے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ انہیں خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود تسنیم کی فکر تھی۔ مجھے اعتراف ہے، وہ بہت عظیم انسان تھے اور میں نے اپنی خود غرضی کے ہاتھوں انہیں پھنسا دیا۔ پھر چوہدرائیں تو ہمیشہ سے ان کے خلاف تھیں۔

چوہدری صاحب خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کئی مہینوں کے بعد ایسے ہی میری ملاقات چوہدری جی سے ہوئی تب انہوں نے مجھے وہ خط دیا جو تسنیم نے پہلے آپ کی والدہ کو دینے کی کوشش کی تھی اور پھر آپ تک پہنچا۔ مجھے معاف کر دیں۔ چھوٹی بی بی! میں صرف چوہدری جی کا ہی نہیں، آپ کا بھی گنہگار ہوں۔“

ماوی کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کے پاس تو اب کچھ بھی نہ بچا تھا۔

تسним کا باپ یکدم ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

ماوی اب تک کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی اور بوڑھے آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آپ مت روئیں۔ ان کی قسمت میں یہی تھا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں چلتی ہوں۔“

”تسним نے بتایا آپ واپس جا رہی ہیں۔ بیٹی! مجھے اس قید سے چھٹکارا دلوا دو۔ قانون کی سزا خدا کے عذاب سے تو کم ہوگی۔“

وہ بوڑھا شخص آس بھری نظروں سے ماوی کو دیکھ رہا تھا۔

”میں ابھی کچھ نہیں کر سکتی۔ ہاں! واپس جا کر کوشش کروں گی کہ پولیس کو آپ کی اس جبری قید کے بارے میں اطلاع دے سکوں۔“

اس نے دھیمی آواز میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے قدموں میں تھکن ہی تھکن محسوس ہوتی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ جنت بیگم اس کے باپ کی موت کی ذمہ دار ہے نہ صرف یہ بلکہ اس شخص کو قید کر کے سچ کو چھپا کر قانون کی مجرم بھی بن رہی ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ یہ خیال ہر دوسرے خیال سے زیادہ مایوس کن تھا۔

اسی مایوسی کے زیر سایہ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دو تین بار دروازے کو دھکیلا اور یکدم اس پر انکشاف ہوا کہ دروازہ باہر سے مقفل کیا جا چکا تھا۔

ماوی نے ہر اسال ہو کر دروازہ پیٹ ڈالا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



پی گیا البتہ غصہ ضبط کرنے سے چرے کے رنگ تیزی سے بدلے۔
”کیا بات ہے، طبیعت تو صحیح ہے نا۔ یا پھر نشہ وشہ کیا ہے۔“ وہ مسخرے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھنے لگی۔

یہ ایک اور وار تھا جس پر وہ بلبلا گیا۔ پہلے ہی اس کے بے نیاز حسن سے گھائل تھا اور اب اس کے یہ تیکھے وار۔ کچھ اسے بھی خود پرست تھا اور بہت اعتماد تھا۔ اس نے چنگاریاں بھری آنکھوں سے اس کے پار

بھی نہ ملے تھے۔ شمالی میں کبھی کبھار وہ اس کی محبت کو خراج تحسین پیش کر کے ہنس پڑتا تھا۔
”اے کیا سکتہ ہو گیا ہے یا اس سے پہلے کبھی اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی؟“ وہ اپنے خیالات کی روش میں جانے کہاں تک بھٹکتا چلا جاتا کہ کشمالہ کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ دشمن جان عین اس کے مقابل کھڑی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے طنز پر اسے اشتعال تو آیا، مگر مصلحتاً

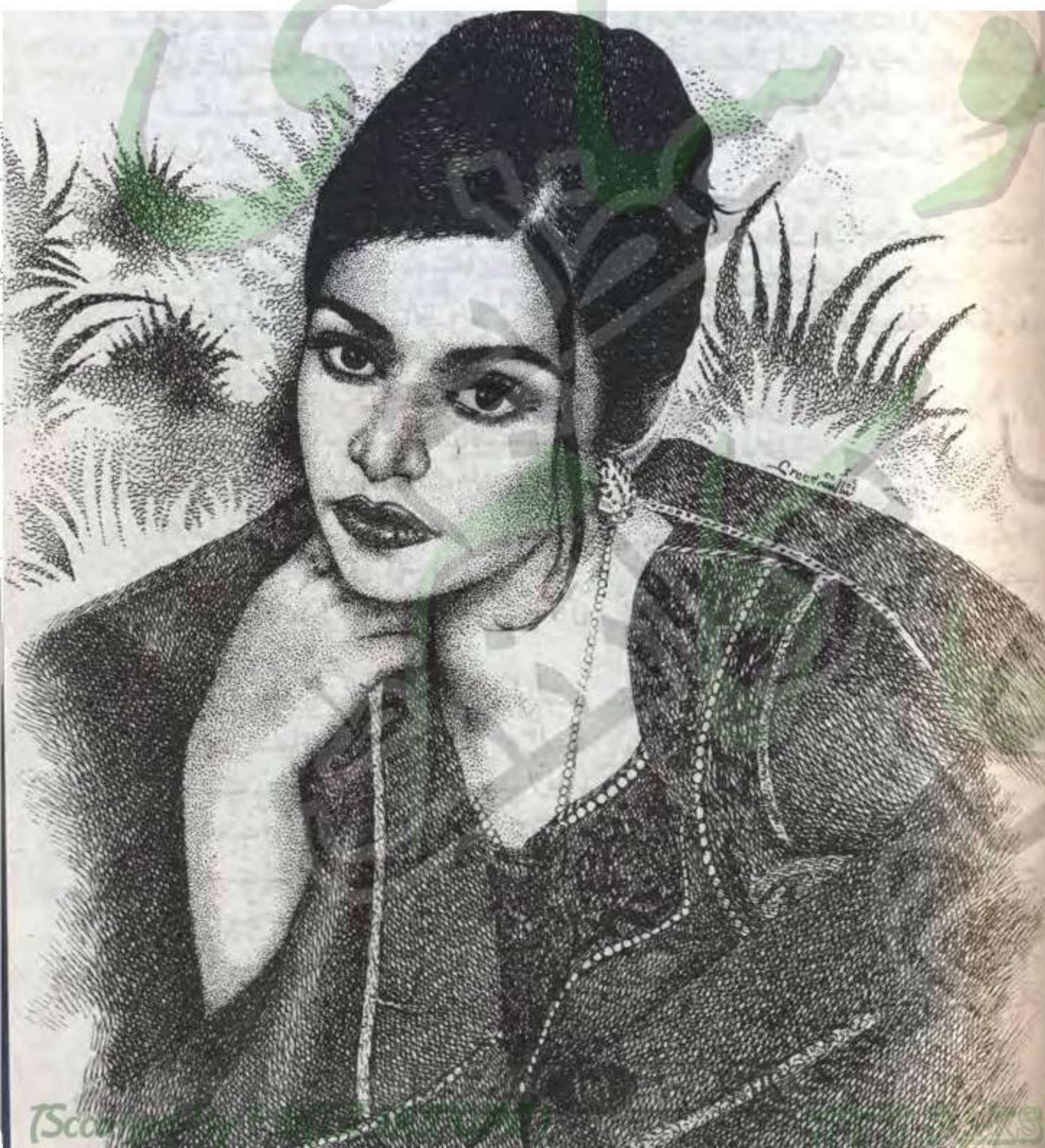
اس سے قبل مہ جبینوں، نازنیوں کی قطار گئی ہوئی تھی، اس جیسے ہنڈ سم، شوخ اور جی دار لڑکے پر مرنے میں اور اس نے بھی وہ مواقع ضائع نہ کیے تھے۔
خوب فائدہ اٹھایا تھا اپنی خوب صورتی کا۔

الماس تو ہمہ وقت اس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اس کی نظر میں اپنے نمبر برہانے کا وہ کوئی بھی موقع نہیں گنوا تی تھی۔ ہر وقت اپنی کوکنگ کے شان دار تجربات سے اسے مستفید کرتی رہتی تھی۔ چونکہ شکل و صورت میں ثانوی سی تھی اس لیے اپنی مہارتیں اور گن اس پر ثابت کرنے پر تلی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایک اور کبھی پڑا نہ جانے کیا کیا بنا کر لاتی تھی، صرف اس کے دل پر راج کرنے کے لیے وہ بھی سخاوت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا دل توڑنا گناہ سمجھا کرتا تھا۔ دل کھول کر اس کی دشمنی کی تعریف کرتا تھا اور تعریفیں کر کر کے اگلی بار کامیونیکا کر لیتا تھا۔ وہ بے وقوف بھی ہر نئی دس بنا کر بھاگی بھاگی اسے کھلانے چلی آتی تھی۔ وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا، اسے بہت جلد اپنانے کا وعدہ کرتا، بار بار وہ یقین کر لیتی۔ مشرقیت تو جیسے اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نہ جانے کب تک یہ کھیل چلتا رہتا۔ ایک روز یہ کھیل بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے وعدے پورے ہونے کی آس نے کرا ایک روز پادیس سدھار گئی کہ گھر والوں نے اس کی شادی کر دی تھی۔ عرصہ تک اس کے ہاتھ کے کھانوں کو وہ یاد کرتا رہا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ پھر اس کے بعد اسے کبھی اتنے مزے دار اور مفت کے کھانے

وہ مگن سے انداز میں گھر کے اندر داخل ہوا تو کشمالہ کے مترنم سے جان دار قبضے کی آواز سن کر ٹھٹھک گیا۔ وہ اسے بچن کی دلیز پر اپنے تمام تر جلوے بکھیرتی دکھائی دی۔ وہ بھابھی سے باتوں میں مصروف تھی۔ اس کے سنہری بالوں کی کھنگھریالی لٹیں اس کے شانوں پر سرسرا رہی تھیں اور سرخ رنگ کی مٹی ٹیپس پر پھول دار بارڈر تلے چوڑی دار پا جاما تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اپنی نرالی چھب دکھلا کر اسے بے چین کر گئی۔
”پھر آگئی یہ پناہ۔“

خاور نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک چھپھلتی نظر اس کے ایمان ڈگمگاتے سراپے پر ڈالی۔ پھر ایک حسرت بھرا سانس بھر کر کچھ مایوسی سے اسے دیکھا۔

اب تک ان گزرے برسوں میں بہت سی لڑکیاں اس کی مردانہ وجاہت پر مرثی تھیں، مگر یہ تو چمکتا گھڑا نکلی۔ پچھلے تین چار ماہ میں خاور نے اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے جتنے پاپڑیلے تھے یہ وہی جانتا تھا، مگر کشمالہ پھر بھی اس کی طرف ملتفت نہ ہوئی تھی۔ شاید اس کو اپنے حسن کا بھرپور اور اک اور خود پر بہت زیادہ گھمنڈ بھی تھا کہ اسے رجھانے کا خاور کا ہر حربہ ناکام رہا تھا۔ ہر بار وہ منہ کی کھا کر پیچھے ہٹا تھا۔ وہ تھی بھی تو آفت کی پر کالہ۔ مجال ہے جو کبھی پروں پر پانی بڑنے دیا ہو۔ ذرا جو وہ بے تکلف ہونے کی یاد دہانی بکھارنے کی کوشش کرتا تو اپنی کنار آنکھوں سے یوں گھورتی کہ خاور کے دل میں خنجر سا گھپ جاتا۔



صفت روپ کو دیکھا۔ اس کا یہی اعتماد تو اسے توڑنا تھا۔
”میرے سامنے ذرا تمیز سے رہا کرو۔ ورنہ مجھے بگڑے
ہوؤں کو ٹھیک کرنا اچھی طرح آتا ہے۔“

اس نے خردوار کرنے والے انداز میں اسے جتایا اور
پلٹ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

خاور نے تملاکر اس کے پلکھیلے، بل کھاتے
سرائے کو دیکھا۔ اسے غصہ تو بہت آیا، مگر یہ سوچ کے
لحاظ کر گیا کہ بھابھی کی بھانجی ہے۔ کہیں اونچ نیچ ہو گئی تو
خواجواہ طوق اس کی گردن میں آجائے گا۔ ویسے بھی وہ
بھیا کے غصے سے ڈرتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کی
سرگرمیوں سے نالاں تھے۔ اس کی بے کاری پر تنقید
کرتے رہتے۔ بلاوجہ بات برہہ جاتی۔ اس نے دل میں
ٹھان لی کہ اسے پیار محبت ہی سے رانم کرے گا۔

وہ نہادھو کر تازہ دم ہو کر کمرے سے باہر آیا تو ماں جی
صوفے پر ہشاش بشاش سی براجمان تھیں۔ انہوں نے
تیل ڈال کر بہت کس کر چوٹی گوندھی ہوئی تھی۔ اس
سے ان کا چہرہ کچھ اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ ابھی
صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ کمرے کے دروازے سے باہر
نظر پڑ گئی۔ وہ وہیں دیوار تلے رکھے گملوں میں کھلے
پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح اس
کے انداز میں بے نیازی سی تھی۔

”مالا۔ مالا! یہاں آؤ۔“ بھابھی نے اسے آواز دی
تو وہ اس طرف چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ گود میں ڈیڑھ سالہ توحید کو اٹھائے
وہیں پودوں کے پاس آگئی اور اسے زمین پر کھڑا کر کے
کچھ فاصلے سے اپنے پاس بلانے لگی۔ توحید لڑکھڑاتا
قدم جمانے کی کوشش کرتا دو چار قدم چلا، لیکن اسے
گرنے سے پہلے ہی اس نے سنبھال لیا اور کھلکھلا کر
ہنس پڑی۔ توحید بھی کھل اٹھا۔

”مالا۔ مالا۔“ اسی وقت پڑوس سے حنیفہ اسے
آواز دیتے ہوئے داخلی دروازے سے اندر داخل
ہو گئی۔

دونوں بڑھ کر گلے ملیں اور وہیں پتھریلی بیچ پر بیٹھ
باتیں کرنے لگیں۔ ننھا توحید اس کے پاس ہی آ
گھٹنے پکڑ کر کھڑا تھا۔ دو، تین مہینوں میں ہی اس
حنیفہ سے ایسی دوستی گانٹھ لی تھی جیسے برسوں پر
دوستی ہو۔

خاور کو اس وقت حنیفہ سے بے حد جلن محسوس
ہوئی۔ یہ کوشش تو وہ بھی کب سے کر رہا تھا، مگر اب
تک ناکام تھا۔ عید سے ایک ماہ پہلے سے اس نے یہاں
ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ آئی تو وہ بھابھی کا خیال رکھنے کے
تھے کہ عید کے بعد ان کے ہاں ڈیووری متوقع تھی، مگر
اس مختصر عرصے میں سب کے حواسوں پر اور خاور۔
دل پر چھا گئی تھی۔ اسے زیر کرنا خاور نے اپنی انا کا مسئلہ
بنالیا تھا۔ ادھر ماں جی اس سے بہت بے زار سی نظر
آ رہی تھیں۔

”مالا۔ مالا۔ مالا۔ توبہ! ہر وقت ناہید اس کے ہاں
کی مالا چپتی رہتی ہے۔ عجیب سی اور بہت چتر مڑول
لڑکی ہے۔ فتنہ ہے فتنہ۔“ ماں جی نے لب کشائی کر دی
لی۔

”خیریت ہے ماں جی! کیا ہوا؟“ اس نے ناراض
ماں جی کو دیکھ کر پوچھا۔

”ارے! ہونا کیا ہے سارے گھر میں پھر کی طرف
ناچتی رہتی ہے۔ کبھی ادھر، تو کبھی ادھر ذرا جو کچھ کاہ
کہہ دو تو ”جی اچھا!“ کہہ کر چھلاوے کی طرح غائب
ہو جاتی ہے، پھر شکل ہی نہیں دکھاتی اپنی۔ کام چور
کہیں کی۔“ ماں جی تو ناک تک اس سے بے زار نظر
آ رہی تھیں۔

”کیا کام ہے“ آپ مجھے بتادیں میں کر دیتا ہوں۔
ان کا خیال کر کے اس نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔
”نہ بھئی! بخشو مجھے۔ پہلے تم وہ کام کرو جو تمہارے
کرنے کا ہے۔ وہ تمہارا بھیا یا دیر پہلے ہی تمہارے پیچھے
پڑا رہتا ہے۔ اس کی جو رو اس کے کان بھرتی رہتی
ہے۔ ابھی کل بھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ خاور کو کوئی کاہ
کیوں نہیں کرتا۔ کہیں جاب کیوں نہیں کرتا۔“ وہ اٹھا

اسی چہرے پر ہیں۔

”تو آپ نے ان سے کہا نہیں کہ وہ کوششوں میں
لگاؤ ہوا ہے، ماں جی! دن رات ان ہی کوششوں میں لگا
ہوں، آپ کو معلوم تو ہے۔“ اس نے مظلومیت کا
ڈھونگ رچا کر فوراً ان کی ہمدردیاں بٹورنے کی
کوشش کی۔

”تو میرے بچے! تو اپنی جو رو کی زبان سمجھتا ہے نا۔
اب اوپر سے یہ فتنی آگئی میرے کیلجے پر مونگ دلنے
کو۔ ارے! آج صبح ہی کی بات ہے میں نے باور سے
کہا کہ سارا سارا دن بے کار پھرتی رہتی ہے۔ کسی کام
کی۔ نہ کانج کی، اڑوس پڑوس میں جھانک لے گی یا پھر
زبان چلا لے گی۔ کبھی کوئی کام کہہ دوں تو اس کی جان
نکل جاتی ہے۔ کچن کا سارا کام ناہید ہی کر رہی ہے یہ
کون سا ہاتھ بٹا رہی ہے اس کا۔ فالتو میں یہاں دندناتی
پھر رہی ہے تو پتا ہے اس نے کیا کہا؟“ ماں جی نے دکھ
بھری نظروں سے خاور کی طرف دیکھا۔

”کہنے لگا، ماں جی! وہ یہاں نوکرانی بن کر نہیں آئی۔
سارا دن وہ توحید کو سنبھالتی ہے، ناہید کے کپڑے دھوتی
ہے، استری کرتی ہے، اے! میں نے صرف اتنا ہی تو کہا
تھا کہ میری چوٹی بھی گوندھ دے، مگر یاور نے نکا سا
جواب دے دیا۔ میرے سامنے اس چھٹانک بھر کی لڑکی
کی حمایت کی، اس نے شاید ہماری باتیں سن لیں۔
ابھی تمہارے آنے سے پہلے زبردستی میرے منع
کرنے کے باوجود میرے سر میں تیل لگا کر اس قدر کس
کر چوٹی گوندھ کر گئی ہے کہ جڑیں کھینچتی ہوئی محسوس
ہو رہی ہیں“ کہتے کہتے ماں جی کی آنکھوں میں آنسو
آ گئے۔

اسی وقت وہ بلائے جان کی طرح پھر حاضر ہو گئی۔
اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔
”لیجئے! گرم گرم چائے کے ساتھ مزے دار
پکوڑے۔“ اس نے اسٹائل سے ٹرے میز پر رکھتے
ہوئے کہا۔

خاور کو تو ویسے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے
بے مہری سے ایک پکوڑا اٹھالیا۔

”دیکھ کر گرم ہیں۔ گرم گرم کھپنے لگی منہ جل

جاتا ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ منہ تک لے جاتا، اس
نے معنی خیزی سے ٹوک دیا۔

اس کی مسکراہٹ اس وقت جلتی پر تیل کا کام
کر رہی تھی، مگر حسب پروگرام وہ کمال ڈھٹائی سے
اس کا یہ طنز بھی نی لیا۔

”خوشی ہوئی کہ کسی بھی بہانے اپنا تو سمجھا۔“ اس
نے دبے انداز میں بردستہ جملہ چست کیا۔

”خوش فہمی ہے جناب کی۔ اور کچھ نہیں۔“ اس
نے تیکھی مسکراہٹ سے سخت لمحے میں کہا۔

”صرف خوش فہمی ہے، غلط فہمی تو نہیں ہے نا۔
کیوں؟“ اس نے براہ راست اس کے دل کے
دروازے پر دستک دے ڈالی۔

اس کے چہرے پر رقصاں مسکراہٹ ایک آن میں
غائب ہو گئی۔ اس نے ماں جی کو چائے کی پیالی دی، پھر
اس کی طرف مڑی۔

”پیدائشی پاگل پن کا علاج میرے پاس نہیں
ہے۔“ اس نے حد درجہ غور سے کہا۔ وہ یہ جملہ کہہ کر
رکی نہیں۔ سیدھی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی
تم مانگتے پھو گے اپنا غرور ہم سے
وہ زیر لب شعر کو بار بار دہرا کر اپنے دل کی جلن کو
دور کرتا رہا۔

اسی طرح ہر بار وہ اس کو ٹھکرا دیا کرتی تھی۔ کبھی
کسی وقت بھی اس نے اپنے کسی بھی عمل سے اس کی
پذیرائی نہ کی تھی اور جوں جوں وہ اسے دھتکار رہی تھی
وہ اتنا ہی اسے زیر کرنے کے لیے اس پر مائل بہ کرم
ہو رہا تھا۔

پہلی بار کسی لڑکی نے اسے رد کیا تھا۔ اس کی
شخصیت کو نظر انداز کیا تھا۔ اسے بار بار کامنی سی ماریہ
یاد آرہی تھی۔ اس قدر جاذب نظر اور پرکشش لڑکی
تھی کہ اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی اسے ماریہ سے محبت
ہو گئی تھی۔ اسے ہر وقت اپنی ڈرینگ اور گرومنگ کی
فکر رہتی تھی۔ جب بھی نیا لباس پہنتی، بار بار اس سے
پوچھتی رہتی کہ ”کیسی لگ رہی ہوں۔“ جب بالوں کا

اشا نکل بدلتی تو جب تک وہ تعریفوں کے پل نہ باندھ لیتا وہ اس کی جان نہ چھوڑتی۔ لیکن پھر کچھ عرصہ اس کے ساتھ گزرا تو وہ اس کے دل سے اتر گئی، کیونکہ وہ ہر وقت خاور کو اپنا جادوئی آئینہ سمجھ کر اس سے اپنی تعریف وصول کرنا چاہتی تھی اور ایسی لڑکی کے ساتھ ساری عمر گزارنے کا تصور اس کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ جو رو کا غلام بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا، کیونکہ ابھی اسے ستاروں سے آگے اور جہاں بھی دیکھنے تھے۔

ویسے بھی وہ نئی نسل کا نمائندہ تھا اور نئی نسل کے اس خیال سے سو فیصد متفق تھا کہ۔ چاند کو بھی مل گئی چاندنی تاروں کا کیا ہوگا محبت ایک سے کرلی تو ہزاروں کا کیا ہوگا سو بڑی صعوبت کے بعد وہ ماریہ سے یہ کہہ کر جان چھڑایا تھا کہ ابھی اسے اپنا کیریر بنانے میں چھ سات سال لگیں گے اور کیریر بنے بغیر ماں جی کہیں بھی اس کا رشتہ لے کر نہیں جائیں گی۔

وہ اتنے سال انتظار نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس کے بہت رشتے آرہے تھے۔ یوں ماریہ کی محبت اپنے اختتام کو پہنچی۔

اور ماہ نور تو واقعی بے حد خوب صورت اور لا جواب لڑکی تھی۔ وہ محبت کے معاملے میں بھی بہت محتاط تھی۔ بہت رد و کد اور نخروں کے بعد اس نے خاور کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما تھا۔ ان دنوں وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ماہ نور ہی اس کی منزل ہے۔ مگر یہاں ماہ نور کی لالچ آڑے آگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ آئے روز اسے بیش قیمت تحائف دے جو وہ انورڈ نہیں کر سکتا تھا، سو بڑی مشکل سے اس نے ماہ نور سے جان چھڑائی۔

بے شمار ناموں کی فہرست اس کے دل میں محفوظ تھی۔ ستارہ، فریحہ اور رشا بھی اسے اچھی طرح یاد تھیں۔ ان سب نے اس پر اپنی محبتیں بچھاؤں کی تھیں۔ وہ سب اس کی ایک نظر کے اشارے پر اس کے آگے بچھ جاتی تھیں۔ مگر یہ مالا تو بہت ہی محتاط اور

تیز نگلی تھی۔



اسے ایک نجی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ یاد رہی تو بے حد خوش ہوئے۔ اس خوشی کے موقع پر انہوں نے گھر میں ہی ایک چھوٹی سی پارٹی ترتیب دی۔ ان کی بیگم تو اپنی طبیعت کی وجہ سے ست سی تھیں۔ زیادہ تر انتظام مالا نے ہی سنبھالا۔

بڑے دنوں بعد بغیر کسی طنز و طعن کے وہ سب اکٹھے بیٹھے۔ اس روز مالا کے چہرے پر بھی ایک چمکتی سی مسکراہٹ تھی۔ بے ریا مسکراہٹ۔ جو اس کا دل لوٹ رہی تھی۔

پارٹی کے اختتام پر اس نے بھیا، بھابھی، اماں کو تحائف دیے اور ایک خاص تحفہ مالا کو بھی دینا چاہا۔ ”شکریہ میں یہ نہیں لے سکتی۔“ اس نے خشک انداز میں جواب دیا۔

”مگر کون۔“ اسے سبکی سی محسوس ہوئی۔ ”اس لیے کہ میرا اور آپ کا ایسا کوئی خاص رشتہ نہیں ہے۔“ اس نے تکلف سے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے باہر چلی گئی۔ یاد رہی اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکلے تھے۔ شاید اسے سمجھانے کے لیے۔

”لو بھلا، کیا فتنہ خیز معصومیت ہے۔ اسے کہتے ہیں ڈورے ڈالنا۔ زبردستی کی رشتہ داری جو ٹٹا۔ کس قدر چلتا ہے کہ اپنے منہ آپ ہی اپنا رشتہ جوڑ رہی ہے۔“ ماں جی کو بے تحاشا غصہ آیا۔

”ارے! میں تو پہلے ہی سوچ رہی تھی کہ یہ کوئی نہ کوئی افسانہ ضرور بنائے گی۔ ایسی تفتیا ہری مرچ لڑکی، توبہ توبہ۔“

ماں جی کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔ وہ بددلی سے وہاں سے اٹھ کر باہر آیا تو وہ وہیں چپا کے درخت تلے کچھ خاموش اور سنجیدہ سی کھڑی تھی۔ ”کسی کی دل شکنی کرنا بہت بری بات ہوتی ہے۔ میرا تحفہ لوٹا کر تم نے میرا دل توڑ دیا۔“ اس کے پاس

جا کر اس نے دھیرے سے سرگوشی کی۔ ”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولی۔ ”تمہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

اس لمحے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں تھمے سے جل اٹھے۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں تو پلکوں کی جھلک مرتعش سی ہو گئی۔ خاور کے دل کو بھی چار سو چالیس دھڑکنا لگا، جیسے سچ سچ ہی دل پر دروازا ہوئی ہو۔ نہ جانے کب، کیسے اس نے اس کا تحفہ قبول کر لیا تھا۔ اس روز سے خاور ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اس نے اس ساحرہ کو بالآخر تسخیر کر ہی لیا تھا۔ اس کی لمبی فہرست میں اب ”کشمالہ“ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔



وہ دن بڑے جادو بھرے تھے جیسے کیسی جادو مگری میں دو محبت کرنے والے اڑن کھٹولے پر بیٹھے آسمانوں کی سیر کرتے پھر رہے ہوں۔ بلند یوں کو چھوتے پھر رہے ہوں۔ شامیں حسین اور رنگین ہو گئی تھیں۔ اب نہ وہ اس سے کتراتے تھے نہ اسے گھورتی تھی اور نہ اس سے خار کھاتی تھی۔ وہ اکثر شام کو مل بیٹھ کر گپ شپ کر لیتے۔ اس نے اسے شاعری کی کتاب کا تحفہ بھی دیا، جسے اس نے خوش دلی سے قبول کر لیا۔ اکثر ان دنوں کا موضوع کسی بھی شعر کی رومانوی اور جذباتی کیفیت ہوتا اور اسی دوران وہ اس پر اپنے جذبات بھی عیاں کرتا جاتا۔

”یہ شعر تو میرے دل کی ترجمانی کر رہا ہے۔ تم ہی میرا آسمان ہو، میرا خواب ہو۔“

وہ بلا جھجک سراہتا اور اس لمحے اس کے چہرے پر بڑے خوب صورت سے رنگ بکھر جاتے۔ وہ اس کی مرضی اور منشا کے مطابق اس کی طرف نہ صرف مائل ہو گئی تھی، بلکہ اس نے اس کی محبت کو سچا سمجھ کر تسلیم بھی کر لیا تھا اور اب وہ وقت قریب آتا جا رہا تھا کہ وہ اسے آسمان سے زمین پر پختا۔ اپنے مجروح اور شکستہ جذبات کا انتقام لے کر اسے اس کی اوقات یاد دلاتا۔

”او نہ! بہت اکرنتی تھی۔ مگر کیسے میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے منصوبوں اور اس کی شکست پر ہنس رہا تھا۔

اپنی جیت اور اس کی ہار کا تماشا دیکھنے کے لیے فی الحال تو اس نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ تڑپتی، شکایت کرتی تو اس کے اندر کی جلن پر ٹھنڈے سے چھینٹے پڑتے، مگر وہ چند دن اور جوہی کے اس کھیل کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے بظاہر مخلص بنا اس کے آنسو بھی پوچھتا، اس کو لطیفے سنا کر ہنساتا بھی تھا۔

ماں جی سب دیکھ رہی تھیں۔ ان کی گھاگ نظروں نے محبت کے اس کھیل کو پہچان لیا تھا۔ وہ برملا کشمالہ کو برا بھلا کہتی تھیں، تاکہ وہ کشمالہ سے بددل ہو جائے۔ اسے یقین تھا کہ کشمالہ کا دل توڑنے پر ماں جی کی طرف سے کوئی سرزنش نہ ہوگی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے کھیل کا ڈراپ سین کرتا، گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔ ناہید بھابھی ڈیلوری کے لیے اسپتال پہنچ گئیں۔ گھر کا نظام مختصر دورانیہ کے لیے تتر بتر ہو گیا، مگر کشمالہ نے بخوبی گھر سنبھال لیا۔ ان دنوں اسے سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ وہ جن میں مصروف ہوتی تو روتے دھوتے توحید کو خاور کی گود میں ڈال دیتی۔ کبھی بھابھی کے لیے سوپ بنا رہی ہوتی تھی، تو توحید کی فیڈر بھی اسے تھما دیتی اور وہ توحید کو سنبھالنے پر بلا وجہ اس سے الجھ بیٹھا۔ جان بوجھ کر اسے باتیں سنائیں۔ اس پر یہ ظاہر کیا کہ وہ ان باتوں کو اور ان کاموں کو ناپسند کرتا ہے، نیز یہ کہ کشمالہ نے اسے بہت مایوس بھی کیا ہے۔

اس وقت اس کے چہرے پر حیرت اور رنج کے تاثرات ابھر آئے۔ شاید وہ اس سے ناراض بھی ہو گئی تھی۔ وہ روئی بھی تھی۔ اس کا شبنم سے دھلا چہرہ اور پلکوں پر چمکتے موتی دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو پشیمان سا ہو گیا۔

ساری رات اسے نیند نہ آئی۔ نہ جانے اسے کیا بے سکونی تھی۔ بھابھی کا کیس سیریس تھا۔ انہیں وہیں روک لیا گیا تھا اور ڈاکٹر نے آریٹھن تجویز کیا تھا۔ صبح وہ

اٹھا تو طبیعت میں گرانی تھی۔ اعصاب بوجھل سے تھے۔ کشمالہ کا دل دکھا کر اسے اپنے دل پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ شاید وہ بھی اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس خیال کو جھٹکنا اس کے لیے آسان نہ رہا تھا۔ وہ اپنی کیفیت سے پریشان ہو کر باہر آیا تو مزید جھٹکا لگا۔ میز صاف ستھری پڑی تھی۔ ناشتے کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ کچن میں گیا تو برتن دھلے ہوئے تھے۔ چائے کا پانی بھی نہیں پکا ہوا تھا۔

”ناشتا...“ اسے سامنے دیکھ کر اس نے فوراً کہا۔ ”خود نکالو۔ میں توحید کے کپڑے بدل رہی ہوں اور ناشتے کے بعد اسپتال میں کچھ سامان دے آتا۔ یہ رکھی ہے باسکٹ۔“ پھر تو زائد از میں جواب آیا۔

اس نے پھر خود پر بے گانگی کا خول چڑھالیا تھا۔ خود کو مصروف ظاہر کر کے اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ ”شش۔“ خواجہ خواہ میں اس کی محبت میں دبلا ہو رہا تھا۔ بھاڑ میں جائے ایسی محبت۔“ اس نے وہیں کھڑے کھڑے محبت پر لعنت بھیجی۔

صبح تو یہ تھا کہ رات بھر کی پریشانی کے بعد اس وقت اسے کشمالہ کی محبت پر حرف آخر پڑھتے ہوئے کوئی دکھ نہ ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی اس کے لیے تڑپ رہی ہوگی، مگر یہاں ایسا کچھ نہ تھا۔

بھابھی چار دن بعد ڈسچارج ہو کر گھر آئیں تو مصروفیت اور بھی بڑھ گئی اور مالا تو جیسے اسے بھول ہی گئی تھی۔ اسے تو سر اٹھانے تک کی فرصت نہ تھی۔ گھر میں مہمان داری بھی ہو رہی تھی۔ گھر بھی سنبھال رہی تھی اور نئے مہمان کو بھی اسے ہی دیکھنا پڑ رہا تھا کہ فی الحال بھابھی اس پوزیشن میں نہ تھیں کہ گھریار اور بچے کو سنبھال سکیں۔

ماں جی کا بڑھاپا اور سو طرح کی بیماریاں تھیں۔ وہ بھی کسی تذبذب نہ تھیں، بس کچھ دیر نو مولود کو گود میں لے کر بچکار لیتیں۔

ایک ہفتہ حتم ہو رہا تھا تو ایک شروع ہو رہا تھا۔ ادھر بھابھی کے کیس سے فراغت ہوئی تو ”ادھر بقر عید“ سر پر کھڑی تھی۔ اس کی الگ گما گسی تھی۔ اب بکرا

کہاں سے آئے۔ بھابھی کے کیس پر پچاس ہزار خرچ ہو گئے تھے۔ یاد رہے تو فی الحال قربانی کے موڈ میں نہ لگ رہے تھے اور خاور ابھی اس قابل نہ تھا۔ مگر ماں جی کو ایک ہی دھن سوار تھی کہ قربانی ہر حال میں کرنی ہے۔

”جلی، محلے میں سب کے ہاں بکرے آگئے، ایک ہمارے ہی گھر میں دیرانی ہے۔ مجھے نہیں معلوم بقر عید پر قربانی ضرور کرنی ہے۔“

”ناہید کے کیس پر پچاس ہزار خرچ ہو گئے ہیں۔ کہاں سے لاؤں رقم۔ پہلے ہی قرض دار ہو گیا ہوں! وہ دہائی دینے لگے۔“

”نوج۔! یہ آج کل کے نامروڈاکٹر، کسی کام کے نہیں۔ کٹ پیٹ کے بھی ڈال دیتے ہیں اور ڈھیر پیسے بھی اینٹھ لیتے ہیں۔ ارے! پہلے بھی تو بچے ہوتے تھے۔ اس طرح تو کوئی گلا نہیں کاٹتا تھا کسی کا۔ دس، دس، بارہ بارہ بچے ہوتے تھے۔ نہ کوئی حساب نہ کتاب۔“

ماں جی بولنا شروع ہوئیں تو بولتی چلی گئیں۔ ”یعنی بے حساب بچے۔“ خاور قہقہہ مار کر ہنسا۔ سب کے چروں پر تمسکراہٹ آگئی، مگر کشمالہ سیاٹ سا چہرہ لیے کھڑی رہی۔ وہ اس سے سخت ناراض تھی اور پہلے کی طرح کھیلی نظروں سے اسے گھور رہی تھی، مگر اسے اب پروا نہ تھی کہ اپنا کیم تو وہ کھیل چکا تھا اور اسے نچا دھا چکا تھا۔

ماں جی اور یاد رہا میں بکرے پر خاصی تکرار ہوئی، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ماں جی ناراض سی ہو گئیں۔ سب گھروں سے بکروں کے بولنے کی آوازیں اور پائل کی چھن چھن آرہی تھی۔ مگر ہمارے گھر میں دیرانی تھی۔ بقر عید میں بھی بس ایک دن رہ گیا تھا۔

اس روز وہ شام ڈھلے یار دوستوں کے سنگ گھوم پھر کر گھر میں داخل ہوا تو چونک گیا۔ سامنے ہی دیوار کے پاس موٹا تازہ بکرا بندھا چارہ کھا رہا تھا۔

”اوم۔ واٹ آگریٹ سربرا۔“ یہ کہاں سے آیا؟“ اس نے خوش ہو کر ماں جی سے پوچھا۔ ”یہ سب ناہید کا کمال ہے۔ بہت اچھی ہے میری

ہو۔“ ماں جی نے محبت سے کہا۔

”واوم۔ تو بے چاری ناہید بھابھی نے اپنا زیور بیچ دیا۔“ اسے بھابھی کے اخلاص پر رشک آیا۔

کچن میں اشتہا انگیز خوشبو میں پھوٹ رہی تھیں۔ ناہید بھابھی بھی کشمالہ کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

”ارے! عید سے پہلے عید۔ گھر میں کوئی دعوت ہے کیا؟“ اس نے ناہید بھابھی سے پوچھا۔

”باجی اور بھائی جان آ رہے ہیں کشمالہ کو لینے۔ اس بار وہ عید بھی یہیں کریں گے۔“ بھابھی نے اطلاع دی البتہ کشمالہ نے نظر اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔

وہ ایک شوخ سے گانے کی دھن زیر لب گنگنا رہا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا کہ ابھی اسے اپنے بقر عید کے کپڑے بھی استری کرنے تھے اور بھی بہت سی تیاریاں کرنی تھیں۔ کشمالہ کے امی ”باجا کب آئے۔ اسے معلوم نہ ہوا۔ وہ تھک ہار کر ایسا بے سدھ سویا کہ رات کا کھانا بھی نہ کھایا۔

اگلے روز بقر عید تھی۔ دیوار تلے بکرا بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ یاد رہے عید کی نماز پڑھ کر قصائی کو لینے گئے ہوئے تھے۔ وہ ماں جی کے پاس چلا آیا، جہاں کشمالہ کے امی، ابو سے پہلی بار ملاقات کی۔ کشمالہ ہنوز سنجیدہ سی بیٹھی ہوئی تھی، مگر اس اداسی میں بھی اسے قیامت لگ رہی تھی۔ اس نے قصداً ”اس سے نظر چرائی۔“

”خاور بیٹا! یہ کشمالہ کی امی اور ابو ہیں اور آج تمہاری اور کشمالہ کی منگنی کا سربراہز بھی ہے۔“ ماں جی کا انکشاف کسی زلزلے سے کم نہ تھا۔

”آپ لوگ لاؤنج میں آجائیں۔ یاد رہے آگئے ہیں۔ وہیں پر رسم رکھ لیتے ہیں۔“ بھابھی نے آکر اطلاع دی۔

سب لوگ اٹھ کر ادھر چل دیے۔ اس نے ماں جی کے دوپٹے کا کونا پکڑ کر روک لیا۔

”یہ سب کیا ہے ماں جی! وہ پٹاخہ۔ وہ تو آپ کو بالکل پسند نہیں تھی۔“ اس نے ناراضی سے کہا۔ ”ارے! سمجھا کرو۔ وقت کی چال بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ویسے وہ اب اتنی بھی بری نہیں ہے۔ خود

میرے سامنے اس نے اتنی ذمہ داری سے سارا گھر سنبھالا ہے۔ ذرا سی مزاج کی تیز ہے وہ۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے تو ناہید نے ہی بتایا کہ اس کی باجی کے گھر میں یہ رواج ہے کہ منگنی اور شادی کے بعد بیٹی کی سسرال میں سالم بکرا بھیجا جاتا ہے۔ بس یہ آئیڈیا مجھے پسند آگیا۔ عزت بھی رہ گئی اور کام بھی ہو گیا۔“ انہوں نے اصل بات بتائی، جسے سن کر وہ چکر اکر رہ گیا۔ یہ تو سیدھا سیدھا ایک سودا ہو گیا تھا اور کسی کے لیے یہ سودا برا نہیں تھا۔ اسی کی مرضی جاننے کی کسی نے کوشش ہی نہ کی۔

”کہاں رہ گئے بھئی! جلدی او، پہلے رسم کر لیں، پھر بکرے کی قربانی بھی کرنی ہے۔“

یاد رہے بھیا اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آگئے اور بازو سے پکڑ کر لاؤنج میں لے گئے۔ خوشیوں، محبتوں اور مبارکوں کے ساتھ اسے انگوٹھی پہنا کر مٹھائی کھلائی گئی اور ادھر ماں جی نے کشمالہ کو انگوٹھی پہنائی۔

یاد رہے بھیا رسم کے فوراً ”بعد بکرے“ کے گلے پر چھری پھیرنے چلے گئے کہ قصائی آچکا تھا۔ جس وقت وہ بکرے کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے تو اسے لگ رہا تھا کہ چھری بکرے کے گلے پر نہیں، اس کی گردن پر چل رہی ہے۔ اس کی نظریں بے اختیار ہی کشمالہ سے ملیں تو کٹار اسی آنکھوں کا خنجر دل میں اترتا چلا گیا۔



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دگلش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ جھپٹی سی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو گھر آئی	450/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے



”کچھ دروازے کھڑکیاں ہمیشہ بند کیوں رہتی ہیں؟“

بند کھڑکی کو تکتے ہوئے اس نے سوچا۔ اس کے پاس لاتعداد ”کیوں“ تھے اور جواب کسی کا نہ تھا۔

”سنو عارفہ! وہ آیا ہے تم سے ملنے۔“ ماہین کے لہجے میں کھنک تھی۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ وہ ضرور آئے گا۔ دیکھا وہ آگیا ہے۔“ وہ خانا نہ بھولی تھی۔

”اتنے عرصے بعد اتنی اچانک کیوں کس لیے؟“ اچانک اٹھ آنے والے سوالات سے دامن بچا کر وہ اٹھی مگر کمرے کے دروازے پر ہی رک گئی۔ ”کیوں اور کس لیے؟“ تیکھے سوال چبھ رہے تھے اس کے قدم روک رہے تھے۔

وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ ویسے ہی ہنستا مسکراتا، کھلا ہوا چہرہ جیسے کل کی بات ہو۔ وہ اسے نظر انداز کر کے بالکونی کی طرف چلی گئی۔

”تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟“ وہ اس کے پیچھے ہی آگیا۔

”مجھے اب کسی چیز کی خوشی نہیں ہوتی۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔

”ہونی چاہیے تھی۔ میں اتنی دور سے آیا ہوں۔ میں نے سوچا تم اتنے سالوں بعد مل کر خوش ہو جاؤ گی پہلے کی طرح۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم بدل سکتی ہو۔ تمہارا انداز بدل سکتا ہے۔ محبت بدل سکتی ہے۔“ لہجہ جتنا سخت تھا شکوہ اس سے زیادہ۔

”محبت نہیں بدلتی فرید! ہم بدل جاتے ہیں۔“

”تو تم ہی بدل گئی ہونا؟“ پہلی دفعہ اس کے اپنی جانب دیکھنے پر آنکھوں میں جھانکا جہاں کوئی نرم ناثر تھا نہ چمک نہ کوئی احساس۔ دشت جیسی دھول اڑ رہی تھی ویران آنکھوں میں۔

”پہلے تمہارے خط بند ہوئے پھر فون کالز پھر ٹیکسٹ میسج پھر سب کچھ۔ پہلے خط کا جواب نہ ملا تھا پھر کالز ریسیو نہ ہوئی تھیں پھر ٹیکسٹ کی ڈیلوری رپورٹ آئی بند ہو گئی اور میں چپ ہو گئی۔“ اسے بھی شکوے تھے۔

”اور تم چپ ہو گئیں۔ یہی تو بات ہے۔ تم نے مجھ سے شکوہ نہ کیا بات نہ کی کلمہ نہ کیا مجھے اکسایا نہیں۔ پہلے بھی تو میں تمہارے خطوط کے جواب نہیں دیتا تھا۔ پہلے بھی پہلی کال بریسیو نہیں کرتا تھا۔ پہلے بھی کئی دنوں بعد ٹیکسٹ دیکھتا تھا۔ دس میسج کا ایک جواب دیتا تھا۔ مگر پہلے تو تم شکایت کرتی تھیں گلے شکوے کرتی تھیں۔“

”پہلے جیسا اب کچھ بھی نہ رہا۔ وقت کے ساتھ تم بدل گئے تو میں کب تک اسی جگہ کھڑی رہ سکتی ہوں؟“ پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا گیا۔

”کسی اور کو چاہنے لگی ہو میری امانت میں خیانت؟“ لہجہ تیز تھا۔

”چاہنے لگی ہوں تمہاری طرح یہ رستہ تم نے ہی مجھے دکھایا ہے فرید حسین!“

”تم نے میرے نام کی انگوٹھی پہن رکھی ہے“

امانت تھیں تم میری۔“ وہ بھڑکا۔

”تم بھی میری امانت تھے۔ تم نے بھی میرے نام کی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔“ اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

”میں نے کچھ ایسا غلط تو نہیں کیا اور پھر میں لوٹ بھی تو آیا ہوں۔“ اس کا لہجہ کمزور ہوا تھا۔

”میں اگر اتنی دور تک نکلتی اور واپس آتی تو کیا تم مجھے قبول کرتے؟“ لہجے کی مضبوطی کم نہ ہوئی تھی۔

”میں نے کوئی گناہ نہیں کیا عارفہ! ایک لڑکی ہی پسند کی تھی۔ اس سے دوستی کر لی۔ مگر شادی تو بہر حال مجھے تم ہی سے کرنی تھی۔ جب ہی میں اسے چھوڑ کر لوٹ آیا ہوں۔“

”میں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایک لڑکا ہی پسند کیا ہے مگر اس سے دوستی نہیں کی۔ مجھے کسی نہ کسی سے شادی تو کرنا ہی تھی۔ تم شادی کر کے بیٹھ جاتے اور میں تا عمر آنسو بہاتی بیٹھ کر۔ صرف اپنی محبت اور سچائی ثابت کرنے کی خاطر میں اپنے والدین اپنے بہن بھائی سب کو پریشان کیے رکھتی۔“

”مجھے نہیں پتا تھا کہ عارفہ بھی بدل سکتی ہے کبھی۔ جو میرا اتنا خیال رکھتی تھی جو مجھے اتنا چاہتی تھی جو میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔“

”اسے اپنے بغیر رہنے کی عادت تم نے ڈالی ہے فرید! اسے بے وفائی کرنا بھی تم نے سکھائی اور بے رخی

بھی۔“ اس کی آنکھ میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو آ گئے۔

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

بھی۔“ اس کی آنکھ میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو آ گئے۔

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“

”اس سے محبت کرنا بھی تو میں نے ہی سکھائی تھی۔“



میں کسی سے زبردستی نہیں چھین سکتی۔ مجھ پر تمہارا اور تم یہ میرا صرف منگنی کا لیبل ہی تو لگا تھا۔ ہم کسی مضبوط تعلق میں کہاں بندھے تھے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی اور اب یہ لیبل بھی باقی رکھ کر کیا کرنا ہے۔“ اس نے بڑے ٹھہراؤ سے اپنی بات مکمل کر کے اس نے انگوٹھی لوٹا دی۔

”تم مجھے چھوڑ رہی ہو، ٹھکرا رہی ہو مجھے؟“ وہ حیرت زدہ تھا۔

”میں خود پر لگا فرید حسین کا لیبل اتار رہی ہوں۔ جب میرا دل ہی اس کا نہیں رہا تو نام کا کیا فائدہ۔ میں تمہاری طرح منافق نہیں ہوں۔“ وہ رکی نہ تھی بات ختم کر کے۔

”تم بہت برا کر رہی ہو عارفہ احمد بہت برا۔ بچھتاؤ کی بری طرح۔“ وہ انگوٹھی ہاتھ میں لیے بیڑا تار ہوا میسر ڈھیاں اتر گیا۔

ماہین پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئی۔

”تم نے بہت برا کیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو اس کا انتظار کیوں کیا۔ وہاں شادی کیوں نہ کی۔ جہاں ابا چاہ رہے تھے۔“ ماہین کو اس سے شکوہ تھا۔

”وہ بھی تو ٹھکرائے جانے کی ذلت سے گزرے۔ اسے بھی تو پتا چلے کہ سراسرے جانا میری کمزوری نہیں ہے، پوجے جانا اس کی کمزوری ہے۔ اسے بھی تو پتا چلے کہ بے رخی کیا ہوتی ہے اور بے وفائی کیا ہوتی ہے جب اس نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ تب اسے کسی نے نہ کہا کہ تم پچھتاؤ گے۔ تم برا کر رہے ہو۔ جب اس نے مجھے چھوڑا تھا میں نے صبر کر لیا تھا لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ صبر نہیں کرے گا۔ اسے صرف ٹھکرائے جانے کا غصہ ہے، پوجے نہ جانے کا دکھ ہے۔ اسی لیے وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔“

اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

ماہین خاموش کھڑی بند دروازے کو گھورتی رہی۔

اسے پتا تھا وہ اندر بیٹھ کر بہت روئے گی۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ اس نے اب رونا چھوڑ دیا ہے۔

اسے صرف یہ تعجب تھا کہ اس نے فرید کو کیسے چھوڑ دیا۔ وہ فرید کو منانا چاہ رہی تھی اور اسے بھی اسے اندازہ تھا یہ اب خاصا مشکل کام ہے۔



مرد کبھی بھی شکست کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی اسٹڈی میں بیٹھ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سامنے میز پر پڑی۔ وہ انگوٹھی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ عارفہ احمد۔ اسے بے پناہ چاہنے والی لڑکی اس کی محتاج۔ اس کی تھوڑی سی توجہ پر خوش ہو جانے والی، مگر عارفہ احمد کا دوسرا روپ بہت ہی محتاط خود میں لپٹا ہوا خاموش دل۔ وہ بچپن سے اس کا گرویدہ تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ جو چاہتا تھا اسے حاصل کر کے دم لیتا تھا۔ وہ اس کی پیچھو کی بیٹی تھی۔ اس نے بات کی اور خوشی خوشی ان کی نسبت طے ہو گئی۔

اسے عارفہ احمد کے آگے پیچھے گھومنا نہیں پڑا تھا۔ نہ ہی اسے اپنی محبت کا یقین دلانا پڑا تھا۔ مخالفت کا بھی سامنا نہ ہوا۔ وہ کتنی آسانی سے مل گئی تھی۔ شاید اسی لیے اس سے محبت تو کرتا تھا پر اس کی قدر نہ کر پایا۔ اسے یقین تھا وہ اس کی ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ چاہے وہ کہیں بھی بھٹکتا پھرے لوٹ کر آئے گا تو وہ تہ دل سے قبول کرے گی۔ اسے پتا تھا وہ اسے چاہتی نہیں اسے پوجتی ہے اور اپنی پوجا کرانا کے اچھا نہیں لگتا۔ بس ایک بات تھی۔ اس نے اپنے درمیان ایک فاصلہ رکھا تھا۔ وہ اس کی ہر بات مانتی تھی اس سے بات بھی کرتی تھی مگر ایک حد میں رہ کر وہ اس سے ڈرتا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ سب نہ کہہ پاتا جو کہنا چاہتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا وہ اس کی نظروں سے گر جائے۔ وہ اس کی شرافت اور اچھی سوچ کی تعریف جو کرتی تھی۔

وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ مرد ہے فرشتہ نہیں۔ مگر وہ اسے فرشتہ سمجھتی تھی اور اب اس کے سامنے فرشتہ بن کر رہنا اس کی مجبوری تھی۔ مگر وہ بچی نہ تھی۔ وہ کب تک دھوکے میں رہتی۔ اسے سب کچھ پتا چل ہی گیا تھا۔



”میں نے اسے چاہا نہیں تھا، پوجا تھا ماہین! اس نے جو کیا اس کے بعد میں کیسے اسے معاف کر دیتی۔“ اس نے تکیہ منہ پر رکھ لیا تھا۔ لاسٹ بند تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کی بات کے جواب میں بولی۔

”وہ اس معاشرے کا مرد ہے عارفہ! اس نے کچھ نیا نہیں کیا۔ مرد کا ایک عورت تک محدود رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ ادھر ادھر منہ مار ہی لیتا ہے۔ اس نے کچھ نیا نہیں کیا۔ اسے معاف کر دو۔ شادی کر لو اس سے۔“

”ماہین! میری نظر میں اس کی عزت نہیں رہی اب۔ میں اسے کبھی اونچا مقام نہیں دے پاؤں گی۔ میں کبھی اس کی پوجا نہیں کر سکوں گی۔“ اندھیرے میں اس کی آواز بہت بھاری اور گہری تھی۔

”انسان خطا کا پتلا ہے۔“ ماہین اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ہاں مگر اسے میرے برابر ہونا چاہیے۔ سچائی میں محبت میں وفا میں خلوص میں۔“ وہ جھجھلا گئی تھی۔ وہ اپنی بات ٹھیک طرح سے اسے کیوں نہیں سمجھا پاری۔

”اس کی ان برائیوں پر تمہیں سمجھوتا کرنا ہو گا۔ اگر نہیں تو میں تمہیں بتا دوں کہ اس دنیا میں شاید ہی تمہیں کوئی ایسا مرد مل سکے جو تمہارے مطابق ہو مگر پھر بھی تم اس سے اتنی محبت نہیں کر سکو گی جتنی محبت خلیفہ حسین سے کرتی ہو۔“ ماہین نے جیسے بات ہی ختم کر لی تھی۔

”اگر کر سکتی ہو تو نواز سے شادی کر لو بس۔ مگر کوئی ایک فوری فیصلہ کر کے اپنے آپ کو اس مشکل سے

نجات دلاؤ جس مشکل میں تم نے خود کو فرید کو اور سب کو ڈال رکھا ہے۔“ ماہین نے کہہ کر کروش بدل لی۔

وہ سو گئی تھی۔ اور وہ پوری رات جاگتی رہی۔ اس کے سامنے ماضی تھا، حال تھا اور مستقبل کے لیے اسے قدم اٹھانا تھا۔ جس دکھ سے وہ گزر رہی تھی اس دکھ میں فیصلہ کرنا مشکل تھا، مگر اس کے پاس وقت کم تھا۔

نواز ایک موبوم سی امید پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نواز اس کے باپ کا بھتیجا تھا۔ اس کے باپ کو وہ شروع سے ہی پسند تھا۔ لیکن سب کے ووٹ فرید کی طرف تھے اور پھر فرید کے گھر والوں کا اصرار۔ انہوں نے فرید کا رشتہ قبول کر لیا۔ فرید کے بارے میں انہیں کچھ عرصے بعد جو معلومات ملیں۔ پھر اس طرف سے شادی کی بات نظر انداز کر دی۔ وہ ٹھٹھک گئے تھے۔

اس نے نواز کو کبھی اس حیثیت سے نہ سوچا تھا نہ سوچ سکتی تھی۔ بس فرید کو جتنا تھا اسے بتانا تھا کہ وہ نواز سے بھی شادی کر سکتی ہے۔ اور یہ خبر اڑتی اڑتی فرید تک پہنچ گئی تھی، مگر اسے یقین نہ تھا۔ اسے پتا تھا یہ خبر اس کے گھر والوں نے اڑائی ہے۔ وہ مطمئن رہا۔

عائزہ بہت مختصر وقت میں اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ عائزہ اس کے ساتھ ڈیٹ پر جا سکتی تھی۔ اس سے گھنٹوں فون پر بات کر سکتی تھی۔ وہ کسی پردے میں لپٹی نہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ خوب مزے کرنا چاہتا تھا۔ عارفہ کے ٹیکسٹ خط نمون اس کے لیے بے معنی اور فالتو سے ہو گئے تھے۔

اپنا خیال رکھنے کی تاکید کے سوا اس کے پاس کیا تھا۔ وہ اس کے لفظوں میں چھپی محبت کو کھوجنا نہیں چاہتا تھا ہر وقت۔ اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا۔ اسے عائزہ کی باتیں اور زیادہ متاثر کرتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی عائزہ کو شادی کے لیے پسند نہیں کیا تھا۔ اسے شادی کرنے کے لیے عارفہ جیسی عورت کی ضرورت تھی۔ اسے نہیں اندازہ تھا کہ یہ خبر عارفہ تک پہنچ جائے گی۔ ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک اتنی

آسانی سے جس بات کو وہ اپنے گھر والوں سے بھی چھپاتا آیا تھا۔

عائزہ کی طرف سے شادی کا اصرار برپا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ عائزہ نے اسے نچا کر رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے خوب سنائی۔ دو ٹکے کا کر دیتی وہ ایسی ہی تھی۔ اسے ایسی پوی نہیں چاہیے تھی اسے پوجنے والی عارفہ چاہیے تھی۔

عائزہ کے ساتھ ساڑھے تین سال تک دھماکے دار افسیر چلانے کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اس کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف انجوائے کر رہا تھا۔

ساڑھے تین سال بعد اسے عارفہ کی یاد آئی۔ اب اسے خیال آیا کہ اسے لوٹنا چاہیے۔ کوئی اس کی راہ تک رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ خود تواز کا حوالہ دے کر اسے خوب سنائے گا، اسے کچھ کہنے نہیں دے گا۔ اسے احساس دلائے گا کہ وہ اسی کی خاطر لوٹ آیا ہے۔

مگر اب وہ انگوٹھی مٹھی میں لیے بے یقینی سے بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کے نام کا لیبل اتر چکا تھا۔ جس لیبل کی بنیاد پر وہ اپنا سکھ چلاتا تھا۔ اس کے سارے سکے کھوٹے ہو گئے تھے۔ اپنے زعم میں اپنا وہ ناقابل تلافی نقصان کر بیٹھا تھا۔

وہ ساری رات بیٹھا گتھیاں سلجھاتا رہا۔ اسے کہہ آیا تھا اور خود پچھتا رہا تھا۔



آج شادی کی پہلی رات تھی اور اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ وہ کھل کر بات کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ اس کی تعریف کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرنا تھا کہ اس نے اسے معاف کر دیا تھا۔

وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش تھی۔ یہ سچ تھا کہ وہ اب کسی سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے بھی

نہیں جس سے کبھی بے پناہ محبت کرتی تھی۔

جذبے بے رخی کی بھیمنٹ جو چڑھ گئے تھے۔

وہ کچھ دیر سر جھکائے اس کے کچھ کہنے کی منتظر رہی۔

پھر خالی دل سے بھاری ملبوس سنبھالتے اٹھی۔ ایک

آئینے میں خود پر پڑی تو خود سے نظریں چرا گئی۔ سرا

جانے کی خواہش نے سر اٹھایا تھا جسے فوراً "کچل دیا"

وہ اپنے سادہ کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔

اسے پتا تھا وہ اب ان معمولی باتوں پر خوش نہیں

ہونے والی۔

اس کے پاس جگہ بنانے کے لیے اسے اب بے

انتظار کا شکار ہونا تھا مگر اسے اب بے انتظار کی بے

ضرورت تھی۔ وہ اس کے پاس تھی۔ وہ اس کی تھی

جسے وہ چاہتا تھا۔ جو اسے کبھی پوجتی تھی۔ اس کے اند

کا مرد مر جھایا ہوا تھا۔ اسے اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں تھا

پچھتاوا یہ تھا کہ وہ یہ سب کیوں جان گئی تھی۔ وہ لاعلم

ہی رہتی تو اچھا تھا۔

وہ محبت ضرور کرتا تھا۔ مگر دیانت دار نہیں تھا۔ اپنی

خفت اور شرمندگی مٹانے کے لیے وہ بے معنی باتیں

کرتا رہا۔

آج سے پہلے فرید حسین اسے کبھی اتنا غیر اہم نہ

معمولی نہ لگا تھا۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے پاس کہنے کو تھا

بھی کچھ نہیں۔

ایک سرد مہری نے ان کے درمیان سے محبت اور

اپنائیت کا وہ احساس ختم کر دیا تھا جو کبھی نہ کہتے نہ سنتے

بھی پاس رہتا تھا۔ باتوں سے عیاں ہوتا تھا۔ آنکھوں

سے چھلکتا تھا۔

اس احساس کو اس کی بے رخی نے سلا دیا تھا۔ بے

وفائی نے جلادیا تھا۔

اب جب تک فرید حسین کو اپنی غلطیوں کا احساس

نہ ہو جاتا۔

جب تک اس کی مردانہ انا کا جھنڈا بلند رہتا۔

جب تک وہ محبت میں سچا اور ستھرا نہیں ہو جاتا۔

تب تک اس احساس کو باقی رہنا تھا۔

تسلی

2013

www.istanbulcity.com

دلچسپ کہانیاں

جنہیں وہ بہائے چلا جا رہا تھا۔ پورے خشوع و خضوع سے نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دل کی دعائیں آنسوؤں کی لڑی میں بدل لگیں۔

”اے میرے رب! میرے گناہوں کو میرے لیے سزا نہ بنا۔ میری کوتاہیوں کو میرے پچھتاوے نہ بنا۔ مجھے ایک موقع دے دے کہ میں اسے بتا سکوں کہ میں نے کیا ہے۔ ایک موقع جو مجھے محبت کی عدالت میں معافی دلا دے۔ میری دعاؤں کو قبول کر دے۔ مجھے مجھے معاف کر دے میرے پروردگار! اسے مجھے لوٹا دے میرے رب۔ لوٹا دے۔“

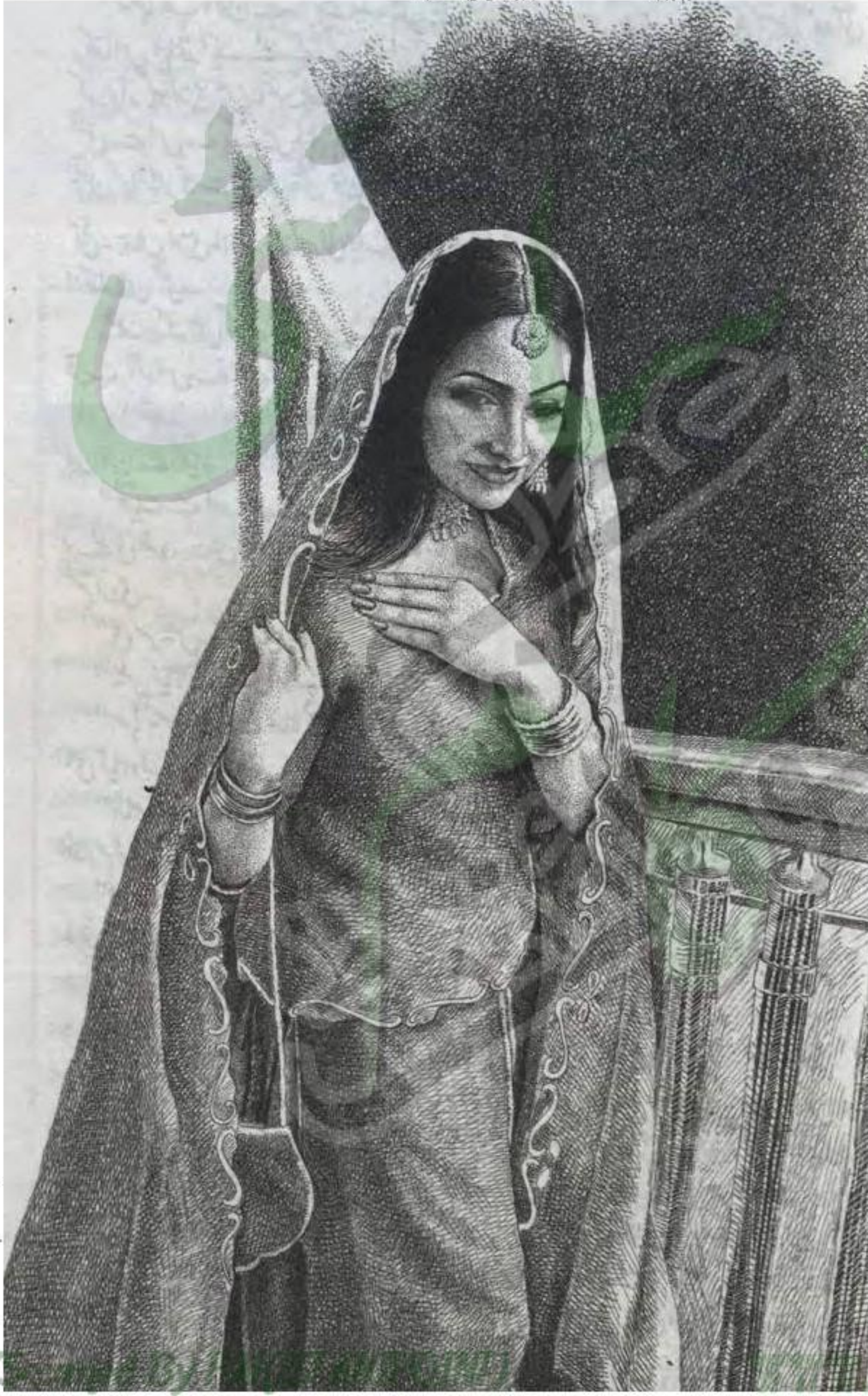
بچوں کی طرح زار و قطار روتا وہ دوبارہ سجدہ ریز

رات ہونے والی بارش نے موسم کی سردی کو دھچکا دیا تھا۔ پوری رات برسنے والی گھٹائیں فجر سے ذرا پہلے تھمیں۔ گھٹائیں گھٹائیں بھی ہلکی ہلکی پھوارنے کی گھول رکھی تھیں۔

”اللہ اکبر“ کی صدا نے اس کے جلد وجود میں حرکت پیدا کی۔ ساری رات ایک ہی جگہ پر منجمد بیٹھے جسم اکڑ چکا تھا۔ تھکن پور پور میں ساگنی تھی مگر رب کی پکار پر لبیک کہتا وہ اسپتال کے احاطے میں بنی مسجد کی طرف چل پڑا۔ اپنے تمام گناہوں، تمام خطاؤں کی معافی مانگنے کے لیے اسے اپنے رب کی ہی طرف جانا تھا اور کوئی جاسے پناہ تھی بھی نہیں۔

سجدے میں سرنگوں ہوتے ہی اس کا چہرہ اور زمین بھینکنے لگے تھے۔ جانے کہاں کہاں کے آنسو تھے

تلاش





”میم! آپ کا فون ہے۔“ ہنڈ بیگ میں سیل فون رکھتا اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس نے پلٹ کر دیوار گیر گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ ایک بج رہا تھا بہت تسلی سے اس نے بیگ میں اپنی باقی اشیاء کی موجودگی کا یقین کیا، پھر آہستہ آہستہ چلتی فون اسٹینڈ کے پاس آئی۔ جہاں گھڑی ملازمہ روز دہرائی جانے والی بات کے انتظار میں تھی۔

”کہہ دو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔“ فون کے بالکل قریب آکر اس نے غصے سے کہا اور فوراً پلٹ گئی۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ملازمہ نے خاموشی سے فون کان سے لگایا۔

”ٹھیک ہے اور سب خیریت ہے؟“ اسے کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ صاحب نے خود ہی بات ختم کر دی۔

”جی سر لیکن۔“ وہ انکی۔

”لیکن کیا؟“ وہ پریشان ہوا۔

”سر! میم دونوں سے کھانا نہیں کھا رہیں اور غصہ بھی آیا ہوا ہے بہت۔“

”شام تک اور دیکھ لو ورنہ جھمٹ کال کر کے انفارم کرونا۔ اوکے۔“

”اوکے سر!“ ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہ کچن کی طرف چل دی۔



نماز اور تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اندرونی حصے کی طرف جانے لگا تو سورج تمام دنیا کو اپنی روشنی میں غلا چکا تھا۔ قرب الہی نے اس کے دل کو پرسکون کر دیا تھا۔ ابھی وہ کوریڈور میں داخل ہی ہوا تھا کہ نرس نے اسے جالیا۔

”مبارک ہو سر! آپ کی پشٹنٹ کو ہوش آگیا ہے۔“

”واقعی؟“

”جی سر! بٹ شی از اسٹل ان آئی سی یو۔“ نرس نے جواب دیا۔

”اوہ تھینک یو سوچ سسر!“ وہ آئی سی یو کی طرف بھاگا۔

آئی سی یو کے شیشے کے اس پار اب وہ ساکت وجود اتنا بھی ساکت نہ تھا بلکہ زندگی مگر ان کے وجود میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ز مختلف طریقوں سے اس کا معائنہ کرنے میں مگن تھے۔ وہ دواؤں کے زیر اثر دوبارہ غنوغی میں جا چکی تھی مگر ایک حوصلہ افزا پیش رفت کے بعد ابھی بھی اسے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اسی وقت ڈاکٹر احمد باہر آئے۔ وہ اس کے بہت پرانے جاننے والے تھے۔

”مبارک ہو بیگ مین! شی از ہیٹر ناؤ۔“ ہنستے ہوئے انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تھینک یو انکل! اگر آپ نہ ہوتے تو۔“

”کم آن! میری جگہ کوئی بھی ڈاکٹر ہوتا وہ یہی کرتا۔“ وہ شفقت سے کہنے لگے۔

”اپنی دے! شام تک انہیں روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔ تم وہیں مل سکو گے۔ بہتر ہے ابھی کچھ دیر آرام کر لو“ وہ متفکر تھے۔ ”کل سے اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں تمہیں۔“

”اوکے انکل! بٹ تھینکس اکیں۔“ وہ مسکرا دیا۔

”ٹیک کیئر۔“ اس کا شانہ تھکتے وہ مصنوعی خفگی سے گھورے۔



چار کنال پر محیط یہ وسیع و عریض حویلی آج پھر ماتم کدہ تھی۔ صبح سے ہی لوگوں کا تاننا بندھا تھا۔ اکیس سال پہلے اس حویلی پر جو قیامت گزری تھی وہ داستان آج بھی گاؤں کے لوگوں کو اذیر تھی۔ رات کے اندھیرے میں پولیس سے بھاگتے ڈاکوؤں نے اس حویلی میں پناہ لی اور موقع اچھا جان کر نہ صرف حویلی

کے مال پر ہاتھ صاف کیا بلکہ تین جوان نعشیں بھی چھوڑ گئے۔

محب شاہ اس گاؤں سمیت پانچ گاؤں کے سردار تھے۔ ایک نہایت ایمان دار، نیک اور خدا ترس بادشاہ کی طرح وہ گاؤں کے باسیوں کی فلاح کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ان کی شریک حیات مومنہ شاہ بھی ان کی طرح تھیں۔ اپنے دونوں بیٹوں سکندر شاہ اور عالم شاہ کو بھی انہوں نے ہمیشہ یہی سکھایا لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ کوئی بھی ماں باپ جیسا نہ بن سکا۔ محب شاہ کے وفات پاتے ہی دونوں بھائیوں کے مابین جاسید او کاہنوار ہو گیا۔

سکندر شاہ بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے سردار بنے۔ ان کی بیگم، مومنہ بیگم کی سگی بھانجی تھیں۔ پیار کرنے والی اور ملنسار۔ سکندر شاہ جیسے ظالم اور اکھڑ انسان کے ساتھ گزارہ کرنا انہی کا صبر تھا مگر ازلان کی پیدائش کے بعد سکندر شاہ انہیں تھوڑی بہت اہمیت دینے پر مجبور ہو گئے۔

دوسری طرف عالم شاہ بھی غصے کے تیز انتہائی جذباتی آدمی تھے لیکن چونکہ مریم ان کی من چاہی بیوی تھیں، سو اچھی گزر رہی تھی۔ مگر ان کے ساتھ ایک دوسرا ہی معاملہ تھا ”شک“۔ انہیں دنیا کی ہر عورت مشکوک لگتی تھی۔ پھر بیوی تو کیا معنی! اور پھر بیوی بھی وہ جسے پہلے ان کے بڑے بھائی بیاہنا چاہتے تھے مگر رقیہ بیگم کوڑوں کی جاسید او کی تنہا وارث تھیں سو انہوں نے مریم کے لیے پسندیدگی کو دل میں چھپا کر رقیہ کو چن لیا مگر عالم شاہ کے لیے اپنی محبت پہلے تھی۔ عالم اور مریم کی بیٹی نور العین صرف تین ماہ کی تھی جب ایک رات وہ سانحہ ہوا۔

مومنہ بیگم اور رقیہ ازلان اور نور العین کو دم کرانے قریبی گاؤں گئی تھیں اور جب واپس آئیں تو سب ختم ہو چکا تھا۔ آج اس قیامت کو گزرے اکیس سال ہو چکے تھے۔ اس واقعے کے صرف دو سال بعد ہی رقیہ بیگم بھی انتقال کر گئیں تو ازلان اور نور العین کی ذمہ

داری تنہا مومنہ بیگم کو سنبھالنا پڑی۔ حویلی میں بڑے پیارے پر قرآن خوانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے دھیرے ان کے اہل خانہ گاؤں کے رہائشی سب ہی جمع تھے۔

”بی جان! آپ کو چھوٹے سائیں نے بلایا ہے وہاں۔“ اصغری بو اس گھر کی پرانی خادمہ تھیں اور بی جان کے نہایت قریب بھی۔

”دعا ہو گئی ہے کیا۔“ تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بی جان نے پوچھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بسا دل	آمنہ ریاض	500/-
درد و سوگ	راحت جبین	600/-
زندگی ایک روشنی	رخسانہ نگار رحمان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار رحمان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
حیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جوں	آسیہ مرزا	400/-
آئینوں کا شہر	قائزہ افکار	500/-
بہول بھلیاں تیری گلیاں	قائزہ افکار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	قائزہ افکار	250/-
یہ گلیاں یہ چہ پارے	قائزہ افکار	300/-
میں سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے دھوٹ لایا	آسید راتی	350/-
بکھرنا چائیں خواب	آسید راتی	200/-
دخم کو خد تھی سچائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 30 روپے منکوانے کا پتہ -
مکتبہ عمر ن ڈائجسٹ - 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر 32216361

”جی اسی لیے آپ کو بلایا ہے کہ آپ آئیں تو لنگر تقسیم ہو۔“ وہ مؤدب سی کہنے لگیں۔
”ٹھیک ہے تم ہمیں رہنا اور یہ نور کہاں ہے۔“
”آپ کو پتا ہے اس وقت وہ کہاں ہوتی ہیں۔“
اصغری بوا افسوس سے کہنے لگیں۔ بی جان آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے اٹھ گئیں۔

”مسز آفریدی! یہ میری فریڈ ہے عینا۔ اور عینا! یہ مسز آفریدی ہیں جن کے بارے میں میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔“
سعدیہ نے اس کا تعارف کرایا۔ وہ آج کل اپنا بوتھ کھولنے کے بارے میں سوچ رہی تھی مگر اس کے پاس سرمایہ تھا، تجربہ نہیں۔ مسز آفریدی اپنا بوتھ کھولتی تھیں اور اس کے ساتھ پارٹنر شپ کرنے کو تیار تھیں۔

”تو آپ عینا ہیں۔“ وہ کافی متاثر لگ رہی تھیں۔
”کیا ایک ٹوٹلہ ہیں آپ کی۔“
”کچھ خاص نہیں ہاؤس وانف سمجھ لیں۔“
”ارے نہیں! اچھی خاصی سوشل لڑکی ہے۔“
دراصل اس کے ہرینڈا بروڈ ہوتے ہیں اسی لیے یہ کوئی بزنس پلان کر رہی ہے۔ ”سعدیہ کو اس کا ہاؤس وانف کہنا ایک آنکھ نہ بھایا۔“

”پھر تو فرصت ہی فرصت ہوتی ہوگی۔“ مسز آفریدی نے مذاقاً کہا۔ اسی لمحے اس کے سیل فون کی ویپ ہوئی۔ گھر کا نمبر دیکھ کر اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایکسکیوز کرتی سائیڈ پر آگئی۔
”ہیلو۔“

”میم! آپ کب تک آجائیں گی؟ وہ سر آپ کو کال۔“
”اے سر سے کہو، میری فکر کرنا چھوڑ دیں اور اب بار بار کال کر کے مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ انڈر اسٹینڈ!“
”میم! وہ۔“ مگر اس نے کال کاٹ دی۔

انکار جیسی لذت اقرار میں کہاں ہے
برہتا ہے عشق غالب ان کی نہیں نہیں سے
وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اذلان شاہ سے محبت کب ہوئی تھی۔ بس ایک سفر مسلسل تھا جو اس کے بچپن سے شروع ہوا۔ لڑکپن میں پھلنے لگا اور جوانی کی دہلیز پر کھڑی وہ پور پور اس کی محبت میں بھیگ چکی تھی۔
اس بھری دنیا میں بی جان کے بعد اس کا واحد خونی رشتہ وہی تو تھا جسے دیکھ کر اسے اپنے ہونے کا یقین ملتا تھا۔ جسے سامنے نہ پا کر اس کی سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ محبت کا یہ سفر وہ تنہا طے کر رہی ہے۔ وہ اس کا شریک نہیں ہے بلکہ ایک محبت کے سفر میں ہی کیا زندگی کی کسی بھی راہ پر وہ اس کے ساتھ نہ تھا۔
اسے یاد نہ تھا کہ اذلان نے اسے کبھی خود سے مخاطب کیا ہو، بلکہ اگر وہ ایسا کر لیتی تو اس کا لہجہ اتنا سرد ہوتا کہ وہ آئندہ کئی ہیسینے اس سے کلام نہ کر پاتی۔
اول تو ملاقات ہی شاندار ہوتی۔ دونوں ہی چھوٹی عمر سے بورڈنگ اسکول رہے تھے۔ بی جان کو یہی آسان لگا تھا اور اگر آسان سامنا ہوتا بھی تو بات کرنا تو دور، وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔

وہ جس کی صورت کے بارے میں بی جان کہتی تھیں کہ نور کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے کسی پاکیزہ ہالے کو دیکھ رہے ہوں۔ اس کی بیسٹ فرینڈ کا کہنا تھا کہ اگر نور مقابلہ حسن میں چلی جائے تو کوئی اس کے مقابل نہیں ٹھہر سکے گا۔ ایسے حسن کی چکا چوند بھی اس پھر کو نہ پھلا سکی تھی۔

وہ جتنا اس سے دور بھاگتا محبت اتنا ہی اسے اذلان کے قریب دھکیلتی۔ وہ کم گو تھا۔ لیے جیسے ہنے والا تھا۔ اس کی دوستیاں بہت زیادہ نہ تھیں مگر پھر بھی نور نے اسے اکثر بٹتے دیکھا تھا، مگر جیسے ہی وہ سامنے آتی اس کے لب بھینچ جاتے۔ چہرے پر نرمی کی جگہ سختی آجاتی اور وہ اس کی موجودگی سے یکسر انجان بن جاتا۔ ایسے میں ماں کی کمی اسے اور شدت سے محسوس ہونے لگتی تھی۔

ماں کی تصویر گو میں رکھے وہ خاموشی سے بس اس

راہی انگلیاں پھیر رہی تھی اور اس کا دکھ قطرہ قطرہ تصور پر بکھیر رہا تھا۔
”نہیں کیا کروں مم! اس سے کہوں؟ بی جان۔“ کو بتانا نہیں پریشان کرنے کے برابر ہے۔ وہ میری خواہش پوری نہیں کر سکیں گی تو ان کا دکھ بڑھ جائے گا۔ وہ آج تک اپنی اولاد کا غم نہیں بھولیں۔“
سک سک کرتے ہوئے وہ ایک ٹوٹی بکھری صورت لگ رہی تھی۔

مومنہ بیگم سمجھ نہ سکیں کہ وہ کس بات پہ شکوہ کناں ہے۔ اندر جانے کا راہ ملتوی کر کے انہوں نے ملازمہ کو رٹائی وہیں چھوڑ کر جانے کا اشارہ کیا۔
اس کے آنسوؤں میں روانی آچکی تھی۔ مومنہ بیگم یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق تھیں۔
اپنا چہرہ مریم کی تصویر پر نکا کر وہ سک رہی تھی۔ بنا آہٹ کیے وہ اس کے برابر آکر رک گئیں۔ وہ چونکی۔
”لگتا ہے میں اپنی بیٹی کو اتنا پیار نہیں دے سکی جتنا عالم اور مریم دیتے۔“

ایک سیکنڈ لگا تھا اسے سنبھلنے میں۔ جلدی جلدی آنسو پونچھے۔
”نہیں بی جان! آپ نے تو ان سے زیادہ پیار دیا ہے۔“

”پھر یہ آنسو؟“
”کچھ نہیں بی جان! بس ویسے ہی۔ میں آ رہی تھی۔ چلیں! میں یہیں کھانا لے آئی ہوں۔“ وہ گڑبڑائی۔
پتا نہیں بی جان کب سے اس کی باتیں سن رہی ہوں گی۔ مومنہ بیگم نے جیکے سے آنکھیں صاف کیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔

ایب کی بار جب وہ کمرے میں آیا تو وہ مکمل ہوش میں تھی اور مسلسل چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔
”کیسی ہو۔“ وہ خاموش رہی۔
”کیسا ٹیل کر رہی ہو اب۔“ لفظ اپنا مفہوم کھو چکے

تھے۔
”پلیز مجھ سے بات کرو۔“ اس نے التجا کی مگر بے سود۔
”دیکھو میں تم سے ایکسکیوز۔“ اس نے کروٹ بدلی۔
”میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو لیکن۔“
نرس آچکی تھی۔ تین روز کا معمول آج پھر اختتام پذیر ہوا تھا۔

”سمیہ! آج شام میری کچھ فرینڈز ڈنر کے لیے آ رہی ہیں۔ کوئی اچھا سا مینور کھانا اور ٹھیک آٹھ بجے تک سب ریڈی ہو۔ اوکے۔“
”اوکے میم!“ وہ مؤدبانہ بولی۔ ”میم! وہ سر کی کال آئی تھی دوپہر میں۔“
”یہ ڈیلی کا سبق ہے کیا جو سنایا جائے۔“ وہ تلخ ہوئی۔

”میم! سر کا آرڈر ہے کہ روزانہ آپ کو انفارم کیا جائے۔“ وہ ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔
”آرڈر مائی فٹ!“ وہ غصے میں آگئی۔
”آئندہ مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں دینا۔ یہ میرا آرڈر۔“

وہ پھر سے کمرے میں بند ہو گئی۔ موڈ درست کرنے کے لیے اس نے جھٹ کال ملائی۔ اس کے بعد شام تک کا وقت کیسے گزرا پتا ہی نہ چلا۔ تقریباً چھ بجے مسز آفریدی سعدیہ اور سنبل اس کے گھر پہنچیں۔
”آپ کا گھر تو بہت خوبصورت ہے بلکہ کافی آرٹسٹک ہے۔“

”تھینکس۔“ وہ مسکرائی۔
”آپ کی پسند ہے یا آپ کے ہرینڈ کی؟“ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔
”نہیں ان ہی کی پسند ہے۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔
”وڈر فل!“ انہوں نے دل سے تعریف کی۔
”سعدیہ! وہ کنٹریکٹ کی فائل عینا کو دکھا دو۔“

”شیور عینا! تم دیکھ لو اور پھر سائن کرو۔“
 ”اوکے“ وہ فائل دیکھ رہی تھی جب لینڈ لائن
 فون کی بیل ہوئی۔ وہ قریب ہی تھی۔ ناچار اٹھانا پڑا۔
 حالانکہ وہ جانتی تھی کہ کس کا فون ہے۔ یہ نمبر کسی نے
 صرف اپنے لیے ہی لکوا یا تھا۔

”ہیلو۔“
 ”یہ تم ہی ہونا۔“ وہ حیران ہوا۔
 ”جی فرمائیے۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔
 ”شکر ہے تم نے مجھ سے بات تو کی۔ میں سوچ بھی
 نہیں سکتا تھا کہ ان جیسے۔“
 ”سوری! رائگ نمبر۔“ اس نے کھٹ سے فون بند
 کر دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا مگر وہ فون ان کیج کر چکی
 تھی۔
 سعدیہ حق دق اسے دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
 وہ ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی حویلی پہنچا تھا۔ اتنی بڑی
 جاگیر تھی اس کے علاوہ شہر کی فیکٹریاں۔ سب کچھ
 اسے ہی دیکھنا پڑتا تھا اس لیے اس نے دوران تعلیم ہی
 سب چیزوں کی دیکھ ریکھ شروع کر دی تھی۔ بہت کم
 عمری میں ہی اس نے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا شروع
 کر دیا تھا۔ وہ سیدھا بی جان کے کمرے میں گیا۔ یہ اس
 کا معمول تھا۔ وہ کہیں سے بھی آتا سب سے پہلے بی
 جان کے پاس جاتا تھا۔
 ”السلام علیکم۔“ وہ بیڈ پر نیم دراز تنبیج کرنے میں
 مصروف تھیں۔

”وعلیکم السلام۔“ مسکراتے ہوئے اس کے سلام
 کا جواب دیا اور ٹانگیں سمیٹ کر اس کے لیے اپنے
 ساتھ ہی جگہ بنائی۔
 ”طبیعت کیسی ہے آپ کی۔“ اس نے ان کی
 ٹانگیں سیدھی کر کے دبانا شروع کر دیں۔
 ”محمد اللہ ہے! جن کی تم جیسی اولاد ہو وہ کبھی بیمار
 نہیں ہوتے۔“ انہوں نے فخر سے اپنے خیر و اور فرماں
 بردار پوتے کو دیکھا۔

”جھاجی کھن! لگتا ہے آج کی میڈیسن گول کی
 ہے۔ ابھی مجھے اصغری بوائے بتا دیتا ہے۔“ وہ بھی
 مسکرایا۔
 ”نہیں نہیں اب تو جینے کی امنگ بڑھنے لگی ہے تو
 میڈیسن تو ضرور دیتی ہوں۔“

”اب“ سے کیا مراد ہے آپ کی۔“ وہ خفا ہوا۔
 ”ایک جوان پوتے اور ایک جوان پوتی کی ذمہ داری
 ہے۔ ان کی شادیاں کرنی ہیں۔ بچے کھلانے ہیں تو جینا تو
 پڑے گا۔“
 وہ شرر ہوئیں۔ پاؤں دبانا ازلان کا ہاتھ ایک لمحے
 کے لیے رکا تھا مگر سنبھل گیا۔
 ”ہاں تو ایسا کریں پوتی کے لیے دیکھیں میری فکر
 ابھی چھوڑ دیں۔ مجھے ابھی آپ کی خدمت کرنی
 ہے۔“

”کیا مطلب ہے شادی کے بعد خدمت نہیں
 کرو گے کیا؟“ انہوں نے مصنوعی ناراضی دکھائی۔
 ”اگر آگئی کوئی ایسی جو مجھے ”جورو کا غلام“ بنا دے
 تو۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔
 ”یہ لگتے تو نہیں ہو۔“ وہ پر یقین تھیں۔ ”تو پھر
 یوں کرتے ہیں کوئی ایسی ڈھونڈتے ہیں جو تم سے بھی
 زیادہ میری خدمت کرے۔“
 وہ اصل موضوع کی طرف آنے لگیں۔
 ”یہ تو پھر میری شادی نہ کرنے والی بات ہوئی نا۔“
 ”کیوں کوئی تو ہوگی ایسی دنیا میں۔“ وہ ڈٹ گئیں۔
 ”نا ممکن ہے۔“
 ”مگر میں ممکن کر دکھاؤں تو؟“ انہوں نے چیلنج
 کیا۔

”تو میں انکار نہیں کروں گا۔“ اس نے قبول کر لیا۔
 ”وعدہ؟“
 ”ہاں۔“
 ”تو پھر اب میں ایسی لڑکی ڈھونڈ کر ہی دم لوں گی۔“
 ”سوچ ہے آپ کی۔“ وہ چڑانے لگا مگر وہ مسکرا
 دیں۔

☆ ☆ ☆

رات سے بی جان کی طبیعت خراب تھی اور وہ ایک
 ٹانگ پر کھڑی تھی۔ ازلان دو دن سے شہر گیا ہوا تھا۔
 وہاں فیکٹری میں کچھ مسئلہ تھا۔ سولی جان نے اسے سختی
 سے ازلان کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔ پوری رات وہ
 ان کے سر ہانے سے لگی رہی۔ جیسے ہی ان کی طبیعت
 کچھ بہتر ہوئی اس نے فوراً ازلان کو فون کیا۔ وہ منع ہی
 کرتی رہ گئیں۔

”ہیلو۔“ اس کی مصروف سی آواز سنائی دی۔
 ”ہیلو میں۔“ میں نور بات کر رہی ہوں۔“ وہ زندگی
 میں پہلی بار اسے فون کر رہی تھی۔
 ”ہاں۔“ بولو کو کیا مسئلہ ہے۔“ وہ بھی شاید اس کی
 توقع نہیں کر رہا تھا۔
 ”وہ بی جان۔“

”کیا ہوا بی جان کو۔“ وہ پریشان ہوا۔
 ”نہیں اب وہ ٹھیک ہیں مگر رات میں ان کا بلڈ پریشر
 بہت ہائی ہو گیا تھا۔“
 ”یہ تم مجھے اب بتا رہی ہو۔“ پہنچ رہا ہوں ابھی۔“
 کھٹاک سے فون بند ہو گیا تھا۔ ننھا ساموئی اس کی
 پلکوں پر ٹھہر گیا۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ دوبارہ ان
 کے پاس آگئی۔

”آ رہے ہیں۔ میں ذرا آپ کے لیے کچھ بنا
 لوں۔“ نظریں چراتی وہ کچن کی طرف چل دی۔
 ”کیا مجھے آپ سے ہمیشہ ذلت ہی ملے گی۔“ محبت نہ
 سہی کم از کم عزت ہی دے دیا کریں۔“ وہ خود سے ہی
 ہمکلام تھی۔

جب وہ حویلی پہنچا تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ وہ سیدھا بی
 جان کے کمرے میں گیا۔ وہ سو رہی تھیں۔ وہ ان کے
 ساتھ بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔ ابھی وہ ان کے ساتھ دراز
 ہونے کا سوچ ہی رہا تھا جب اس کی نظریڈ کے ساتھ
 نماز پڑھتی نور پر پڑی۔ ایک بار پھر اسے نور پر غصہ
 آیا۔

”السلام علیکم۔“ نماز پڑھ کر وہ مخاطب ہوئی۔
 سر کی جنبش سے جواب دیا گیا۔
 ”آپ کے لیے کھانا لگواؤں؟“

”نہیں اور اب جاؤ میں ہوں ان کے پاس۔“ اس
 کی موجودگی ازلان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔
 ”لیکن کھانا۔“ وہ فکر مند ہوئی۔ جانے کیوں اس
 شخص کے ہاتھوں اتنی مرتبہ ذلیل ہونے کے باوجود بھی
 وہ ٹھکتی نہ تھی۔
 ”ایک بار کا کھانا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟“

☆ ☆ ☆

فون کی ٹھنٹی مستقل بج رہی تھی مگر وہ ان سنی کرتی
 ٹی وی میں مگن رہی۔ سمجھا اپنے کمرے میں جا چکی
 تھی اور وہ جانتی تھی کہ کچھ دنوں سے وہ اسے اس
 وقت اسی لیے فون کر رہا تھا کہ وہ ریسیور کرے گی۔
 وہ اس شخص کی سزا کا دورانیہ گھٹانے کے حق میں
 نہیں تھی جو وہ سوچ چکی تھی اور جو اسے سمجھایا گیا
 تھا۔ اسے اس ہی پر عمل پیرا رہنا تھا مگر آج جانے کیوں
 فون کی ہر ٹھنٹی اس کے دل میں پیوست ہو رہی تھی۔ وہ
 دماغ کی انگلی تھامے اپنے عہد پر کار بند رہنے کی کوشش
 کرنے لگی مگر دل جیت گیا۔ فون ریسیور ہو چکا تھا لیکن
 اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہوا۔
 ”ہیلو۔“ وہ بے قرار ہوا۔

”ہیلو۔“ پلیز مجھ سے بات کرو۔“ اس نے التجا کی۔
 ”میں جانتا ہوں یہ تم ہی ہو۔ تم بھی میری طرح
 اذیت میں ہو۔“ پلیز ایک بار بس ایک بار
 لوٹ آؤ۔“ کریڈل پر رکھی اس کی انگلی اس کے لفظوں کا
 گلا گھونٹ گئی۔ ایک ننھا سا قطرہ اس کے گال پر پھیلا
 اور خود بخود جذب ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

ازلان جب ان کے کمرے میں آیا تو وہ نماز سے
 فارغ ہو کر اپنے بیڈ پر لیٹ رہی تھیں۔ انہوں نے
 ابھی اسے مردانے سے بلوایا تھا اور وہ فوراً حاضر
 ہو گیا۔ ان کا بلاوا ہمیشہ اس کے لیے پہلی ترجیح رہا تھا۔
 ”ارے میں نے اصغری سے کہلوا یا تھا کہ فارغ ہو
 کر آجانا۔“ وہ نہال ہوئیں۔
 ”آپ بلائیں اور میں فارغ ہونے کا انتظار

کروں۔ امپائل!

”امپائل تو تم نے اور بھی ایک کام کو کہا تھا مگر میں نے وہ کروا دیا۔“ وہ پراسرار ہو میں۔

”کیا کام؟“ اسے یاد نہ آیا۔

”یہی کہ میں اپنے لیے ایسی ہوڈھونڈوں جو تم سے زیادہ میرا خیال رکھے، میری خدمت کرے۔“

”تو کیا ڈھونڈی آپ نے؟“ وہ سراپا حیرت تھا۔

”ہاں بالکل اور وہ تم سے صرف ”زیادہ“ نہیں بلکہ ”بہت زیادہ“ خیال رکھے گی میرا۔“ وہ پر جوش تھیں۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ۔۔۔“

”میری چھوڑو بس اب اپنا وعدہ پورا کرو۔ اسی لیے تمہیں بلوایا ہے۔“

”وعدہ؟“

”یہی کہ تم انکار نہیں کرو گے۔“

”میری جان! پتا تو چلے ہے کون۔“ وہ ابھی تک حیران تھا۔

”ہاں ہے نا تمہاری طرف سے؟“ وہ سوال ٹال گئیں۔

”بی جان! آپ نے نور کے لیے کوئی لڑکا دکھا ہے؟“ اس کی چھٹی حس الارم دینگے گی۔

”ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ وہ بھی غالباً اس چھین چھپائی سے محفوظ ہو رہی تھیں۔

”مطلب؟“

”مطلب صاف ہے میں نے تمہارے لیے نور کو اور نور کے لیے تمہیں پسند کیا ہے۔“

اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اسے لگا پوری حویلی اس کے اوپر آگری ہو۔

”کیوں بچے! کیسی لگی میری پسند۔“ اب وہ فاتحانہ اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

”بی جان! کیا یہ آپ کی محض سوچ ہے یا خواہش؟“ وہ فوراً انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا مگر سوچ کو بدل جاسکتا تھا اور خواہش کے معاملے میں اسے خود کو بدلنا پڑتا۔

”یہ کیسا سوال ہے اذلان!“

”میرا مطلب ہے اس کے علاوہ کوئی اور حل۔“

”سنبھلا۔“

”کیوں تمہیں نور پسند نہیں ہے؟“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے مگر میرے اور اس کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے جو۔۔۔“

”انڈر اسٹینڈنگ کرنے سے ہوتی ہے مگر پھر بھی اگر تمہیں اعتراض ہے تو میں اپنی خواہش دبا سکتی ہوں ہزار چند کہ اسے بھلا نہیں سکتی۔“ انہوں نے اس جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

”تم نے ہمیشہ ہر حال میں میرے کئے کا مان رکھا ہے اذلان! یہ ایک آخری خواہش بھی پوری کر دو۔ نور کے معاملے میں تم سے زیادہ میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ میری نور بہت معصوم ہے، بہت سادہ دنیا کی سختیوں سے ناواقف۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں کوئی اور لوگ۔۔۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بی جان!“ اسے خود کی آواز کہیں پاتال سے آتی محسوس ہوئی۔ ”ہاں افسوس رہے گا کہ مجھ سے بات منوانے کے لیے آپ کو اتنی وضاحت دینا پڑی۔“

”نہیں اذلان! یہ تو تمہارا حق ہے بچے!“ انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔

”بلکہ مجھے ہی تم پر اپنی خواہش مسلط نہیں کرنا چاہیے۔“ اس کی اتنی فریاد برداری انہیں سوچنے پر مجبور کر گئی۔

”آپ کی کسی بھی خواہش کو پورا کرنا میرا فرض ہی نہیں بلکہ میری سب سے بڑی خوشی ہے بی جان!“

انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

☆ ☆ ☆

محبت کے ہزاروں رنگ لاکھوں روپ اور کروڑوں ٹام ہیں مگر یہ محبت کا کون سا روپ تھا۔ حیرت سی حیرت تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی دعائیں اتنی جلدی مقبول ہو جائیں گی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے بی جان نے اسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری

دی تھی۔

”تو کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور اسی محبت کو چھپانے کے لیے اتنا روڈ لی ہو کر کرتے تھے۔ جب ہی بی جان کو فوراً ہاں کر دی۔“

”مسکراہٹ اس کے چہرے سے جدا ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔“

”تعلق، محبت، جذبے سب ہی اتنی شدت سے اظہار مانگتے ہیں، جتنی شدت سے وہ کسی دوسرے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انہیں ان کی طلب کے مطابق اظہار نہ دیا جائے تو سب ختم ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے اس ان کے تعلق کا اظہار چاہتی تھی صاف اور واضح!“

☆ ☆ ☆

آج مایوں کی رسم ہو گئی تھی۔ اس نے بی جان سے ایسی کسی بھی رسم میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ انہوں نے بھی زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

جب تک باہر نور کے مایوں کی رسم ہوتی رہی، وہ باہر نہ نکلا۔ تقریب کے اختتام کا اندازہ کرتے ہوئے وہ باہر نکلا۔ تب ہی اس کی نظریں جیسے ٹھہر گئیں زرد رنگ کے پاؤں تک آتے فراک اور سر پر وہ پٹا سیٹ کیے وہ اپنی دوستوں کے گھیرے میں بیٹھی تھی اور مسلسل مسکرا رہی تھی۔

ایک عجیب سے احساس نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ پلٹنا چاہتا تھا مگر پلٹ نہیں پارہا تھا۔ نگاہیں ہٹانا چاہتا تھا مگر مٹا نہیں پارہا تھا۔ اچانک نور نے غیر ارادی طور پر اوپر دیکھا۔ وہ جو کافی دیر سے جانا چاہ رہا تھا اب لوٹنے میں ایک لمحہ لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆

جمعہ المبارک خوشیوں کی بارات لے کر اتر رہا تھا۔ ہر طرف ہانچل تھی۔ پھولوں سے سجی حویلی ہنستے مسکراتے چہرے، ایک افزائے تفری کا عالم تھا۔ دور پرے کے سب رشتے دار دو دن پہلے ہی آگئے تھے۔ نور کی دوستوں نے الگ الگ اودھم مچا رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

جمعہ کی ادائی کے بعد نکاح ہوا۔ پوری حویلی مبارک سلامت کے شور سے گونج اٹھی۔ ہر چہرے پر خوشی رقصاں تھیں۔ نکاح کے بعد اس کی دوستوں کی جان کی ہدایت کے مطابق کھانے کے بعد اسے اسٹیج پر لے آئیں۔

گہرے سرخ رنگ کے بھاری کام والے مدراسی لہنگے میں وہ اپسرا لگ رہی تھی۔ اذلان کے برابر بیٹھی وہ نروس تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔

بی جان تو ان کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ دونوں کی کتنی ہی بار نظر اتار چکی تھیں۔ دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ان پر پھونک رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں رخصتی کا شور اٹھا مگر یہاں رخصتی کا روایتی سین دیکھنے کو نہ ملا کیونکہ رخصت ہو کے بھی اسے اپنی پیاری بی جان کے ساتھ ہی رہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

پچھلے ایک گھنٹے سے وہ ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔ کمرے میں اتنا مہیب سا تھا کہ گھڑی کی ٹک ٹک بخوبی سنائی دے رہی تھی مگر اسے یہ سنا محسوس نہ ہو رہا تھا بلکہ اس کے ارد گرد تو بلا کا شور تھا۔ نفرت کا غصے کا اور اس کے لفظوں کا جو ابھی تک اس کے ارد گرد منڈلا رہے تھے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

آج اس کا مان ٹوٹا تھا۔ اعتماد ریزہ ریزہ ہوا تھا۔

”تم ایک انتہائی خود غرض لڑکی ہو۔ کوئی جیسے یا زندہ درگور ہو جائے، تمہیں صرف اپنی خوشی سے مطلب ہے۔“

وہ الفاظ نہیں چنگاریاں تھیں جو اسے راکھ کر رہی تھیں۔

”لیکن یاد رکھنا! یہ تمہاری آخری فتح اور میری آخری شکست ہے۔ اب زندگی کے ہر مقام پر تمہیں ہارنا ہے۔“

اس کا رویہ اسے لہولہا کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ اسے اپنی ہی نظروں میں گرا رہے ہیں اس سے بے

☆ ☆ ☆

جمعہ المبارک خوشیوں کی بارات لے کر اتر رہا تھا۔ ہر طرف ہانچل تھی۔ پھولوں سے سجی حویلی ہنستے مسکراتے چہرے، ایک افزائے تفری کا عالم تھا۔ دور پرے کے سب رشتے دار دو دن پہلے ہی آگئے تھے۔ نور کی دوستوں نے الگ الگ اودھم مچا رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

جمعہ کی ادائی کے بعد نکاح ہوا۔ پوری حویلی مبارک سلامت کے شور سے گونج اٹھی۔ ہر چہرے پر خوشی رقصاں تھیں۔ نکاح کے بعد اس کی دوستوں کی جان کی ہدایت کے مطابق کھانے کے بعد اسے اسٹیج پر لے آئیں۔

گہرے سرخ رنگ کے بھاری کام والے مدراسی لہنگے میں وہ اپسرا لگ رہی تھی۔ اذلان کے برابر بیٹھی وہ نروس تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔

بی جان تو ان کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ دونوں کی کتنی ہی بار نظر اتار چکی تھیں۔ دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ان پر پھونک رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں رخصتی کا شور اٹھا مگر یہاں رخصتی کا روایتی سین دیکھنے کو نہ ملا کیونکہ رخصت ہو کے بھی اسے اپنی پیاری بی جان کے ساتھ ہی رہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

پچھلے ایک گھنٹے سے وہ ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔ کمرے میں اتنا مہیب سا تھا کہ گھڑی کی ٹک ٹک بخوبی سنائی دے رہی تھی مگر اسے یہ سنا محسوس نہ ہو رہا تھا بلکہ اس کے ارد گرد تو بلا کا شور تھا۔ نفرت کا غصے کا اور اس کے لفظوں کا جو ابھی تک اس کے ارد گرد منڈلا رہے تھے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

آج اس کا مان ٹوٹا تھا۔ اعتماد ریزہ ریزہ ہوا تھا۔

”تم ایک انتہائی خود غرض لڑکی ہو۔ کوئی جیسے یا زندہ درگور ہو جائے، تمہیں صرف اپنی خوشی سے مطلب ہے۔“

وہ الفاظ نہیں چنگاریاں تھیں جو اسے راکھ کر رہی تھیں۔

”لیکن یاد رکھنا! یہ تمہاری آخری فتح اور میری آخری شکست ہے۔ اب زندگی کے ہر مقام پر تمہیں ہارنا ہے۔“

اس کا رویہ اسے لہولہا کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ اسے اپنی ہی نظروں میں گرا رہے ہیں اس سے بے

نیاز وہ اپنی ہی کے جا رہا تھا وہ اس سے کم از کم ایسے رویے کی امید نہیں کر رہی تھی۔
 "نفرت کرتا ہوں میں تم سے۔ سمجھیں تم نفرت!" وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ توبت بن چکی تھی۔ بس چلتی سانسیں اس کے زندہ ہونے کی دلیل تھیں۔ وہ یوں بیٹھی تھی۔ گویا اگر حرکت کی تو وجود بھر بھری ریت میں بدل جائے گا۔ وہ اس کی طرف پلٹا اور نہایت بے دردی سے اس کا بازو دبوچا۔
 "اور تمہیں اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ اس کی وجہ بتاؤں۔" وہ غصے سے پھنکار رہا تھا۔
 ایک جھٹکے سے اذلان نے اس کا بازو چھوڑا۔
 "تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ چپ چاپ اپنی خوشی کا ڈھونگ رچانی رہنا ورنہ تمہیں چھوڑنے میں مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔" اسے وارننگ دیتا وہ وہاں رکا نہ تھا۔

محبت تو انسان کو اندر تک سیراب کر دیتی ہے مگر ابھی تو بارش کی پہلی بوند بھی اس تک نہ پہنچی تھی۔ ابھی تو وہ اس جذبے کو مکمل پا بھی نہ سکی تھی کہ پہلے ہی قدم پر غم کا صحرا اس کے سفر میں حائل ہو گیا۔ وہ ہنستی کھیلتی نور العین بالکل خاموش تھی۔ یہ خاموشی نہ تو محبت کی ناکامی پر تھی نہ ہی اپنی بے بسی پر۔ اسے تو بس اذلان شاہ کی نفرت کا غم تھا۔ دل جیسے درد کا ایک ٹکڑا بن گیا تھا۔ ایک اندھا کنواں یا جیسے ایک بند گلی! گلشن کی بہاروں میں رنگین نظاروں میں جب تم مجھے ڈھونڈو گے آنکھوں میں نمی ہوگی محسوس تمہیں ہر دم پھر میری کمی ہوگی ساون کی ہواؤں کا جب شور سنو گے تم بکھرے ہوئے ماضی کے

اور اراق چنو گے تم ماحول کے چرے پر جب دھول جمی ہوگی محسوس تمہیں ہر دم پھر میری کمی ہوگی

وہ رومانیک شاعری کی شوقین نازک سی لڑکی کچھ ہی دنوں میں اپنی پسند بدل گئی۔ جب زندگی میں ہر سو کانٹے بکھرے ہوں تو نرم و نازک پھولوں سے سجے لفظ بھی دل کو بے چینی کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ یہ نظم اس کے دل کا حال عیاں کر رہی تھی۔ کتنا خوبصورت شکوہ کر رہی تھی اور وہ جو اپنی فائل ڈھونڈنے کمرے میں آیا تھا۔ رانٹنگ پیڈر لکھی نظم پڑھ کر کچھ کھوسا گیا مگر فائل کی عدم دستیابی اسے پھر سے پتا گئی۔
 "نور۔ نور!"

اس نے وہیں سے پکارا۔ وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔ اس کی ہر پکار پر وہ ایسے ہی بھاگی آتی تھی۔
 "میری بلیو فائل رکھی تھی یہاں۔" اس کے غصے میں کمی نہ آئی۔

"وہ وہاں دراز میں ہے۔ میں دیتی ہوں۔" وہ جلدی سے بال ٹیمپتی دراز کی طرف بوڑھی مگر لمبے بال پوری کر رہی بکھرے گئے۔
 "وہاں کیسے پہنچی۔ تمہیں ہزار بار کہا ہے، میری چیزیں مت چھیڑا کرو۔" جانے کیوں اس کا غصہ سوا سو گیا۔

"میں نے سوچا اوھر اوھر نہ ہو جائے تو۔" وہ بوکھلائی بوکھلائی اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ وہ نظریں چرا گیا۔

"یہ لیں۔" اس نے فائل بڑھائی۔
 "رکھ دو اور جاؤ یہاں سے۔" رخ موڑے موڑے نئی ہدایت ملی۔ اس نے فائل ٹیبل پر رکھی اور اپنے قدموں پلٹ گئی مگر اسے فائل کیوں چاہیے تھی نہ بھول چکا تھا۔

آج اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جاتا تھا۔

ڈراپور اس کا سارا سامان گاڑی میں رکھ چکا تھا۔
 "چلیں۔"

"کہاں؟" یہ پہلا لفظ تھا جو اسپتال کے آٹھ روزہ قیام کے دوران اس نے اس سے براہ راست کہا تھا۔
 "واپس۔"

"ہاں مگر میں اکیلے واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"لیکن۔۔۔"

"اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھ سے دور چلے جائیں۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھی۔
 "تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔۔۔ محبت کے لیے بھی نہیں۔"

"محبت کو بیچ میں مت لائیں۔ یہ نہ ہو کہ یہی محبت آپ کو مجبور کر دے۔"

"میں محبت کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" وہ دل گرفتہ تھا۔

"میں آپ سے دور جانا چاہتی ہوں۔"

"جو غلطیاں میں نے کی ہیں، تم وہی دہرانا چاہتی ہو۔" کتنا ٹوٹا بکھرا لہجہ تھا مگر وہ پھرتی رہی۔
 "ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں تم سے دور۔ خود سے مجھ تک کا یہ فاصلہ اب تم ہی سمیٹ سکتی ہو۔ جلد یا بدیر یہ فیصلہ تم ہی کو دینا کیونکہ اب میں مزید تمہیں تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔
 وہ بنا کچھ کے چپ چاپ باہر چل دی۔

"جب سب کچھ میرے حسب منشا ہو رہا ہے تو یہ ابھن کیسی یہ اضطراب کیسا۔ کہاں کیا غلط ہے۔ اس کی مجھ سے محبت۔ میری اس سے لا تعلقی یا پھر ہمارا فیصلہ۔"

دے۔ مجھے سکون دے دے۔"

اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز گڑ گڑا کر وہ اپنے لیے سکون و اطمینان مانگ رہی تھی۔ اس کی سسکیوں کو فون کی اچانک گونجنے والی گھنٹی نے توڑا تھا۔
 اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو رات کے گیارہ بج رہی تھی۔ ریسیور ہاتھ میں لے کر وہ خاموش گھڑی تھیں۔

"فون بند مت کرنا پلیز۔" وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔

"میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔ بی جان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ فون کو کریڈل پر پھینکتی وہ کمرے میں آئی۔ ضروری چیزیں بیگ میں ٹھونکتے ہوئے وہ مستقل رو رہی تھی۔

"کیا بات ہے نور! اداس کیوں ہو۔ کوئی مسئلہ ہے کیا۔" وہ اس کی ماں تھیں۔ اس کی رگ رگ سے واقف۔ وہ جتنا مرضی دکھاوا کر لیتی، مگر ماں کا دل مطمئن کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

"نہیں! میں تو بہت خوش ہوں، بہت زیادہ دیکھیں! کتنا ہنس رہی ہوں۔" زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے آج اس کا دل دغا دے گیا۔ بی جان نے تڑپ کر اسے گلے لگایا۔

"بی جان! میں۔۔۔" وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔
 "نور سچ بتاؤ۔ مجھ سے مت چھپاؤ۔"

"بی جان۔! وہ اذلان۔"

"کیا کیا ہے۔ اس نے تمہیں ڈانٹا ہے۔" انہوں نے اس کا چہرہ اونچا کیا۔
 "وہ مجھ سے۔۔۔" ایک لمحے میں وہ خود کو قابو کرنے میں کامیاب ہوئی تھی جو اس کے آنسوؤں سے تڑپ اٹھیں۔ حقیقت تو انہیں جیتے جی مار ڈالے گی۔
 "وہ مجھ سے ناراض ہیں۔" کتنا مشکل تھا جھوٹ بولنا، مگر سچ بولنے سے بہتر۔

”باگل لڑکی!“ انہوں نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔
”ناراض ہے تو منالو۔“ ان کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔
”کیسے۔“

”جیسے ناراض کیا تھا۔“
”مگر میں نے تو ناراض کیا ہی نہیں۔“ وہ بس سوچ سکی۔

”اس سے ناراض مت ہوا کرو اذلان! ایک منٹ میں حال سے بے حال ہو جاتی ہے۔ شام کو بھی اتنی مشکل سے چپ کرایا۔ رو رو کر حالت خراب کر لی کہ تم ناراض ہو آؤ اگر منائے تو مان جانا۔“

جب سے لی جان نے اسے بتایا تھا وہ عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ ابھی بھی وہ کسی نشن کے کاغذات دیکھنے بیٹھا تھا مگر لی جان کے کسے لفظ اسے شام سے بے چین کے ہوئے تھے۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر بیڈ کے ایک کونے میں کٹھن ہوئی نور کو دیکھا جو بہت پرسکون سو رہی تھی۔

”اب اگر منائے تو مان جانا۔“ مگر اس نے تو نور کو ایسا کوئی حق دیا ہی نہ تھا روٹھنے منانے کا پھر وہ کیوں اسے مانتی۔ مگر کیسی خواہش اس کے دل میں پنپ رہی تھی کہ وہ اذلان کو منائے اس سے پوچھے کہ وہ اس سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے اور وہ اپنے دل کا غبار نکال کر پرسکون ہو جائے اور نور کی ہی طرح پرسکون نیند سو سکے۔

یہ کیسا احساس اس کے اندر جاگنے لگا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کو سوچتا تھا۔ اس کا معصوم سا چہرہ سوتے ہوئے اور بھی مقدس لگ رہا تھا جیسے چودھویں کا چاند جیسے نیا اودھ کھلا گلاب جس کی خوشبو پورے ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ کب وہ دبے قدموں چلتا عین اس کے ساتھ آکھڑا ہوا اسے خود بھی خبر نہ ہو سکی۔

”کیا یہ لڑکی اس قاتل ہے کہ اس سے نفرت کی جائے؟ اسے کانٹوں پر گھسیٹا جائے؟ کسی اور کے لیے کی سزا اسے دی جائے؟ میرے روئے سے اسے تکلیف ہوتی ہوگی، میرا لہجہ اسے چھلنی گرتا ہوگا، مگر میں۔“

وہ خود سے ہی ہم کلام تھا۔ اس نے کروٹ بدلی، جیسے سب ختم ہو گیا۔ وہ چونکا اور پلٹ کر اپنی جگہ آکر لیٹ گیا، مگر نیند داغ کی ایک ہی تکرار سے گھبرا کر پلٹ گئی تھی۔

”اب اگر منائے تو مان جانا۔“
”اب اگر منائے تو مان جانا۔“

صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ نماز کے بعد ہی باہر نکل جاتی تھی۔ فجر کی اذان کے بعد ہی تو اذلان کی آنکھ لگی تھی۔ اب سر بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ پوری رات جاگنے کا کمال تھا۔ گھڑی کی سوئیاں دس بج رہی تھیں۔ اسے کوفت ہوئی وہ بھی اتنی دیر تک نہ سوتا تھا۔ بے زاری سے اٹھ کر فریش ہونے چلا گیا نیچے آیا تو پونے گیارہ ہو چکے تھے۔ ”سوری لی جان! وہ دراصل رات نیند دیر سے آئی تو۔“ لی جان کو دیر سے جاگنا نحوست لگتا تھا۔ وہ صفائی دینے لگا۔

”ناشتا لگواؤ نور! اذلان کے لیے۔“ انہوں نے نور کو ہدایت دی۔
”آئندہ بھی اس سے ناراض مت ہونا۔“ نور کے جاتے ہی وہ گویا ہوئیں۔

”جی۔“ وہ حیران ہوا۔
”بھی بتایا ہے نور نے تم ناراض نہیں ہو اب۔“
”جی۔“ وہ گڑبڑایا۔

”ناشتا کر لیں۔“ لی جان کے سامنے دونوں ہی نارمل بات کرتے تھے۔
”ہاں چلو۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ڈانگنگ ہل میں آگیا۔ وہ جانتا تھا وہ ساتھ ضرور آئے گی۔ کھانا

کھاتے ہوئے وہ ہمیشہ اس کے آس پاس رہا کرتی تھی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔ آج بھی وہ وہیں تھی۔ اصغری بوا ٹیبل پر سبزیاں رکھے انہیں صاف کر رہی تھیں۔

”ناشتا کر لیا تم نے۔“ نور نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، کیا اسے ہی مخاطب کیا گیا تھا یا کوئی دوسرا۔
”ناشتا کرو۔“ اس بے نام سی خاموشی کو اذلان کی مدھم سرگوشی نے توڑا۔

”آپ کر لیں میں بعد۔“
”میں نے کہا ہے ناشتا کرو۔“
”جی۔“ وہ نروس سی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ جب سے گھر آئی تھی خوف زدہ تھی حالانکہ قصور اس کا نہیں تھا۔ آج شادی کے فنکشن میں جو کچھ ہوا اس میں اس کی خطانہ ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو قصور وار سمجھ رہی تھی۔

واپسی پر وہ ولید کی بہن کے ساتھ دولہا دلہن سے ملنے اسٹیج پر گئی تھی۔ وہاں ولید کے سب کزنز موجود تھے، وہ کون تھا نہیں جانتی تھی۔ مگر وہ بناؤرو خوف کے اسے مسلسل گھورے چلا جا رہا تھا۔

وہ جلدی جلدی دلہن سے مل کر نیچے اترنے لگی تو وہ جان بوجھ کر اس سے ٹکرا گیا۔ وہ توازن پر قرار نہ رکھ سکی اور لڑکھڑا کر اسی کا ہاتھ پکڑ کر خود کو گرنے سے بچایا۔

”ارے سنبھل کر! اتنی نازک سی تو ہیں آپ۔“ وہ ابھی بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا تھا۔ سب ہی متوجہ ہو گئے۔ وہ بھی جس کا اسے سب سے زیادہ ڈر تھا۔

”ہاتھ چھوڑیں میرا۔“ وہ تلخی سے بولی۔
”چھوڑ دیتے ہیں، ہم نے کون سا ساری عمر کے لیے پکڑا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
”شٹ آپ! اذلان کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر اس کی رنی سہی جان بھی نکل گئی۔

”آپ کو کیوں اتنا غصہ آگیا۔“ بہت ہی ڈھیٹ انسان تھا۔
”بیوی ہے میری اور۔“

”پلیز اذلان چلیں۔“ نور نے ڈرتے ڈرتے اس کا بازو تھاما۔ اذلان نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے گھورتا ہوا ولید سے ملے بغیر وہاں سے آگیا۔

پورا راستہ خاموشی سے کٹا۔ واپس آکر وہ ہمیشہ کی طرح لی جان کے کمرے میں چلا گیا۔ واپس اپنے کمرے میں آیا تو اس کی دبی دبی سسکیاں اذلان کو متوجہ کر گئیں۔

”کیوں رو رہی ہو؟“ وہ اس کے سر پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتا وہ کون تھا۔“ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے۔

”تو میں نے کب کہا کہ تم اسے جانتی ہو۔“ وہ حیران تھا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں۔“ رونے میں کچھ کمی آئی۔

”فار گاڈ سیک نور! میرا داغ خراب مت کرو۔“ وہ گرجا۔

اس سے ناراض مت ہوا کرو اذلان! ایک منٹ میں حال سے بے حال ہو جاتی ہے۔“ اس کی حالت غالباً اسے پہلی بار نظر آئی تھی۔

”میرا اور تمہارا جو بھی اختلاف ہے مگر میں تمہارے کردار پر شک کرتا ہوں، ایسا کبھی سوچنا بھی مت اور اب رونا بند کرو۔“ اس کے آنسو اذلان کو تکلیف دے رہے تھے۔ وہ پلٹ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔

دل اور داغ کی جنگ بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ دل اپنی کہتا ہے اور داغ اپنا راگ الاپتا ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی سننے سے گریزاں رہتے ہیں۔
کتنے برسوں سے وہ دل اور داغ کی اس جنگ میں

جتلا تھا اور اس نے بڑے فخر سے ہمیشہ داغ کی فتح کو یقینی بنانے کے لیے دل کی خواہشوں کا گلا گھونٹا تھا۔ شاید اسی لیے مطمئن نہ تھا۔

اس کا دل نور سے اس وقت سے محبت کرتا تھا، جب سے اس نے لفظ محبت کو جانا تھا۔ اس کے لیے محبت کا وہ سرانام نور العین شاہ تھا۔

وہ اس سے پانچ سال بڑا تھا مگر عموں کا یہ فرق بھی ان دونوں کے لیے ایک تحفہ تھا۔ وہ اس سے بھی سی پری کا ایسے خیال رکھتا تھا جیسے وہ اس سے پندرہ سال بڑا ہو۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ ایک بار بی جان نے اس سے کہا تھا۔

”اذلان کی چاند سی دلہن لاؤں گی بالکل پریوں جیسی۔“ اور وہ ہر جہت بولا تھا۔

”پری بی جان! نور تو پریوں سے بھی زیادہ پیاری ہے۔“

کتنی ہی دیر بی جان مسکراتی رہی تھیں۔

پھر اچانک سب بدل گیا۔ وہ بھی سی پری اس کی محبت کی عادی ہو گئی ہے، یہ جانتے ہوئے بھی وہ اس سے دور بھاگنے لگا۔ وہ روتی، بکیتی، سسکتی مگر اس کے اس چہرے کے پیچھے اذلان کو ایک ہی چہرہ نظر آتا، ایک ہی تصویر ابھرتی اور وہ تصویر بھی ایک قاتل کی جس نے قتل کیا اور خود کشی کر لی۔

نور کی بیسٹ فرینڈ کی سالگرہ تھی اور بی جان نے صاف کہہ دیا تھا۔

”اب اذلان سے پوچھا کرو، کہیں بھی جانا ہو میری ذمہ داری نہیں رہی۔“

”مگر بی جان! اب تو میں تیار ہو گئی ہوں، اگر انہوں نے منع کر دیا؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”تو بچے! اس سے پہلے پوچھ لینا تھا اور وہ منع کیوں کرے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے خود چھوڑ بھی آئے گا۔“ وہ پھر سے تسبیح میں گمن ہو گئیں۔

کتنی ہمت جمع کر کے وہ یہاں تک آئی تھی اور اب

اس کے بالکل سامنے جیسے ہمت جواب دینے لگی تھی۔ ایک ہاتھ دونوں آنکھوں کے اوپر رکھے اور دوسرا سر کے نیچے رکھے وہ بیڈ پر سیدھا لیٹا تھا۔ پاؤں مسلسل ہل رہے تھے، یعنی وہ جاگ رہا تھا۔

”آپ جاگ رہے ہیں۔“ پاؤں رک گیا، مگر آنکھوں پر ہنوز بازو تھا۔

”مجھے۔۔۔ سعدی کے گھر جانا تھا۔۔۔ چلی جاؤں؟“ خاموشی برقرار رہی۔ وہ قریب چلی گئی، اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا، مگر منظر دھندلا گیا۔

”میں سعدی کی طرف جاؤں؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”ہزار دفعہ منع کیا ہے مجھے اپنی شکل نہ دکھایا کرو۔“ جانے کون سے جذبے کو وہ غصے کے بروے میں چھپا رہا تھا۔ نور کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔

”دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ آؤش۔“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بھاگی تو بی جان سے ٹکرائی۔ وہ اس کی سفارش ہی کرنے آ رہی تھیں۔

”نور۔۔۔ نور۔“ وہ پکارتی رہ گئیں، مگر وہ ان سنی کرتی بھاگ گئی۔ ان کا پروگرام اب اذلان کی کلاس لینے کا تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر اس کے ہونٹ بھیج گئے مگر اس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”میں نے کہا ہے نا مجھے اپنی شکل مت دکھایا کرو۔“ اس کی زبان سے نکلتے لفظ بی جان کو ساکت کر گئے۔

”نفرت ہے مجھے تم سے۔۔۔ اسی لیے میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ اس کے منہ سے نکلتے انکارے بی جان جیسی مضبوط عورت کو لڑکھڑا گئے تھے۔ اگر وہ سارا نہ لیتیں تو اب تک گر جاتیں۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔

”وہ میرے خدا! یہ سب کیا ہے۔“ ان کا سر گھوم رہا تھا اور وہ جو سمجھ رہا تھا کہ وہ ابھی تک اس کی ڈانٹ سننے کے لیے کھڑی ہے، آنکھوں پر سے بازو ہٹائے تو برف کی سل بن گیا۔ وہ اسے اتنی بے یقینی سے دیکھ

رہی تھیں، جیسے انہیں اس کے اذلان ہونے پر شبہ ہو۔

”کیوں نفرت کرتے ہو اس معصوم سے۔“ ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ وہ سر پاجیرت تھیں۔ ”بی جان وہ۔“ وہ ایک دم ان کے قریب آ گیا اور ان کے ہاتھ تھامنے چاہے، مگر انہوں نے جھٹک دیے۔

”مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے اذلان!“

”بی جان۔۔۔ وہ میں ویسے ہی۔“ اس نے پھر سے انہیں سہارا دینا چاہا۔ مگر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ اندر داخل ہوتی نور کے لیے اندر کا منظر حیران کن تھا۔

”تم بتاؤ نور! کیوں کرتا ہے یہ تم سے نفرت۔“ بی جان کا سوال اس کی سانسیں روک گیا۔

”کس نے کہا۔۔۔ آپ سے۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ نظریں چرانے لگی۔

”کاش جھوٹ ہوتا۔“ وہ وہیں کرسی پر ڈھے گئیں۔ کئی منظر آنکھوں کے سامنے لہرائے، جس میں نور کے آنسو، اس کی اواسیاں رقصاں تھیں۔ وہ بھی بے جان سی ان کے سامنے گر گئی۔

”میں نہیں جانتی بی جان! مگر اب میں تھکنے لگ ہوں۔ آج۔۔۔ آج اذلان ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔“

نڈھال و دل گرفتہ سی آواز انہیں اور بھی افسردہ کر گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

دھیرے سے نور کا سر اپنے گھٹنوں سے الگ کیا اور کڑے تیوروں کے ساتھ اذلان کی طرف بڑھیں۔

”مجھے جواب چاہیے اذلان! کیوں پرہیز کی تم نے میری بچی کی زندگی؟“ وہ اس کا دل ہلار رہی تھیں۔

”جو بچ آپ نے ہم سے چھپایا، وہ میں برسوں پہلے سے جانتا ہوں۔“ بی جان پتھر کی ہو گئیں۔

”کون سا بچ۔“ ان کے لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

”یہی کہ نور العین شاہ میرے باپ کے قاتل کی بیٹی ہے۔“

کسی نے کچھلا ہوا سیدہ نور کے کانوں میں ڈال دیا۔

کوئی دھماکا ہوا تھا جس میں اس کا بورا وجود جھلس گیا۔

”اس کا باپ میرے باپ کا قاتل ہے۔“

”خاموش!“ ایک زنانے وار پھٹا اذلان کے لفظوں کو کاٹ گیا۔ ”اس سے آگے ایک لفظ بھی تم نے کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“ انہیں اسے پھٹ مارنے پر زور بھی افسوس نہ ہوا۔

”اس سچائی کو میں نے تم سے اس لیے چھپایا تاکہ تم عزت سے جی سکو مگر تم نے اس کو میری بچی کے لیے ہی ذلت کی وجہ بنا دیا۔“ وہ سفید پڑتی نور کو دکھ سے دیکھ بولیں۔

”صرف یہی قصور ہے اس کا کہ یہ تمہارے باپ کے قاتل کی بیٹی ہے مگر اصل حقیقت اب میں تمہیں بتاؤں گی۔“ وہ غصے سے پھنکارتی، کہیں سے بھی شفیق سی بی جان نہ لگ رہی تھیں۔

”شکر ہے مولانا صاحب شام میں ہی مل گئے۔ ورنہ کل صبح واپسی ہوتی۔“ حویلی میں داخل ہوتے ہوئے بی جان اطمینان سے بولیں۔

وہ اور رقیہ اذلان اور نور العین کو دم کرانے قریبی گاؤں گئے تھے۔ واپسی میں پہنچتے پہنچتے انہیں رات کے بارہ بج گئے۔ تین ماہ کی نور بی جان کی گود میں تھی، جبکہ پانچ سالہ اذلان کو رقیہ نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔

بی جان! نور کو مریم کو دینے کے لیے عالم اور مریم کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور رقیہ اپنے کمرے کی طرف۔ سکندر شاہ اپنے کمرے میں نہیں تھے۔

”پہلے انہوں نے سوئے ہوئے اذلان کو لٹایا ہی تھا جب بی جان کی دلدوز چیخ نے ان کو حواس باختہ کر دیا۔ وہ دوڑ کر وہاں پہنچیں۔ سامنے کے منظر نے ان کے ہوش اڑا دیے تھے۔ بیڈ پر موجود مریم کا بے جان وجود اور نیچے کارپٹ پر پڑے سکندر شاہ کی خون میں لت پت لاش کے ساتھ ہاتھ میں خنجر لیے عالم شاہ نے زمین آسمان ان کی نظروں کے سامنے گھما دیے۔ عالم شاہ تو شکار پر گئے تھے اور انہیں دو دن بعد لوٹنا تھا وہ یہاں؟

”عالم۔ عالم تم نے۔“ بی جان کے لب کپکپائے۔
 ”یہ میرا بھائی نہیں تھا ماں۔ یہ وہ آستین کا سانپ تھا جسے ہم دیکھ ہی نہ پائے۔ سیری بیوی۔ میرے ہوتے ہوئے بھی اس غلیظ انسان سے ڈرتی رہی اس کی بری نیت کو چھپاتی رہی۔ صرف۔ صرف اس حویلی کی عزت کی خاطر اور آج۔ آج اس نے اس عزت کے لیے اپنی جان دے دی۔“ ان کے لفظوں میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔
 ”مرنے سے پہلے اس نے مجھ سے آخری خواہش کی تھی کہ میں اس کے قاتل کو معاف کر دوں۔“ وہ دونوں ساکت کھڑی تھیں۔

”اور میں نے کر دیا ماں۔ معاف کر دیا مگر مرنے کے بعد‘ ناگہ۔ ناگہ میرا خدا بھی اسے معاف کر دے۔“ وہ اب اور شدت سے رونے لگے تھے۔
 ”بھابھی۔“ انہوں نے رقیہ کو پکارا۔

”آپ۔ آپ بھی مجھے معاف کر دینا۔“ وہ رقیہ کے قدموں میں بیٹھے مگر ان کے جامد وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ”آپ دونوں مجھے معاف کر دینا۔“ وہ وہیں سے ماں کو دیکھنے لگے۔ خنجر ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھا۔ خون سے بھرا ہوا۔

مومنہ بیگم کی پلکوں میں ارتعاش ہوا، مگر کچھ لمحوں کی تاخیر ہو گئی۔ عالم نے خون میں ڈوبا خنجر اپنے سینے میں اتار لیا۔ اب کی بار بی جان کے ساتھ ساتھ رقیہ کی چیخوں سے پوری حویلی گونجنے لگی۔
 ”عالم۔“ وہ، سٹریائی انداز میں چلا رہی تھیں۔

”ہم نہیں جانتے کہ اصغری نے ہر آنے والے کو کیا بتایا۔ رقیہ کو تو پورے تین دن بعد ہوش آیا تھا اور میں۔ میں ہوش میں ہوتے ہوئے بھی بے ہوش تھی۔“

ماضی ایک فلم کی طرح ان کی نظروں کے سامنے چل رہا تھا۔
 ”گناہ کیا تمہارے باپ نے مگر اس کی سزا عالم اور

میرم کو ملی اور تم نے اپنی ناقص آگاہی کی بنیاد پر اس کے ساتھ وہ کیا جس کے حق دار نہ تو اس کے ماں باپ تھے اور نہ یہ۔“ انہوں نے اذلان کو حتمیٰ۔

کاش نشین بچے اور وہ اس میں سما جائے یا آسمان اسے نگل لے، مگر اسے نور العین شاہ کی نظروں کا سامنہ نہ کرنا پڑے، مگر وہ اس کی طرف دیکھ ہی کب رہی تھی وہ تو گم غم سی اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں نے تم دونوں کو ہمیشہ محبت سکھائی، مگر یہ نفرت کا بیج تمہارے اندر کہاں سے آگیا“ انہوں نے منہ پھیر لیا۔

وہ دیکھی تھیں ان کا درد حد سے سوا تھا۔

”تم نے میری تربیت کو مٹی میں ملا دیا۔ میری پرورش میری محبت سب کو رول دیا۔ مجھے اس کے سامنے سر اٹھانے کے قابل بھی نہ چھوڑا۔“ انہوں نے نور کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”نور کو تمہیں اسی لیے سونا تھا میں نے کہ تم سے زیادہ مجھے کسی پر اعتماد نہیں تھا اور تم ہی نے میرے اعتماد کا خون کر دیا اذلان!“ وہ ندھال ہو گئیں۔
 وہ ان دونوں کا گناہ گار تھا۔

وہ ایک ایسا مسافر تھا جس نے دوران سفر کوئی بھی ایسی نشانی نہ چھوڑی تھی جس پر چل کر وہ واپس لوٹ سکتا۔ کوئی ایسی یاد کوئی لمحہ جو اس کی نور سے محبت کا ثبوت دیتا، نفرت کی اس جنگ میں سب سے زیادہ خسارہ تو اسی کے حصے میں آیا تھا جو سر جھکائے ابھی تک اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو گھورے جا رہی تھی۔

”نور!“ بی جان نے اسے پکارا، مگر اس نے جواب نہ دیا۔ اذلان نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ وہ اس کا گناہ گار تھا۔ اس کی اس حالت کا ذمہ دار تھا۔ پھر بھی اس کی نفرت برداشت کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ پہلے ہی اپنے دل میں اس کے وجود سے نفرت جگانے کے لیے محبت کے طوفانوں سے ٹکرایا تھا اور اب جب نفرت کا بیج تلف ہوا تو سارے طوفان یک لخت اس کے دل کی سرزمین پر کود پڑے تھے۔

”نور بچے۔“ بی جان تڑپ کر اٹھیں وہ دیوانوں کی

طرح اپنے ہاتھوں کو تکیے جا رہی تھی۔ نظریں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پھر پہلے ہاتھ کی طرف گھوم رہی تھیں۔

”نور۔“ بی جان نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ سوچ کے دورانوں سے حقیقت کی دنیا کا سفر بہت کھنکھن تھا۔ اس نے مڑ کر اذلان کی طرف دیکھا بہت سنبھل کر کھڑے ہونے کے باوجود بھی اس کے قدم لڑکھڑاہے تھے وہ چلتی ہوئی بالکل اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

کیا کچھ نہ تھا ان آنکھوں میں دکھ، تکلیف، برداشت کی حدوں کو چھو تاکرب۔

”مجھے میری کسی کوتاہی کی سزا دی ہوتی، میرا کوئی عمل میرے گناہ میں شامل ہوتا تو آج میں اپنی غلطی ہر عمل کے لیے آپ کے سامنے گڑ گڑا کر معافی مانگتی۔“
 اس نے اذلان کا گریبان اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پہلی بار وہ اس کے اتنا قریب آئی تھی مگر ہر احساس ہر جذبے سے عاری ہو کر۔

”میری کوئی لغزش میری سزا کا باعث ہوتی، پھر بھی آپ حق پر ہوتے۔ لیکن اگر قصور میرے باپ نے کیا بھی تھا تو اس کی سزا آپ مجھے کیسے دے سکتے ہیں، میری زندگی کیسے برباد کر سکتے ہیں۔“ ایک جھٹکے سے اس نے اذلان کا گریبان چھوڑا۔

”نور میری بات۔“ وہ گڑ گڑایا۔

”بہت نفرت ہے نا آپ کو مجھ سے۔“

”نور تم۔“
 ”اتنی نفرت کہ میری شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں ہے۔“

اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو، ایک ہی جست میں اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی فروٹ باسکٹ سے چھری اٹھالی، سب اتنا آنا فنا ہوا کہ وہ دونوں کچھ نہ کر سکے۔

”نور۔ نور بچے۔“ بی جان جیسے ہوش میں آئیں، وہ بھی اس کی طرف بڑھا۔

”خنجر واسے میرے پاس مت آئیے گا۔“ اس نے دارنگسوی اور چھری اپنی کلائی پر رکھ دی۔

”نور پلیز۔ ایسا مت کرو۔“ وہ چیخا، مگر اسے کوئی بھی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، بس ایک گونج تھی۔
 ”اس کا باپ میرے باپ کا قاتل۔“
 ہلکی سی سسکی اس کے منہ سے نکلی تھی۔ اس نے اپنی کلائی پر چھری پھیر لی۔

اسپتال میں اس نے آٹھ دن کس طرح گزارے تھے، یہ وہی جانتا تھا بی جان نے اسے بس اتنا کہا تھا۔
 ”اگر میری بچی اپنے پاؤں پر چل کر میرے پاس نہ آئی تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔“

جب اسے نور کے ہوش میں آنے کی خبر ملی تو سب سے پہلے اس نے بی جان کو ہی بتایا تھا۔ انہوں نے محض ”ہوں“ میں جواب دے کر فون کٹ دیا تھا۔

وہ ایک بار ٹھیک ہو جائے، وہ اس کے سارے گلے دھو دے گا۔ سارے شکوؤں کو مٹا دے گا، جتنی محبت وہ اس سے کرتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ محبت وہ اسے دے گا، اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے گا۔ کتنی پلاننگ کی تھی اس نے مگر نور کا فیصلہ اس کی کوتاہیاں سود سمیت اسے لوٹا گیا۔

پورا ایک مہینہ وہ حویلی نہ گیا تھا۔ مگر زمینوں کے مسائل، قصلوں کے ٹھیکے، حویلی کا سارا انتظام وہ کب تک وہاں نہ جانا۔ بی جان نے خود اسے فون کر کے بلایا تھا۔ پورا دن گزرنے کے بعد بھی وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ بالآخر کھانے کی ٹیبل پر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”نور کہاں سیلی جان!“
 ”وہ شروالے گھر چلی گئی ہے، بلکہ میں نے ہی بھیجا ہے۔ جب وہ تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تو اب میں بھی زبردست نہیں کروں گی۔“ وہ پریشان ہو گیا۔
 ”مگر وہاں اکیلے۔“

”اصغری کو ساتھ بھیج دیا ہے میں نے۔ پہلے بھی پڑھائی کے لیے اکیلی ہی رہتی تھی۔ اب کیا پریشانی ہے، مانی ہے ڈرائیور ہے گاڑی ہے، بس ایک کل وقتی

ملازمہ کی ضرورت ہے اگر بھجوا سکتے ہو تو بھجوا دینا کسی کو، تاکہ اصراری واپس آجائے۔“
”لیکن لی جان۔“ وہ انہی بھی مطمئن نہ تھا۔
وہ پلیٹ ایک طرف کر کے اٹھ گیا۔
پھر مہینہ کو اسی نے وہاں بھجوا دیا۔

زندگی ایسے دورا ہے پر آگئی تھی جہاں ہر طرف دھول ہی دھول تھی۔ کون سی راہ اسے اس کی منزل پر پہنچائے گی، کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ وہ تھکنے لگا، مگر محبت پھر سے اس میں نئی توانائیاں بھر دیتی۔ وہ نئی امید کے ساتھ پھر اسے فون کرتا۔ اس کا رویہ بھی اسے مایوس نہ کرتا۔ وہ کیا کرتی ہے، کہاں جاتی ہے، پل پل کی خبر ازلان کو ہوتی، مگر وہ موم کی گڑیا اب پھر کی سل بن چکی تھی۔

”اب آپ کچھ نہیں بولیں گی۔“ وہ غصے سے بولی۔
”اور یہ اُبلتی، پھینکی غذا میں کھاؤں گی؟“ وہ نروٹھے پن سے بولیں۔
”اُبلتی پھینکی غذا میں؟“ اس کی آنکھیں پھٹیں۔
”یہ جن کو آپ اُبلتی پھینکی غذا میں کہہ رہی ہیں، پورے ڈھائی گھنٹے میں بنائی ہیں میں نے۔“ وہ مصنوعی غصے سے بولی۔
”اس سے بہتر تھا تم مجھے آدھے گھنٹے میں چکن مسالا بنا دیتیں۔“

”آپ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ کھاتی ہیں آپ یا بلاؤں آپ کے ہلر پوتے کو۔“ اس نے دھمکی دی۔ جانتی تھی لی جان کے کھانے پینے کے معاملے میں وہ اس سے بھی زیادہ محتاط تھا۔
”چھا وہی ہلر پوتے جو آپ کے شو ہر نامدار بھی ہیں۔“ وہ شریر ہوئیں اور چچہ اٹھالیا۔
”ویسے پلان کامیاب رہا ہے۔“ وہ فخر سے کہنے لگیں۔
”دیکھو نا کیسے سیدھا ہو گیا ہے۔ میرا پوتا ہے میں جانتی ہوں اسے۔“ وہ ہنس۔

”ایسے ہی تم نے اسے معاف کر دینا تھا تو تمہیں فارگ رائٹ لیتا۔“
وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگی۔

”آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ ازلان جان کے پاؤں دبا رہا تھا جب وہ ان کی دواؤں کا کالا کر بیچ گئی۔
”تم بھی بالکل بھولتی نہیں ہو۔“ انہوں نے دہرایا۔ دوائیاں کھا، کھا کر وہ تنگ آچکی تھیں۔ ازلان ابھی بھی ان کے پاؤں دبا رہا تھا بالکل خاموش۔ وہ کھلا کر کمرے سے چلی گئی۔
”بس سنجے!“ انہوں نے پاؤں سائیڈ پر کر لیے ازلان نے اٹھ کر ان کا کمبل درست کیا۔
”میرا ازلان اتنا خاموش تو نہیں تھا۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔
”آپ کا ازلان اتنا برا بھی تو نہیں تھا۔“ وہ جبراً مسکرایا۔
”کس نے کہا کہ تم برے ہو۔“
وہ پوچھنے لگیں مگر وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیت گیا۔

”لی جان! وہ مجھے معاف نہیں کرتی۔ وہ مجھ نفرت کرتی ہے اور میں۔“ اس کی نظرس دھند گئیں۔ میں ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نہیں دیکھ سکتا۔
”اس لیے اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہو۔“ تنج کافی دنوں بعد وہ دونوں یوں بات کر رہے تھے۔ ازلان نے سر جھکا لیا۔
”اس سے کہتے کیوں نہیں ہو؟“
”اس قابل ہوں کہ اس سے کچھ کہہ سکوں؟“ مہم ساہنسا۔
”میں بات کروں نور سے؟“ انہوں نے استفادہ کیا۔
”نہیں بالکل نہیں، میں اسے فورس نہیں کرنا“

چاہتا۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔
”یہ ایک تک چلے گا۔“

میں تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں ازلان اور وہ بھی ایک ساتھ۔ وہ مسکرائیں۔
”تین نے بہت مشکل سے تم سے زیادہ خدمت گزار ہوؤ ہوئی ہے نالائق! مجھے میری ہنستی مسکراتی ہو واپس چاہیے۔“ وہ شریر ہوئیں۔ اب کی بار وہ کھل کر مسکرا دیا۔

کمرے کے دروازے بالکل اسی کی طرح تھے خاموش، پر اسرار، مگر شان دار، جب بھی وہ چوٹی سے باہر ہوتا وہ اس کے کمرے میں ضرور آتی تھی، ورنہ واپس آنے کے بعد وہ پہلے کی طرح اپنے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی۔
اس کی غیر موجودگی میں وہ بڑے حق سے اس کے کمرے میں موجود ہوتی تھی۔ کمرے کی ایک ایک چیز اسے اپنی محسوس ہوتی تھی، بس ایک اس کا مالک ہی انا نہ تھا۔ ابھی بھی وہ کمرے کی ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر محسوس کر رہی تھی۔

اس کی فل سائز تصویر جو بیڈ کے بالکل سامنے آویزاں تھی، کے سامنے آکر وہ تھم گئی۔ وقت جیسے رک گیا۔ لمحے منجمد ہو گئے۔ اچانک اس کی تصویر دھندلا گئی۔ اس نے بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا، پوری طرح نم ہو چکا تھا۔ دائیں ہاتھ کی پشت سے چہرہ پونچھتی وہ دھیرے سے مسکرا دی۔
”اب تو آپ کی تصویر بھی رلانے لگی ہے۔“ اس نے شکوہ کیا مگر جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ باہر ہوا تیز ہو گئی تھی شاید بارش ہونے والی تھی۔ بادل بہت زور سے گرجے، بالکنی کا دروازہ کھلا تھا۔

وہ بالکنی میں آگئی۔ گرل کے اوپر دونوں بازو ٹکا کر وہ بالکل ازلان کی طرح کھڑی تھی۔ ایک بے اختیاری عمل۔
نور نے ہاتھ بڑھایا۔ بارش کی پھوار شروع ہو چکی تھی۔ ہوا سے بال اوہرا اوہرا بکھر گئے۔ اوہرا اوہرا ہوتی

پھوار اس کے کپڑے بھی بھگونے لگی۔ مگر وہ اپنے چلے سے بے خبر کھڑی وہیں بھبھک رہی تھی۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز نے اس کا دھیان کھینچا۔ وہ چونکی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دروازے تک آئی۔ سامنے کا منظر اس کے چودہ طبق روشن کرنے کو کافی تھا۔

ازلان اپنا والٹ اور چابیاں سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا پھر اس نے اپنا کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا۔
وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔
”نا خدا! یہ آج کیسے آگئے۔ انہیں تو برسوں آنا تھا، وہ گھبراہٹ سے باہر جانے کا ایک ہی راستہ تھا جہاں وہ موجود تھا۔ ایک بار پھر دروازہ کھلا۔ اس نے جھانکا اصراری ہوا اندر آرہی تھیں۔
”ہیٹا! کھانا نکلا دوں۔“

”نہیں بواجی! میں فریش ہو جاؤں، بس ایک کپ کافی بھجوا دیں۔“ وہ تھکا تھکا سا کہہ رہا تھا۔ نور کی جان میں جان آئی۔
ابھی وہ فریش ہونے جائے گا تو وہ چپکے سے باہر نکل جائے گی وہ سکون سے دوبارہ پیچھے ہٹ گئی مگر اصراری ہوا کے جاتے ہی ازلان نے سب سے پہلے بالکنی کا دروازہ مقفل کیا اور نہانے کے لیے چلا گیا۔ بند دروازہ اس کا منہ چڑانے لگا۔
وہ نما کر نکلا ہی تھا کہ بالکنی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا پریشان ہونا فطری تھا۔
ایک جھٹکنے سے اس نے دروازہ کھولا مگر نور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔
”تم یہاں کیسے؟“

”راستہ دیں۔“ نور نے اس کی بات کاٹ دی۔
اسے حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔
وہ کبھی بالکنی کو دیکھتا اور کبھی کمرے کے بند دروازے کو۔ معمر اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆ ☆ ☆

”نور۔“

”جی بی جان!“ ٹی وی کی آواز کم کرتی وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بچے! وہ اذلان کے کمرے میں ایک کب کافی بھجوا دو۔ صبح سے اس کی طبیعت خراب ہے۔“ گھنٹوں پر زور ڈالتیں وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”جی اچھا۔“ پاؤں میں سلیپر ڈالتی وہ اٹھی۔

”بلکہ ایسا کرو خود ہی دے آؤ۔ دوا بھی بوجھ لیتا۔“ انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا اور کھینچ کرنے لگیں نور نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

اس نے گھڑی دیکھی جو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہی تھی۔

وہ جتنا اس کا سامنا کرنے سے بچ رہی تھی اتنا ہی پھنسی تھی۔

دودھ گرم کر کے گلاس ٹرے میں رکھا اور مرقی کیا نہ کرتی کے مصداق اس کے کمرے کی راہ لی دستک دینے کے باوجود اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ اسے پریشانی ہوئی۔

بالکنی سے مدھم سی روشنی آرہی تھی۔ وہ اس طرف آگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی وہ خود بخود کھل گیا۔

ہر طرف روشنی کی چکاچوند تھی۔ سرخ رنگ کی لاتعداد موم بتیاں بالکنی کی تمام گرلوں پر روشن تھیں۔ ٹیبل کے درمیان اس کا پسندیدہ پائن اپیل کیک موجود تھا جو چاروں طرف سے سرخ گلابوں سے گھرا تھا وہ متحیر سی پورے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ دودھ کا گلاس ہنوز ہاتھوں میں تھا۔

اناک بات ہے ورنہ محبت اب بھی باقی ہے مجھے میری مجھے تیری ضرورت اب بھی باقی ہے یہ کیسا کھیل کھیل ہے میرے ساتھ قسمت نے منزل کھڑا ہوں اور

مسافت اب بھی باقی ہے ٹھہر ٹھہر کر نظم پڑھتا وہ اس کے عقب سے بالکل اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کی نظروں میں موجود محبت نہ تو خواب تھی نہ خیال۔ وہ پھر بھی اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے بے یقین ہو۔ وہ مسکرا کر ہوئے آگے بڑھا۔ دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ لے کر سائینڈ ٹیبل پر رکھا۔ پھر پلٹ کر اس کے سامنے آگیا۔

”کچھ کہو گی نہیں؟“ وہ چپ چاپ کھڑی رہی، اب آنکھوں میں نہ حیرت تھی نہ بے یقینی۔

”میں جانتا ہوں نور! میں نے دیر کر دی لیکن کیا تو دیر کر دی کہ واپسی کا ہر دروازہ بند ہو گیا ہے؟“ وہ قطرہ قطرہ اپنے آنسوؤں کو اندر اتار رہی تھی مگر وہ پھر بھی مقابل کو اپنے ہونے کا احساس دلا گئے۔

”میری محبت نے تمہیں آج تک صرف آنسو دیے ہیں نا۔“ وہ افسردگی سے کہنے لگا۔

”میری کوئی دلیل ان کا مددوار نہیں، میرا کوئی ایکس کیوز ان کا کفارہ نہیں۔“ اس کے لفظوں میں بھی نمی گھلنے لگی۔ نور نے چونک کر اسے دیکھا۔

”جانتی ہو نور! ایک ہی وقت میں کسی سے محبت اور نفرت کا عذاب کیسا ہوتا ہے۔“ وہ ٹٹکی باندھے لے دیکھ رہی تھی۔

”میں نے یہ عذاب سہا ہے نور!“ جیسے جیسے بولے وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا یہ کوئی نور العین سے پوچھتا جس نے ہمیشہ اس کے منہ سے اپنے لیے انکارے لگے دیکھے تھے۔

”مگر اب میں تھکنے لگا ہوں، ٹوٹنے لگا ہوں۔ تیرا گناہ گار ہوں اور آج۔ میں تم سے اپنے ہر لفظ پر روئے کے لیے معافی مانگتا ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ رہا تھا۔

”نہیں اذلان۔ میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا کہ آپ مجھ سے معافی مانگیں۔ میں نے تو آپ کو اسی رخصت کر دیا تھا جب مجھے آپ کی نفرت کی وجہ معلوم ہوئی تھی۔“ وہ آبدیدہ تھی۔

”ہاں میں یہ ضرور چاہتی تھی کہ آپ مجھے منائیں اور اس سے زیادہ میری محبت کی نہ تو کوئی طلب ہے نہ کوئی تقاضا۔“ وہ روہا سی ہو گئی۔

”میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں۔“ اس نے اذلان کا ہاتھ تھامنا جسے اذلان نے مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

”میں تم سے اس وقت سے محبت کرتا ہوں نور! جب تم محبت کے جے بھی نہیں جانتی تھیں! ہاں! اعتراف اب کر رہا ہوں۔“ وہ مسکرا دی۔ آنسوؤں کے درمیان معصوم سے مسکراتے چہرے پر اسے بے ساختہ پیار آیا۔

”کیک کاٹیں۔“

”آج سے زیادہ خوشی کا دن بھی کوئی ہو گا؟“

”ہاں کل ہو گا۔“ وہ مسکرائی۔

”کل کیوں؟“

”کل میں اپنی برتھ ڈے پر آپ سے زندگی کا پہلا گفتگوں کی۔“ وہ اترائی۔

”آپ کا وہ کل شروع ہوئے پورے نو منٹ ہو چکے ہیں اور یہ رہا آپ کا گفتگو۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ نور نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ کو میرا برتھ ڈے یاد تھا؟“

”یاد بھی تھا اور اس کا انتظار بھی تھا۔ ورنہ آپ کو منانے کا معاملہ اس دن بھی سرانجام دیا جاسکتا تھا۔ جب آپ بڑے مشکوک انداز میں ”یہاں“ پائی گئی تھیں۔“ اس نے یہاں پر خاصا زور دیا۔ نور نے سٹیٹا کر نظریں گھمائیں۔

”پہلے کیک کاٹیں۔“ وہ پوچھنے لگا۔

”پھر میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ آپ اس رات یہاں کیا کر رہی تھیں؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا روپ نور کے لیے نیا اور انوکھا تھا۔

”جب آپ کی طبیعت خراب تھی تو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ فکر مند ہوئی۔

”میری طبیعت خراب تھی؟“ وہ الٹا اسی سے

پوچھنے لگا۔

”ہاں! وہ بی جان نے آپ۔۔۔“ وہ چونکی۔ اذلان کی گہری ہوتی مسکراہٹ اس کو بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔

”اتنے عرصے سے وہ آپ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ اگر آج تھوڑا سا میرا دے دیا تو کیا ہوا۔“ وہ ذرا بھی شرمندہ نہ تھا۔

”یعنی آپ دونوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنایا۔“ اسے صدمہ ہوا۔

”مسوری! مگر ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔“ وہ چڑانے لگا۔

”مطلب بی جان نے پارٹی بدل لی۔“ وہ شاکد تھی۔

”نہیں! دوپاروں کے بیچ ٹالٹ بن گئیں۔“ اس نے سمجھایا۔

”منائیں ذرا اب آپ مجھے مانگی ہوں میں۔“ روٹھی روٹھی سی نور کا یہ روپ بھی اسے آج ہی دیکھنے کو ملا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا اسے اور ستائے لیکن! ”او کے سیز فائر! کیک کاٹیں۔“

اس نے کندھے اچکائے مگر یکدم اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ اس اچانک افلاک کے لیے تیار نہ تھی سو اسی پر آری۔ اذلان نے اسے شانوں سے پکڑ کر اس کا رخ ٹکیک کی طرف کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹکیک پر چھری چلائی۔

”ابھی برتھ ڈے مسز نور العین شاہ۔“

اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتا وہ اس کی دھڑکنیں بڑھا گیا۔ دل میں لگتا تھا طوفان مچا ہوا۔ ساری روح بس ہاتھ میں سمٹ کر آگئی ہو مگر ہر شور پر بھاری بس ایک آواز تھی۔ ہر طوفان پر حاوی بس ایک گونج تھی۔

”ابھی برتھ ڈے ٹوپو مسز نور العین شاہ۔“

رشتوں کی خوبصورتی ان کو بنانے میں نہیں بلکہ ان کو نبھانے میں ہے اور رشتوں کو نبھانے کے لیے ”محبت“ سے زیادہ مؤثر اور پائیدار ہتھیار کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔



”ارے! اس کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ماسی آتی ہے۔ وہ صفائی، کپڑے اور برتن دھو جاتی ہے۔ بانی رہ گیا ہنڈیا پکانے کا کام تو یہ امی کو پسند نہیں کہ یہ کام ملازم سے کروایا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ کچن کا کام گھر کی عورت کو ہی کرنا چاہیے، ورنہ کھانے میں برکت نہیں رہتی اور پھر عثمان بھی کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کرتے۔“ میں نے سہولت سے منع کرتے ہوئے ساتھ ہی اسے جتایا۔

”رہنے دیں بھابھی! یہ ساسیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔“

چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ میرے تاثرات کی پروا کیے بغیر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”آپ جانتی ہیں کہ ہمارے گھر میں کتنے لوگ ہیں۔ صرف میں اور بلال۔ اور بلال بھی زیادہ تر وہی میں رہتے ہیں۔ پھر بھی گھر کے ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ کچن میں بھی دو دو لک ہیں۔ آپ کہیں تو میں اپنا ایک ملازم کچن کے کاموں کے لیے بھیج دوں؟ مجھے کون سا ملازموں کی کمی ہے۔“ وہ اترائی۔

دیا۔

میں کہاں اس کے آنے سے خوش ہوتی تھی۔ اس کا میاں وہی میں کاروبار کرتا تھا۔ جب آتی اپنی امارت کے قصبے سنا کر میرا دل جلاتی۔

میں ان ہی سوچوں میں گھری تھی اور وہ میرے سر پر پہنچ گئی۔

”او گاڈ! آپ کچن میں چھپی بیٹھی ہیں اور میں آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے دوران کہا۔

میں نے ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی۔ اس نے تیز میک اپ کیا ہوا تھا اور بھاری جیولری اپنے جسم پر لادی ہوئی تھی۔

”اتنا زیور تو آج کل کی دہلیزیں بھی اپنی شادی پر نہیں پہنتیں۔“ میں نے کوفت سے سوچا۔

”یہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہے۔ احمر کو اسکول سے گھر عثمان ہی لاتے ہیں اور پھر دوپہر کا کھانا کھا کر وہ دوبارہ آفس جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے اس وقت کچن میں ہی ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے اسے جتاتے ہوئے کہا۔

”اف بھابھی! آپ تو ہر وقت کچن میں مصروف رہتی ہیں۔ یہ لسن اور اورک کی بو سے آپ الرجک نہیں ہوتیں؟ میں تو تھوڑی دیر کے لیے ہی کچن میں چلی جاؤں تو فوراً میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ کم از کم کچن کے کاموں کے لیے تو پرمننٹ ملازم رکھ لیں۔“ اس نے مفت مشورے سے نوازا۔ میرے

”سعدیہ بھابھی! سعدیہ بھابھی!“ نازلی نے گیٹ سے داخل ہوتے ہی آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔

”اف! یہ مصیبت کہاں سے نازل ہو گئی۔“ احمر اور عثمان کے آنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ صبح بھی علیزے کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ بخار کی وجہ سے وہ چڑچڑی ہو رہی تھی کہ امی سے بھی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ اسے سلا کر میں کچن میں دوپہر کا کھانا پینے آئی تھی اور اب یہ نازلی صاحبہ تشریف لے آئی تھیں جو گھنٹہ دو گھنٹے سے پہلے ٹلنے والی نہیں تھیں۔

میں نے کوفت اور بے زاری سے سوچا۔

پتا نہیں! لوگوں کے پاس اتنا فال تو وقت کیسے ہوتا ہے۔ عثمان تو پہلے ہی اس کے آنے سے چڑتے ہیں۔

”پتا نہیں کیسے کیسے لوگوں سے میل جول رکھا ہوا ہے تم نے۔ انسان اپنے جاننے والوں سے ہی پہچانا جاتا ہے۔“

اگر کبھی وہ عثمان کی موجودگی میں آجاتی تو ان کا موڈ فوراً خراب ہو جاتا۔ اور پھر اس کے جانے کے بعد سارا غصہ مجھ پر نکلتا۔

”میں کون سا اس کے گھر جاتی ہوں۔ وہ خود ہی آجاتی ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں اس سے کہہ دیجی ہوں کہ میرے میاں کو تمہارا آنا پسند نہیں۔ براہ مہربانی آئندہ ہمارے گھر آنے کی زحمت مت کرنا۔“ اور پھر بعد میں امی گھر آئے مہمان اور وہ بھی ہمسائی کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے پر جو یکچرخہ سنا میں کی وہ صرف آپ ہی سنیں گے۔ میں نے بھی انہیں چڑ کر جواب



یہ تو دیکھ ہی نہیں سکتیں کہ ہوسکون سے رہے۔ میری ساس شکر ہے! میرے ساتھ نہیں رہتیں۔ لیکن جب کبھی بلال سے ملنے آتی ہیں تو جتنے دن بھی رہتی ہیں، میرا ناک میں دم کیے رہتی ہیں۔ ”سارا دن گھر میں فارغ رہتی ہو تو پھر اتنے ملازم کیوں رکھے ہیں۔“ اس نے اپنی ساس کی نقل اتاری۔

”جھٹی! میرا میاں میرے لیے کھاتا ہے۔ ساری زندگی خود اپنے میاں کے پیسوں پر عیش کیا ہے۔ میرا خرچ کرنا انہیں برداشت نہیں ہوتا۔“ پھر چمک کر بولی۔

”اور میاں کی پسند کی بھی خوب کئی۔ یہ ان مردوں کی چال ہوتی ہے کہ عورتوں کو یوں ہی جھوٹی سچی تعریف میں الجھائے رکھیں اور خود باہر کی دنیا میں عیش کرتے پھریں۔“

میرے چہرے پر غصے کے تاثرات دیکھ کر وہ فوراً سنبھل گئی۔

”لیکن یہ سچ ہے بھابھی! کہ آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ کافی عرصہ پہلے آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی کھیر کھاتی تھی۔ آج تک میں اور بلال اس کا ذائقہ بھول نہیں سکے۔“ اس کی تعریف سے بھی میری ناگواری کم نہ ہوئی۔

تب ہی اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر نمبر دیکھ کر بولی۔

”بلال کا فون ہے۔“ میں خاموشی سے ہنڈیا میں چھپے چلاتی رہی۔

”بلال! آپ بھی حد کر رہے ہیں۔ آپ کے دوست کو پہلے بتانا چاہیے تھا۔ اب اپنی ایمر جیسی میں دعوت کرنے کی کیا تک ہے۔ میں ابھی گھر پر نہیں ہوں اور پھر مجھے تیار ہونے میں بھی خاصا وقت لگے گا۔“ وہ تیز آواز میں نلن اسٹاپ بول رہی تھی۔

اس کی آخری بات پر میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ابھی اسے تیار ہونے کے لیے وقت چاہیے؟ کیا کوئی کسرا پتی رہ گئی ہے اس کے تیار ہونے میں؟ ”آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ اوف! آپ فون بند

کریں گے تو میں تیار ہوں گی نا۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

یعنی اب اس سے جلدی جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے اطمینان بھری سانس لی۔ فون بند کر کے وہ میری طرف پلٹی۔

”بلال کا فون تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے بلال کتنے سوشل ہیں۔ ان کے دوستوں میں بہت بڑے بڑے لوگ شامل ہیں۔“ اس نے فخریہ لہجے میں مجھے اظہارِ پنچائی۔

”خاص طور پر جب سے بلال دینی گئے ہیں، ہر کوئی ان کا دوست ہونے کا دعوے دار بن گیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ بلال کتنے سیدھے ہیں۔ اسی لیے تو میں ان کے ساتھ ہر وقت رہتی ہوں، تاکہ لوگ ان سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے انہیں بے وقوف نہ بنالیں۔ میری ساس تو شروع سے چاہتی ہیں کہ بلال اپنے بانی دونوں بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ کاروبار میں شریک کر لیں۔ لیکن میں اتنی آسانی سے ان کے کسی بھی منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“

اس نے نخوت سے سر جھٹکا اور پھر میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پاپوس ہوئی، جہاں صاف لکھا تھا کہ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

”سعدیہ بھابھی! بڑی عید آنے والی ہے۔ آپ نے ابھی تک قربانی کا جانور نہیں خریدا؟“ وہ ادھر ادھر یوں نظریں دوڑا رہی تھی جیسے ابھی کہیں سے جانور نکل آئے گا۔

”اوہ! تو یہ پراہلم ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔

”ابھی عید میں کافی دن ہیں۔“ میں نے چولہا بند کیا اور چائے کے کپ میز پر رکھ کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ”بھابھی! آپ نے بلاوجہ تکلف کیا۔ میں بس جارہی تھی۔“

”میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی تھی تو تمہارے لیے بھی بنادی۔“ میں نے چائے کا کھونٹ لیتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

”تم لوگوں کے خرید یا جانور! میری سانس کی آواز سے کھل اٹھی۔ اس طرح اسے اپنی امارت کا رعب جھاڑنے کا موقع چوم گیا تھا۔

”جی بھابھی!“ اس بار ہم لوگ ایک گائے اور چار بکروں کی قربانی کریں گے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ جانوروں کی قیمتیں آسمانوں کو چھو رہی ہیں، لیکن بلال نے کہا کہ چاہے قیمت کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ہم لوگ اچھے سے اچھا اور اعلیٰ نسل کا جانور ہی خریدیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہے بلال کا خاندان کتنا غریب ہے۔ وہ لوگ بھی بے چارے عید کے دن گوشت کی شکل دیکھ لیں گے اور ہمیں بھی ثواب مل جائے گا۔“ اس نے معصوم شکل بنا کر یوں کہا جیسے اس کے علاوہ دنیا میں کوئی اور نیک انسان نہیں ہے۔

”دوسروں کے سامنے اپنی نیکی کا اعلان کرنا بھی نیکی کا کام ہے۔ قربانی کا جانور خرید کر اس کی قیمت دگنا کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے بھی ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا، لیکن اس نے محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی توجہ اپنے موبائل کی طرف ہو گئی تھی، جو ایک بار پھر بج اٹھا تھا۔

”اف بلال! آپ بھی ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ بتائیں کس بات کی جلدی ہے آپ کو.....“ اچھا! ٹھیک ہے، آئی ہوں۔“ اس نے چڑ کر کہا اور غصے سے موبائل بند کر دیا اور پھر میری طرف دیکھ کر زبردستی مسکرائی۔

”بھابھی! بلال گھر آگئے ہیں۔ میں اب چلتی ہوں۔ کل پھر آؤں گی۔“

”ہاں بھئی! ابھی تمہارے آنے کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ جب تک تم اپنے خریدے ہوئے جانوروں کی قیمتیں دگنا کر کے نہیں بتاؤ گی، تمہیں چین کہاں ملے گا۔“ میں نے سوچا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ عثمان کے آنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ میں فوراً اٹھ کر روٹیاں پکانے لگی۔

”بابا! ہم لوگ قربانی کا جانور کب لیں گے۔ میرے

کھانے کے معاملے میں ہمیشہ سے چور تھا۔ اس وقت بھی اسے کھانے سے زیادہ بکروں کی فکر سوار تھی۔ ”خرید لیں گے آج کل میں۔“ عثمان نے پانی پیتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

مجھے لگا جیسے عثمان اسے ٹال رہے ہوں۔ میں نے احمر کوٹو کا کہ وہ دھیان سے کھانا کھائے۔ وہ ہمیشہ بکروں کے بارے میں اتنا ہی بر جوش ہوتا ہے۔ وہ تو چھوٹی عید کے فوراً بعد عثمان کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ بکرے خریدیں اور جب بکرے آجائیں تو پھر نہ اسے کھانے کا ہوش رہتا تھا، نہ ہی کسی اور چیز کا۔ اسکول سے آتے ہی وہ بکروں میں مگن ہو جاتا ہے۔ کبھی انہیں منہلا رہا ہے، کبھی چارہ کھلا رہا ہے اور کبھی بکروں کو سیر کرائی جارہی ہے اور پھر قربانی کے بعد نہایت اداس ہو جاتا ہے۔ سارا دن کچھ کھاتا پیتا نہیں۔

”عثمان بیٹا! آج مجھ سے قربانی کا جانور خریدنے کی رقم لے لیتا۔ یہ بھی سر پر ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اگر مجھ سے خرچ ہو گئے تو بلاوجہ پریشانی ہوگی۔“ امی نے کھانے کے دوران عثمان سے کہا۔

”امی! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں، اگر آپ سے پیسے خرچ ہو بھی گئے تو کیا میرے پیسے اور آپ کے پیسے علیحدہ علیحدہ ہیں؟“

”بیٹا! ایسی بات نہیں ہے۔ عورت اگر صاحب نصاب ہو تو اسے خود قربانی کرنا چاہیے، ورنہ مرد کے ذمہ اس کی طرف سے قربانی کرنا ضروری نہیں۔ گنجائش ہو تو کروے اور پھر یہ میرے دلی سکون کی بات ہے۔ مجھے اسی میں خوشی ملتی ہے۔“ امی کی بات سن کر عثمان خاموش ہو گئے۔

عثمان کے آفس جانے کے بعد میں کچن سمیٹ کر امی کے کمرے میں آئی تو احمران کے بستر پر لیٹا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ بھی اماں کا معمول تھا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد احمر کو اپنے کمرے میں لے آئیں اور باتوں باتوں میں بہت سی دینی باتیں اسے بتا دیتیں۔ میں نے علیزے کو قالین پر بٹھایا اور اس کے سامنے

ھلوانے رکھ کر خود احرار کی باتیں سننے لگی۔
 ”اچھا! یہ بتاؤ ہم لوگ قربانی کیوں کرتے ہیں؟“
 اماں نے احرار کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے
 پوچھا۔
 ”کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے
 پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔“ احرار نے
 مقصودیت سے جواب دیا۔
 ”شاباش بیٹا! اماں نے خوش ہوتے ہوئے اس کا
 ماتھا چوم لیا۔

”قربانی ایک اہم عبادت اور شعائر اسلام میں سے
 ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا
 تھا۔ مگر وہ بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے۔ اسی طرح
 آج بھی دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور
 پر ادا کی جاتی ہے۔ مشرکین اور عیسائی بتوں کے نام پر یا
 مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں۔ سورہ کوثر میں اللہ
 تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے
 کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔
 قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہیے۔ دوسری ایک
 آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے بیان فرمایا
 ہے۔ ”بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری
 زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں
 کا پالنے والا ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد
 دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا۔ ہر سال برابر قربانی
 کرتے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ
 معظمہ میں حج کے موقع پر واجب نہیں بلکہ ہر شخص
 پر ہر شہر میں واجب ہوگی بشرطیکہ شریعت نے قربانی
 کے واجب ہونے کے لیے جو شرائط اور قیود بیان کی
 ہیں وہ پائی جائیں۔ ”امی نے اسے تفصیل سے بتایا۔
 ”لیکن امی! آج کل تو قربانی بھی لوگوں کے لیے
 ثواب سے زیادہ نمود و نمائش کا کھیل بن چکا ہے۔ لوگ
 اب قربانی ثواب کی نیت سے نہیں بلکہ معاشرے
 میں اپنی ناک اونچی کرنے کے لیے کرتے ہیں۔“ یہ
 شاید نانی کی باتوں کا اثر تھا کہ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے

بھی بخ ہو گیا۔
 ”ہاں بیٹا! بعض لوگ یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ طائر
 نہ ہونے کے باوجود شرم کی وجہ سے قربانی کرتے ہیں کہ
 لوگ یہ کہیں گے کہ انہوں نے قربانی نہیں کی۔ محض
 دکھاوے کے لیے قربانی کرنا درست نہیں۔
 بہت سے لوگ محض
 گوشت کھانے کی نیت سے قربانی کرتے ہیں۔ اگر
 عبادت کی نیت نہ ہو تو اس کو ثواب نہیں ملے گا۔
 بعض لوگ گائے یا بھینس میں حصہ رکھ لیتے ہیں اور یہ
 نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں کے حصے رکھے ہیں وہ کیسے
 لوگ ہیں۔ یہ بڑی غلطی ہے۔ اگر سات حصہ داروں
 میں سے ایک بھی بے دین ہو یا اس نے قربانی ثواب کی
 نیت سے نہیں بلکہ محض گوشت کھانے کے لیے کی تو
 سب کی قربانی برباد ہوگئی۔ اس لیے حصہ ڈالتے وقت
 حصہ داروں کا انتخاب بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے۔“
 امی نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور احرار کے ماتھے پر
 ہمار کیا جو باتوں کے دوران سو گیا تھا اور نماز پر ہنسنے کے
 لیے اٹھ گئیں۔

رات کو جب میں بچوں کو سلا کر کمرے میں آئی تو
 عثمان کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ میں نے بیڈ پر ان
 کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کا کندھا ہلایا تو وہ ایک دم چونک
 پڑے۔
 ”کیا بات ہے عثمان! آپ کچھ پریشان لگ رہے
 ہیں؟“ میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔
 ”کچھ نہیں۔ بس یوں ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔“
 عثمان کی عادت تھی کہ وہ مشکل سے ہی اپنی پریشانی کسی
 دوسرے سے بیان کرتے تھے۔ مجھے ان کی اس عادت
 سے چڑھ گئی۔ اس لیے میں خاموش ہو گئی۔
 ”لا میں! میں آپ کا سر دباؤں۔“ کچھ دیر بعد میں
 نے کہا تو وہ کسی گہری سوچ سے چوٹے اور تکیے پر سر رکھ
 کر لیٹ گئے۔
 میں ان کا سر دبانے لگی۔ وہ تھوڑی دیر سوچوں میں

گم رہے پھر متفکر سے انداز میں بولے۔
 ”سعدیہ! آج کل کاروبار کچھ مندا چل رہا ہے۔
 بڑی عید بھی سر پر ہے۔ قربانی کے لیے جانور بھی
 خریدنے ہیں۔ ویسے تو میں اس چیز کو جواز بنا کر اس
 سال قربانی نہ کروں، لیکن میرا دل نہیں مان رہا ہے۔ ہم
 لوگ اپنے باقی سارے اخراجات تو اسی طرح کرتے
 ہیں۔ بس ڈنڈی مارنی ہو تو صرف دین کے کاموں ہی
 میں مارتے ہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ تمہاری جو کمیٹی نکلی
 ہے وہ رقم تم مجھے دے دو۔ اس سے جانور خرید لیں
 گے اور جب نقصان پورا ہو جائے گا تو میں تمہیں رقم
 واپس لوٹا دوں گا۔“

”میری کب سے خواہش تھی کہ کمیٹی نکلے تو میں
 سونے کے کنگن بناؤں۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ
 کی نظر میری کمیٹی پر ہے۔“ غیر ارادی طور پر میری
 زبان سے نکل گیا۔
 عثمان میری بات سن کر اک دم چپ ہو گئے اور
 میرے ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر اپنی جگہ پر کھڑک بدل
 کے لیٹ گئے۔ عثمان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ
 ایک بار بات کرنے کے بعد اسے دوبارہ دہراتے نہیں
 تھے۔

میں ساری رات خود کو ملامت کرتی رہی کہ میں نے
 عثمان سے اس طرح کیوں کہا۔ یہ بات صحیح ہے کہ
 سونے کے کنگن بنانے کی میری خواہش بہت دیرینہ
 ہے، لیکن جب کمیٹی نکلی تھی تو مجھے پہلا خیال یہی آیا
 تھا کہ میں یہ پیسے عثمان کو دے دوں گی، تاکہ وہ کاروبار
 میں لگا سکیں اور اب جب خود عثمان نے مجھ سے پیسے
 مانگے تو میں نے انہیں اس طرح نکا سا جواب دے
 دیا۔ میں ساری رات اس پریشانی میں صحیح طرح سے سو
 نہیں سکی۔

میں صبح جب اٹھی تو طبیعت بہت ست تھی۔
 عثمان کا رویہ میرے ساتھ بالکل نارمل تھا۔ اس سے
 مجھے اور زیادہ دکھ ہوا، کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ کبھی بھی

مجھ سے میرے رویے پر شکوہ یا شکایت نہیں کریں
 گے۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح ان سے معذرت کر لوں
 گی، لیکن مجھے موقع نہ مل سکا اور دوپہر کو عثمان کا فون
 آگیا کہ وہ آج کسی ضروری کام کی وجہ سے لُنج پر نہیں
 آسکیں گے۔ اس لیے میں سعد کو فون کر دوں کہ وہ احرار
 کو اسکول سے لے آئے۔ صبح مجھے اس بات کی تسلی
 تھی کہ دوپہر کو جب عثمان گھر آئیں گے تو ان سے
 معذرت کر لوں گی اور انہیں پیسے دے دوں گی، لیکن
 میں ایک بار پھر مایوس ہو گئی۔

میں نے بے دلی سے اپنے جیٹھ کے گھر فون کیا تو
 فون میری جیٹھانی نے اٹھایا۔ ان کی آواز بہت چمک
 رہی تھی۔ انہوں نے بہت خوش دلی سے میری اور
 بچوں کی خیریت پوچھی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، مگر اپنی
 حیرت پر قابو پا کر میں انہیں اپنے فون کرنے کی وجہ
 بتائی تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں بھی ابھی تمہیں ہی فون کرنے والی تھی۔“
 ”خیریت بھابھی؟“ اس بار میں اپنی حیرت چھپانے
 سکی۔ جسے انہوں نے بھی فوراً محسوس کر لیا۔
 ”کیوں بھئی! میں تمہیں فون نہیں کر سکتی کیا؟“
 انہوں نے تیز آواز میں کہا۔

”نہیں بھابھی! ایسی بات نہیں۔ وہ دراصل آپ
 نے اس طرح سے کبھی فون نہیں کیا ناں۔“ میں نے
 فوراً وضاحت دی۔

”وہ میں سوچ رہی تھی کہ کافی عرصہ ہو گیا ہے
 ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ تو کیوں نہ آج
 رات کا کھانا تم لوگ ہماری طرف کھاؤ۔“
 ”اس میں بھی آپ کے مزاج کا تصور ہے بھابھی
 صاحبہ! کہ اتنا قریبی رشتہ ہونے کے باوجود بھی ہم ایک
 دوسرے سے ملنے سے کتراتے ہیں۔“ میں نے
 سوچنے لگی اور پھر ان کی آواز پر چونکی۔

”میں عثمان کو اس کے موبائل پر فون کر کے کہہ
 دیتی ہوں۔ وہ آفس سے سیدھا ہماری طرف آجائے
 گا۔ تم اور اماں ایسا کرو! جب سعد احرار کو گھر چھوڑنے
 آئے گا تو اس کے ساتھ ہی بچوں کو لے کر آجائے۔ تم

لوگوں کو آسانی رہے گی ورنہ بلاوجہ چھوٹے بچوں کے ساتھ رکنا، ٹیکسی کے دھکے کھانے پڑیں گے۔“ میں ان کی اس فراخ دلی پر ایک دفعہ پھر حیرت زدہ رہ گئی۔

پھر جب ہم ان کے گھر گئے تب مجھ پر ان کی اس اچانک بیدار ہوئی محبت کا عقدہ کھلا۔ انہوں نے پورے گھر کو نئے سرے سے پینٹ کروایا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرائنگ روم کا سارا فرنیچر نیا اور عمدہ کوالٹی کا تھا۔ اس کے ساتھ میچنگ پردے اور کارپٹ بھی بالکل نئے اور اپنی قیمت کا اعلان کر رہے تھے۔

”اوہ! تو بھابھی یہ سب مجھے دکھانا چاہتی تھیں، تاکہ مجھ پر اپنی حیثیت کا رعب ڈال سکیں۔“

اگر میں امی کی محبت میں نہ رہ رہی ہوتی تو ایک عام عورت کی طرح یہ سب دیکھ کر حسد یا جلن کا شکار ضرور ہوتی، لیکن اپنی ساس کے ساتھ رہنے سے میری طبیعت میں ایک تبدیلی یہ پیدا ہوئی ہے کہ اگر وقتی طور پر ایسا کوئی جذبہ میرے اندر سر اٹھاتا بھی تھا تو میں فوراً اس پر قابو پا لیتی تھی۔ امی کے ساتھ رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ میں نے ہر حال میں شکر کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونے کا ذہنک بھی میں نے اپنی ساس سے ہی سیکھا ہے۔ اسی لیے میں نے بہت خوش دلی سے بھابھی کو اس نئی سیشنگ پر مبارکباد دی اور ان کے انتخاب کو کھلے دل سے سراہا۔ انہیں شاید مجھ سے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ ان کا چہرہ بچھ گیا، لیکن پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا کر انہوں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

”اس دفعہ ہم لوگ بڑی عید پر قربانی نہیں کر رہے، اس لیے میں نے سوچا عید سے پہلے ہی تم لوگوں کی دعوت کر لوں۔“

”ایک دوسرے کی دعوت کرنا اچھی بات ہے۔ اس

سے مل جل کر بیٹھنے کا موقع ملتا ہے اور عید تو بہانہ ہو ہے ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا۔ لیکن قربانی دعوت کرنے کی نیت سے نہیں، بلکہ ثواب کی نیت سے کی جاتی ہے۔“ امی نے بھابھی کو ٹوک دیا۔

بھابھی کو امی کا ٹوکنا برا لگا۔ ان کا فوراً منہ بن گیا۔ بھائی جان کے اشارے پر وہ خاموش ہو گئیں۔ ورنہ ان کی طبیعت میں برداشت کا مادہ بہت کم تھا۔

کھانے کے بعد جب سب چائے پی رہے تھے امی نے ایک بار پھر قربانی کا موضوع چھیڑ دیا۔

”انوار بیٹا! اس دفعہ تم لوگ قربانی نہیں کر رہے؟“

امی نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں پوچھا۔ بھائی جان اک دم سٹپٹا گئے اور مدد طلب نظروں سے بھابھی کو دیکھا۔ کیونکہ بھابھی ہمیشہ بھائی جان پر حاوی رہی ہیں، سو اب بھی انہوں نے ہی امی کو جواب دیا۔

”امی! آپ دیکھ تو رہی ہیں کہ گھر پر کتنا خرچہ ہوا ہے۔“

”انوار بیٹا! یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو سراسر فضول خرچی ہے۔“ امی نے بھائی جان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، جن کی نظریں ابھی تک بھابھی کے چہرے پر تھیں، لیکن بھابھی کو اماں سے اس بات کی توقع نہیں تھی، پہلے تو وہ حیران ہوئیں، مگر پھر اگلے ہی لمحے تیز لہجے میں بولیں۔

”امی! آپ بھی پتا نہیں کس زمانے میں رہتی ہیں۔

ہماری تین جوان بیٹیاں ہیں۔ کل کو ہمیں ان کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔ آج کل وہ دور نہیں، جب صرف لڑکی کی شکل و صورت یا تعلیم دیکھی جاتی تھی، اب تو سب سے پہلے لڑکی کا گھر دیکھا جاتا ہے۔ جتنا بڑا اور فرنیشڈ گھر ہوگا، لڑکی کو اتنا ہی اچھا رشتہ ملے گا۔

لڑکے والوں پر رعب ڈالنے کے لیے یہ سب بہت ضروری ہو گیا ہے۔ قربانی تو ہم ہر سال ہی کرتے ہیں۔ اس سال نہیں کریں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ ماشاء اللہ! میرے چاروں بھائی بکرے اور گائے دونوں

کی قربانی کرتے ہیں۔ ہمیں گوشت کی کمی نہیں ہوگی۔ پہلے دن ہی ہمارا فریزر گوشت سے بھر جائے گا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ لوگوں سے نہیں مانگیں گے۔ ویسے بھی عثمان مشکل سے ایک بکرا ہی انورڈ کر سکتا ہے، اپنی محدود آمدنی میں۔ وہ بھی اگر سارا بانٹ دے گا تو پھر آپ لوگ گوشت کہاں سے کھائیں گے؟“

میں نے عثمان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ بالکل ساٹ تھا، لیکن میں جانتی تھی وہ کتنی مشکل سے بھابھی کی باتوں کو برداشت کر رہے ہیں۔ امی نے بھی بھابھی کی بات پر انہیں ناگواری سے دیکھا۔ لیکن اپنا لہجہ دھیمہ اور نرم ہی رکھا۔

”بسو! پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قربانی عمر بھر میں ایک دفعہ کر لینا کافی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جس طرح زکوٰۃ اور صدقہ فطر ہر سال واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر صاحب نصاب پر قربانی بھی ہر سال واجب ہے۔ قربانی نہ کرنے پر احادیث میں بہت سی وعیدیں مذکور ہیں، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ہے کہ جو قربانی نہ کرے وہ ہماری عید گاہ میں نہ آئے۔“ امی کی بات سن کر بھائی جان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”قربانی کے دنوں میں قربانی کرنا بہت بڑا عمل ہے۔ حدیث میں ہے کہ قربانی کے دنوں میں قربانی سے زیادہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں اور قربانی کرتے وقت خون کا جو قطرہ زمین پر گرنا ہے وہ گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو جاتا ہے۔“

”امی جان! ہم لوگ بھی الحمد للہ مسلمان ہیں اور قرآن و احادیث سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اگر گنجائش ہو تو ضرور قربانی دیتے۔“ بھائی جان نے نظریں جڑاتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

امی نے ایک نظر انوار بھائی کو دیکھا اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولیں۔

”ایک مسلمان اور پھر تمہاری ماں ہونے کے ناتے میرا فرض تھا کہ میں تمہیں ایک اچھے عمل کے بارے میں بتاؤں۔ آگے تمہاری مرضی۔ ہر شخص کا عمل اس کے اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کے عمل کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔“

واپسی کا راستہ بہت خاموشی سے گزرا۔ سب ہی اپنی اپنی سوچوں میں مگن تھے۔ مجھے معلوم ہے بھائی جان اور بھابھی کے رویے سے امی اور عثمان بہت دل برداشتہ ہوئے ہیں۔

ہدایت اور بھلائی بھی ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی، لیکن امی نے ایک بات ٹھیک کہی تھی کہ ہر انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہوتا ہے اور عمل کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے۔ یعنی ہر انسان کو اس کی نیت کے حساب سے اس کے عمل کا اجر ملے گا۔ لہذا قربانی کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ نے کتنا منگا اور اعلا نسل کا جانور خریدا ہے، بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ آپ کس نیت سے قربانی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پاس نہ تو آپ کی قربانی کے جانور کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ہی اس جانور کی کھال۔ ہاں! وہ آپ کی نیت ضرور دیکھتا ہے۔ قربانی کرنے کا اصل مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔

میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے کہ گھر جا کر میں عثمان سے اپنے رویے کی معافی مانگوں گی اور انہیں وہ رقم دوں گی، تاکہ وہ قربانی کا جانور خرید لیں۔ نیت صاف ہو تو پھر آپ کا ہر عمل صحیح ہوتا ہے۔ عثمان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب دوسرا بندہ خود اپنی غلطی تسلیم کر لے تو وہ بھی فوراً اپنا دل صاف کر لیتے ہیں۔

میں نے ایک پیار بھری نظر عثمان پر ڈالی اور پھر سکون سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔



ساترہ رخصتا

روٹی کا حکم

سنائی نہیں دی تھی۔ ڈرل مشین پل بھر کو رکی تو بیل نے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آواز کے تو میں فون تلاش تو خود ہی تقریباً "فون پر چڑھا بیٹھا تھا۔" سات مسڈ کال "اونو۔" "ہیلو، ہیلو، علیکم السلام!" "نہیں! میں کمرے میں نہیں تھا۔" "کمرے میں نہیں تھے تو کہاں تھے۔ اور یہ شور کیسا ہے، لگتا ہے جیسے کوئی ڈرل مشین چل رہی ہو، کیا ہو رہا ہے؟" "نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ سرے سے دوسرے کمرے کی جانب بڑھا۔ "آپ بتائیے! طبیعت ٹھیک ہے نا؟ شوگر کنٹرول ہے؟"

"زول۔۔۔ نف۔۔۔ ل۔۔۔ ل۔۔۔ زول۔۔۔" ڈرل مشین کی مسلسل چلتی آواز اس کے اعصاب کا کڑا امتحان تھی۔ وہ ٹی وی لائونج کے تھری سیٹر صوفے کی درمیانی نشست پر پیر لٹکائے سینے پر بازو لپیٹے بیٹھا تھا۔ پلکیں جھپکائے بنا کریم کلر کی دیوار کو گھور رہا تھا۔ تصور کی آنکھ جو منظر کشی کر رہی تھی وہ اس کے صحت مند چہرے، سرخ و سفید رنگ کو لال انگارے میں بدل رہی تھی۔ اور منہ سوچ سوچ کر اس غبارے کی مانند ہو رہا تھا جس کے پھٹنے میں بس اگلا منٹ درکار ہو۔ فون کب سے بج رہا تھا۔ وہ اپنی غصیلی سوچوں میں بری طرح تو گم تھا ہی مگر ڈرل مشین کے شور میں آواز

مکھنناؤں



ہے اور موسم کیسا ہے؟“
 ”ارے! یہاں اگر سارے دل در دور ہو گئے ہیں۔ میرے بھی اور تمہاری داوی جان کے بھی۔ کچے پر پہلی نظر پڑنے کی دیر تھی۔ لوگ حج کرنے کے بعد کی زندگی کو نیا جنم کہتے ہیں۔ ہم تو اس پہلی نگاہ میں ہی دھلے دھلائے ہو گئے۔ یہ کوئی نیا آسمان ہے نئی زمین اور ہم بھی وہ نہیں جو گھر سے نکلے تھے۔ نئے نئے سے خود اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو پہچان نہیں پاتے۔“
 ہر زاویہ کی طرح دادا جان پر بھی مکہ کافسوں چڑھ گیا تھا۔ وہ کہنے کو اس کا حال چال پوچھنے کو فون کرتے تھے، مگر قصے سارے اپنے کہتے تھے۔
 ”آپ خوش نصیب ہیں دادا جان!“ وہ مسکرایا۔ اسے اپنی مسکراہٹ بہت خوشی دے رہی تھی۔
 ”بالکل بالکل! یہاں اگر یقین آگیا۔“ دادا جان خوش دلی سے ہنسے۔ ”تم سناؤ! مجھے مجھے لگ رہے ہو۔ بور ہو رہے ہوتا؟ بس بیٹا چند دن اور۔۔۔“
 ”اُس اوکے! آپ میری فکر نہ کریں۔ داوی جان ٹھیک ہیں نا اور۔۔۔“
 ”وہ ٹھیک ہیں۔ انہیں یہاں کوئی اسکول کے زمانے کی دوست مل گئی ہے۔ دونوں بڑھیا میں اپنے اپنے گناہوں کی معافی اکٹھے ہی مانگتی ہیں۔ ہا ہا ہا۔“
 ”بری بات دادا جان۔“ وہ جو بہت دیر سے تن کے بیٹھا تھا، بیڈ پر ڈھیلا سا ہو کر نیم دراز ہو گیا۔
 ”بھابھی بیگم کیسی ہیں؟ میری ان سے بات ہی نہ ہو سکی۔ بیٹا کافون بھی بند جا رہا ہے۔ تم تو میری بات کروانا۔ اور تم ان کا خیال رکھ رہے ہو نا؟ کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے نہ ہی کسی کو شکایت۔“ دادا جان دھیان آنے پر ہمیشہ کی یاد دہانی کروانے لگے۔
 وہ دوبارہ تن کے بیٹھ گیا (انہیں اب میری کیا ضرورت۔۔۔ مجھ سے بہتر خیال رکھتا تو جا رہا ہے۔)
 ”جی دادا جان! رکھتا ہوں خیال۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ چاچو کدھر ہیں؟“
 ”تمہاری داوی جان تمہارے کھانے کے حوالے

سے فکر مند ہو رہی ہیں کہ باہر کا گند مند کھانا ہو گا۔ نے تشفی کروائی بھابھی بیگم اور نوین بیٹا ہیں نا جو مرضی کھاؤ پو، مگر ناشتا گھر کا بنا ہوا کرنا مجھے تمہارے چچا۔“
 اس نے دیوار گیر گھڑی پر ٹائم دیکھا۔ دن کے بج رہے تھے اور ابھی تک اس نے ناشتا نہیں کیا دیر سے سو کر تو اٹھا تھا۔ مگر دیکھو جو ذرا پروا ہو۔۔۔“
 ”چند ناشتا کر لو۔ خالی پیٹ چائے مت لیتا۔ پہلے کھاؤ اور اب دیکھو! اچال ہے جو تین دن سے ہو، زندہ ہو یا مر گئے۔ ہا ہا! اور دادا جان کہتے ہیں گھ ہونا ناشتا۔؟“
 اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ناشتے کا قصہ کیا۔ جلے اکڑے سیاہ توپ۔ اندھے کی زردی گزر۔ وقت کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل پھسل گئی۔
 ”ری چائے۔۔۔ وہ چائے کے مخصوص ذائقے کا حامل تھا۔ مناسب چینی، مناسب پتی اور مناسب دودھ نہ اور نہ زیادہ بلکہ زیادہ تو حلق سے بھی نہیں اتر پاتی اور خود سب کام کر لیتا تھا، مگر اپنی ہی پسند کے فلیور کی چائے نہیں بناتا تھا۔ داوی جان بنادیں، داوی بیگم بنادیں یا پھر۔۔۔ اسے یکدم یاد آیا۔ اس کے ہاتھ کی چائے پر کیا جانے والا تاریکی بصر۔
 ”توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ یہ چائے ہے۔ اسے چائے کہتے ہیں۔ غضب خدا کا۔ چینی کا ڈھیر پتی کا ڈبالتھ دیا گو اور دودھ توبہ! رنگ دیکھو چائے ہے یا کاڑھا۔ خبردار! جو تم نے آج کے بعد مجھے کبھی چائے کی آفر کی۔ پکن اپنی پیالی۔ توبہ توبہ۔۔۔ چائے پیس کی میں اپنے ہاتھوں سے بناؤں گا۔“ اس کے لہجے کی نقل اتار کر پیالی میں بچ کر رکھی تھی۔
 ”کالے منہ والی بد کردار چائے نہ شکل نہ عطر نہ رنگ نہ ذائقہ مطلق کڑوا کر دیا۔“
 اور وہ جو اپنی چائے کی اس کردار کشی پر روکھا ہوا تھا۔ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔
 ”اب خیال نہیں آ رہا۔ تین دن سے میں دلی

کالے منہ والی بد کردار چائے لی رہا ہوں گا۔ سچ ہے بھئی! دنیا مطلب کی۔ جب کوئی نہیں تھا تو میں تھا۔ اب جب کوئی ہے تو میں کیوں ہوں گا؟“
 دادا جان کو جھولی چچی کہہ سنا کر اس نے فون رکھ دیا۔
 پہلے سوچا پڑا کا آرڈر دے مگر تین دن سے پڑا ہی تو کھا رہا تھا۔
 اوں ہوں!“ یہ۔۔۔ خیال برو کیا، پھر۔۔۔ دودھ پی کر کچھ غور کرنے کا سوچا، مگر لاؤنج میں آتے ہی ڈرل مشین۔ مانو دماغ گھوم گیا۔
 ”نی الوقت گھر سے بھاگ جانے۔ سے اچھا خیال کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔“



”آپ کو خبر ہے لڑکیوں کی تربیت کتنا نازک اور اہم کام ہے؟“ سوال کے ہاتھ میں لمبی پتلی سی چھڑی تھی جو کل مالی سے لان کی چھٹائی کرواتے ہوئے اس نے نجانے کہاں سے توڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ اب اسے تول تول کر اپنے ہاتھ پر خود ہی مارتے ہوئے اس کے خطاب کا وقت ہو گیا تھا۔
 ”پہلے زمانے کی لڑکی پروے میں سب کی نظروں کے درمیان پروان چڑھتی تھی اور اسے اس وقت خطرہ تھا، صرف خاندان کے کسی کزن سے چاچے مامے کے لڑکے سے یا کوئی شیر دل ہمت کر کے رقعہ بھیج دے تو جیسے آخری حد۔ اور لڑکیاں گھر سے نکلتی کب تھیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ کسی شادی عقیقے پر جب سب گولے لپے پہن کر اکٹھے ہوتے۔ تو اگر کسی بے چارے کی کسی بے چاری سے نگاہ مل جاتی تو بس جی! اگلے روز رشتہ، چھ ماہ بعد شادی۔ دی اینڈ۔ جبکہ۔۔۔ ہم نے چھڑی کرسی کی ہتھی پر برسائی۔
 ”جبکہ آج کی لڑکی کے لیے جگہ جگہ خطرات ہیں۔ جیسے اسکول، کالج، یونیورسٹی، گوجنگ ڈرائیورز، موبائل فون انٹرنیٹ۔۔۔ ہر جگہ خطرہ ہی خطرہ۔۔۔ چلتے رستے پر اتنی بہت ساری کہانیاں

سنجھ کر چلیں تو چلیں، ورنہ گرنے کے چانسز زیادہ۔ سو آج کل کی لڑکیوں کے لیے زیادہ مشکلات اور خطرات ہیں اور ان کی تربیت ایک بالکل نئے انداز سے کرنے کی اشد ضرورت ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔
 ”اور مجھے بہت افسوس ہے کہنا پڑتا ہے۔“ ڈرامائی وقفہ دیا۔ ”کہ نانا میاں نے آپ دونوں کی تربیت پر بالکل توجہ نہیں دی۔ اور وہ بھی نئے زمانے کے حساب سے۔۔۔ چچ چچ۔۔۔ آپ دونوں قطعی طور پر ناموزوں ثابت ہوئی ہیں۔“
 وہ جیسے شدید صدمے سے اب مزید بولنے سے قاصر تھی۔
 اس کی لٹر لٹر چلتی زبان سے سحر زدہ نوین تو اول روز ہی سے اس کی زبان دانی کی قائل ہو گئی تھی اور دس روز سے اس کے تمام سنہری کلمات سے فیض یاب

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم

ننگے پاؤں

منگوانے کا ہند:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

ہو رہی تھی۔
نوال کا منہ کھلتا تو نوین کا سارا وجود سماعت کا آلہ بن جاتا۔ نجانے کس پل کیا سننے کا مل جائے مگر یہ جملہ وہ کریں پر بیٹھی تھی کہنی ہتھی پر اور بند ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکی تھی۔ نوال کا جملہ سمجھ میں آیا تو جیسے ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

”لڑکیاں! کون لڑکیاں یہاں کون سی لڑکیاں ہیں؟“ اس نے چار جانب دیکھا۔

کن دو لڑکیوں کی تربیت میں چوک ہو گئی تھی؟ اس گھر میں تو وہی دو تھیں۔ ایک وہ نوین منیر عمر بیس سال اور دوسری اس کی امی زینت منیر۔ تو کیا ان دو لڑکیوں کی تربیت خراب ہو گئی، مطلب غلط کی گئی۔
”بیس سالہ نوین منیر اور چونسٹھ سالہ زینت زوجہ منیر خان۔“

نوال ضمیر خان جیسے ہار مان کے بیٹھ گئی۔ اپنی نانی زینت منیر خان کا ہر سال چہرہ اس کے سارے خطاب پر پانی پھیر رہا تھا۔

اگلے پل نوین اپنی امی کے ہمراہ ہنسی سے دہری ہو گئی تھی۔

”لڑکیاں؟“ ہنسی رکتی تو لفظ ”لڑکی“ پر ایک بار پھر پھوٹ پڑتی۔ ہنسی کے رکنے تک وہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو چکی تھی۔

”تو کیا آپ لوگ لڑکیاں نہیں ہیں؟ لڑکے ہیں کیا؟ اور اتنی بھی ہنسنے کی بات نہیں۔ یہ ہنسی کا نہیں رونے کا مقام ہے اس قدر ناکارہ۔ اب میں تو تصور نہیں کر سکتی ایسی زندگی کا جیسی آپ لوگ گزار رہی ہیں محتاجی کی زندگی بلکہ احترام ملحوظ خاطر۔ نکمی۔ ہڈ حرامی والی بزدل زندگی۔“

ضمیر بھائی کا فون ہر بار خوشی بے فکری اور پل بھر کے لیے ہی سہی ہر شے کو بھلا دینے والا ٹانگ ہوا کرتا تھا۔ جب سے انہوں نے بتایا کہ نوال کراچی آنا چاہ رہی ہے اور ان کے ہاں رہے گی۔ اور اگر اس کا

مانڈ سیٹ ہو اور موڈ بن گیا تو وہ آنرز کے لیے ”جامعہ کراچی“ میں داخلہ بھی لے سکتی ہے۔
اور ظاہر ہے جب جامعہ کراچی میں داخلہ لے گی تو رہے گی بھی یہاں ان کے گھر اور دوسرا کون ہے یہاں جہاں جا کر وہ رہے؟ کیا نانی کا گھر ہوتے ہوئے ہاسٹل میں رہے گی۔

ان دونوں کی تنہا۔ یکدم تنہا اس بے رنگ زندگی میں نوال کی آمد۔ خوشی رنگ اس امید ہنسی بن کر اتری۔

نوین تنہائی پسند تھی یا تنہا رہ کر اب عادی ہو چکی تھی۔ اس نے پہلے نوال کے لیے اپنے کمرے میں جگہ بنانے کا ارادہ کیا، پھر یہ سوچ کر دو سر اکڑہا دیا کہ شاید وہ اپنے لیے علیحدہ کمرے کی خواہش کرے بوجہ پرائیویسی۔

زینت بیگم نے کچن ہر طرح کے کھانے پینے کے سامان سے بھر لیا، کسی بدلی۔ گھر ایسے صاف ستھرا ہوا کرتا تھا جیسے کسی شیشے کے بکس میں بند ہو، مگر دونوں نے مل کر کونے کھد رے بھی جھاڑ ڈالے جیسے نوال انکیشن کے لیے آنے والی ہو۔

نوال اٹھارہ برس کی تھی۔ ایک طلسماتی گنگناتی عمر کا دور۔ مگر زینت بیگم کے داغ میں نجانے کیا سما یا ان کے تصور میں وہی بچی تھی جب اسے پہلی بار گود میں لے لیا تھا۔

انہوں نے ایک بے حد خوب صورت بابرٹی ڈول بمعہ لوازمات کے کمرے میں سجا ڈالی۔

نوین ان کی آخری عمر کی اولاد تھی۔ ان کی پہلی اولاد نعمان تھا اور دونوں بچوں کے بیچ بارہ برس کا فرق تھا۔ وہ تو بس ایک اکلوتے بیٹے ہی کو پال رہے تھے۔ نوین کی پیدائش بہت خوشی کا باعث تھی۔ مگر وہ جتنی توجہ نعمان کو دیتے تھے نوین ذرا سی نظر انداز ہو گئی۔ نعمان اپنی بیماری کے باعث ہم عمروں سے پیچھے رہ گیا۔ وہ کچھ عرصہ ہوا گیا تھا۔ اگلی کلاس میں جانے والے فیلوز آواز نہ کتے تھے وہ ایک لائق اور ذہین طالب علم تھا۔ فقط امتحان کے مہینے میں شدید بیماری کے باعث امتحان نہ

دے سکا۔ اس کا پچھلا ریکارڈ اس بات کا متقاضی تھا کہ اسے اگلی کلاس میں ترقی مل جاتی مگر منیر خان کی اصول پسند فطرت نے اس چیز کو سخت ناپسند کیا۔

نتیجتاً ہونے والے نفسیاتی بدلاؤ سے نبٹنے کے لیے دونوں میاں بیوی کو بہت محنت کرنا پڑی۔ نوین فطرتاً نازک خاموش طبع اور خود میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی دنیا بسائی ہوئی تھی۔ گڑیوں، کھلونوں اور کتابوں کے ساتھ اب منیر خان کی دس ماہ پہلے ہونے والی موت نے زینت بیگم اور نوین کو ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا تھا۔

نعمان سالوں پہلے باہر پڑھنے گیا تھا اور اب اس کے اپنے بچے وہاں پڑھتے تھے کہ اس نے وہیں سے گوری حسینہ پسند کی اور رہائش کے لیے اسی دیس کو چن لیا۔

وہ باپ کے انتقال کی خبر سن کر ترنت پہنچا۔ اس نے تمام انتظامات سنبھال لیے تھے۔ مگر اسے واپس جانا تھا۔ اس نے ماں سے قطعاً ”ضد نہیں کی کہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی نہیں جائیں گی۔ وہی اپنا ملک، خاندان، مذہب۔۔۔ کچر اور اینٹ اینٹ جوڑ کر بنایا جانے والا گھر۔ مرحوم شوہر کی نشانیاں۔۔۔

سو جب بیٹے کے ساتھ نہیں گئیں تو اپنی پسندیدہ چیزوں کے ہمراہ رہیں۔ یہاں مگر ان سب من پسند چیزوں میں ایک چیز تنہائی بھی شامل کر لی جائے اور اب یہی تنہائی خاموشی اور سنائے کو توڑنے والی ضمیر آرہی تھی۔

اس نے اپنی آمد کے پہلے پل سے لے کر ان دونوں کو اتنا حیران کر دیا تھا کہ اب تو اپنی مسلسل حیرت پر بھی حیرت نہیں ہوتی تھی۔

سب سے پہلے تو اس کی ڈرنگ اور ہینڈ بیگ کے ہمراہ پشت پر لگے بیگ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ اتنا چھوٹا بیگ جس میں بمشکل دو جوڑے اور ایک جوتا آیا ہو گا۔ تو کیا وہ بس دو چار دن رہے گی؟ ضمیر بھائی تو کہہ رہے تھے عید کر کے جائے گی۔

اور کپڑے۔ اگر جو منیر خان حیات ہوتے؟ جاگرز کے اور جینز کے پائینچے مڑے ہوئے تھے۔ گول دامن کی جی قمیص ٹخنوں کو چھوتی تھی۔ اوپر چیک کا مردانہ کالر کف اور ڈھکن والی جینس سر پر اسکارف لپٹا تھا۔

ان دونوں سے گلے مل کر وہ صوفے پر ڈھے گئی۔ ٹانگیں تپائی پر رکھیں اور چٹکی سے اسکارف اتار کر زمین پر چھوڑ دیا۔ بالوں کا کلب کھول کر گود میں رکھا تو ریشمی گھنگھریالے بال چہرے اور شانوں پر بدلہوں کی طرح چھا گئے۔

”تمہارا سامان نوال!“ زینت بیگم کی سوتی وہیں اٹکی تھی۔

”یہ ہے نا۔“ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کھول کر تپائی پر الٹ دیا۔ دو جینز ایک ٹائٹس اور چار شرٹس ایک پھوٹی سی تھیلی میں شاید پونیاں وغیرہ۔

”بیٹا! تم تو عید تک رہو گی نا۔ یا پھر بس ملنے آئی ہو۔ دو چار روز کے لیے؟ ضمیر تو کہہ رہا تھا کہ۔“

زینت بیگم کے چہرے پہ مایوسی پھیل گئی۔
”اوہ نونانی جان۔“ وہ بھانپ گئی اچک کر ان کے گلے لگ گئی۔ گال پر زور کی بھی دی ”ضمیر ہمیشہ سچ کہتا ہے۔“ اس نے نوین کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر آنکھ دیا۔

اپنے باپ کے نام کا ایسا استعمال۔ نوین کا چہرہ حق دق رہ گیا۔

”تو اتنے کم کپڑوں میں اتنے دن کیسے گزریں گے؟“ زینت بیگم کپڑوں کو دیکھ کر بد مزہ ہوئی تھیں۔ اول تو انہیں کپڑوں کا اشاکل ہی پسند نہ آیا تھا اور دوئم اتنے بدرنگ کپڑے، کالی، نیلی اور گرے جینز۔ سفید ٹائٹس گرے براؤن سی گرین اور سفید رنگ کی شرٹس۔

”تو کیا کراچی میں بازار نہیں ہیں؟ میں تو نہیں لا سکتی بڑے بڑے صندوق بھر کے خواہواں۔ میں نہا کر فریش ہولوں تو چلیں گے شاپنگ پر۔ آپ کھانا لگائیے! میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔“

وہ مسلسل بولتے ہوئے بیگ میں واپس کپڑے ٹھونس رہی تھی۔ سفید ٹائٹ اور گرے بیگی شرٹ کندھے پر ڈال لی۔ شرٹ کے گلے میں سفید اور گرے اسکارف ٹھنسا ہوا تھا یہ یقیناً اس کی امی کا کام تھا۔

بیگ سے نفیس دوپٹا نکال زمین پر پھینکا۔
”کتنی دیر میں نکلو گی میں کھانا لگاؤں؟“ زینت بیگم نے صبح سے اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔
”بس دو منٹ میں۔۔۔ ویسے تو میں دیر سے نکلتی ہوں مگر آپ کو بھوک لگ رہی ہے۔۔۔ ہے ناں؟ بس دو منٹ۔“

زینت بیگم نے حیرت کا اظہار کیا۔
”آپ شوگر پیمینٹ ہیں ثانی جان! اور صبح سے بھوکی بھی ہیں۔ چہرہ سب کہہ دیتا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر آنکھ میچی۔ زینت بیگم کا چہرہ لال ہو گیا۔
”ہا ہا ہا۔۔۔ شرماتے ہوئے آپ کتنی کیوٹ لگ رہی ہیں۔۔۔ اف! اس نے پھر آنکھ میچی۔ نوین کا ماتھا ٹھنکا۔
”یہ حرکت تم خود کرتی ہو یا کوئی میکنیکل خرابی ہے؟“

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔“ اس نے آنکھیں مٹکائیں اور ہاتھ نچائے۔ ”اتنی بھی سیدھی نہیں ہیں۔ آتے ہی پوائنٹ مار دیا واہ! نوال ضمیر کا خیال تھا کہ اسے پوائنٹ مارنے والا آج تک کوئی مائی کالا پیدا نہیں ہوا مگر افسوس عالم بے خبری۔۔۔ ہاہ! کراچی کی ایک ”مائی“ سالوں پہلے ایسا ”لال“ بلکہ ”لال“ سرخ پیدا کر چکی ہے۔“

اس نے مائی کہہ زینت بیگم کو دیکھا اور نوین کی بے ساختہ ہنسی سے ہونے والے سرخ چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

زینت بیگم حیرانی کی شدت سے مسکرا بھی نہ سکیں۔ ان کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ نوین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے صوفے پر ڈھسے سی گئی۔

☆ ☆ ☆

”میں تو تین دن میں عاجز آگئی اور آپ تیس برس

سے ایسی ہی زندگی گزار رہی ہیں مجھے نہیں معلوم تھا نا اتنے تنگ نظر! انتہا پسند اور۔۔۔ کتنے مزے سے آپ کو اپنی پسند کی لاشی سے ہانکا اور آپ کیا خوب مزے سے رہٹ پر بندھے نیل کی طرح گھومتی جا رہی ہیں۔ گھومتی جا رہی ہیں۔ آنکھ پر بندھی پٹی ہٹا کر دیکھیں! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور! اور۔۔۔ اب تو وہ نہیں ہیں۔۔۔ اور آپ پھر بھی۔۔۔ مائی گاؤ۔“

وہ اپنا سر پیٹ رہی تھی۔
نوین اس کے بچکانہ انداز پر بردباری سے مسکراتی رہی۔

”واہ! آئی سی۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔“
اتنے مانوس صاف سے ہو گئے۔ اور آگے۔۔۔
”اب رہائی ملے گی تو مرجائیں گے۔“
نوین نے اس کے اٹکنے پر شعر پورا کیا۔
”واہ واہ۔۔۔ یہ شعر مکمل کیا ہے یا اپنے دل کا حال کہا ہے؟ یہ آپ جیسی عورتیں ہی ہوتی ہیں جو مردوں کو بردھا دیتی ہیں۔ آپ نے کبھی شبخیم شکیل کا وہ شعر نہیں سنا۔“

آدھی ماں چکی ہوں اس کی
آدھی بات پر آڑی ہوئی ہوں
مذہب معاشرہ قواعد اصول تابعداری سب اپنی
جگہ۔۔۔ مگر کچھ چیزیں تھوڑی سی آزادی تھوڑی سی خواہش تھوڑی انا تھوڑی میں بجا کر رکھنی چاہیے۔ جب تک جان باقی ہو، آن بھی باقی رہنی چاہیے۔ آپ نے کبھی پرکٹے پرندے کو دیکھا؟ بھلے سے اس کے پرواز سے گترو پے جاتے ہوں مگر وہ ذرا سا بھی گمان آتے ہی اڑان بھرتا ضرور ہے۔ نتیجہ خواہ دھڑام سے گرنا ہی ہو۔ کیونکہ اڑان فطرت ہے اور آپ کہتی ہیں مانوس صاف سے ہو گئیں مجھے تو ناٹا جان کبھی اتنے ڈکٹیٹر نہیں لگے۔ سفاری سوٹ پہن کر کیا لبل آوی دکھتے تھے۔ لے کر اچھی خاصی لڑکی کا بیڑا غرق کر دیا۔ کون کسے گا۔ آپ نے کبھی یونیورسٹی کا منہ دیکھا ہے؟ مجال ہے جو ذرا الٹکیو ہوں۔ تین دن سے مجھے اس گھر میں بند کر رکھا ہے۔ اور سچ کہتی ہوں اگر

آپ اب بھی مجھے لے کر باہر نہ نکلیں تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اف! اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے۔
”لان میں چلتے ہیں۔“ توین گھبرا گئی۔
”واہ۔۔۔ مائی گاؤ۔! میرے اللہ کہاں بھیج دیا؟ لان بھی تو گھر ہے خالص۔ میں باہر کہہ رہی ہوں باہر۔۔۔ وہ جہاں روڈ ہوتا ہے۔ سیاہ رنگ کا جس پر گاڑیاں چلتی ہیں۔ ہیں ہیں سپاں پاں۔ لوگ چلتے ہیں کانوں میں ہینڈ فری لگا کر فٹ پاتھ پر پڑے ایک پتھر کو ٹارگٹ بنائیں اور اسے پیروں سے دھکیلتے ہوئے وہاں تک لے جائیں۔ جہاں تک آپ جا رہی ہیں۔ اف! اتنا مزہ آتا ہے۔ آپ نے کبھی ایسا کیا؟“ اسے نفی کا یقین تھا مگر پھر بھی۔ نوین سحر زدہ سی تھی۔ کسی معمول کی طرح نفی میں گردن ہلاتی۔

اچھا! کبھی کبھی رنگ اسپون سے سرف کے بلبلے بناتے ہوئے فٹ پاتھ پر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے چلی ہیں؟“
”ناں۔۔۔ نہیں۔۔۔ مگر آسمان کی طرف دیکھ کر چلیں گے تو منہ کے بل نہ گر جائیں گے؟“ توین مسلسل نفی میں جواب دے کر جیسے شرمندہ تھی۔
”کیا ہو گیا ہے خالہ! اس نے گویا سر پیٹ لیا۔
”آسمان پر نگاہ رکھنے والے بھی منہ کے بل نہیں گرتے۔“

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے ہوئے۔
”تمہیں شعر تو بہت اچھے یاد ہیں۔“ توین نے سرائے کے ساتھ موضوع بدلنے کی کوشش کی۔
”ڈیڈ کو یاد ہیں۔“ اس نے شانے اچکائے۔
”بہر حال! مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ نے اب تک کی زندگی بس یونہی فضول گنوائی۔“
”ہی۔۔۔ ہی۔۔۔“ وہ تاسف سے سر ہلانے لگی۔
”لیکن خیر! آپ فکر مند نہ ہوں۔ اب میں آگئی ہوں ناں۔ جیسے جیسے میں کموں ویسے ویسے کرتی جاؤں اور۔۔۔“

☆ ☆ ☆
”تتا کتا تھا ڈیڈ نے لیپ ٹاپ لے کر جاؤ۔ بس! اس وقت میرا دماغ نجانے کہاں تھا۔ توجہ ہی نہیں دی۔ اور اب۔۔۔ آخر! انٹرنیٹ کنکشن میں پرالیم کیا ہے؟“ وہ کمپیوٹر کو گھورتے ہوئے سخت آکٹائی ہوئی تھی۔
”غصہ مت کرو نوال! بس ایک دو روز اور رکو۔ آجائے ناں! اخفش تو وہ کرے گا کچھ۔“ توین نے صفائی دی۔
”ارے میرے مالک۔۔۔ مفلوج قوم کی مفلوج خواتین۔۔۔! اس نے سر پیٹ لیا۔“ اتنی محتاجی کی زندگی یہ آپ کی ہر تان اخفش پر آکر کیوں ٹوٹی ہے؟ یہ ہے کون۔ کون سی بلا ہیں یہ حضرت؟“

”اور تم کیا کہو گی؟“ توین نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
”میں۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ تھلنے لگی۔ ٹھوڑی گردن سے لگی تھی اور شہادت کی انگلی کپٹی پر مارتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔
”میں کہوں گی۔۔۔ میں کہو گی۔۔۔ بازار چلتے ہیں، شاپنگ پر۔“ اس نے چٹکی بجائی۔
”بازار؟ اس وقت شام کے چھ بج رہے ہیں نوال۔ جائیں گے کب اور آئیں گے کب؟ رات ہو جائے گی۔ کل۔ کل چلیں؟“ توین نے چونک کر گھڑی دیکھی۔
”کل کیوں؟ اسی کل کی گردان نے تین دن کر دیے ہیں اتنے کم کپڑے کیوں لائی تھی۔ بتائیے! کیوں لائی تھی؟“

”ہپ۔۔۔ ہپ۔۔۔ پتا نہیں۔“ اس کے ڈپٹے سے نوین ہٹکائی۔
”اس لیے کہ مجھے کراچی سے شاپنگ کرنی تھی خالہ! آئی لو شاپنگ۔ اور اس میں کپڑے جو تے سب شامل ہیں۔ آپ کو پتا ہے گھر میں سبزی گوشت سب میں لائی ہوں لیکن خیر! اب آپ کو خود ہی پتا لگ جائے گا نوال ضمیر کس چیز کا نام ہے؟“
نوین کا سر اثبات میں ہل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
”تتا کتا تھا ڈیڈ نے لیپ ٹاپ لے کر جاؤ۔ بس! اس وقت میرا دماغ نجانے کہاں تھا۔ توجہ ہی نہیں دی۔ اور اب۔۔۔ آخر! انٹرنیٹ کنکشن میں پرالیم کیا ہے؟“ وہ کمپیوٹر کو گھورتے ہوئے سخت آکٹائی ہوئی تھی۔
”غصہ مت کرو نوال! بس ایک دو روز اور رکو۔ آجائے ناں! اخفش تو وہ کرے گا کچھ۔“ توین نے صفائی دی۔
”ارے میرے مالک۔۔۔ مفلوج قوم کی مفلوج خواتین۔۔۔! اس نے سر پیٹ لیا۔“ اتنی محتاجی کی زندگی یہ آپ کی ہر تان اخفش پر آکر کیوں ٹوٹی ہے؟ یہ ہے کون۔ کون سی بلا ہیں یہ حضرت؟“

☆ ☆ ☆
”تتا کتا تھا ڈیڈ نے لیپ ٹاپ لے کر جاؤ۔ بس! اس وقت میرا دماغ نجانے کہاں تھا۔ توجہ ہی نہیں دی۔ اور اب۔۔۔ آخر! انٹرنیٹ کنکشن میں پرالیم کیا ہے؟“ وہ کمپیوٹر کو گھورتے ہوئے سخت آکٹائی ہوئی تھی۔
”غصہ مت کرو نوال! بس ایک دو روز اور رکو۔ آجائے ناں! اخفش تو وہ کرے گا کچھ۔“ توین نے صفائی دی۔
”ارے میرے مالک۔۔۔ مفلوج قوم کی مفلوج خواتین۔۔۔! اس نے سر پیٹ لیا۔“ اتنی محتاجی کی زندگی یہ آپ کی ہر تان اخفش پر آکر کیوں ٹوٹی ہے؟ یہ ہے کون۔ کون سی بلا ہیں یہ حضرت؟“

”بلا نہیں مجھے سمجھو۔ خان صاحب کے بعد اتنا ساتھ دیا ہے ہمارا کہ اپنے گئے بیٹے سے بھی برہ کر۔“

زینت بیگم فوراً بولیں۔

”ہونہ! نوال کے بڑے تیور درست نہ ہوئے۔ ہم بازار جا رہے ہیں نانو۔“ اس نے اپنی پونی ٹائٹ کی اور اسکارف کی تہہ جمانے لگی۔

”ہائیں۔ ہم کون؟“

”کون“ مطلب میں اور نوین خالہ۔“ وہ مگن انداز میں اپنے ہینڈ بیگ میں موبائل اور رقم چیک کرنے لگی۔

”کون سے بازار؟“ نوین اچانک افتاد پر بوکھلائی۔

”کوئی سے بھی۔ جو اچھا ہو۔ یا جہاں آپ جایا کرتی ہوں۔ کہاں سے کرتی ہیں آپ شاپنگ؟“

حیدری طارق روڈ؟“

”تم کو کیا لینا ہے؟ پھر اسی حساب سے۔“

”صرف اور صرف تھوڑا سا ریلیف۔۔۔ کچھ ہوا۔۔۔ کچھ نئے چہرے۔۔۔ تھوڑا سا شور۔“ اس نے اچھل کود کر کے بتایا اور زوردار تین چیخیں ماریں۔ زینت بیگم نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور نوین ہڑبکا کر گھڑی ہو گئی۔

”چیخی کیوں؟“ نوین نے دھڑدھڑول پر ہاتھ رکھا۔

”یوں ہی۔“ وہ طمانیت سے جوتی پیر میں پھنسانے لگی۔ ”تھوڑی زندگی محسوس ہو اس لیے ہوئی نا، ہوئی کہ نہیں؟“ اس نے سٹولتی نگاہوں سے دونوں کو کھوجا۔

”ہوئی بہت ہوئی میری بچی۔“ زینت بیگم نے بمشکل کھڑے ہو کر اسے خود سے لپٹا لیا۔ نوین بھی ہنس پڑی۔

”کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ ہنستے ہوئے کس قدر خوب صورت لگتی ہیں؟“ نوال اسے دیکھ کر جیسے مسحور ہو گئی۔

نوال نے بڑی سراہتی نگاہوں سے بایک کو دیکھا۔ رنگ باڑی دیکھ کر لگتا تھا کہ گاڑی گویا دل سے لگا کر

رکھی گئی ہو۔

”واؤ۔“ اس کے ہونٹ سیٹی کے انداز سے کھلے۔ بایک سوار نے نیچے اتر کر نکلی پر یوں تھکی دی جیسے گھڑ سوار گھوڑے کی گردن سہلاتے ہیں۔ نوال پودوں کی آڑ میں تھی۔ جی بھر کے جائزہ لینے سہولت۔

آنے والے نے ہیلمٹ اتار تو صحت مند، سر سفید چہرہ سامنے تھا۔ بالوں میں انگلیاں چلا کر اس نے سر جھٹک کر پسینے سے جان چھڑائی۔

”یہ کون ذات شریف ہے؟“ وہ کیاری پھلانگتے ہوئے چراغ رگڑے جن کی طرح اس کے عین سامنے پہنچ گئی۔

اور وہ جو بایک گلوڑ اتار رہا تھا۔ اچانک افتاد پر اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ نوال نے کمر ہاتھ جمائے۔ وہ سخت نگاہوں سے سوالیہ تاثر کے ساتھ جواب چاہتی تھی۔ نووارد کی آنکھوں میں ہلکی حیرت کے بعد جوشیلی خوشی بھر گئی۔

”ہیلو نوال! کیسی ہو، کب آئیں؟“ اب دھچکے کی باری نوال کی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہوئی۔ اس کی نظروں کے استعجاب سے نووارد کے چہرے پر خجالت آمیز بھلے رنگ ابھر آئے۔

”ست۔ تم نے مجھے نہیں پہچانا؟“ (نوین نے میرے بارے میں نہیں بتایا۔ اس سے ایسی امید تو ہرگز نہ تھی۔ یو بروس)

”نہیں! میں نے کبھی اسامہ اور اوباما کو قریب سے دیکھا نہیں دیکھا۔ سو اندازہ نہیں کہ وہ اسکرین کے علاوہ سامنے سے کیسے نظر آتے ہوں گے۔ تم کون اب خود ہی بتاؤ! اسامہ یا اوباما؟“

”نہیں! ان کا ما۔“ وہ بھنا گیا۔

”یقیناً۔“ بھانجے اور مامے ایک ہی ہڈی سے بنے ہیں۔ وہ بھی جب جیسے کی بنیاد پر کہیں بھی بنا اجازت کھس جاتے ہیں۔ بڑی ہی دیدہ دلیری سے بے شری سے اور۔۔۔

”ایکسکیون۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔۔۔“ اس نے کرنٹ

کھائے انداز میں انگلی اٹھا کر اسے روکا۔

”انگلی نیچے۔“ نوال نے اپنی شہادت کی انگلی اٹھا کر درشتی سے کہا۔ اور اتنا بے ساختہ انداز تھا کہ نووارد کی انگلی نیچے گر گئی۔

”نہیں!۔“ نوال نے فاتحانہ مسکراہٹ سے تعریف کی۔

”میں جواب دینے کا پابند نہیں۔“ وہ پلک جھپکتے بایک پر سوار ہوا اور کنگ لگائی۔

”اے سنو! تم اس طرح سے نہیں جاسکتے۔“ وہ سرعت سے دونوں ہاتھ پھیلائے عین سامنے آگئی۔

”تو کیا تمہاری لاش پر سے گزرنا پڑے گا؟“ اس نے جیسے چڑایا۔

”لاش کے رشتے دار۔۔۔“ اس کے سر پر لگی ٹکڑوں بجھی۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ نوال پر یقین تھی۔ وہ اسے جل دے کر کیسے بھاگ سکتا ہے۔ مگر اگلے پل نوال ہاتھ ملتی رہ گئی۔ وہ جھانسنے میں آگئی تھی۔ اگلے نے نگاہ سیدھی رکھ کر نشانہ دوسری جانب باندھا تھا۔

”ارے! روکو! روکو۔ ارے۔۔۔“ اس نے بایک اشارت کر دی۔ پیچھے بھاگی۔ مگر بایک کے زوردار جھٹکے سے جھولتا کوڑا ناک پر لگا۔ دن میں تارے بلکہ سارا نظام شمسی گھوم گیا۔

”ہائے! میں مری۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا نوال! ایسے کیوں بیٹھی ہو اور یہ ابھی انخفش کی بایک کی آواز تھی؟ کہاں چلا گیا؟“

”انخفش۔۔۔“ نوال نے نام دہرایا۔

”اتنا ہینڈ سم، گنڈ لکنگ، لاکھوں روپے والی گاڑی؟“

وہ تو اتنے دن سے ذکر سن رہی تھی۔ غریب غریاء ملازم سمجھی تھی یہ تو۔

”ہائے!۔“ وہ کراہی۔ انخفش سے دشمنی کی بنیاد یہیں سے پڑی تھی۔

بظاہر لا تعلق بنی نوال کا خون کھول رہا تھا۔ وہ صبح

کیا رہے سحر لودھی کا شوق کچھ کر اس سے برہ کر بلند مصنوعی قمقمے لگا رہی تھی۔ گویا لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ کینہ توڑ نگاہوں سے ڈانگنگ ٹیمبل پر بیٹھے انخفش کو گھور رہی تھی۔ نانی اماں اس کے ساتھ براجمان تھیں۔ جبکہ نوین خالہ کچن سے گرم گرم پرائیڈ پینچانے کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ نانی امی کا بس نہیں چلتا تھا نوالے منہ میں دینا شروع کر دیں اور وہ مہسننا منہ بسور بظاہر ”نہ نہ نہ“ کرتے ساڑھے تین پرائیڈ (اف توبہ) ڈکار چکا تھا اور نوین کہہ رہی تھی۔

”اب یہ آوہا کیا چھوڑنا؟ دو نوالے بناؤ چندا۔۔۔“

”اتنا موٹا چندا۔۔۔؟ میں نواسی! مجھے تو ایک بار بھی اس طرح لاڈ سے کھلایا پلایا نہیں اور اس ابلے ہوئے آلو کے کیسے ترلے کیے جا رہے ہیں۔“

حالانکہ نانی اور خالہ نے اس کی آمد پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ مگر اس کے ایک ہی جملے نے سب پر پانی پھیر دیا۔

”یہ تو برے، بریانی، کباب اور کھیر، میری دعوت ولیمہ نہیں تھی نانی! غضب خدا کا تین افراد کے کھانے کے لیے اتنا پیسہ وقت اور سب سے برہ کر محنت برباد کی جائے۔ دس ازناٹ فیر۔ پیٹ بھرنے کے لیے تو ایک سیب، ایک نوڈلز کا پیک یا پھر آرڈر پر پڑا منگوایا جاسکتا ہے۔“

نانی خالہ ایک دوسرے کو دیکھتی رہ گئیں۔ وہ بڑے مزے سے بھوک لگنے پر کچھ بھی کھانے بیٹھ جاتی تھی۔ صاف کہہ دیا۔

”کم از کم میرے خیال سے چولہے کے آگے کھنے کی ضرورت نہیں۔“

اور اب خالہ کو گرم گرم پرائیڈ اتارتے دیکھ خواجواہ کی تپ چڑھ رہی تھی اور وہ گھلو کیسے مزے سے حق سمجھ کر لاڈ اٹھوارا تھا۔

انخفش۔۔۔ انخفش۔۔۔ انخفش۔۔۔

دراصل نوال غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی اور یہ بھی اس کا اپنا قصور تھا۔ وہ اپنی مرضی کا سنتی سمجھتی تھی۔ اس نے جس چیز، جس مسئلے کے لیے سوال اٹھایا۔

دونوں کے منہ سے ایک ہی نام نکلا۔

”حفش۔“

”حفش آجائے تو کمرے گا۔“

”ہاں! حفش کو معلوم ہو گا۔ کیبل والے کا نمبر تو

اس کے پاس ہے۔“

”یو پی ایس کی پیشوری حفش ہی دے کر آیا تھا۔

اس کو معلوم ہے۔“

”وہ تو اسے اچانک کسی فوننگی میں جانا پڑ گیا۔

آجائے گا دو ایک روز میں۔“

وہ نوال کے یہاں پہنچنے سے ایک روز پہلے ایمر جنسی

میں روانہ ہوا اور سوئم کے بعد بھی نکلنے نکلنے دو روز مزید

لگ گئے۔ نوین اور زینت بیگم بہت خوشی اور جوش

سے اسے نوال کی آمد کا بتا چکی تھیں اور وہ بھی بہت

شدت سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ مگر۔۔۔

نوال ضمیر زینت بیگم کے بھانجے ضمیر احمد اور

دوسری بھانجی نورین کی بیٹی تھی۔ منیر خان کے انتقال پر

ضمیر اور نورین بڑی بیٹیوں مشعل اور گلال کے ہمراہ

دسویں تک رہے تھے۔ نوال پیرز کے باعث نہ آئی۔

اس نے پورے ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہر

دیکھ رکھے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ پانچ

برس کی عمر میں ہی کراچی آئی اور دوبارہ کبھی چکر نہ لگ

سکا۔

سواب سے بہتر موقع اور کیا ملتا۔ عید کا موقع

۔۔۔ نانی اور خالہ کی تنہائی کا خیال اور اگر موڈ بن گیا تو

جامعہ کراچی میں داخلہ۔۔۔

تنہائی اور ناقدری کے دکھ سہتی زینت بیگم اور نوین

منیر خان کے لیے شاید یہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی

تھی۔ ان کے ذہن میں شاید وہی پانچ برس کی بچی تھی

جس کی پونیاں بنانی پڑتیں، مگر بی بی توبالوں میں کنگھا ہی

نہیں کرتی تھیں۔

کنگھریا لے گول گول رنگ جن میں انگلی پھنس

جائے سنہری بال تھے۔ کیلے ہوتے تو شانوں سے نیچے

لہراتے جیسے جیسے سوکتے، اوپر چڑھنا شروع ہو جاتے۔

کانوں کی لو کے پاس جا کر رک جاتے۔ وہ کھائی پر چڑھا

بینڈ انار کر سر کے عین اوپر ایک پونی بناتی تھی۔

”پڑیا کا گھونسیلہ۔“ وہ ہر معاملے میں دونوں کے

اندازوں کا الٹ تھی۔

”یا اللہ!“ اپنے کمرے کی گلابی سیٹنگ جھارواں

بیڈ شیٹ اور سائیڈ پر بڑا سا پانڈا دیکھ کر۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں اور بعد میں

ماں، بیٹی کی۔ وہ جہاں جیسا کی بنیاد پر جب دل چاہتا

لڑھک جاتی۔ گانے سنتے سنتے کی وی دیکھتے ہوئے کھانا

کھاتے ہوئے۔

اور باربی ہاؤس نے تو اسے گنگ کر دیا صدے کی

شدت سے۔

”میں نے تو گڑیا کھیلنے کی عمر میں گڑیا نہیں کھیلی

خالہ!“

وہ مصنوعی طور پر لہراتی بیڈ پر دھڑام سے گر گئی۔

”گڑیا سے کھیلنا، گھر سجانا، نسوانیت کی نشانی ہوتا

ہے بیٹی!“ نانی کی بعد سن کر وہ اچھل پڑی۔

”تو یہ اتنی ساری نسوانیت کی نشانیاں دکھائی نہیں

پڑتیں کیا؟ یہ نازک وجود، یہ پتلی لمبی انگلیاں، یہ دراز

گیسو اور یہ آپ کی ساڑھی اور خالہ کا کرتا یا جامہ۔

اور۔۔۔ اور۔۔۔ اب کیا بولوں؟“ اس کا اشارہ سمجھ کر نوین

جھینپ گئی اور زینت بیگم ہنس پڑیں۔

”ویسے میرا گمان ہے خالہ! کہ اللہ نے آپ کو جو

نسوانیت عطا کی وہ اپنی جگہ۔ مگر بعد میں نانا نے کوٹ

کوٹ کر بھری، جیسے کم گنجائش والے تھیلے میں جبرا“

سامان ٹھونساجائے۔“

نوین زور سے ہنس دی۔

وہ نوین کے کمرے میں اس کی گود میں سر رکھے لیٹی

تھی۔ اے آر رحمن کا میوزک دھیمے سروں میں بج رہا

تھا۔

”ویسے خالہ! ایک بات ہے، آپ ہیں پور لڑکی۔

پور مشرقی لڑکی۔“ وہ دھیان آنے پر اچھل کر سیدھی

ہوئی۔

”یہ پور مشرقی لڑکی کیسی ہوتی ہے؟“ وہ اچھے کا شکار تھی۔

”آپ جیسی اور کیسی۔ لمبی، لمبی، پتلی کرتے باجائے، بچے دوئے، دراز چوٹی، کھانا پکائی دھیسے دھیسے، شکر اتنی سبج چلتی۔ اب تو فلموں میں بھی ایسے کرکٹر نہیں ہوتے۔“

وہ مایوس تھی۔ نسوانیت و مشرقیت کا شاہکار۔ نوین مسرخانہ۔ ڈھن ڈھن۔ ذرا تصور کریں۔ دیا جلائی، عظم کی نوک دبا کر شعر کہتی اور سب سے چھپا کر رکھتی۔ ایس سو سینتالیس سے پہلے کی لڑکی ہیں آپ، بلکہ ایس سو بارہ کی جبکہ اب دو ہزار بارہ ہے۔ ہونہ۔“

نوین کی آنکھیں پھیلیں۔

”تم نے میری دراز سے ڈائریاں پڑھی ہیں؟“ اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ ”میں کچھ دھونڈ رہی تھی۔ مگر کیا کلام ہاتھ لگا سبحان اللہ! ان وہ کرب کا لمحہ وہ درو کی شدت جب دکھ کے گھنے سے جنگل میں کوئی وحشی ہرنی بھٹکی تھی جب پیاس کے اتھاہ سمندر میں کوئی مچھلی پیاسی تڑپی تھی تو شدت سوچ میں آئی تھی اک بات سمجھ میں آئی تھی آئے گا وہ لمحہ بھی بھی جب شیشے کے ٹکرانے سے پتھر کے آنسو ٹپکیں گے جب خواب جڑیں گے ٹوٹے ہوئے جب جل کے درو کی شدت سے کوئی چاندنی رات کو روئے گا جو نہتا ہے وہ روئے گا جو شخص ہے آج اذیت میں وہ چین کی نیند تو سوئے گا وہ بڑے مزے سے نظم کھل کرنے کے بعد نوین

کی پٹھی آنکھوں اور حیرت سے کھلے منہ کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے تین روز پہلے ہی تو یہ نظم لکھی تھی اور مصوفیت کے باعث دوبارہ دیکھ بھی نہیں پائی تھی اور نوال نے کیسے فر فر سادی تھی۔

نوین کے ہونق چہرے سے قطع نظر وہ اپنی ہی کر رہی تھی۔

”میں ذاتی طور پر شاعری دائری کے چکر میں پڑی نہیں۔ اور وہ بھی نظم اول ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن تمہیں تو خوب شعرا دیں۔“ نوین بولی۔

”خالی کاغذ نیلے کر کے درازیں بھرتی ہیں یا کبھی کچھ چھوایا بھی۔؟“

نوین چپ رہی۔

”دیکھا! میرا درست اندازہ۔ صرف چھپایا ہی گیا ہے۔ نا؟“

نوین خوا خواہ بستر کی سلوٹ میں درست کرنے لگی۔

”یار! آپ تو پور مشرقی سے بھی کچھ آگے کی چیز ہیں۔ آپ کو پتا ہے نانو! کہ خالہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔“

نوال نے اندر آئی زینت بیگم سے پوچھا۔

”ہاں! کچھ لکھتی دکھتی تو ہے یہ۔“ زینت بیگم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”دراصل تمہارے نانا پسند نہیں کرتے تھے تو۔“

”ارے! میرے اللہ وہ پسند کرتے کیا تھے؟ یہ بھی بتائیے کبھی۔ بٹی اتنا پیارا، ہنر چھپا کر بیٹھی ہے اور۔“

آپ کے کیا کہنے، لیکن آپ فکر نہ کریں میں آپ کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔“

”میرے لیے کیا؟“ وہ اچھل پڑی، اس سے کیا بعید۔

”آپ اپنی زندگی کی ڈور میرے ہاتھوں میں دیں، پھر دیکھیں! اس نے پھیلی پر مکا مارا۔

”پاکل ہوئی ہو، ارے رو کو اسے نوین! کیا کرے گی یہ۔“ ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”جو بھی کروں گی، آپ کے سامنے آجائے گا۔“ وہ

بے فکر تھی۔

”کروں گی ضمیر کو فون، باقی دو تو ٹھیک تھیں۔ اسے کیا بنا دیا۔“ وہ پریشان لگ رہی تھیں۔

”ضمیر کچھ نہیں کر سکتا، کیونکہ ضمیر کا ضمیر ابھی زندہ ہے اور زندہ فیصلے کرتا ہے۔ سمجھیں آپ؟“

اس کا انداز دھونس آمیز تھا، ماں بیٹی ایک دوسرے کو متفکر نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

”بل جمع کروانے جیسا معمولی کام بھی آپ خود نہیں کرتیں خالہ۔“ چچ چچ۔“ نوال کے تاسف کی حد نہیں تھی۔ ”ایک سراسر غیر لڑکا آئے آئے نہ آئے، اس کے اسے سو کام، اور آپ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں گی۔“ صدیے کے زیر اثر جیسے وہ اب کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔

”تم سے کس نے کہا، آئے نہ آئے؟“ خفش نے جھپٹا مار دو نونوں بل اچک لیے۔ نوال کرنٹ کھا کر اچھلی۔

وہ اس کے پیچھے صوفے پر براجمان تھا۔ ملک شمشک کے گھونٹ اتارتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اوس۔ تو تم یہاں موجود ہو؟“ اس نے اصل فساد کی جڑ کو گھورا۔ ”پہلے ہی نانا نے کم کسر رکھی تھی جو تم رہی سہی پوری کرنے آتے ہو۔ بجائے اس کے ان میں خود اعتمادی پیدا کرو، تم تو ان کو بالکل مفلوج کر دو گے۔“ وہ کمر ہاتھ رکھے سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”مردوں کے کرنے کے کام مرد کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔“ وہ بل اور پیسے جیب میں ٹھونس کر اب جانے کو تیار تھا۔ ملک شمشک کا بڑا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا نوال نے دماغ گھما دیا تھا۔

”اب واضح ہو گیا ان دونوں عورتوں کی ناکارہ زندگی کے پیچھے کن دو مردوں کا ہاتھ ہے۔“ نوال باقاعدہ لڑنے کے موڈ میں تھی۔

اس پر لعنت بھیج کر خفش خود پر کنٹرول کرنا مڑا۔

”تو براے مہربانی! حاضرین کو آگاہ کریں، آپ جیسی کامیاب عورت کے پیچھے کس مرد کا ہاتھ ہے؟“

بے فکر تھی۔

کلاس ایکٹریس جیسی مسکراہٹ، جمائی۔ ”پہلے تو آپ کلیئر کریں، آئی ایم ناٹ دو من۔ کوآٹ ٹیگ کرل سوٹ اپٹھن۔ اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے تو مجھ جیسی کامیاب لڑکی کے پیچھے ایک ہی مرد کا ہاتھ ہے اور وہ ضمیر۔ میرا بابا بابا!“

اس نے مصنوعی وقار لگایا۔ ”کوئی اور سوال۔“

انفخش کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے چابی اٹھائی اور باہر کو لپکا۔

”ناراض کر دیا اسے۔“ زینت بیگم کو بائیک کی ریس کی آواز سے اس کے غصے کا اندازہ ہوا۔

”اور جو میں ناراض ہو چکی ہوں۔ اس کی آپ کو کوئی فکر نہیں؟“ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر جما کر خیرانی سے پوچھا۔

”ارے میری بچی۔ اپنا ہی بچہ ہے، میرے ہاتھوں کا بیلا ہوا۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ یوں اٹھائے جیسے ان پر کوئی نو مولود پڑا ہو۔

”کچھ زیادہ ہی پال لیا۔“ نوین کی زوردار ہنسی نکلی، اس نے ”پال لیا“ کہنے کے بعد گال پھلا لیے تھے۔ اشارہ انخفش کے موٹاپے کی طرف تھا۔

”مجھے تو حیرت ہے، تم دونوں کے ایک دوسرے سے رویے پر۔ تم اسے پسند نہیں کرتیں اور وہ تمہیں۔ میرے تو تم دونوں پیارے بچے ہو۔ چالیس سال سے میں اس گھر میں رہ رہی ہوں۔ انخفش کے دادا ہمارے اتنے ہی پرانے بڑوسی ہیں۔ تمہارے نانا کے بچے دوست۔ اتنے نائس۔ آدمی کہ تم ان سے مل کر۔“

”ارے جانے دیں۔ اندازہ ہو گیا ان کے نائس ہونے کا۔ مثلاً، کیا کم ہے کہ وہ نانا کے بچے دوست اور اس انخفش کے بچے دادا ہیں۔ دیگ کا ایک دانہ کافی ہے، یہ تو وہ ہو گئے۔“ اس نے دانت پیسے۔

”نہیں، نہیں نوال! انکل بہت ہی الگ آدمی ہیں۔ تم ان سے ملو تو۔“

”بس! اب اور کچھ نہ کہیں۔“ نوال نے بے زاری

سے ٹوک۔ ”میں عین ایٹین پر تھیں رہتی ہوں۔ اور دوسرے آپ دونوں وہ عورتیں کبھی نہیں ہو سکتیں جن کی گواہی کافی ہوتی ہے۔“

زینت بیگم کی ہنسی نکل گئی۔ ”نہیں نوال! یہاں میں اختلاف کروں گی۔“ نوین بولی۔ ”انگل کے معاملے میں تم واقعی وہ ایک لڑکی ہو جس کی گواہی سراسر ناقابل یقین ہو۔“

”بہت اعلا بہت ہی اعلا۔ دیکھنے میں بس سیدھی سیدھی دیکھتی ہیں۔ یہ دوسرا پوائنٹ مار دیا جبکہ میں نے کہا تھا کہ آج تک کوئی مانی کالال نوال پر پوائنٹ مارنے والا پیدا نہیں ہوا۔ اس نے ہاتھ اور آنکھیں نہ چھڑائیں۔“

”آپ نے خالہ! آپ نے مجھے فرعون کہا؟“ ”میں نے اپنے منہ سے تو کچھ نہیں کہا۔ تم ہی بول رہی ہو جو بول رہی ہو۔“ نوین نے اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

”بہر حال! میں بتائے دے رہی ہوں جب تک میں یہاں ہوں۔ آپ لوگ میری ذمہ داری ہیں۔ خبردار! جو اس موٹے لال سرخ کو بلایا۔ آپ کو کوئی بھی کام ہو مجھ سے کہیں۔ میں ہوں نا۔“

نوین اور زینت بیگم ایک دوسرے کو دیکھ رہ گئیں۔ ”آجاتا ہے کبھی آلو کے پرائیڈ کھانے۔ کبھی ملک شیک پیئے۔ نوین آئی! بریانی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ نوال نے ہو ہو نقل اتاری۔

”اور پرسوں آپ کیسے سبب کی قاشیں کاٹ کاٹ کر دے رہی تھیں۔ اتنے لاڈ۔ اور وہ نواب کا بچہ خود سے ہاتھ برہا کر قاش بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ پہلے کانٹے پھر ان پر نمک، کالی مرچ چھڑکا اور ہر بار آپ ہی نے قاش برہائی اور اگلا کر کیا رہا تھا۔ پانی کی موٹر کی بیلٹ چڑھا رہا تھا۔ مجھے تو نہیں لگتا۔ اسے اپنی پینٹ پر بیلٹ چڑھانی بھی آتی ہے کس۔“

زینت بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہ تھی۔ ”ضمیر نے آخر بیٹی کو پالا کیسے۔ مشعل اور گلالتو ٹھیک ٹھاک پچیاں ہیں تو پھر یہ۔“

اور نوال خالی کہتی نہیں تھی کرتی بھی تھی اس کی تمام حرکتیں اور فرمودات نوین اور زینت بیگم کے زلزلے کے جھٹکے جیسے تھے۔ مگر جب وہ عملی میدان میں اتری تو جیسے شدید زلزلہ آیا تھا۔

نوین اور زینت بیگم کا منہ حیرت سے اتنی بار کھلتا اور پھر کھلے کا کھلا رہ جاتا کہ رات بستر پر جاتے وقت ہاتھ سے جبراً جبراً کو کسا جاتا اور اب تو وہ جیسے عادی ہو گئی تھیں۔ شدید زلزلے کے بعد اب تو آئینہ شاخس سے ڈرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

میر خان نے نوین کو ڈرائیونگ سکھائی تو تھی مگر وہ خود ہمیشہ فرنٹ سیٹ پر براجمین ہوتے تھے۔ نوین نے پوری مہارت حاصل کر لی تھی۔ ٹریفک جام کو ہینڈل کر لیتی پارکنگ سے نکال لیتی، اور ٹیک کرتی بھاگ لیتی مگر یہ سب ابا کی موجودگی میں ہوتا تھا کہ ابا ساتھ ہیں نا، مگر اکیلے، آف تو یہ۔ اکیلے تو اس سے گاڑی بھی اشارت نہیں ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے۔ ابا کے انتقال کے بعد شاید تین چار بار ہی گاڑی نکالی ہوگی۔ ایک بار نعمان بھائی کے ساتھ دوبارہ انخفش کے ہمراہ۔ ہاں! ایک بار امی کی طبیعت خرابی پر وہ انہیں لے کر قریبی اسپتال گئی تھی۔

انخفش مینے پندرہ دن میں گاڑی کی جھاڑ چھپاڑ کر لیتا تھا۔ کھڑے کھڑے وہ مزید کچرا بنی جا رہی تھی۔ ٹین ڈیا۔ ہلکے نیلے رنگ کی ابا کی جوانی کے زمانے کی میک تھی جسے انہوں نے دل سے لگا کر رکھا تھا۔

اور اب نوال کا کہنا تھا۔ ”گھر میں گاڑی موجود ہے تو کیا ضرورت ہے رکشہ، ٹیکسی کے دھکے کھائے جائیں۔“

”پتا نہیں، چلے نہ چلے کب سے بند ہے۔“ نوین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ نوال کے حتمی فیصلے یا

”تو اس میں کیا مشکل ہے؟ چپک کرتے ہیں۔ ابھی پتا لگ جائے گا۔“ اس نے چابی اچھالی۔ نوین نے بمشکل کیچ پکڑا۔

”فیلڈنگ تو آپ اچھی کرتی ہیں۔“ نوال نے سراہا۔

نوین کی لاکھ دعاؤں اور اندازوں کے باوجود گاڑی چابی لگتے ہی اشارت ہو گئی۔ نوین نے حیرت سے گاڑی کو دیکھا۔

”خدا کے لیے آج نہ چلنا۔“ اس نے نوال کی نظروں سے چھپ کر گاڑی کے پیروں (ٹائر) کو ہاتھ لگا کر منت کی تھی۔ مگر آج قسمت نوال کے ساتھ تھی۔

جو آرام دہ سیٹ پر اچھل کر گاڑی کا اندرونی طائرانہ جائزہ لے رہی تھی۔

”ہے تو پرانی، مگر مین ٹین رکھی ہوئی ہے۔ گڈ!“ اس نے سراہا تھا۔

گاڑی بہت اچھی چلی۔ وہ قریبی اسٹور سے کچن آئٹمز لینے اور آکس کریم کھانے گئی تھیں۔ مگر ایک غیر قانونی اسپڈ بریکر سے زوردار جھٹکا لگا۔

پہلے گاڑی رکی، پھر چلی تو آواز اتنی بلند تھی کہ ہر راہ چلتے نے مڑ مڑ کر رک رک دیکھا۔ اسٹور نزدیک آچکا تھا۔

”اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا، سامان لے کر ہی جائیں گے خالہ۔“ نوال نے خفت سے سرخ نوین کو فیصلہ سنایا۔

واپسی پر آواز حد سے زیادہ ناقابل برداشت تھی اور جب اندر بیٹھے یہ حال تھا تو باہر والے تو کانوں کے پردے پھٹنے کے اندیشے سے ہاتھ رکھے چلتے ہوں گے۔ نوین نے ارد گرد بالکل نہ دیکھا۔ وہ ناک کیسیدھ میں دیکھتے ہوئے جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ گلی کے کونے پر گاڑی بند ہو گئی۔ جب نوین نے فوراً موبائل اٹھا کر انخفش کو کال کرنا چاہا تو نوال کو پتہ لگ گئے اس نے ملائے ہوئے نمبر پر جھٹکا مارا اور فون قبضے

میں لے لیا۔ ”دھکا لگانا پڑے گا نوال!“ نوین نے حیرت سے دہلی آواز میں وجہ بتائی۔

”لو خوا خواہ۔ میں ہوں نا!“ نوین کچھ سمجھ پاتی اس سے پہلے وہ باہر تھی۔

”۲ اشارت کریں۔“ اس نے دیو مر سے جھانکتی نوین کو اشارہ کیا۔

”وقت اچھا ہو یا برا گزر رہی جاتا ہے، سودھ کا کھاتی گاڑی گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ نوین ”توبہ توبہ“ کرتی باہر آئی۔ وہ عرق ندامت میں غرق تھی۔

مگر نوال۔۔۔

وہ گاڑی کی چھت پر کہنی ٹکا کر بہت آرام دہ حالت میں کھڑی تھی۔

”ایک بات بتائے! کیا آپ کو معلوم ہے چاند سے زمین کی کون سی چیز نظر آتی ہے؟“ نوین نے اچھے سے نوال کو دیکھا۔ ”اس بے موقع سوال کا مطلب۔۔۔؟“

”مجھے پتا تھا آپ کی جنرل ٹانج صفر ہے۔ چاند سے زمین کی ایک چیز دکھائی دیتی ہے اور وہ دیوار چین اور اگر چاند پر کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ ہے آپ کی یہ گاڑی۔ اس کی آواز خواہ۔“

نوین زور سے ہنس پڑی۔

”سامان نکالو۔ انخفش لے جائے گا شام کو مکینک کے پاس۔“ نوین بولی۔

”انخفش!“ وہ حلق کے بل چلائی۔ ”انخفش کیوں؟ میں نے منع کیا تھا نا۔“ وہ بل کھا گئی۔ ”یہ ماں، بیٹی باز ہی نہیں آتیں۔“

نانی، نوین اور انخفش کے بارے میں اس کے فرمودات با آواز بلند جاری تھے۔ اسے خبر نہیں تھی۔ اس نے کمرے سے باہر ٹیلیزی میں کھڑا انخفش سب کچھ سن گردانت پس رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا کہ وہ سب اسے سن رہی تھی۔ چڑا رہی تھی، جتا رہی تھی۔

وہ پہلے اس سے اور بعد میں دادی بیگم اور نوین سے

خود ساختہ سخت ناراضی کا شکار ہو گیا۔ خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔ نوین اور نالی نوال کی ہدایات کے زیر اثر تھیں۔ وہ سخت خفا ہو جاتی تھی۔

دوسری جانب نوین چاند والی پترا بھی تک ہنس رہی تھی۔ انخفش کو لگا وہ نوال کی ہم خیال ہے اور انہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔

ناراض ہو کر اپنے گھر میں خود ساختہ قیدی بن گیا۔ نوال کو مزا چکھانے کے لیے آئیڈیاز سوچتے تھے۔ اتنے اہم کام کے لیے تنہائی تو ملنی چاہیے تھی نا۔

منیر خان ان مردوں میں سے تھے جو عورت کے عورت پن کو پسند کرتے ہیں۔ بڑھاوا دیتے ہیں اور اسے اس پر ہی کاربند رہنے کی نہ صرف سخت تاکید کرتے ہیں بلکہ عملاً ”کوشش“ بھی کرتے ہیں۔ وہ عورت ہی کیا جس کی نسوانیت میں ذرہ بھر شک ہو۔

اس کے لباس، آواز، ناز و انداز، چال ڈھال، بول چال اور سلیقے طریقے ہر پہلو سے اس کی نسوانیت اور نزاکت نمایاں ہونی چاہیے۔

چادر اور چادر دیواری کے اندر وہ اپنے وجود، سوچ کو چھپائے زندگی گزارے۔ اسے مردانہ وار مقابلے کی قطعاً ”ضرورت“ نہیں۔ وہ ہیں نامرد۔

اور اب جب وہ نہیں تھے؟ تو ان کے درمیان دوست اشتیاق اُحد تھے، ان کی بیوی صوفیہ اشتیاق اور ان کا پوتا انخفش انعام۔ وہ نانا جتنے سخت کھنور تو یقیناً ”نہیں“ تھے۔ مگر اپنے خول میں نہنت اور نوین دن بدن سکرتی جا رہی تھیں۔ جس کو ذمے داری نبھانی تھی وہ سات سمندر دور نئی ذمہ داریوں کو سنبھال چکا تھا۔

”دنیا میں رہتی ہیں ہزاروں اکیلی عورتیں۔ اور وہ اکیلی کیسے؟ میرے ساتھ تو آئیں نہیں، اب جب اکیلے رہنا ہی ہے تو اپنے مسئلے جی حل کریں گی اور مسئلے کی کیا بات، اصل چیز پیسہ ہے۔ ایک فون کال پر سب حاصل ہو جاتا ہے۔“

اور اگر فون ہی خراب ہو، یا بندے میں فون کرنے کی بھی ہمت نہ ہو تو۔ یہ اس نے سوچا نہیں۔ ”پھر اپنا خاندان ہے، اپنا شہر، اپنا محلہ، اپنے لوگ۔“

بہت حد تک وہ درست بھی تھا۔ وہ اپنے باپ کی نسبت بہت کھلے ذہن کا تھا، مگر فطرت باپ جیسی انتہا پسند تھی۔ باپ نے بالکل جگر کر ذہن و جسم کو قائل کیا تھا۔

بیٹا کھلی چھوٹ دے رہا تھا۔ دونوں مرد اپنے مزاج کی انتہاؤں پر تھے۔

دونوں عورتیں کس اعتدال کو پسند کرتی تھیں۔ نہ انہوں نے بھی بتایا۔ پوچھا تو خیر کسی نے نہیں۔

سو وہ تنہا عورتیں شوہر کے چھوڑے بہت سے پیسے، بیٹے کے بھیجے جانے والے نوٹ، تین پشتوں سے خاندان کی چوکیداری کرنے والے خاندان کے ہمراہ رہ رہی تھیں۔ بوڑھے لالا اپنے تیرہ برس کے پوتے کے ہمراہ گیٹ کے نزدیک بنے کمرے میں رہائش پذیر تھے۔

کافی ہے نا، وہ اکیلی عورتوں کے لیے اتنی پرومیکشن۔ پیسے سے ہر شے ملتی ہے نا۔

ایک اچھے محفوظ علاقے میں گھر۔ گلی کے دونوں جانب رکاوٹیں لگی تھیں۔ بہترین سکیورٹی۔ اچھے بڑوسی۔ بس پارا کافی ہے نا۔

نوال کمپیوٹر کے آگے بیٹھی اپنی ماں، بہنوں اور ابا سے جیسے باقاعدہ لڑ رہی تھی۔

”کاش ڈیڈ! کوئی تو ہوتا جو نعمان بھائی کو آئینہ دکھا سکتا۔ سچ اگر میرے سامنے آجائیں تو میں۔۔۔“ وہ تلملارہی تھی۔

”ایک بیس برس کی جوان حسین لڑکی اور چونٹھ برس کی بوڑھی ماں۔ وہ بھی حد سے زیادہ حسین۔ کوئی چور ڈاکو لٹیرا اور آج کل تو کون کب آستین کا سانپ بن جائے پتا نہیں چلتا۔ اچھا بڑوسی ہو، یا جدی پشتی ملازم ہوں، سارا زمانہ جانتا نہیں کیا۔ اس گھر میں خوب پیسے والی ماں بیٹی رہتی ہیں۔ مال ہی مال۔“

”تا بھیا نک نقشہ تو مت کھینچو نوال۔“ مشعال نے جھرجھری لی۔

”اور تم تیسری حد سے حسین لڑکی وہاں رہے گی تو تب چور ڈاکو کیا کریں گے؟“ گلال نے چھیڑا۔

”تیسری حد سے حسین ہا ہا۔ خالی حسن کا پپالے کر گلی گلی نہیں بجاتی میں۔ کرائے میں بلیک بیلٹ۔ ہٹل سے لے کر دو تالی تک چلائی آتی ہے۔ قسمت میں برائی نہ لکھی ہو تو بہ استغفار! تو مجھ سے بھڑتا آسان نہیں۔“

”ڈیڈ! کیا آپ کی بیٹی ناکارہ ہے؟“ اس کا سوال اکساتا ہوا تھا۔

”نہیں، نہیں، قطعی نہیں۔ میری رضیہ سلطانہ۔“ ڈیڈ کو اس پر جی بھر کے چار آیا۔

”اب جواب میں مجھے بھی کچھ کہنا پڑے گا۔“ اس نے جیسے مجبوری سے کہا۔

”وہ تو ہے۔“

”آئی لو یو ڈیڈ!“ وہ زور سے ہنس دی۔

”آئی لو یو بیٹا!“ منیر خان کی آنکھیں جھل سی ہوئیں۔

”ارے۔۔۔“ وہ چیخی۔ ”ٹو، تھری، فور، فائیو، کیوں؟“

آپ نے تو کہا تھا کہ میں آپ کا آخری پیار ہوں۔“ وہ بسوری۔ ”پہلا می، دو سرا مشعال پھر گلال اور آخری میں۔ اور اب کہتے ہیں کہ۔“

”یار! تسلی رکھو۔ پہلے دوسرے تیسرے کو ہم نے کب کا بھلا دیا۔“ منیر خان نے نوال کی نگاہوں سے بچ کر ان تینوں کو آنکھ ماری۔ ”اب تو بس آخری پیار ہی یاد ہے۔“

ان تینوں سے زیادہ پیار ڈیڈ اس سے کرتے ہیں۔ پہلے یہ بچپن کا لاڈ تھا۔ اور بڑے ہونے پر یہ یقین دہانی اسے مزا دیتی تھی۔

وہ اپنے باپ سے بہت نزدیک تھی، بہت زیادہ اور جب وہ آٹھ برس کی تھی۔ تب سے۔ تب سے اور زیادہ ہو گئی، قریب دوست بازو۔

”تنی بڑی مصیبت نہیں۔ دو منٹ کا کام ہے۔ یہ۔۔۔ یہ تو صرف چار سو راخ ہیں۔“

زہنت بیگم اور نوین اس تسلی سے مطمئن تو نہ ہوئیں۔ مگر تب حق دق رہ گئیں۔ جب اسٹور روم سے ڈرل مشین اٹھالائی۔ یہ دو ڈرل مشینیں تھیں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی، کم وزن، مگر اتنی ہلکی بھی نہیں۔

وہ اسٹول بھی نکال لائی۔

”بس! آپ اتنا کریں کہ جب میں اوپر کھڑی ہوں تو مجھے زور سے پکڑ لیں۔ اس طرح مجھے زور دینے میں آسانی ہوگی۔ اور۔۔۔“

”میں گے بھی تو دونوں اکٹھے۔“ نوین کو بجلی کے لال کالے بل والے تار دیکھ کے ویسے ہی ڈر لگ رہا تھا۔

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ میں گے بھی اکٹھے۔ میں ہمارے دشمن۔“ وہ ڈرل مشین آن کر چکی تھی۔ زہنت بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”کیا ہونے والا ہے، میرے مالک؟“ نوین کا حال برا تھا۔

”تنی مشقت جھلنے کی کیا ضرورت۔۔۔ انخفش کو بلا لیتے۔“ مشین پل بھر تو رکی تو نوین سکھ کا سانس لیتے ہوئے ترنت ہوئی۔

نوال کا دماغ گھوم گیا۔ زبانی لیکچر اور عملی مظاہروں کے باوجود وہ دونوں اپنی طاقت و صلاحیت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

”اور میرا یہ کہنا ہے کہ جو کام ہم خود کر سکتے ہیں، اس کے لیے کسی اور کو بلائے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کرشن کی رینگ تو جڑ گئی۔“

اس نے پیچ کس سے سنہری پیچ بھی ٹائٹ کر دیے۔

زہنت بیگم کا ہاتھ اپنے منہ پر تھا۔ نوال کو ان کا چہرہ دیکھ کر مزا آیا۔ اس نے پرہ زور، زور سے کھینچ کر دکھایا۔

”اب نہیں گرے گا۔“ اس نے تسلی دی۔ ”اور

اگر گرا تو میں ہوں نا۔

”مجھے تو اب تک حیرت ہے، یہ اچانک گر کیسے گیا؟“ توین کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

”کل آپ اس بات پر حیران تھیں۔ موٹر کی بیلٹ کیسے کٹ گئی؟ نوال نے ڈرم مشین اس کے بکس میں بڑی مہارت سے سیٹ کرتے ہوئے یاد دلایا۔

”ہاں! وہ تو سچ مچ ہفتہ پہلے تو انخفش نے بدلا تھا۔ حیرت ہے نا۔ چار چھ ماہ تو گزرتے ہی ہیں۔ اس بار تو۔“

”دو نمبر ہوگی، تھیلی میں ہی تو پیک ہوتی ہے۔ شاید پہلے تھسی ہوئی ہو۔“ زینت بیگم نے تمام پہلوؤں پر سوچا۔

”ہو سکتا ہے۔“ نوال زیادہ نہ بولی۔ اس نے اپنی رائے محفوظ رکھی تھی۔

”لیکن تم نے تو کمال کر دیا ہے۔“
”ایسے چھوٹے موٹے کمال میں کرتی ہی رہتی ہوں۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”وقت سب سکھا دیتا ہے۔“ وہ ذرا سادھیمارپی۔
”اور آپ لوگ فکر مند نہ ہوں، جو کام وقت نہ کر سکا۔“ اس نے انگلی سے ان دونوں کی جانب اشارہ کیا۔

”وہ میں کروں گی، جتنے کام مجھے آتے ہیں نا اتنے نہ سہی، کچھ نہ کچھ تو آپ لوگ سیکھ لیں گی۔ میں نے کما نا نانا نے آپ دونوں کی تربیت بالکل صحیح نہیں کی۔“

وہ شریر ہوئی۔ نوین اور زینت بیگم ہنس دیں۔
یہی وہ دقت تھا، جب ڈرل مشین کی مسلسل آواز سے پیچ و تاب کھاتا انخفش مرجانے یا مار دینے کے پلان بنا رہا تھا۔ وہ نوین اور اپنی دادی بیگم سے بھی خفا ہو گیا تھا۔

”موٹر کی بیلٹ ٹھیک کرنا، ڈرل مشین چلانا، گاڑی ٹھیک کرنا اور ٹائر بدلنا، سب سمجھ میں آتے ہیں، مگر۔“ زینت بیگم کا ذخیرہ الفاظ ختم ہو گیا۔

”ابھی تو آپ نے میرے ہنر کی ذرا سی جھلک دیکھی ہے۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے نا! وہ سیب کی قاش کانٹے سے منہ میں رکھتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

”آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے واشنگ مشین اور گھر کی چھوٹی موٹی الیکٹرونکس کو ٹھیک کرنا میرے دائرے میں ہاتھ کا کام ہے۔ اس کے علاوہ پتکھے کا کھیس مشین بدلنا، بند نالیاں کھولنا، دکان داروں سے لڑاؤ کرنا اچھی سبزیاں، پھل اور گوشت لانا اور۔ اور ہاں! موبائل ٹھیک کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے اور۔“

”بس۔ بس!“ نوین دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلاتی اسے روکنے کے لیے اٹھ کر اس کے ساتھ آئی تھی۔

”ہمیں سب خبر ہے، تم ہر فن مولا ہو، مگر یہ کام۔“
”توین نے جھرجھری لی۔

”اور گل آپ کہہ رہی تھیں، عین سوچ سے فیوزاڑ جائے تو بجلی والے کو بلانا پڑے گا۔ میں نے کیسے ایک منٹ میں فالٹ پکڑا اور دو منٹ میں پلگ پر نئے تار جوڑے۔ اتنا معمولی سا کام۔ اور ماں بیٹیاں کانپ کانپ کر دھرتی ہلاتی رہیں تو۔“

نوین نے اس کی طمانیت کو رشک سے دیکھا۔ وہ اتنی عمر میں اپنے آپ میں گم ادب آداب والی بی بی بن چکی تھی۔ نیک پروین، بلکہ اب بھی ویسی ہی تھی۔

کل دوپہر ہائینڈول کے لائٹ چلی گئی۔ اب بجلی والے کس وقت کیا کر جائیں گے خبر سوتیلوں صبر سے لکڑ فین جھلاتی رہیں۔ اسی دھوکے میں شاید جس بھرا گرم سیلا سیلا دن گزر جاتا جو انخفش کے گیلری والے کمرے سے میوزک بجنے کی آواز کانوں میں نہ پڑتی۔

”میں تیرا اہمیلی فائر۔“
”ایک بات تو بتائیے۔“ وہ اپنا ذہن میں ابلتا کھولتا سوال لے کر نوین کے سر پر پہنچی۔

”ایک یہ شاعری ہے، میں تیرا اہمیلی فائر۔“ اور ایک وہ دوسری بڑی مشہور ہوئی تھی۔

”کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا ٹکٹن ہوتا۔“
یہ آپ شاعر لوگ اتنی انسوئی باتیں آخر کیسے لیتے

ہیں؟ شاعری پر غور کریں جسٹ امیجین خالص جسٹ امیجین۔“ نوین نے تو کیا تصور باندھنا تھا، وہ خود ہی پیٹ پکڑ دہری ہوئی چلی گئی۔ پھر صوفے پر لڑھک گئی۔

”ہو مائی گاڈ۔ ہا ہا۔۔۔ ہی ہی۔۔۔ ہو ہو۔ ہائے۔“ اپنی ہنسی سے خود ہی تھک ہار جب سانس برابر ہوئی تو اپنے جہزے سہلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

اور دیے بھی مرد حضرات خواہ شاعر ہوں یا نہ ہوں اپنے محبوب پر ایک بڑن (بوجھ) کی طرح کیوں مسلط رہنا چاہتے ہیں صفحے کے صفحے کالے کر دیے۔ سارے شہر میں واہ۔ واہ۔۔۔ بوجھ سارا عورت کے کندھے پر۔ کبھی کسی نے یہ تو نہ لکھا کہ

”کاش میں تیرا باورچی ہوتا۔ دھوبی ہوتا۔“ اور یہ بد بخت فلموں والے خواجوا کی بکواس کرتے ہیں، نئے موضوعات نہیں ملتے۔

”تو بھی ایسے مسئلہ نوال ضمیر کے ہاتھوں حل ہوتا تھا۔ توین ہنسی۔

”تو اور کیا میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ہیرا بچھا بنالیں۔“
”لیکن وہ تو پٹی ہوئی اسٹوری ہے۔“ توین نے بے ساختہ ٹوک۔

”لو یا ر! پوری بات تو سنیں۔ ہیرا بچھا بنائیں، بس فرق یہ رہے گا، اس بار ہیر کی جگہ رانچھا بکھیاں بھل رہا ہو۔ اور۔“

”بہت اعلا پروڈیو سر بے چارہ پٹ جائے گا۔ ایسی فلم دیکھنے کوں جائے گا۔ مردوں کا معاشرہ ہے۔“ زینت بیگم بھی متوجہ تھیں۔

”تو ایسے کیا مسئلہ۔۔۔ معاشرہ مردوں کا ہے تو رہے۔“ عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فلم تو چلے گی۔

”آئی گاڑی۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ دراصل۔“
”میلوں کے ہیں یہ فاصلے تم سے نجانے کیوں۔“

تو جانے ناں۔۔۔
وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر چوکی۔

”جب آپ کے اس انخفش کا ڈیک اتنے زور سے بج رہا ہے تو۔ اس کا مطلب ہوا۔ لائٹ ہے۔“

یعنی۔۔۔

”ارے! تو ہمارے گھر کیوں نہیں؟“ زینت بیگم بوکھلائیں۔ ”ایک گھر کے لیے تو یہ بجلی والے منت کرنے پر بھی نہیں آتے۔ ارے اللہ! تار وغیرہ گرتا یا کچھ اور فالٹ ہوتا تو آواز آتی۔ پتا چل جاتا۔ یہ تو کوئی اور ہی بات لگتی ہے۔ نوین بلانا زرا انخفش کو۔ اسے آتا ہے بجلی کا کاموام۔“

مگر نوین کے جانے سے پہلے نوال اسٹور روم سے ٹیسٹر لیے آئی۔

اس نے مین سوچ کے پاس جا کر پانچ منٹ میں فالٹ پکڑا اور نیا تار ڈھونڈنے کاٹنے میں لگے ٹوٹل نو منٹ۔ دسویں منٹ میں سارا گھر جگمگا گیا۔

ان کے گھر بجلی آتے ہی انخفش کا ڈیک بند ہو گیا تھا۔ وہ کن اکھیوں سے اپنی گیلری میں کھڑا نوال کو دیکھ رہا تھا جو دادی بیگم کے دونوں بازو پکڑے انہیں بھنجوڑ رہی تھی۔

”ماں۔ ماں۔ میرے گاؤں میں بجلی آئی ہے ماں!“
نوین اور زینت بیگم حیرت سے گنگ تھیں۔

”آپ لوگ کچھ بولتی کیوں نہیں؟ زیادہ اور ایکٹنگ ہو گئی ناں؟“ اس نے جیسے اپنا فالٹ خود ہی پکڑا۔

”ضمیر بھائی اور نورین باجی نے تمہیں کیا بتا دیا نوال؟ کس نے سکھایا یہ سب؟“

نوین حیران تھی۔
”کسی نے نہیں۔ مجھے جو چیز ضروری لگتی ہے وہ میں کر لیتی ہوں۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”کوئی چیز باقی ہے ابھی؟“ زینت بیگم نے پوچھا۔
”نوا! ابھی تو دنیا میرے آگے شناختی کارڈ آجائے تو لائسنس۔ اگلے روز ریڈ کلر کی وٹز (vitz) خرید لوں گی۔ ڈیڈ نے وعدہ کیا ہے۔“

”یعنی شناختی کارڈ اور لائسنس کی امپورٹنس کا پتا ہے۔“ توین نے سراہا۔

”نوال ضمیر کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتی۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کا ضمیر زندہ ہے۔“

زینت بیگم نے اسے بے ساختہ اپنے ساتھ لپٹالیا۔
نوال کی نئی فرمائش۔ لیکن نہیں فرمائش تو رد کی
جاسکتی ہے۔ نوال کا فیصلہ افسوس۔
”مخفیہ کی کیا ضرورت؟ ہم خود اپنا جانور لاسکتے
ہیں۔“ اس کا قطعیت سے بھرپور لہجہ۔
اشتیاق احمد اور صوفیہ بھابھی کا سعودیہ سے فون آیا
تھا۔ بہت دیر حال احوال پوچھنے بتانے کے بعد صوفیہ
بھابھی، داوی بیگم کو وہ تمام ہدایات بتانے لگیں جو
انہوں نے اخفش کو ان کے لیے قربانی کا جانور خریدنے
کے لیے دی تھیں۔ اخفش اشتیاق احمد کے ایک
دوست عزیز اللہ کے ہمراہ جاکر داوی بیگم کے لیے جانور
خرید لائے گا۔
داوی بیگم کی ایک طرف گفتگو ان تینوں کے کانوں
میں پڑ رہی تھی۔
جی ہاں۔
اخفش انعام اپنے دادا کا پیام لے کر حاضر تھا۔ نوین
نے اسے دیکھتے ہی نجانے فریج سے کیا کیا برآمد کر لیا۔
وہ اس کے اتنے دن کی غیر حاضری پر استفسار کر رہی
تھی۔
”دوستوں کے ساتھ تھا آنی!“ وہ بھری تیاری سے
چیزیں اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ نوال کے نزدیک کھانا ہی
جابر تھا۔ کھانا۔ آگے ہی۔
شامی کباب، مسالا، ونگز، ٹوڈلز، وپر ان، بڑی کسٹرو
”کیچمپ اور لذیذ کھوپرا بسکٹس۔ پیسنہ پیسنہ ہوئی
کو لڈو رنک۔
”دوستوں کے پاس ضرور جاؤ، مگر دوست اچھے
ہونے چاہئیں۔ انسان کی ایک پہچان اس کا حلقہ
اجاب ہی ہوتا ہے۔“ زینت بیگم نے بڑے رساں
سے نصیحت کی۔ ”برکی صحبت سے بچنا چاہیے
سمجھے۔“
”جی۔۔۔ داوی بیگم! میں ہمیشہ بری صحبت سے دور
رہتا ہوں۔“ اس نے نوال کو حاکم سے دیکھا۔
”ہائیں۔ بری صحبت؟ دل ہی دل میں پیچ و تاب
کھاتی وہ اچھل پڑی۔

”سی لیے تو آج کل آپ کے گھر آنا پ
ہے۔“ وہ کشن سیدھا کرنے کے بہانے دامیں جھڑ
جھکا۔ نوال سنگل صوفے پر ٹکی تھی اور کیزہ
نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔
”نوال ضمیر سے پنگالینے کی کوشش؟ بڑے
سے تمہاری ساری حرکتیں برداشت کر رہی ہوں۔
خالیہ کا خیال نہ ہو تو۔۔۔ وہ دھوبی پٹا ماروں ہوں۔
کم گھسیٹوں زیادہ۔ مگر خیر۔“
وہ بظاہر بڑی متانت سے بیٹھی نانو اور اس کی نگاہ
سن رہی تھی۔ مگر اس کی شرر بار نگاہیں دیکھ کر اخفش
سب سمجھ رہا تھا۔
دل سے نکلے ”لفظ ٹھاہ“ کر کے دل تک ہی نہ
رہے تھے۔
”تم کیوں نہیں کچھ لے رہی ہو نوال۔ کچھ توڑا
کرو ناں۔“ توین نے یکدم دیکھا۔ وہ سبز چائے کا چھوٹا
ساکپ لیے بیٹھی تھی۔ ہلکی ہلکی چسکیاں لیتی گویا مگر
کے گھونٹ بھر رہی ہو۔
”ٹھہنکس خالیہ! یونو زیادہ کھانا جسم پر چربی چڑھا
ہے داغ موٹا ہو جاتا ہے۔ زمین کا بوجھ بن کر زندگی
گزارنے کا کیا فائدہ؟ اپنے جسم کو کھلا کھلا کر لانے کا
مقصد۔ اس سے اچھا بندہ کوئی گائے بھی نہیں پال
لے۔ دودھ گوشت کا مسئلہ ہی حل ہو جائے۔“
اس کے مشورے میں چھپا ”مخلوص“ شیرے کی
طرح ٹپک رہا تھا۔ بہت غور سے سنتی نوین کو جھکا لگا
وہ کیا کہہ رہی تھی۔ کیا وہ اخفش کے کھانے پینے کو
ٹوک رہی تھی۔ یا اس کے موٹاپے کو۔
حقیقت یہی بن کر اس کے دل پر اتری۔ اس نے
ڈرتے ڈرتے اخفش کو دیکھا۔ بلو جینز پر سفید
شرٹ اس کا تندرست جسم اور لال رنگ اس دن
میروں سے سیاہی کی جانب گامزن تھا۔ یہ اس کے منہ
اور عینے کی انتہا تھی۔
”تم۔۔۔ تم یہ کسٹرو ڈرائی کرو اخفش! توین کو فوراً
طور پر یہی سوچھا۔ اس نے ترنت سیالہ لبالب بھر لیا۔
نوال کانوں میں ہینڈ فری ٹھوستے ہوئے اٹھ کھڑا

ہوئی۔
”تم جو ہزاروں سال۔ اور تم جو ہزاروں
سال۔ اور سال کے دن ہوں۔ فقط ساڑھے سات
۔۔۔ اوٹھ۔“
اس سے پہلے اخفش کا داغ گھومتا، نوین نے نقص
امن کے خدشے کے تحت زینت بیگم کو یونہی مخاطب
کیا۔
”ای۔۔۔ ای۔۔۔ ای۔۔۔“
نوال لان میں کرسی ڈال کر بیٹھی تھی۔ چوکیدار بابا کا
نیمہ سالہ پوتا بے خود خان زمین پر پھسکڑا مار کے بیٹھا
تھا۔ دوسری کرسی پر اس سے کافی فاصلہ رکھ کر بابا بے
زار خان بیٹھے تھے۔
”مجھے جانور کے بارے میں سب کچھ ڈیٹیل میں بتاؤ
خان بابا! ہر چیز جزئیات کے ساتھ۔ میرا مطلب ہے
اس کا پورا احلیہ، مشکل اخلاق و کردار، چال ڈھال میرا
ذہن کلیہ ہو گا تو کام صحیح ہو گا ورنہ۔“
”آپ اتنی پریشانی کیوں کھاتا ہے نوال بی بی۔ اپنا
اخفش صاب لائے گی ناں۔“ بے زار بابا بے زاری
سے بولے۔
”میں قربانی کے جانور کی بات کر رہی ہوں اور آپ
گلی کے ”جانور“ کا ذکر لے آئے۔ بس آپ مجھے
بتائیے۔“
بے زار خان کی بیزاری برہتی جارہی تھی۔ جبکہ
بے خود کو نوال باجی بے حد پسند آتی تھیں۔ وہ بے
خودی کے عالم میں سرٹاپا اس کے ساتھ تھا۔ اتنی
ٹپٹپٹا جی۔
”میں بتاتا ہوں باجی۔“ اس اپنے ذہن میں
خصوصیات ”ری کال“ کیس۔
”چار ٹانگیں۔“ اس کے بتانے پر نوال کا قلم چلا۔
”ایک پیڈلے کر بیٹھی تھی۔“
”اور اگر باجی ہوں تو۔۔۔ یا تین۔ یا۔۔۔“
بے خود خان نے استفہامیہ نگاہوں سے دادا کو

”باجی کا پتا نہیں۔ تین نہیں ہونی چاہئیں۔“ بابا سر
پیٹ لینے والا تھا۔
”سب سے اہم وانت۔ نہ زیادہ نہ کم۔ ورنہ قربانی
نہیں ہوتا۔“
”گڈ۔ گڈ! بس بیلنس ہر دم، ہر چیز۔“ نوال کا قلم
اور زبان دونوں چل رہے تھے۔
”موٹے پیٹ کا بکرا اچھا نہیں ہوتا۔“ بے خود سوچ
سوچ کرتا رہا تھا۔
”وہ کیوں۔؟“
”بیس کھاتے ہیں تاکہ تندرست لگے۔ شہر کے
لوگوں کو کیا پتا۔ بے وقوف بن جاتے ہیں۔“
”پکوڑے۔۔۔ پکوڑے پکوڑے کھاتے ہیں؟“ نوال کو
جھٹکا لگا۔ اس نے اپنی تمام عمر کی یادداشت ٹٹولی
۔ گھاس ٹوسن، کھل بنولہ، سبزیاں، چھلکے، مگر پکوڑے
۔
”پکوڑے نہیں بیسن۔۔۔ بیسن، خالی کچا بیسن۔۔۔
پانی میں گھول کے بیسن۔ وزن بھی زیادہ لگتا ہے اور
دیکھنے میں ایک دم پلوان (پهلوان)۔“
”آئی سی۔“ نوال کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔
”دو سینگ، دو آنکھیں، ایک ناک اور دم بھی
ایک۔۔۔“
”ہائیں۔!“ روانی سے لکھتی نوال کا ہاتھ ٹھٹکا۔
”یہ سب تو مجھے پتا ہے بے خود خان! وہ بتاؤ جو مجھے
نہ پتا ہو۔“ اس نے سمجھایا۔
”اب میرے کو کیا پتا کہ آپ کو کیا نہیں پتا۔“ اس
نے اپنی مشکل بتائی۔
”آں۔ ہاں رنگ؟“
”کوئی سا بھی چلے گا۔“ بے خود نے ناک چڑھائی۔
”آپ نے کیا سمجھی قربانی کا جانور نہیں دیکھا؟“
”دیکھا کیوں نہیں۔ مگر کبھی خریدار کی نظر سے
نہیں دیکھا ناں! اور مجھے لگتا ہے دنیا میں بہت کچھ باقی
ہے ابھی میرے سیکھنے کے لیے۔“ اس نے کانڈ پر کچھ
نوٹ کیا اور خود کلامی کی۔

”تو کیا اس صاب ام لوک کے سات نہیں جائے گی۔؟ اکیلے۔؟“ بے خود اور نوال کی سرگوشی سے بے نیاز بنے بیٹھے بے زار خان کو دھیان آیا۔
”بے زار بابا! آپ میں اور بے خود پھر اکیلے کیسے؟“ اس نے سرپیٹ لیا تھا۔

زینت بیگم اور نوین حق دق درایوے میں کھڑی تھیں۔
شاید آفریدی، بمعہ اہل و عیال دروازے پر کھڑا ہوتا تو اتنی حیرت نہ ہوتی۔
میرا فرنگش بولتی آجاتی تب بھی۔
حسن نثار کی زبان سے شیرینی ٹپک رہی ہو تب بھی۔
یا۔۔۔
بی بی کا قاتل دست بدستہ خود کو پیش کر دیتا تو بھی۔۔۔

”ارے میرے اللہ! توین نے حیرت سے آنکھیں مسلیں اور زینت بیگم نے چشمہ کو ساڑھی کے پلو سے رگڑا کہ اگر کوئی یقینی یا گمان ہو تو منظر واضح ہو سکے مگر جو سچ تھا وہ آنکھوں سے دکھائی دے رہا تھا۔ کانوں سے سنائی دے رہا تھا۔“
”میں۔۔۔ میں اس۔۔۔ میں اس۔۔۔ میں اس۔۔۔ سرخ فرش پر مالا کے بھرے موتیوں (سیاہ موتی) کی طرح مینگنیاں بکھری تھیں۔ (مینگنیوں کی مالا۔ آخ تھو۔ آؤک) بکرے بڑے زور آور تھے۔ بے زار خان نے ایک کان بالکل ویسے ہی جکڑ رکھا تھا جیسے بچپن میں مسجد کے امام ان کے کان پکڑا کرتے تھے اور دوسرے کان بے خود خان کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ دونوں بکروں کو چوکنا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ انہیں فوری طور پر باندھ دینا ہی عقل مندی کا تقاضا تھا۔ نوال سونو کی والے کی پے منٹ بننا کر پٹی۔

”کیسے ہیں؟“ اس نے گھرے براؤن والے کی پشت پر چھکی دی۔

”س کے ہیں؟“ توین کے تمام عجیب و خدشات پھٹی آواز سے ظاہر تھے۔
”ہمارے اور کس کے۔“ اس نے طمانیت اور اسکارف چٹکی سے پکڑ کر اتار لیا۔ سردا میں ہلا کر خود کو سکون دیا۔ پونی بھی کھول دی سنہرے رنگ چہرے کے گرد تن گئے۔

”تو یہ آئے کہاں سے ہیں؟“
”ظاہر ہے منڈی سے۔“
”تو انہیں لایا کون؟“

”آپ کو ہمارے علاوہ یہاں اور کون نظر آ رہا ہے؟“
”ارے! مگر تمہارے پاس اتنے میسے کہاں آئے؟“ زینت بیگم چکرا کر گرنے والی تھیں۔
منہ کی آٹوینک مشین سے تڑتڑ جواب نکل رہا تھا۔ اب یکدم چپ لگ گئی۔

”یہ کوئی دو چار روپے کی چیز ہے۔“ وہ نوین کی رائے مانگنے کو مڑیں۔ اس نے اپنا حیران پریشان منہ تائب ہلایا۔ جواب تو دینا ہی تھا۔ سارے کام اس نے سیدھے کیے تھے۔ بس یہی ایک پیسے والا لٹا تھا مگر نا تو پڑتا ہے۔

”وہ جو آپ نے رات لفافے میں ڈال کر رکھے تھے ناں! کہ صبح اخفش کو دیں گی۔ وہ کسی انکل کے ساتھ جائے گا۔ بکرے لینے۔ تو۔۔۔“ انک انک کر بولتے وہ رک گئی۔
”وہ میں نے اڑا لیے۔“ اس نے تیزی سے جملہ مکمل کیا۔

”اور تب ہی مجھ پر یہ عاب پتا نہیں اچھا یا۔“
بہر حال انکشاف ہوا کہ اگر میں توجہ دوں تو ایک اچھا چور بن سکتی ہوں۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ دانی جون میں لوٹ آئی۔

”ہا۔۔۔ لوگ خوشی اور غم سے مرتے دیکھے ہیں۔“
نوین نے سوچا۔ ”اور اگر ہم دونوں ماں بیٹی میں سے کسی کو پارٹ انیک ہو جائے تو نئی مثال۔۔۔ جی! اجرت سے مرگئیں ہائے۔“

”اچھی چور ہی کیوں؟ تم توجہ دو تو ایک اچھی پاکٹ مار کار لوٹنے والی، بینک روبری تک کر سکتی ہو۔۔۔ بچے اٹھانے والی مائی بن سکتی ہو۔ اپنی فتنہ انگیز زبان سے دو انسانوں کو کیا تم ملک و قوم کو لڑوا سکتی ہو۔ بارڈر پر توپ میں گولے کی جگہ تمہیں رکھ کر چلا میں ناں تو دشمن لیر لیر ہو جائے۔ نام و نشان مٹ جائے۔“

”اخفش نجانے کب پیچھے آکر کھڑا ہوا تھا۔
”کیا۔ کیا۔؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”نت تہ۔۔۔ تم نے میرے بارے میں۔؟“

”ہاں! ہاں! تمہارے بارے میں۔۔۔ زہر لگتی ہیں؟“ اپنی شناخت بھلا کر مرو۔ مرو کھیلنے والی لڑکیاں۔ جی! ہم بڑی بہادر ہیں۔ مروانہ پکڑے پن کر جا کر زچڑھا کر کیا سمجھتی ہو ہم مرو بن گئی ہو؟ ابھی کوئی بد نیت ہاتھ پکڑے تو منہ سے چوں ہی نہ نکلے۔ بھلے پلگ جوڑ لویا ہار بیل کر لو۔ سمجھیں؟“

”اخفش کے اچانک وارہ ہونے والے غصے سے نوین اور زینت بیگم واقف تھیں۔ مگر نوال کو اس طرح لٹاڑتا۔

نوال کا چہرہ حیرت میں رنگنے کے بعد پھیکا ہوتے ہوئے بالکل سفید ہو گیا۔ اتنا شدید ری ایکشن۔ وہ کس حد تک صحیح تھا یا غلط مگر اس وقت کاروبار۔۔۔ نوال مہمان تھی اور۔۔۔

نوین نے کچھ بھی کہنے کے لیے لب کھولے مگر اخفش نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

”ابھی عزیز اللہ انکل کا فون آیا ہے۔ وہ اپنے دو بھائیوں، تین بیٹوں اور دو دامادوں کے ہمراہ بکرا منڈی جانے کے لیے نکلے ہیں۔ مجھے یہاں سے لیتے ہوئے جائیں گے۔ میں آپ سے پیسے لینے آیا تھا اور یہاں۔۔۔ جب آپ کے سارے کام اسی مردار کو کرنے تھے تو مجھے کیوں کہا؟ اب میں انہیں کیا جواب دوں؟ یہ دیکھیں! ان کی مس کل۔ آگے ہیں وہ گلی کے کونے پر۔“ اس نے اپنے فون کو زور سے بند کیا۔

نوال کی حرکت بے حد حیرانی کا باعث ضرور تھی مگر اسے اتنی سادگی جاتی۔ دس ازناٹ فیہ۔ مگر شاید اپنی

جگہ اخفش انعام بھی درست تھا۔
اس کی فون نیل دوبارہ ہوئی تو وہ پیر پختا بال نوچتا باہر کو لپکا۔ لوہے کا دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ در تک بازگشت سنائی دیتی رہی۔ چھ نفوس کو چپ لگ گئی تھی (دو بکرے)۔

”یہ باقی پیسے۔۔۔“ نوال نے سفید لفافہ زینت بیگم کے سامنے کیا۔ ساٹھ ہزار تھے۔ پینتالیس ہزار کی بکروں کی جوڑی۔ سونو کی اور ٹیکسی کا کراپہ دو ہزار روپے ہیں۔ پھر ان کا چارہ اور ہار، کھنکھرو وغیرہ۔ باقی آپ گن لیں۔

”میں نہیں پانی پلا دو بے خود خان اور مضبوطی سے باندھو۔ وہ بکرے والے نے کہا تھا ناں! بہت جی دار بکرے ہیں۔ کھل گئے تو لان خراب کریں گے۔“
وہ کلائی سے پونی اتار بالوں میں چڑھاتے ہوئے اندر رہ گئی۔

نوین اور زینت بیگم ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔
”میں سونے لگی ہوں، کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“ نوال نے آواز لگائی تھی۔

”وہ تو باجی نے مجھ سے بولا، بے خود! بکرا منڈی چلتے ہیں۔ کچھ نہ کریں گے تو بڑے بڑے جانور ہی دیکھ لیں گے جن کے بارے میں روزی وی والے بتاتے ہیں۔ بہت بڑے بیلوں کی جوڑیاں۔ تو میں نے کبھی اتنے بڑے بیل نہیں دیکھے تو میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ پھر باجی نے بولا، ہم اپنے لیے بھی جانور دیکھیں گے۔ دیکھتے ہیں ہم یہ کام کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ خان دادا کو اس لیے ساتھ لے کر گئے تھے کہ ان کو پہچان ہے جانور کی۔ مگر اور (ادھر) اتنی اتنی رقم بولتا تھا۔“
بے زار خان نے بکروں کے منہ، دانت، آنکھیں سب چیک کیں۔

”کان بھی چیک کرو۔“ نوال نے یاد کروایا۔ ”مہرا بکرا نہیں چلے گا۔“

”کان کیسے چیک ہوں گے؟“ بے خود پریشان ہوا۔
”اس کے کان میں چیخ مارو! اگر اچھل پڑا تو ٹھیک
ورنہ۔۔۔“
بے خود کو آئیڈیا اچھا لگا۔ وہ کان اوپر پکڑ کے جھکا مگر
اس سے پہلے اس کے گال پر بے زار خان کا طمانچہ لگا۔
وہ اچھل پڑا۔

”کیا سہرا کرے گا۔ خوچہ۔۔۔“
”سب ٹھیک ہے نوال بی بی! پیسہ دو۔ اور باگو۔۔۔“
نوال صاحبہ کے کریڈٹ میں یہ بھی کمال لکھ دیا گیا
کہ وہ بکرا خرید سکتی ہیں اور چوری بھی کر سکتی ہیں۔
مگر جو کچھ اخفش کہہ گیا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ سب۔
وہ سب سننے میں ٹھیک لگتا تھا مگر اس کا حقیقت
سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

نہنت بیگم اور نوین لاؤنج میں ٹکر ٹکر ایک
دوسرے کی صورتیں دیکھ رہی تھیں۔ اخفش بانٹیک
لے کر نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ نوال کمرے میں سو رہی
تھی۔ نوین دو مرتبہ دیکھ کر آئی مگر وہ گہری نیند میں
تھی۔ بے خود خان بے خودی کے عالم میں بکروں کی
سیوا میں لگا تھا۔ بے زار خان کی بھی ساری بے زاری
رفو چکر تھی۔ وہ کئی بار بکروں کا منہ سرچیک کر چکا تھا
مگر بے براؤن اور سفید موچے قد کے بکرے۔ ایک
دوسرے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تھے۔

نہنت بیگم اور نوین نے بھی اپنی آنکھوں میں گویا
ایکسے فٹ کر کے معائنہ کیا تھا۔ کوئی نقص خالی
پکڑی جائے۔ مگر نہیں۔ دونوں شان دار تھے۔
بے خود ایک بل کے لیے بھی بکروں کے پاس سے
پٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے نوال بی بی کی سخت ہدایت
تھی۔ بے زار خان سونو کی میں بکروں کے ساتھ آیا تھا
جبکہ نوال اور بے خود خان ٹیکسی کی پچھلی نشست پر
سرگوشی میں باتیں کرتے آئے۔

نوال کے حیرت انگیز انکشافات ناقابل یقین
خدا شات۔ بے خود کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ وہ تو ایسا

کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ۔۔۔ نہیں نہیں۔ تو بے
مگر نوال بی بی غلط کیوں بولیں گی؟ وہ اتنی سمجھ دار
تجربہ کار ہر فن مولا جبکہ خود بے خود خان کم عمر کم
عقل بے وقوف اور ہر کسی پر اعتبار کرنے والا بھولا۔
”ان بکروں کی حفاظت اس طرح کرو جیسے یہ ایٹمی
اٹاٹے ہوں۔۔۔ مجھے تم۔۔۔ آنکھیں اور کان کھلے
رکھنا۔“

”لیکن کیا ہو سکتا ہے؟ بکروں کو کوئی کیا نقصان پہنچ
سکتا ہے؟“
”میں بہت سا آٹا کھلا کر موشن پر مجبور کیا جاسکتا
ہے۔ ایسی کوئی دوائی کھلایا جگھادی جاسکتی ہے کہ یہ
ٹن پڑے ہوں جیسے۔۔۔“
”جیسے چرس کا سگریٹ۔“ بے خود نے کلیو
دیا۔ ”اولیں۔“

”نوار ہی چنادی گئی تو گئے بکرالوگ۔“ بے خود کا
اگلا اندازہ تھا۔

”بالکل! بالکل۔۔۔“
”میں نہیں اندھا یا لنگڑا بھی کیا جاسکتا ہے۔“ نوال کا
اپنا دماغ اب تیزی سے اس پہلو پر بھاگنے لگا۔ ”سو
ثابت ہوا کہ بے خود خان! ان تین دنوں میں اپنی جان
سے بڑھ کر ان کی حفاظت کرنی ہوگی۔ ذرا سی بے
احتیاطی نقصان کا باعث ہوگی۔ دشمن بہت مکار
ہے۔“

”ام تیار ہے۔“ بے خود نے نوال سے زیادہ
پر اسرار الٹ لہجہ اپنایا۔ اب اس کی اپنی چارپائی بکروں
کے پاس رکھی تھی۔
نوال خاصی شام کو نہا دھو کر باہر نکلی۔ اس کے
چہرے پر دو ہروالی خاموشی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ فرنگ
سے انگوروں کا کچھانکال کروہنی وی کھول بیٹھ گئی۔
”میں نے وہ کونے والے مرغی والے سے بات کر لی
ہے۔ وہ آئے گا زنج کے لیے۔ آپ کو اگر کسی اور کو ملانا
ہے تو۔۔۔ یہ پرچی بہر حال سنبھال لیں۔“

”مرغی والا بکرانج کرے گا؟“ توین نے پوچھا۔
”جب ہی تو تو کن بانٹا پھر رہا ہے۔“ لائن مٹی

تھی۔ ”نوال گردن پیچھے گرائے گچھے کو چہرے پر
لٹکائے انگور ٹونگ رہی تھی۔
”ان لوگوں کے پاس تو بہت رش ہوتا ہے۔ اگر نہ
آتا تو۔۔۔؟“ نہنت بیگم کے پاس سالہا سال کا تجربہ تھا۔
”سب لوگ لے رہے تھے تو میں نے بھی لے
لی۔ بے زار بابا نے بھی کہا تھا باقی آپ کی مرضی۔ آپ
کو زیادہ پتا ہے اور پھر۔۔۔“

اس نے یکدم جملہ ادھور چھوڑ دیا ”نی وی کی آواز
بند تھی۔ اپنے پسندیدہ گانے کی جھلک دیکھ کر اس نے
آواز بلند کی۔ اور انگور ٹونگ پر رکھ دیے۔
اب وہ کومل رضوی جیسے جھٹکے صوفے پر بیٹھے بیٹھے
دکھا رہی تھی۔
نوین اور نہنت بیگم ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ
گئیں۔

گھڑی کی سوئیاں دس سے اوپر گئیں تو نہنت بیگم
اور نوین دونوں کے ہاتھ پر پھول گئے۔ نہنت بیگم اور
نوین کا روزہ تھا۔ قربانی کے گوشت سے کھولنا تھا اور
نہنت بیگم شوگر پینٹ نہنت بیگم کی آنکھیں بار بار
بھر آتی تھیں۔ پچھلے برس صغیر خان نے خود قربانی کی
تھی۔ اور اب بیٹے کا صبح صبح فون آگیا تھا۔

کتنا کیرنگ بیٹا تھا ناں۔ اپنی آدمی رات کے وقت
جاگ رہا تھا کہ ماں کو ”صبح“ مبارک باد دے دے۔ فرض
پورا۔ احساس ذمہ داری واجب نہنت بیگم دل
چھوڑے بیٹھی تھیں۔
اخفش نے بھی ابھی تک جھلک نہ دکھائی تھی۔ وہ
خفا تھا۔

نوال سحر خیز تھی۔ وہ بہت دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔
دس بار بے زار خان کو بھیج چکی تھی۔ وہ ”بس آ رہا
ہوں“ کا جواب لے کر آتا۔ قصائی ان ہی کی لین کے
تھمرل میں مصروف عمل تھا۔ ان کا نمبر آنے میں دیر
نہ تھی۔

مگر پھر یکدم وہ گلی سے غائب ہو گیا۔

”کہاں گیا۔؟“ نوال نے نمبر ملایا۔
”ہاں! اس نے فون کو چہرے کے سامنے رکھ کر
گھورا۔
”کیا ہو گیا؟“ سر اسیم سی نوین سامنے ہی کھڑی
تھی۔ نوال نے جواب نہ دیا۔ دوبارہ سہ بارہ نمبر ملایا۔
”کیا کہہ رہا ہے؟“ نہنت بیگم بھی آگئیں۔
”آپ کا ملایا ہوا صارف بڑا ہی بے غیرت جھوٹا دو
نمبر بھگوڑا ہے۔“
”یہ۔۔۔ یہ کہہ رہا ہے۔“ توین کے حلق سے بمشکل
نکلا۔

”ظاہر ہے! مطلب تو یہی نکلتا ناں۔“ وہ سوچ میں گم
ہوئی۔
”یعنی قصائی جل دے گیا۔ ارے! اور گھروں کے
تو مرد ساتھ ساتھ پھر رہے تھے۔ یہاں سے کس نے
جانا تھا۔“ نہنت بیگم نے آنسو پونچھے۔

”بے زار لالا گئے تو تھے تین بار۔“ توین بڑبڑائی۔
”بے زار کو کون پوچھتا۔ ارے! اخفش ہی کو بلا
لیتے۔ وہ بھی صبح سے نہ آیا۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔“
”یہ کوئی مہورت ہے جو پیتا جا رہا ہے۔ شہ
مہورت؟“ نوال نے ناگواری سے کہا۔
”بے خود! بے خود! بے خود!“ وہ چلائی۔
”جی بابجی۔!“ وہ پیچھے ہی کھڑا تھا۔ فوراً حاضر ہوا۔
”لاؤ! چھری کاٹنے۔“

”وہ تو صبح سے تیار ہیں۔“ بے خود نے چری بیگ کی
جانب انگلی کی۔ ”چٹائی پانی کا ٹب بالٹی لکڑی کے
مڑے۔“
”ارے میرے مالک!“ نہنت بیگم اچھل کر کرسی
سے اٹھیں پھر ڈھم گئیں۔

”مہورت قربانی نہیں کر سکتی۔ ارے!
روکو۔“ توین بھی آنے والے وقت کا سوچ کر تھرا
گئی۔ نوال سے کیا بعید۔

”پاگل ہوئی ہو۔ دماغ درست ہے؟“
”پتا ہے مجھے۔ بے زار بابا آپ کریں گے نہ؟“
”میں۔۔۔“ وہ اپنے سینے پر انگلی رکھ کر حیران

تھے۔ ”اب وہ جوانی دم کہاں رہ گیا۔ ہاتھ مات ہلتا رہتا اے ام نہیں کر سکتا۔ جانور نہیں سنبھال سکتا۔“ وہ تاسف سے اپنی مجبوری بتا رہے تھے۔

”لوہو! نوال کے ہونٹ سکڑ گئے۔ معاملہ تو بگڑ گیا تھا۔ مگر نہیں نوال کے سامنے کوئی معاملہ خراب یا ادھورا نہیں رہ سکتا۔

”کسی بھی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر

ممکن کوشش کرنی چاہیے۔“ اس کی زندگی میں اس

جملے کی بہت اہمیت تھی۔ ”ہار مان لینے سے پہلے تمام

داؤ آزمائے جانے چاہئیں اور ہر جائز راستہ اپنالیتا چاہیے۔“

نوال نے بے خود کے چہرے کو دیکھا۔ وہ چوکس

بکروں کے ہمراہ کھڑا تھا۔ مانو تین دن سے بکروں کے

ساتھ بندھا تھا۔ بے خود خان کی کینہ توڑ نگاہیں برابر

والے گھر کے ٹیرس پر جمی تھیں۔

نوال ہر وقت فیصلے پر یقین رکھتی تھی۔

”اے۔ اے سنو! اوپر کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے

ہو؟ اتنی جان بنا کر رکھی ہے۔ نظر نہیں آ رہا دس بجنے کو

آگے ہیں اور ابھی تک قربانی نہیں ہوئی؟ ویسے بڑے

طرز پر خان بنے ہو۔ آؤ بڑا دیکھیں تو۔“

انخفش تو چھوڑا دھڑا چاروں لوگ بھی حق دق رہ

گئے۔

”مجھے۔ مجھے بلارہی ہو؟“ وہ ذرا سا جھک کر حیرانی کا

مظاہرہ کرنے لگا۔

”ہاں! تو تم ہی ایک گائے ہو ادھر۔“ توین نے

اچنبھے سے نوال کا چہرہ پڑھنا چاہا۔

اس نے انگلش کا ”گائے“ کہا تھا یا اردو کی

”گائے۔“

”تو تم تو سارے کام خود کرتی ہو۔ یہ بھی کر

دیکھو۔“ (اس سے اچھا موقع طعنہ دینے کا کب۔ مل

سکتا تھا ہو)

نوال کو آگ لگ گئی۔ مگر اس کے جواب سے پہلے

زیانت بیگم نے اسے پکارنا شروع کر دیا۔ ساڑھی کے

پلو سے آنسو پونچھتا تو وہ انہیں کب سے دیکھ ہی رہا تھا۔

”جی داوی بیگم۔!“ وہ ٹیرس سے غائب ہو گیا۔

”اب میرے کو کیا حکم۔؟“ بے خود خان اس کے کان کے پاس منمنایا۔ ”یہیں بیٹھو نال، نظر رکھو۔“

”خالی تم کیوں۔ میری بھی کرسی لگاؤ۔“

تھوڑی ہی دیر میں سیاہ ٹراؤزر پر لمبی قمیص

آستینیں شانوں کے نزدیک نزدیک موڑے قاتلانہ

چمک اور سرشاری سے زمین پر دھمک پیدا کرتا، خف

انعام سامنے تھا۔

وہ نہ انگلش کا ”گائے“ لگ رہا تھا نہ اردو کی

”گائے۔“

سنڈا یعنی گینڈا۔ گوشت سے پریشان اور لال

سرخ رنگت۔

”بانی والی ڈالو بے خود!“ اس نے آواز لگائی۔

”آئی مین۔ بکروں کو۔“ انخفش کی طرف دیکھ کر

اس نے جملہ جیسے واضح کیا۔

بہت دل گردے، جگرے، ہمت کا کام اس نے بہت

سیلے سے جیسے بل بھر میں بنایا تھا۔

اب کھال اتارنے کے لیے دونوں بکروں کے

ٹھنڈے ہونے کا انتظار تھا۔

وہ ہاتھ دھو کر نوین کی دی چائے کی چسکیں لے رہا

تھا۔ اتنے دن بعد آتی ”باکروار چائے“ نصیب ہوئی

تھی۔

”آپ کوئی ہیلپ کریں گی یا میں اکیلا ہی۔“

”اس نے اسے باقاعدہ جتایا تھا۔ وہ بسکٹی گھیر دار

فراک اور چوڑی دار یا جامہ میں بالکل مختلف لگ رہی

تھی۔ اسٹول پر بیٹھی نگرانی کر رہی تھی۔ فراک کے

گھیرنے اسٹول کو چھپا دیا تھا۔ اچانک دیکھنے سے لگا

جیسے کوئی باری ڈول ہو امیں بیٹھی ہے۔

بال ابھی تک نم تھے تو کمر پر جھول رہے تھے۔

”نہیں! جس کا کام اسی کو سا جھ۔“ اس نے سرخ

نیل پالش کو پھونکیں مارتے ہوئے جیسے تسلیم کیا۔

”آپ کے خیالات کچھ اس سے الگ نہیں

تھے؟“ وہ چھرا روک کر کچھ یاد کروا رہا تھا۔

نیل پالش کا ڈھکن بند کرتی نوال ٹھکی پھر

سکرائی۔

”معاشرت کے مخالف جایا جاسکتا ہے۔ فطرت

سے رد گردانی بھی کر سکتے ہیں مگر قدرت سے بچنا نہیں

لیتا چاہیے۔ قدرت کی قدرت کو مان لینے ہی میں بھلائی

ہے، خیر ہے۔ کینوس کے اوپر لگائے ہوئے اسٹروک

تصور ہوتے ہیں۔ ایک لائن بھی باہر نکل جائے تو

تصویر بگڑ جاتی ہے اور اثر کھودیتی ہے۔ جب اللہ نے

کہہ دیا کہ یہ کام مردوں کے کرنے کا ہے تو مرد کریں

گے۔ میں وہی کام کرتی ہوں بچن کے بارے میں مرد

و عورت کی تمیز نہیں دی گئی سمجھے؟ نوکا دھیان سے

چلا نا۔ اپنا ہی ہاتھ نیچے ہے۔“

اس کی حیرانی پر اس نے اسے نرمی سے دھیان دلایا

تھا۔



عید کا دن سب گلے شکوے بھلا کر خوش دلی سے

ملنے جلنے کا تھا اور انخفش کے لیے تو یہ واقعی عید کا دن

تھا۔ کامیابی کا۔

آخر کار وہ نوال پر اپنی برتری ثابت کرنے میں

کامیاب ہو گیا تھا۔ کہ ناکام ہو کر اسے مردہ ہی کو پکارنا

پڑا تھا اور مرد بھی کون۔؟ انخفش

اب انخفش راجہ اندر بن کر بیٹھا تھا جیسے کہ ہمیشہ

بیٹھا کرتا تھا اور اسے نوال کی طنز یہ جتاتی نگاہوں کی

قطعاً پرواہ نہیں تھی۔ آج وہ کتنے دنوں بعد اس طرح

لاڈلھواٹھواٹھوا کر کھاتی رہا تھا۔ اس نے بارہ بجے تک بے

خود خان اور بے زار خان کے ساتھ مل کر دونوں بکرے

ٹھکانے لگا دیے۔ بے خود اپنے آنسو پی لی بلکان تھا۔

اسے بکروں کے ساتھ تین دن و رات رہ کر عجیب سی

انسیٹ ہو گئی تھی۔

زیانت بیگم نے آسان الفاظ میں فلسفہ قربانی کو بیان

کیا۔ بے زار خان نے بے زاری سے اس کی آنسو

بھری آنکھوں کو دیکھا جو ٹھنکی باندھ کر کبھی بکروں کے

چہرے تکتا تھا، کبھی پیر۔۔۔ ہا۔۔۔

”ہم تمہیں ایک بکرا لادیں گے بے خود! تم پالنا

تھا۔

اسے۔“ نوال مسئلہ کا حل پیش کرنے پر یقین رکھتی

تھی۔ مگر کوئی تسلی تشفی اترے چہرے پر رنگ لانے

سے قاصر تھی۔ وہ شکوہ کنال نگاہوں سے نوال کو دیکھتا

تھا۔

اتنے دن اس نے ہر بل بلک جھپکائے بنا نوال کی

تمام ہدایات کے مطابق انخفش کے بڑے ارادوں،

عزام سے بکرے بچا کر کیا اسی لیے رکھے تھے کہ وہ ان

کے ساتھ۔۔۔

”ہائے، ہائے، ہائے!“ وہ اپنی ران پر پچھتاوے کے

ہاتھ مارتا تھا۔ جب جب انخفش ماہر قصائی کی طرح نوکا

چلاتا تھا۔

مگر بعد میں بے خود نے نوین کے ہاتھ کی مزے دار

کلیجی بے حد و حساب کھاتے ہوئے اپنا غم معدے کے

راستے ہضم کر لیا۔

نوال کلیجی پورے سال میں ایک بار صرف قربانی

والی کھاتی تھی۔ انخفش نے پہلے جی بھر کے کلیجی کھائی

اور بعد میں دسترخوان پر وہ کھا کھا کر تھکتا تھا اور تھک

تھک کر کھاتا تھا۔ بریانی، کھیر، نمکین گوشت اور سلا

چشتی۔۔۔ نوال نے ہر چیز چکھی، مگر اس کا پیٹ بے حد

بھر چکا تھا۔

وہ انخفش کے کھانے کی رفتار دیکھ حیران تو تھی ہی

مگر تب چڑھانے والی بات۔ زیانت بیگم اور نوین کا

اسے بڑھ چڑھ کر کھانا تھا۔

اس نے پہلی بار ہی جب زیانت بیگم اور نوین کو

اسے اس طرح کھلاتے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ وہ اٹھارہ

برس کا جوان بلکہ حد سے زیادہ جوان یہ موٹا ہٹا تھا (کٹا

۔۔۔ بھینس کا بچہ جو ابل جوتنے کے لیے استعمال ہوتا

ہے)

”نانو کو بچہ گود لینا تھا، ضرور لیتیں، مگر کچھ زیادہ ہی

چھوٹا بچہ گود نہیں لے لیا؟“ اس نے نوین سے پوچھا

تھا۔

”کیا مطلب؟“ نوین اچھلی۔ کیا اس نے وہی سمجھا،

جو اس نے کہا یا اس کا کوئی اور مطلب تھا۔

”یا پھر یہ وہ بچہ ہے، مگر جو ہے تو بہت چھوٹا، مگر زیادہ

لکھانے یا پھر جینیٹک طور پر عمر سے بڑا بے حد بڑا دکھائی دیتا ہے۔ سائنس میں باقاعدہ اس کا نام ہے جیسے کہ۔ ”اس نے کسی مکار اینکو کی طرح اپنے بیان پر رہتے ہوئے لہجے کے معمولی رد و بدل سے وہی کہا جو وہ کہنا چاہتی تھی۔“

”تم بہت بد تمیز ہو نوال!“ نوین بے ساختہ ہنس دی۔

”مائی پلہڑ۔۔۔!“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر خمیدہ ہوئی۔

”دراصل!“ نوین ماضی میں کھو گئی۔ ”چار سال کا تھا اخفش جب ہما بھابی نے دوبارہ اپنی جاب جوائن کرنے کی بات کی۔ وہ ایئر ہوسٹس تھیں اور یہ لومیرج تھی۔ شادی کے وقت انعام بھابی کے دماغ میں کلیئر تھا کہ بس! اب شادی ہو گئی۔ گھر بچہ، فیملی۔۔۔ اور ضرورت ہی کیا تھی کہ ایک ٹف شیڈول جاب کو جاری رکھا جائے۔“

”مجھے شوق ہے۔۔۔ اگر ضرورت نہیں تو۔۔۔“ ہما چلائی تھیں۔

”شادی سے پہلے تم اپنا شوق پورا کر چکی ہو۔ کوئی گلٹ تو نہیں۔۔۔ کہہ ہائے! میں یہ کام کرنا چاہتی تھی۔ اب گھر ہے۔۔۔ فیملی ہے۔۔۔ آج ایک بچہ ہے، کل اور ہوں گے۔ شادی سے پہلے شوق پورا کر لیا اب باقی زندگی گھر کے لیے وقف کرنا ہوگی۔“ انعام بھابی کا جواب واضح تھا۔

مگر ہما پانچ سال سے گھر گھر کھیل کر اوب چکی تھیں۔ انعام کے لاکھ منع کرنے اور ناراضی کے باوجود جوائن کر لیا۔ اخفش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے اشتیاق انکل اور صوفیہ آنٹی بہت لاڈ سے پالتے تھے۔ انعام بھابی کی توجہ اپنے بزنس کی طرف تھی۔ تو وہ وقتی کمی اخفش کے چاچو پوری کیا کرتے۔ وہ چچا بھی تھے۔ دوست بھی اور۔۔۔ اور پھر۔۔۔ نوین ماضی میں کھو گئی۔

گھر میں سرد مہری کا ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ آئے روز کی تکرار جھگڑا۔۔۔ مگر اس سے پہلے کوئی نا پسندیدہ کام ہوتا یعنی طلاق وغیرہ۔ ایر کریش میں جہاز

کے تمام سوار جاں بحق ہو گئے اور ہما بھابی کی تک نہ مل سکی۔ ان کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ مگر بعد میں دنیا کی باتیں۔۔۔ گھر میں رہتی ناں۔۔۔ کیوں گئی تھی نوکری کرنے۔۔۔ عیش مل تو رہے تھے اور پھر بد خوئیاں کرنے والے لوگ اخفش بہت بچپن سے ہمارے کو قصور وار سمجھتا رہا۔ اس کے دماغ میں کلیئر ہے کہ ماں گھر میں ہوتی تو کبھی نہ مرنی۔ اور وہ اپنی موت کا بخو ذمے دار ہے اور یہ ایک مائنڈ سیٹ ہے جس سے شاید وہ کبھی نہ ابھرے۔ صوفیہ آنٹی کے تین تو بچے ہیں۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ وہ امریکا میں رہتی ہے۔ پھر وہ گھنٹوں سے معذور ہو کر جب وہیل چیئر پر آئیں تو غیر محسوس طریقے سے اخفش امی کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ مجھ سے تیرہ چودہ برس چھوٹا ہے۔ میں تو اسے گود میں اٹھا کر کھیلنے جایا کرتی تھی۔ میرے اور امی کے بیچ گھس کر سویا کرتا تھا۔“ نوین کی آنکھوں میں تاسف کی گہری نمی تھی۔

اوہر امی نعمان بھابی کے باہر پڑھنے جانے کے فیصلے سے۔۔۔ اور پھر بعد میں وہیں کے ہو جانے سے غیر ارادی طور اخفش کے نزدیک ہوتی چلی گئیں۔ کسی سے کہنے سننے کی بات نہیں۔۔۔ دو محروم افراد اپنی اپنی محرومی کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امی کو نوال اٹھا کر ممتا کی تسکین ملتی ہے تو یقیناً ”اخفش کو ان سے اٹھوا کر اپنی محرومیوں سے جان چھڑانے کا موقع ملتا ہے۔ جب ہما بھابی کی ایسی توجہ کی ضرورت تھی اور وہ نہیں ہوتی تھیں۔۔۔ اور موٹاپا زیادہ کھانے سے ہی ہے اور کچھ خاندانی بھی۔ دو چار سال بعد خود بخود اسماٹ ہونا شروع ہو جائے گا۔ اس کے پیلا اور چاچو بھی ایسے تھے۔“ نوین مسکرائی۔

”اور۔۔۔ اور اس کے پیلا۔۔۔ انعام بھابی؟“

”وہ امریکا میں ہیں۔۔۔ وہیں شادی کر لی۔ بیٹے بیٹیاں سب ہیں۔ آتے ہیں چار پانچ سال بعد۔“

”تو یہ یہاں اکیلا رہتا ہے؟“

”نہیں! کیوں۔۔۔ دادا۔۔۔ دادی۔۔۔ چاچو اور ابھی ذ سب جج پر گئے ہیں ناں تو اس لیے۔۔۔“

نوین کے چپ ہونے پر نوال نے سب سمجھ آ جانے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے لمبی سانس لی۔

”سب ٹھیک۔۔۔ مگر مجھ سے کیوں خار کھاتا ہے؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟“

”اس کا تم نے کچھ نہیں بگاڑا۔۔۔ وہ عورت کی بے جا آزادی، خود مختاری، بڑھ چڑھ کر آگے ہونے کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کے پیچھے وجہ وہی۔۔۔ شاید ماں کی ضد اور ضد کے بعد موت۔۔۔ سب کچھ یوں ہی لکھا تھا۔ مگر اخفش کا کہنا ہے۔ عورت کو عورت بن کر رہنا چاہیے۔ مرد پر ڈپینڈ کرنا چاہیے۔ من مانی مست کرے۔ چھوٹی موٹی کا پھول بن کر رہے اور کچھ یہ ہے کہ اس کی اپنی دادی معذوری کی بنا پر گھر کے تین مردوں کی محتاج ہی ہیں۔ ایک طرح سے کہہ لو میں اور امی کچھ فطرتاً ہی ایسی ہیں کچھ ابانے بنا دیا۔۔۔ اور اہم بات یہ بھی ہے کہ اخفش کی تربیت میں زیادہ ہاتھ ہمارے ابا کا ہی ہے۔ ورنہ اشتیاق انکل تو۔۔۔ تم ان سے ملو تو مزا آجائے۔“

”یعنی۔۔۔!“ نوال نے لمبا کھینچا۔ ”دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کی برباد تربیت کے پیچھے والا خفیہ ہاتھ۔۔۔ ہمارے نانا کا ہے۔“ نوال نے نتیجہ نکالا۔ نوین ہنس دی۔

”اور تمہارے مرد مار کام اسے جڑاتے ہیں۔ آگ لگاتے ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے ہم نے اسے اتنا تیار کیا تھا کہ نوال یہاں رہے گی۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن دونوں اکٹھے لیتا۔ تمہیں پتا ہے تمہاری اور اس کی برتھ ڈے میں صرف تین دن کا فرق ہے۔ سو دنوں لیو ہیں۔ مگر تم نے تو آتے ہی دشمنی کی داغ بیل ڈال دی۔“

”لوا! خواہ مخواہ میں نے۔۔۔ وہی گھر میں رہیں دیتا داخل ہوا تھا۔ میں سمجھی کہ۔۔۔ اور ہماری دوستی نہیں ہو سکتی۔ وہ میرے آنے سے اس لیے خوش ہوا ہو گا کہ ایک اور بے بس، بے عقل ڈرپوک کو وہ اپنی آنکھوں سے دکھائے گا، بتائے گا اور میں رہٹ گے نکل کی طرح ”جی، جی“ کروں گی ہونہہ!“ نوال کا تنہا

ہنوز تھا۔

دنیا بہت روشن اور چمک دار دکھائی دے جو آنکھوں پر ہمہ وقت اعتدال کی عینک لگی ہو۔

”ہمارے گھر آکر کیسے فرمائش کر کر کے کھاتا ہے۔ گرم گرم پرائے اترتے ہیں اس کے لیے۔۔۔ نانو نوالے دیتی ہیں منہ میں۔۔۔ اور یہ ہمیں دے گا ٹھنڈے، پچھے پچھے تگے۔۔۔ خود کیسے موجیں اڑا رہا ہے۔۔۔ دوستوں کے ساتھ غل غپاڑہ مچا رہا ہے۔ ویسے بڑا اچھا بنتا ہے دیکھو! اور اس کو۔“

نوال کے کہنے اور کر کے دکھانے پر بے خود نے بھی اس کی طرح دیوار کے ساتھ گھٹنے موڑے تھے۔ اور اگر دیوار کی دوسری جانب سے دیکھا جاتا تو ان کی فقط آنکھیں، سر دکھائی دیتا جبکہ وہ دونوں سب کو دیکھ رہے تھے۔

تین انگلیٹھیوں میں کوئلے دھک رہے تھے۔ سینوں پر یونی کباب پروئے ہوئے تھے اور کچھ برا اخفش اور دوسرے دو لڑکے قیمہ چپکا رہے تھے۔ مہارت شاندار تھی۔ دھواں، خوشبو، یمیم۔۔۔ ٹھنڈی کولڈ ڈرنکس۔۔۔ اخفش کے علاوہ چھ لڑکے اور تھے۔ بوائز پارٹی۔

عید کے دن شام سے رات گئے تک رشتے دار اور کچھ دوست احباب عید ملنے اور گوشت دینے آتے رہے۔ دوسرے دن نہ انت بیگم نوین، نوال بے خود کے ہمراہ کچھ عزیز رشتے داروں سے ملنے چلی گئیں۔ واپس آئے تو فضاؤں میں چکراتی بابلی کیو کی مست اشتہا انگیز مہک پھیلی ہوئی تھی۔ نوین نے بتایا۔

”اخفش عید کی دوسری رات اپنے فرینڈز کے ساتھ پارٹی کرتا ہے۔“

”ہم بھی چلیں؟“

”پاکل ہوئی ہو۔۔۔ برا لگتا ہے وہاں۔“

”ارے واہ!“ نوال نے چمک کر ہاتھ لہرایا۔

”ہمارے گھر آکر تو مانگ مانگ کر کھاتا ہے اور ہمیں نہیں

دے گا بھوکا ندیدہ۔
 ”یہ نہیں کہہ رہی۔۔۔ جسٹ بوائز پارٹی ہے۔
 ہمارا کیا کام۔۔۔ وہ دے گا ناں بعد میں۔“ نورین نے
 سمجھایا۔
 ”مجھے بھوک لگ رہی ہے خالہ!“ نوال نے منہ بنا
 کر کہا ”اور آپ کتنی ہیں۔ وہ دے گا۔“
 ”تو آؤ ناں! میں کھانا دیتی ہوں۔“ نورین نے تسلی
 دی۔
 ”نہیں! مجھے تو وہی چاہیے۔“ اس نے ضدی لہجے
 میں کہا ”یونو! آئی لو باربی کیو۔۔۔ مچی گرم گرم سیخ سے
 اتار کر جب منہ جلے۔۔۔ منہ میں گرم گرم لقمہ اور پھر منہ
 کھول کر دھواں نکالنا واہ واہ۔“ اس نے گویا لطف
 لیا۔ ”اور آپ کے لاڈلے کو چاہیے تھا۔ سب سے
 پہلے ہمیں دینا آخر میں بچا کچھا دے گا۔“ وہ آگ ہو
 رہی تھی۔
 ”اچھا! میں کتنی ہوں اس سے نورین نے ہار بان لی۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ نوال نے سختی سے
 منع کیا اور فریج سے پائن اپل کا ٹھنڈا ٹن نکال کر اپنے
 کمرے میں چلی گئی۔
 نورین تھک چکی تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے کی جانب
 بڑھی۔

چھت کی لوکیشن جانی پہچانی تھی۔ اس نے بے خود
 کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ پلان ٹھیک ٹھاک تھا۔
 چھت پر فل والیوم میں ڈیک چل رہا تھا۔ چھت
 کبار خانہ نہیں تھی۔ گولوں پودوں بیلوں کے ساتھ
 اس کی باقاعدہ آرائش کی گئی تھی۔ ایک چھوٹے سے
 باغ کا سا تاثر دیتا تھا۔ انگیٹھی نون اور انخفش کی
 مشترکہ دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ شوئی قسمت جس
 نیبل پر چٹنی کے ڈونگے گولڈ ڈرنک اور تیار میٹھی
 رکھی جا رہی تھیں وہ ہاتھ بھر کے فاصلے پر تھی۔ میٹھے
 میں پرس ملائی تھی مگر دکھائی نہیں دی۔ شاید نیچے فریج
 میں تھی۔

بڑا ہی سلیقہ مندی والا انتظام تھا۔ لڑکے ا
 آپ کے تحت سب سامان کین سیٹ کے پا
 گئے۔ تمام میٹھی بھی چلی گئیں۔ صرف پاس
 انگیٹھی رہ گئی تھی۔
 نوال چٹنیاں اور گولڈ ڈرنک اڑا چکی تھی۔ یہی
 تھا اس نے سرعت سے آٹھ میٹھی اڑائیں۔
 کامیاب ہو چکی تھی۔ بھوک چونکہ بے حد شدہ
 سو وہ دیں شروع ہو گئے۔ بے خود نے کھانا کھانے
 بعد باقاعدہ بیعت لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ واہ۔
 لیکن۔
 ”یار! یہاں تو کوئی سیخ نہیں۔ خالی کوئلے دھک رہے
 ہیں۔ تم نے رکھی بھی نہیں کہ نہیں۔“ اچھے سے
 بھرپور آواز گونجی۔
 نوال نے سر مزید جھکاتے ہوئے ہنسی ضبط کی۔
 ”اب آئے گا مڑا۔“ اس نے بے خود کو اشارہ کر
 دیا۔ ”آہستہ ہسو۔“
 ”آنکھیں کھول کر دیکھ۔ میں نے خود چھوڑ
 ہیں کہ ایک سائیڈ سے ذرا کچی بیٹھیں۔ میں نے کہا تھا
 اچھی پانچ منٹ میں لے آؤں گا۔“ یہ انخفش کی آواز
 تھی۔ وہ غالباً اٹھ کر آیا تھا اور بھونچکا رہ گیا۔
 ”ہائیں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے خود
 رکھی تھیں۔ کیوں زمان میں نے کہا تھا ناں! ایک رپ
 سے مزے کر کے پھر ایک ساتھ اگلی لگائیں گے؟“
 انخفش نے گواہی مانگی۔ زمان نے سر ہلایا۔ اس نے
 کھاتے کھاتے اس انگیٹھی کو دو ایک بار دیکھا بھی تھا۔
 ”تت۔ تمہارے گھر میں یہاں چھت پر کوئی
 سایہ دایہ تو نہیں۔ میری امی کتنی ہیں شام کو پودوں
 کے پاس۔“ مولے چشمے والا بے حد متلا فواد کھپکپایا۔
 وہ ساتوں چھت کے نیچوں پہنچ کھڑے تھے۔ آسمان
 دیکھتے، بکھی ارد گرد۔
 اب کوئی ملی کتنی ہی مکار ہوتی۔ دیکھتے انکاروں سے
 سیخ کیسے اٹھا سکتی تھی۔
 ”ارے چپ کر بنت رضیہ!“ فواد کے ڈرنے پر
 اسے لتاڑتے ہوئے انخفش کو دفعتا احساس ہوا۔

اس نے انگیٹھی اس دیوار کے ساتھ اس لیے لگائی
 تھیں کہ یہاں گیلے وغیرہ نہیں تھے۔ چھت کی ساری
 انجمنٹ چاچو نے کرواتا تھی۔ ساتھ والی چھت
 نون آئی کی تھی۔ ان کی چھت بھی ڈیکورٹ تھی مگر
 اتنی زیادہ نہیں۔ اور اس درمیانی دیوار کے ساتھ اس
 جانب بھی کوئی گملا نہیں تھا پھر اچانک یہاں گیلے کہاں
 سے آگئے۔ سمجھ بھی اسی سچ پر سوچ رہا تھا۔ وہ اکثر آیا
 کرتا تھا۔
 اور انگیٹھی اس نے ہی سیٹ کی تھی۔ شام کو اس
 طرف گیلے نہیں تھے۔ وہ دونوں یکدم اس طرف
 بڑھے تو باقی پانچ ڈرپوک فواد سمیت دیوار کے قریب
 چاہید اکیے بغیر آگئے۔
 انخفش اور سمجھ ہی نے جھانکا۔ چھت پر قدرے
 اندھیرا تھا۔ ہاں! انخفش کی جانب بارہویں گے چاند کی
 مدھم روشنی میں ہلکا سا سایہ نظر آیا۔
 ”ہا۔۔۔!“ فواد کی نکلتی چیخ پر مانی نے اپنا ہاتھ جمایا۔
 وہ تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کسی کا سایہ ہے
 ”کوئی۔۔۔ چوڑیل!“
 چڑیل کا سر جھکا ہوا تھا اور گھنگھریالے بال دائیں
 بائیں پھرے ہوئے تھے۔ وہ کرمی کھلے پانچچوں
 والے پاجامے اور اورنج کرتے میں ملبوس تھی۔
 اسکا رنگ شانوں پر نکلتا تھا۔ چڑیل کا ایک مددگار جن بھی
 تھا یا چڑیل کا بچہ۔ دونوں چوکری مار کے بیٹھے تھے۔
 درمیان میں میٹھی کوک اور ہری چٹنی کا پورا پیالہ
 ۔
 دونوں کے ہاتھ اپنے منہ پر جمے تھے۔ بڑے بڑے
 گرم نوالے نگلتے ہوئے وہ دراصل اپنی کامیابی کی
 گد گدائی ہنسی سے بے حال تھے۔
 ”کوک تم لے جانا اور کھڑے بالکل نہیں ہوتا۔ ہم
 بیٹھے بیٹھے بچوں کے بل چل کر جائیں گے۔ سمجھے۔“
 اس کی آواز مدھم پراسرار اور فتح کے نشے سے سرشار
 تھی۔
 اس نے جب سر اٹھا کر اپنے چہرے کے گرد پھیلے

جنگل کو پونی میں کسنا چاہا تو فواد کی چیخ نکل گئی۔
 نوال اور بے خود نے چونک کر سر اٹھایا تو سات افراد
 دوسری جانب سے رکوع کی حالت میں دیوار سے جھلکے
 ان دونوں کو بے یقینی اور حیرت سے تنک رہے تھے۔
 بے خود کا منہ بھرا ہوا تھا۔ وہ آواز بھی نہ نکال سکا۔
 اسے کسی نے ہینڈ زاپ نہیں کیا تھا مگر اس نے خود
 ہی ہاتھ اٹھا دیے۔
 ”او۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہائے!“ نوال نے فوراً کہا۔ ساتھ
 ہی بے خود کی ٹانگ پر ٹانگ ماری کہ ہاتھ نیچے کر لے۔
 ”بہت مزے گے تھے۔ تمہارے ہاتھ میں تو
 بہت ذائقہ ہے انخفش۔“ آئی ایم امپرسیبل۔
 ”آپ۔۔۔؟“ زمان کی دلچسپی کی حد نہ تھی۔ باقی تو
 ابھی تک سکتے سے نہیں ابھرے تھے۔
 ”میں۔۔۔ پڑوسن۔۔۔“ وہ قطعاً نہیں مسکرائی مگر
 ہونٹ دائیں بائیں پھیلا کر مسکرا نے کا تاثر دیا۔
 ”یہ برتن۔۔۔“ اس نے چٹنی کا ڈونگا اور خالی
 میٹھی ان کی جانب برہائیں جیسے وہ سب یہی لینے
 آئے تھے۔ انخفش شدید صدمے کے زیر اثر تھا۔ اس
 میں ذرا حرکت نہ ہوئی۔ سمجھ نے بعد احترام برتن
 لے لیے۔ بے اختیاری کا عالم کیا خوب تھا۔ اس نے
 ”تھینک یو“ بھی کہا۔ (بھلا اس کا تھینک یو بننا تھا
 ۔۔۔؟؟؟)
 ”ویل کم! ہم یہ حرکت کبھی نہ کرتے۔۔۔ لیکن
 دیکھئے ناں۔۔۔ کیا آپ نے سنا نہیں پڑوس کے کتنے
 حقوق ہوتے ہیں۔ خالی پیٹ اور اتنی خوشبو۔۔۔ ہائے
 اس اسی لیے مجبوراً کیا۔ آپ سب کو زیب دیتا ہے
 کہ آپ کا پڑوسی بھوکا ہو اور آپ سب لوگ موبیوں
 اڑائیں؟“
 اس کے جملے میں موجود کٹ اور انداز کی بے بسی
 ۔۔۔ چھ کے چھ عرق ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے۔
 اپنی کل زندگی کے کھانے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔
 اور ساتواں؟
 وہ سوچ رہا تھا وہ ڈوب مریوں نہیں جاتا؟
 ”یار! تمہیں دینا چاہیے تھا۔“ سنی کا بس چلتا تو وہ

احفش کا گریبان پکڑ لیتا۔

”بہت غلط بات ہے یہ۔۔۔ ورنہ انہیں یہ حرکت کیوں کر ناپڑتی؟“ دوسرا طرف دار بھی بولا۔ باقی سب کے سر زور زور سے ہلتے تھے۔ ملامت کی مار۔۔۔

”م۔۔۔ میں دیتا۔ ابھی لگاتا تو سب کے لیے بناتا۔ میں نے پہلے۔۔۔“

”اس وقت تک ہماری آنتیں ”قل ہواند“ پڑھتیں۔ تمہیں پتا ہے میں نے صبح کا ناشتا کیا ہوا تھا؟“ وہ بڑے مان سے بولی۔

سارے دوست حق دق تھے۔ ان کا سیدھا سادہ گولومولو دوست اور ایک لڑکی نوٹھے پن سے کہہ رہی ہے۔ ”تمہیں پتا نہیں میں صبح سے بھوکی؟؟؟“

انتا گھنا دوست۔۔۔ مہسناس۔۔۔ شکل مومننا۔۔۔ اس کی زندگی میں ایک لڑکی۔۔۔؟؟؟

اور وہ۔۔۔ بھی اتنی شان دار کانفیڈنٹ طرح وار۔ ہم اسے ایسے ہی شریف نیک بے ضرر سمجھتے رہے۔ ایسی پڑوسن پائے۔ اور بات کہاں تک بڑھی کہ گلے شکوے پر لگی۔ احفش کی چھت پر پری۔۔۔

گھنگھریالے بالوں والی پری۔۔۔ چھ کے چھ اپنے اپنے انداز سے سوچ رہے تھے گویا سر پیٹ رہے تھے۔

”بعد میں دیتے۔۔۔ جھوٹا مونا۔۔۔ ہونہہ!“ وہ پکی سیلیوں کی طرح منہ بنا کر بولی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ احفش کے ساتھ سارے کورس میں بولے۔

”اچھا ایسے تو میرا پیٹ بھر گیا۔۔۔ مگر یونہی۔۔۔ اگر برا نہ لگے تو بولی والے تیغ دے دو۔ ہمارے ہاتھ تو قیمتی۔“ اس کا جملہ ابھی اڑھوڑا تھا۔

چھ کے چھ اوندھے سیدھے گرتے پڑتے کین کی کرسیوں کی جانب بڑھے۔ سب کے ہاتھ میں دو۔۔۔ دو۔۔۔

آواز نکلی۔

”اب آپ کہہ رہے ہیں تو لے آئیے۔۔۔ بے خود کھاؤ گے ناں؟“

”جی۔۔۔ جی!“ بے خود کی بے خودی عروج پر تم کوک سینے سے لگی تھی۔ منہ ٹھنسا ہوا ایک میں سیخ اور رس ملائی آرہی تھی۔

”نانو اور خالہ کو دے جانا۔۔۔ وہ ٹھنڈا کھا لیتے۔ مجھے پسند نہیں۔۔۔ آئندہ دھیان رکھنا۔“ وہ مثلاً انداز سے کہہ کر واپسی کے لیے مڑی۔

”آئندہ؟“ چھ بندوں کا کورس۔ وہ کھینچ کر احفش کے چہرے کے آگے کھینچے تھے۔

”بول گئے۔۔۔ بول۔۔۔ میرے سامنے والی کھڑی میں۔۔۔“

دوسری تان۔۔۔ ”میری نئی پڑوسن دیکھو۔“

”جو ہو گیا تھا۔ وہ برا تھا۔“ احفش نے سوچا۔

جو ہونے والا تھا وہ یقیناً ”بہت برا تھا۔“ اس کے دوست۔۔۔ اب وہ کیا کیا صفائیاں دے یا برائیاں کرے۔۔۔ یا۔۔۔ ہائے۔

☆ ☆ ☆

”اپنے بال نوچ ڈالے اس نے۔۔۔ دیواروں سے ٹھو کریں مار رہا تھا کہہ رہا تھا نوال نے انتا زچ کیا۔۔۔

”تنگ۔“ توین نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

”لو خواجوا۔۔۔ ہمارا اصل جرم صرف یہ ہے کہ ہم پکڑے گئے۔ ورنہ ہم نے کیا ہی کیا ہے اور اس واقعہ سے ہم سبق سیکھا ہے نوال ضمیر نے کہ جائے وقوف زیادہ کیا کر لیتے۔ مان لیتے کوئی رات کی رانی موتی کا چڑیل کا کام ہے۔“

”ہاں! کتنے کباب کھانے والی چڑیل۔“ توین نے ٹکڑا جوڑا۔

”ویسے اس بور احفش کے دوست مزے تھے۔ ایک پتلا دلا بالکل اپوزٹ موٹا چشمہ ہیکپار اور اس کا نام رکھا انہوں نے۔۔۔ بنت رضیہ ہی۔“

یہ۔۔۔ ”وہ یاد کر کے مسلسل ہنس رہی تھی۔ نوین فواد کو جانتی تھی۔ اس کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

”دونوں ہنس رہی ہو۔ وہ اور خفا ہو گا۔۔۔ اور یہ بے خود کب اتنا مکار ہو گیا۔ کیسے شانہ بہ شانہ چلا۔۔۔ پوچھتی ہوں اسے بھی۔“ نہ منت بیگم کو احفش بہت لالچا تھا۔

”وہ میرا رائٹ ہنڈ ہو گا۔ ہم عنقریب باقاعدہ تقریب رکھیں گے گنڈا باندھنے کی۔ وہ میری شاگردی میں آنے کو بے تاب ہے۔“ نوال کی بے نیازی عروج پر تھی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا نوال! ناراضی میں بھوکا رہنے لگتا ہے۔ پھر کمزور ہو جاتا ہے وہ۔“

”ادھر اب آئے گا نہیں۔ اس کے دوستوں نے بہت تنگ کیا۔ عجیب و غریب باتیں کر رہے تھے۔ تم تو لڑکوں کی فطرت جانتی ہونا۔“

”تو اسے کیا ضرورت ہے ایسی ویسی فطرت والوں سے دوستی کرنے کی؟“ اس نے الٹا اس کی غلطی پکڑی

”پہلے تو انکار کرتا رہا۔ غلط فہمی کہہ کر نفی کی۔ مگر دست تو۔۔۔ احفش کے گھنے پن سے شک میں تھے۔ اسے جی بھر کے رگیدا۔ جب صفائی دے دے ہار گیا تو اپنے ہی گھر کی دعوت سے کرسیوں کو ٹھوکر مار، نیچے اتر کر کمرے میں بند ہو گیا۔

اس کاری ایکشن زیادہ اور تھا یا پھر شاید ان سب سے زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ معذرت کرتے نیچے آئے مگر اس نے دروازہ نہ کھولا۔

دادی بیگم کے سامنے بے خود کو کھڑا کر کے بیان سنوایا۔

اور اب نوال کی گوشمالی ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

نمنت بیگم آنسو پونچھ پونچھ نہ تھکتی تھیں۔ نوین بھی بہت ڈھیلی سی صوفے میں دھنسی تھی۔ نوال بڑے سے بیگ کو گھسیٹ کر لاؤنج میں لے آئی۔ وہ

جب آئی تھی تو چھوٹا سا بیگ تھا اور اب واپسی پر کراچی سے کی گئی شاپنگ کا ڈھیر۔ اسے صبح گیارہ بجے گھر سے نکلنا تھا۔ رات ہی پیکنگ کر لی تھی۔ ابھی ناشتا کرنے کے بعد سب سامان تیار کر کے تیار تھی۔

”تمہارا دل نہیں لگانا۔۔۔ اسی لیے جا رہی ہو۔“ نوین کے آنسو بہہ نکلنے کو تیار تھے۔

”کس نے کہا میرا دل نہیں لگا۔۔۔ مجھے دل لگانا آتا ہے۔ اور نانو آپ بلا لیں اپنے لاڈلے کو۔۔۔ میں نے سوچا ہے کہ جاتے وقت تو میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ آپ لوگ مجھے گاڑی میں چھوڑ سکتی ہیں۔ مگر پھر واپسی میں آپ لوگ تنہا ہوں گی۔ گاڑی رک گئی یا کچھ اور۔۔۔ تو آپ لوگوں سے ہنڈل نہیں ہو گا۔ خواجوا کا مسئلہ پھر ایر پورٹ بہت دور بھی ہے۔۔۔ مجھے فکر رہے گی۔“

”وہ خفا ہے۔ کبھی نہیں آئے گا اور وہ بھی تمہارے کام سے۔“

”میرے جانے کا بتائیں۔۔۔ سر کے بل آئے گا۔ بلا جو سر سے لٹے گی۔ واپسی میں آپ کو خوشی کے مارے آئیں کہ ہم نہ کھلائی تو کیسے گا۔“ نوال کا تجزیہ ستر تھا۔

”تو تمہاری وجہ سے دوستوں سے خفا ہو گیا سب سے کٹ کر بیٹھا ہے۔“ نہ منت بیگم نے گلہ کیا۔

”توبہ نانو۔۔۔“ اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ ”بندے کی بات میں اتنا اثر ہونا چاہیے۔ بات مدلل ہونی چاہیے کہ جو کہا ہے وہی صحیح ہے۔ اسی کو مانوس پر سنائی یوں ہونی چاہیے کہ آپ کا کہا حرف آخر ہو اور کسی کو اپنی مرضی کی زیر زور لگانے کی ہمت نہ ہو۔“

”میں تمہیں بتا چکی ہوں نوال! بچپن کے کچھ مسائل۔۔۔“

”بچپن ختم ہو گیا ہے خالہ!“ اس نے صاف گوئی سے ٹوک دیا۔

”اگر اتنا ہی دکھی ہے اور اس سے اتنی معمولی بات نہیں ہو سکتی تو میں اس کے دوستوں سے ایک ملاقات کر کے کہہ دیتی ہوں کہ احفش ایک نیک شریف

سے ٹوک دیا۔

”اگر اتنا ہی دکھی ہے اور اس سے اتنی معمولی بات نہیں ہو سکتی تو میں اس کے دوستوں سے ایک ملاقات کر کے کہہ دیتی ہوں کہ احفش ایک نیک شریف

پاکردار نگاہیں زمین پر ٹکا کر چلنے والا مرد مومن ہے اور مجھے تو جانتا تک نہیں اور۔۔۔

”اب بس کرو۔۔۔“ نوین کی نگاہ پھر ہچکچڑ پر تھی۔

نوال کو ابھی بہت دن رہنا تھا۔ پھر اسے جامعہ میں داخلہ وغیرہ کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ مگر قریبی فیملی فرینڈز کے گھر اچانک شادی کا شور اٹھا۔ شادیوں کی دوست تھی۔ منگیترا اچانک باہر سے آگیا۔ سوگھر والوں نے شادی کا ارادہ کر لیا۔

نوال گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہی تھی۔

”میں آؤں گی نانوس۔ شادی کے فوراً بعد۔ قسم سے۔“

”تمہارا دل نہیں لگتا۔؟“ نہنت بیگم کی ایک ہی گردان تھی۔ نوین ہم خیال۔۔۔

گہری خاموشی آداسی۔

نوال بھی خاموش تھی۔ وہ کیسے تسلی کروائے پھر اسے دھیان آیا۔

☆ ☆ ☆

انخفش نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ دوستانہ مسکراہٹ لیے دروازے پر کھڑی تھی۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گے؟“

”تم کیا اجازت بھی طلب کرتی ہو؟“

”نہیں۔۔۔ ہاں! اگر کوئی راستہ روکے کھڑا ہو تو۔۔۔“

مانگنی پڑ جاتی ہے۔ مے آئی کم ان۔۔۔ دیسے اکیلے ہویا۔۔۔

”یوں تو بڑی بولڈ بنتی ہو۔۔۔“ اس نے فوراً بتایا۔ ”ہر فن مولا۔۔۔ بہادر۔“

نوال کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”بہادر ہونے اور بے وقوف ہونے میں بڑا فرق ہے۔ میرا اس وقت اکیلا پوچھنا یوں ہے کہ تمہارے دوست وغیرہ تو نہیں ہیں ناں؟“

”تم دوستوں کا خیال کرتی ہو کیا؟“ اس نے فوراً طعنہ دیا۔

”بالکل کرتی ہوں۔۔۔ تو پھر جاؤں یا تم اندر آنے دو

گے؟“ اس نے سادگی سے اس کا چہرہ کھوجا۔

”او۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ آجاؤ۔“

انخفش کے راستہ دیتے ہی وہ ترنت اندر آگئی۔

”اندر چلیں۔۔۔ یا بیس لان میں۔۔۔؟“

”جہاں تم بتاؤ۔۔۔ ویسے تمہارا لان بھی بہت خیر صورت ہے باغ جیسا۔“ وہ کہتے کہتے سنگی بیچ پر بیٹھ گئی۔ انخفش کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اب دونوں کے سروں پر درمیان میں خوب خالی جگہ چھوڑ کر بیٹھ تھے۔

”میں جا رہی ہوں۔۔۔ فلائٹ ہے دو بجے کی۔“

شادی آگئی ہے اچانک ہمارے فیملی فرینڈز ہیں۔ سوچا تم سے ایکسکیوز کر لوں۔۔۔

”ایکسکیوز فار واٹ۔۔۔“

”ایکسکیوز فار اپنی تھنگ۔۔۔ تم میری وجہ سے کافی خفا رہے۔ آئی ایم سوری! بس میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔۔۔ بلکہ تمہیں ایک فن ٹیو کہ تم ناٹو اور خالہ کا اتنا خیال رکھتے ہو۔۔۔ لیکن خیر! وہ تم سے بہت محبت بھی تو کرتی ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”میں نے بہر حال تمہیں جان بوجھ کر کبھی تنگ نہیں کیا جبکہ تم نے۔۔۔“

اس کا جملہ اودھورا رہ گیا۔ ہدایت کے مطابق بے خود خان چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی جو نانوں نے اپنے لاڈلے کے لیے سجائی تھی۔ وہ اسے لیے سیدھا کچن میں چلا گیا۔

”میں جانتی ہوں ہم تم مجھے پسند نہیں کرتے۔“ وہ بات اس سے کر رہی تھی مگر چہرہ بے تاثر اور نگاہیں سامنے کیاری پر ٹکی تھیں۔

انخفش کو ایک دم شرمندگی نے گھیر لیا۔

مہمان تھی ہمیں با میں دن کے لیے۔۔۔ اتنا اور ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر اس چلے ہی جاتا تھا۔ اب چند روز کے لیے آنے والے عادتیں فطرت خیال تو نہیں بدل سکتا ناں۔ وہ زندگی میں جب اس کے بارے میں سوچے گی اچھا تو۔۔۔

سوچے گی۔ مجھے سوری کہنا چاہیے۔“

”اور سچ یہ ہے کہ میں بھی تمہیں پسند نہیں کرتی۔“

”یہ صاف کوئی تھی یا۔۔۔“

”دھت تیرے کی۔۔۔“ ہے ناں مکار لومڑی۔۔۔

ابھی میرے دل میں شرمندگی پیدا کی اور ابھی کیسے اپنا ہی پیر اوپر رکھ دیا۔ خبردار انخفش انعام جو تم ذرا بھی شرمندہ ہوئے۔“

”لیکن ہمارا ایک دوسرے کو پسند کرنا نہ کرنا ناٹ اپورٹ تھنگ از کہ ہم دونوں کی توجہ کا مرکز ایک ہی ہے۔ ہم دونوں کی لڑائی کی وجہ بہر حال! ناٹو اور خالہ کی بہتری ہی تھی۔ تمہارا اپنا طریقہ اور میرا اپنا طریقہ۔۔۔ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ مگر ایک بات۔“ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”ہم دونوں ناٹو اور خالہ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ ان کی پروا کرتے ہیں۔ بلکہ اگر نمبر دیے جائیں تو۔“

وہ کی ”تمہیں زیادہ ملیں گے۔“

انخفش کے چہرے پر مسکراہٹ پہلی بار چمکی۔

”بیگم صاحبہ نے بولا تھا ناٹا ابھی کر لیں۔۔۔ نوال باجی! آپ کے لیے جو س بھی بھیجا اور لاؤں یا گھر چل کے۔“ وہ باقاعدہ انخفش سے منہ موڑے کھڑا تھا۔

انخفش کی جان پھر جل گئی۔ ”بھائی جان! بھائی جان۔“

کرنے والا اکثر اسے گھورتا پایا گیا تھا۔

”نہیں! یہیں! پی لیتے ہیں۔ ہمیں اپنا گھر نہ دکھاؤ گے۔ خالہ کہہ رہی تھیں تم صرف چھت اور لان پر فدا ہو رہی ہو۔ کبھی اندر سے گھر دیکھنا۔“ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ اور اشتیاق تھا۔

وہ پہلی بار گھر آئی تھی۔ انخفش کو تو خود دعوت دے کر بلانا چاہیے تھا مگر ایسے تعلقات بن ہی نہ سکے۔

”آؤ۔۔۔ اندر چلتے ہیں۔“ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ نوال کے پیچھے پیچھے باڈی گارڈ۔۔۔ بے خود خان۔

”واؤ۔۔۔“ پہلے مرحلے ہی پر نوال کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔

وہ گردن اٹھائے چار اطراف گھومتے ہوئے بری طرح امپریس ہو چکی تھی۔ سجاوٹ، ذوق، صفائی و سلیقہ

مندى ہر شے سے ٹپک رہی تھی۔

”یہ سب کس کا کمال ہے؟“

”سب کا۔ آل فیملی ممبرز۔“ وہ پہلی بار کھل کے مسکرایا۔

وہ سیاہ و سرخ کیمنٹ اور سلیپ سے آراستہ کچن میں کھڑا تھا اور ناٹشے کے لوازمات دیکھ کر بھوک چمک اٹھی تھی۔

”تم جو س لوگی یا ناٹا۔“ نوال سوچ میں پڑ گئی۔

انخفش نے پل بھر میں فیصلہ کر لیا۔

اس نے بے خود کو سیب چھیلنے کا اشارہ کیا۔ جسے اس نے نوال باجی کی جانب دیکھنے کے بعد بحالت مجبوری قبول کیا۔ چھوٹے ساس پین میں میکرونی ابلانے رکھ دی۔ سیب کے کیوب کٹ گئے تو انگور، آم کے چھوٹے کیوبز اور ٹیڑا ایک کریم میں چینی پھینٹ کر اس نے منٹوں کے اندر فروٹ سلاوتیار کر لی تھی۔

”میں نے تمہیں اکثر فروٹس ہی کھاتے دیکھا ہے۔“ اس نے توجیہ پیش کی۔

”ویری گڈ۔۔۔“ نوال نے سر ہلایا۔ ”مگر وہ فروٹس اتنی ملائی کے بغیر ہوتے ہیں۔“

”او سوری۔۔۔ ڈائٹ کانٹنس؟“

”ناٹ سینشن بٹ یس۔۔۔“ وہ پیالہ پکڑ کر ٹہلنے لگی۔ دیواروں پر کثرت سے تصاویر تھیں۔ اسے افسوس سا ہوا، وہ پہلے کیوں نہ آئی۔ دیوار گیر آرائشی اشیاء وادرات میں شمار کی جاسکتی تھیں۔

اس نے جس جس چیز کو چھوا، وہ گرد مٹی کے بغیر تھی اور اس کی معلومات کے مطابق گھر میں کوئی عورت یہاں تک کہ ملازمہ بھی نہیں تھی۔

”ان سب چیزوں کو مین مین کون رکھتا ہے؟ آئی مین! تمہاری دادی تو حج کے لیے۔“

”وہ ہوتیں بھی تو کچھ نہیں کرتیں۔ تمہیں آنی نے بتایا نہیں، وہ پیر الاز ہیں؟ یہ سب کام ملازمہ کرتی ہے۔ ہاں! اس کے سر پر ہم کھڑے ہوتے ہیں۔ اب آج کل تو ملازمہ ہی نہیں ہے تو میں ہی کرتا ہوں۔“

”تو تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ یہ موجودہ صفائی

ستھرائی تمہارا کمال ہے؟“ وہ بہت دل سے مسکرائی۔
”ہاں ہے۔۔۔ تو؟“ وہ اتنی جان دار مسکراہٹ سے
کوئی معنی اخذ نہ کر سکا۔

”میں تمہیں ایکسپلین کر سکتی ہوں کچھ
چیزیں۔“ وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

”کون سی چیزیں۔۔۔؟“
”تم یہ عورتوں والے کام سجانا، اٹھانا، سنبھالنا، صفائی
جھاڑ پونچھ خود کیوں کرتے ہو؟“

”یہ کیسا سوال؟“
”تم جواب دے۔۔۔ بس۔“

”ابھی تو بتایا ہمارے گھر میں دادو کے علاوہ اور کوئی
عورت نہیں۔ اور دادو پیرالائز ہیں تو اب ہم گرد کے
ڈھیر پر تو نہیں بیٹھیں گے ناں۔ اور صفائی رکھنے اور
کرنے میں کیا عار۔“

”یعنی تم یہ سب اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں شوق
ہے اور مجبوری بھی۔۔۔؟“

”ہاں! شوق بھی اور مجبوری بھی۔ صفائی نصف
ایمان ہے۔ دوسری جماعت کے اردو کے قاعدوں میں
لکھا ہے۔ تم نے نہیں پڑھا۔“ وہ بے فضول سوالوں
سے عاجز آ گیا۔

”بالکل! پڑھا ہے۔“
”آئی ایم ایٹن ایزاولڈ“ (میری عمر اٹھارہ سال ہے)
وہ شروع ہو گئی۔ انھن نے الجھ کر اس کی صورت
دیکھی۔ وہ ناشتا شروع کر چکا تھا۔

”میں آٹھ سال کی تھی، جب میرے ڈیڈ روڈ
ایکسیڈنٹ میں پیرالائز ہو گئے۔ ان کی ٹانگیں
گھٹنوں کے پاس سے کاٹ دی گئیں۔ وہ وہیل چیئر پر
ہوتے ہیں تب سے آج تک۔ بہت چھوٹی تھی
میں۔ بڑی دونوں بہنیں مشعل، آبی اور گلال، ہم عمر ہیں
جبکہ میں بہت بعد میں پیدا ہوئی۔ مشعل آبی ڈاکٹر ہیں
اور گلال آبی جرنلزم میں ماسٹرز کے بعد ایک چینل میں
کام کرتی ہیں۔“

ڈیڈ کے ایکسیڈنٹ کے وقت وہ یک گرنل تھیں
اسکول کے لاسٹ ایئر۔۔۔ می ہاؤس وائف۔۔۔

ایسٹ آباد کے ماحول میں وہ گھر سے باہر بھی نہیں نکل
پاتی تھیں۔۔۔ ڈیڈ جسمانی ٹوٹ پھوٹ سے زیادہ
نفسیاتی گریہوں کا شکار ہو چکے تھے وہ باقاعدہ روتے
تھے۔ جھک جھک کر گھٹنوں کے نیچے اپنے پیر ٹٹولتے
تھے اور پھر دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔

چڑچڑے، افسردہ، خاموش یا پھر چیختے چلاتے۔۔۔ وہ
می کو، آپوں کو کسی کو اپنے گرد برداشت نہیں کرتے
تھے۔ میں چھوٹی تھی اور ان سے بہت پیار کرتی تھی۔
وہ چاہے جو بھی برتاؤ کرتے میں ان کے پاس سے نہیں
ہٹتی تھی۔

میں نے ڈاکٹر انکل سے کہا، ”آپ میری ٹانگیں کاٹ
کر ڈیڈ کو لگا دیں۔۔۔“

”تو پھر آپ کیسے چلو گی بیٹا۔!“ وہ بولے تھے۔
”ڈیڈ مجھے گود میں اٹھالیں گے۔۔۔ میرے پاس یہی
حل ہے انکل۔ میں چھوٹی ہوں ناں! ڈیڈ آرام سے
مجھے گود میں لے کر مود کر سکتے ہیں جبکہ ڈیڈ بڑے ہیں
میں انہیں گود میں بھر کر نہیں گھوم سکتی۔ میرے ہاتھ
چھوٹے ہیں ناں۔“ میں نے اپنے بازو سامنے کر دیے۔

”اور پھر جب تم بڑی ہو گی تو تب کیا کرو گی۔“
”جب میں بڑی ہوں گی تو گھٹنوں کے نیچے سے
ٹانگیں بھی بڑی ہو جائیں گی ناں! مجھے تو ابھی بہت برا
ہونا ہے۔ ڈیڈ تو اب بڑے نہیں ہو سکتے۔ ڈیڈ کی نئی
ٹانگیں نہیں آسکتیں۔۔۔ میری آجائیں گی۔“

ان فضول، بے معنی باتوں کا حقیقت سے کوئی
واسطہ نہیں تھا۔ ایک آٹھ سالہ بچی کی فکر کا اندازہ۔
”مگر ڈیڈ پر یہ مکالمے جاو اثر ثابت ہوئے۔۔۔ وہ
یکدم بدل گئے۔۔۔ میرے دوست بن گئے۔ وہ پھوٹ
پھوٹ کر رو دیے۔“

”مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ ٹانگیں کاٹ کر
لگائی نہیں جا سکتیں مگر میں ان کے پیر بن کر چل تو سکتی
ہوں ناں۔ میں ان کی جگہ نہیں لے سکتی مگر عارضی
طور پر خالی سیٹ پر بیٹھ جانے میں کیا حرج ہے۔“
انھن ناشتا گرنا چھوڑ چکا تھا۔ وہ شاید سانس بھی

نہیں لے رہا تھا۔ البتہ نوال کے چہرے پر پرسکون ندی
جیسی خاموشی تھی۔ وہ سامنے ویوار کو دیکھتے ہوئے یوں
بول رہی تھی جیسے کوئی سبق پڑھ رہی ہو۔
”امی سبزی گوشت کی محتاجی سے بیٹھی تھیں۔ بل
بھرنے سے رہ جاتے، خراب استری ٹھیک کروانے
کون جائے؟ بچکی کے چھوٹے موٹے کام۔۔۔“

میرے ڈیڈ ایک گھر گریٹی والے آدمی تھے
مطلب وہ بینک میں کام کرتے تھے اور چھٹی ہوتے ہی
گھر میں گھستے تو اگلی صبح ہی باہر نکلتے۔ گھر میں سو کام
۔۔۔ درنہ اپنی لاڈلی بیٹیوں کو گود میں بٹھا کر ہوم ورک
کروانا یا کارٹون دیکھنا بھی تو کتنا اہم کام ہوتا تھا ان کے
لیے۔

لمبی کہانی ہے انھن انعام۔۔۔ کبھی سناؤں گی
تفصیل کے ساتھ۔۔۔

ہمارے گھر میں کسی بھی انسان کا آنا منع ہو گیا۔
انہیں ہر شخص دشمن دکھائی دیتا۔ مکینک آکر بھید
لے کر جائے گا، اس گھر میں ایک معذور آدمی اپنی
بیٹیوں کے ہمراہ رہتا ہے۔

دادو والا تجربے گا۔ اخبار والا اخبار پھینکتے خود بھی
دروازہ پھلانگ لے گا۔ انہیں اس ٹرانا سے ابھارنے
کے لیے ہر بندے نے محنت کی اپنے حساب سے
دوست ہمارے چچا، می۔۔۔ دوبارہ بینک جوائن کیا
اور۔۔۔ میں کیا کر سکتی تھی۔ ان کی ٹانگیں تو نہ بن سکی
بازو بن گئی۔

گھر کے چھوٹے چھوٹے کام جو وہ پہلے خود کرتے
تھے۔ نجانے کب میں ان سب میں ماہر ہو گئی۔

میری خود اعتمادی نے ڈیڈ کا اعتماد بحال کیا۔ کون کون
سے کام ہیں جو مجھے نہیں آتے۔ میں تو گھر میں گھسنے
والے چور کو گن سے زخمی کر کے گرفتار تک کراچی
ہوں۔

میرے یہ سارے اعمال بالکل اسی طرح سمجھے جا
سکتے ہیں انھن انعام۔۔۔ جیسے تم اپنی دادو کے پیرالائز
ہونے پر سلیقہ مند عورتوں کی طرح گھر کو سنبھال سکتے

ہو۔ اس سے تمہاری مردانگی پر کیا حرف آئے گا؟ کیا یہ
اچھا لگتا کہ تم گند کے ڈھیر پر براجمان رہتے کہ جی
صفائی ستھرائی عورتوں کا ڈیڑھ نمٹ ہے۔ مردوں کو
مردوں والے کام کرنے چاہئیں صفائی نصف ایمان
ہے، دوسری جماعت میں پڑھا تھا۔“ آخر میں وہ شریر
ہو گئی، مسکرا دی۔

انھن مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے بھی نہ
دے سکا۔

بے خود کی آنکھیں لبالب بھری تھیں۔
”اور تمہارے ڈیڈ اب کیا کرتے ہیں؟“

”انہیں کیا کرنا ہے بینک جاتے ہیں۔ رٹائر ہونے
والے ہیں، بڑی آبی کی رخصتی کے بعد یہاں کراچی
شفٹ ہوں گے۔ گلال کی جاب وغیرہ ہے۔ کراچی
میں تمام بڑے چینلز کے ہیڈ آفس ہیں ناں۔
فل کانفیڈنٹ۔۔۔ برونین۔۔۔ آئی لومائی ڈیڈ۔۔۔“

اور جہاں تک تمہارا سوال ہے میں نے بھی تمہیں جان بوجھ کر نہیں چڑایا۔ میں ایسی ہی ہوں جبکہ تم نے اس نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

”جبکہ تم نے میں نے کیا کیا؟“ اخفش نے ادھورے جملے کی تفصیل مانگی۔

”ابھی رہنے دو۔ میں جا رہی ہوں۔ ابھی ابھی بائے۔“

”نہیں، نہیں! تم بولو۔ میں نے کیا کیا؟“ وہ مصر ہوا۔

نوال گردن پیچھے گرا کے ہنس دی۔ وہ جتنا ہی نگاہوں سے بے خود کو دیکھ رہی تھی۔ ایک اسی کو تو اس نے راز میں شریک کیا تھا۔

”خفش نے دونوں کی صورتیں دیکھیں۔ بے خود بھی جانتا ہے۔ مگر کیا؟“

”تم نے۔ تم ہماری موٹر کی بیلٹ کافی۔ تم نے ہمارے پردے کی رینگ اکھاڑی۔ پردہ پوری طاقت سے کھینچ کے۔ تم نے ہمارے گھر کے مین پلگ کے تار کاٹے اور۔“ وہ قصداً رکی۔

”اور آپ ہمارے بکروں کو بھی مار دیتے مگر ام نگرانی نہ کرتے۔ یا نقصان پہنچاتے۔“ بے خود کا تو ایک ہی گلہ تھا۔

”یہ۔ یہ کس نے کہا؟“ وہ تڑپ اٹھا۔

”بی بی نے اور کس نے۔ آپ انتقام کی آگ میں جل رہے ہوں گے اس لیے۔“

”دلغہ خراب ہے۔ جانوروں کا کیا تصور؟“ وہ بھٹنا گیا۔ (اس نے غصے میں باقی سب کا اعتراف کر لیا گویا۔)

”ہم اپنے جانے انجانے ناکرہ گناہوں کی معافی مانگتے آئے ہیں اور تم کرہ جانے پہچانے کی بھی معذرت نہیں کرتے؟“ نوال ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر تسلی سے بیٹھی۔

”ہم نے ایک بار بھی تمہیں جان بوجھ کر ہٹ نہیں کیا۔ جبکہ تم نے باقاعدہ پلاننگ سے۔“ نوال نے

جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

”تمہیں کیسے پتا کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟ ایسے کام تو گھروں میں نکلتے ہی رہتے ہیں۔“

”مجھے ایسے پتا کہ میرا ضمیر اچھی زندہ ہے اور یہ میں نے اپنے باپ کے لیے نہیں کہا۔ ضمیر مطلب میری عقل، سمجھ بوجھ، اندازہ قیافہ، گمان۔ میرا اندر۔“ وہ زور سے ہنس دی۔

”خفش فوراً ناشتے پر جھک گیا۔ شاید جھینپ مٹانے کو۔“

نوال اٹھ کر سامنے والی دیوار پر لگی تصاویر کے پاس آرکی۔ وہ سب ایک ہی بندے کی تھیں۔

بے حد اسمارٹ، خوش شکل، نہیں بلکہ خوب صورت جوان۔

”یہ کون؟“

”میرے چچا ہیں، خطبہ اشتیاق۔“

”بہت اسمارٹ ہیں۔ میوڈ ہیں کیا؟ یہی جج پر گئے ہیں نا۔؟“

”ہوں! یہی گئے ہیں۔“

”فیملی کے ساتھ۔؟“

”نہیں! میوڈ نہیں ہیں۔“

”اتنا ڈشنگ بندہ اور ابھی تک کنوارا۔؟“ نوال ہر تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے سنو! اتنا ہینڈ سم بندہ اور ابھی تک شادی نہیں کی۔ کمال ہے! کیوں نہیں کی؟“ وہ سچ سچ حیران تھی۔

”تمہاری خالہ بھی اتنی خوب صورت اسمارٹ ہیں۔ انہوں نے ابھی تک شادی کیوں نہ کی؟“

”خفش نے الٹا ایک بالکل الگ سوال جڑویا۔ جلا سزا انداز۔ بے زار سا۔

”ہپ۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ میں نے کبھی سوچا نہیں، مطلب غور نہیں کیا۔“ نوال ہکلا کر بولی۔

”جا کر پہلے اس سوال کا جواب لاؤ۔“ وہ بڑا سافٹ منہ میں ٹھونس کر بولا۔

نوال کچھ نہ سمجھی۔ پھر یکدم کلک سا ہوا۔

”یعنی اس میں کچھ بات ہے؟“ وہ چلائی۔

”اور وہی اصل بات ہے۔“ اخفش نے پانی کا بڑا گھونٹ حلق سے اتارا۔

”واقعی؟“

”جی ہاں۔۔۔“

”مگر ایسا کیوں۔۔۔؟“

”ویسے بڑی عقل مند، ہر فن، مولا بنتی ہو۔ معلوم کرو ناں! وہ شاید اکسار ہاتھ۔“

”کیا تم وہی کہنا چاہتے ہو جو میں سمجھ رہی ہوں۔“

نوال بے یقینی کی انتہا رہی۔

”ہو سکتا ہے۔“ اخفش نے شانے اچکائے۔

”پھر خالی خولی معلوم کیوں کرنا۔ ہم تو انجام پر یقین رکھتے ہیں۔“

”ابھی اینڈ کی بات کر رہی ہوں ناں؟؟؟“

جب تک اپنڈ ابھی نہیں ہو گا۔ ہم کہانی کا انجام لکھیں گے ہی نہیں۔“ اس پر جیسے یکدم انکشافات کے دروازے کھل گئے تھے۔

”خفش کو پہلی بار نوال کا جملہ اور خود اعتمادی، جی بھر کے بھائی۔“

وہ ایک تصویر اتار کے بغور دیکھ رہی تھی۔

”آریو شیور؟“

”پیس! آئی ایم۔۔۔“ وہ مسکرائی۔ اخفش نے کچھ سوچ کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

”فرینڈز؟“

نوال سوچ میں پڑ گئی۔ وہ بڑھے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

”پیس فرینڈز۔۔۔“ اس نے ہامی بھری۔ مگر ہاتھ نہ بڑھایا۔ وہ ذرا سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”خفش ذرا سا جھینپ گیا، مگر اگلے ہی پل اسے نوال کا اپنے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا پسند آ گیا تھا۔

وہ بھی جلیانی اسٹائل میں جھک گیا۔

”لیکن تم تو جا رہی ہو۔“ اخفش کو یکدم دھیان

آیا۔

”لیکن میں واپس آنے کے لیے جا رہی ہوں۔“

اس نے یقین سے کہا۔

”مجھے واپس تو آنا ہی تھا۔ پہلے ناؤ اور خالہ کی تنہائی کے خیال سے اور اب۔۔۔“ اس نے ڈرامائی وقفہ دیا۔

”اور اب تنہائی ختم کرنے کے یقین سے۔ ٹھیک ہے ناں؟“

”کیا تم کر لوگی؟“ اخفش تمام سیاق و سباق سے آگاہ تھا۔

”کیا تمہیں اب تک میری صلاحیتوں کا یقین نہیں آیا؟“ نوال کھلکھلا کر ہنس دی۔

”خفش خاموش ہو گیا۔ اس کا سر جھک سا گیا۔ اسے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہی مردانہ انا۔۔۔ تسلیم کرنے کا دل ہی نہیں کرتا۔

نوال کی رکتی ہنسی ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ وہ بے خود کو اشارہ کرتی باہر نکل گئی۔

”خفش ہلتے پردے کو تکتا رہا پھر اس نے چاچو، خطبہ کی تصویر اٹھالی بے ترتیبی برداشت نہ تھی۔ اسے جگہ پر لگانا تھا۔

چیزوں کو صحیح ٹائم پر ہی جگہ پر لگانا چاہیے اور اگر وہ نوال کے یقین پر یقین کرے تو ابھی ٹائم باقی تھا۔

سو قارئین! آپ سب بھی انتظار کریں کہ نوال واپس آئے اور اس گتھی کو سلجھائے کہ۔۔۔

”خفش کے اتنے شدید قسم کے اسمارٹ ڈشنگ چاچو نے اب تک شادی کیوں نہ کی۔“

اور اس سوال کا جواب ڈھونڈیے کہ اتنی حسین شاعری غزل، نظم کے عنوان مصنف کے گمان جیسی خالہ ابھی تک کنواری کیوں پھر رہی ہیں؟

تو آپ بھی اخفش کی طرح دن گن رہی ہیں ناں۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ نوال کی صلاحیتوں پر یقین تو ہے ناں؟؟؟



من حشر المسلس



”وہ تو ان کے برہوں کے درمیان اختلافات ہو گئے تھے اس لیے منگنی ٹوٹ گئی تھی۔ اب پھر سے صلح ہو گئی ہے۔“

”مجھے تو تم پر حیرت ہوتی ہے کہ تم نے افضل بھائی کو کیسے شتر بے مہار چھوڑ رکھا ہے۔ مرد کی نیت کا کیا بھروسہ۔ کب پھسل جائے۔“ اس کی سادگی پر ہنس کر وہ سر ہلاتے ہوئے وہ اب ٹیبلز کی گرد صاف کر رہی تھی۔

”عامر بھی تو مرد ہی ہیں بھابھی۔“ طیبہ نے مسکرا کر کہا تو وہ یقین سے بولی۔

”اب پانچوں انگلیاں برابر بھی نہیں ہوتیں۔ عامر نے مجھ سے لو میرج کی ہے۔ لو میرج میں یہی تو فائدہ ہوتا ہے یا عامر تو جان چھڑکتا ہے مجھ پر۔“

”افضل بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں بھابھی! گو کہ ہماری قطعی ارٹھ میں ج ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں پرسوں تمہارے گھر گئی تھی تو افضل بھائی خوب ہنس ہنس کر اپنی اپنی کزن سے باتیں بگھا رہے تھے اور آج تو حد ہو گئی دونوں لڈو کھیلنے میں مشغول تھے اور تم ان کے لیے چائے بنا رہی تھیں۔ تمہارے جیسی بے وقوف لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی طیبہ۔“

”بیوی اپنے شوہر کا ہر انداز سمجھتی ہے بھابھی۔ افضل کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں وہ ایسے نہیں ہیں۔“

”تو میں نے کب کہا وہ ایسے ہیں میں تو ان خاتون کی بات کر رہی ہوں جو تمہارے مجازی خدا کی سابقہ منگیت رہ چکی ہیں اور اب بھی صرف منگنی شدہ ہیں۔“ اس نے جیسے زچ ہو کر کہا تھا۔ طیبہ صاف ستھری ذہنیت کی مالک کالی ہنس مکھ اور ساوہ مزاج تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ لن کے ہمسائے میں آکر آباد ہوئے تھے۔ اب تو طیبہ اور مریم کی اچھی خاصی دوستی تھی لیکن اس میں بھی کچھ ٹکلف طیبہ کی طرف سے ہی تھا اسے ”آپ جناب“ سے بات کرنے کی عادت تھی۔

”شاید آپ کی بات درست ہو بھابھی! لیکن ورورہ آپنی سمیہ کی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی ہیں اور میں خواستواہ افضل پہ پابندیاں عائد کر کے کوئی بد مزگی نہیں چاہتی۔۔۔ میرا تو اس بات پر یقین ہے بھابھی کہ جس کو ہسکنا یا راستہ بدلتا ہوتا ہے وہ پابند راہوں میں بھی سبیل بنا لیتا ہے۔ جو راستے میں چھوڑ جانے کے خوگر ہوں انہیں محبت کے مقابر میں مقید نہیں کیا جاتا۔ محبت حصار ہے لیکن بے جا پابندیاں بھی بغاوت کو جنم دیتی ہیں۔ چاہے یہ جذلوں کی بغاوت ہو یا رسموں کی۔“

اس نے نئے تپے انداز میں پتے کی بات کہی تھی۔ مریم کندھے اچکا کر رہ گئی۔

چیزیں گھر پہ ہی تیار کر لی تھیں کہ پیسے بچ جائیں گے۔ شام سات بجے تک انہوں نے آنا تھا۔ پانچ بجے وہ کام کاج سے فارغ ہوئی تو خیال آیا کہ نند صاحبہ اور اس کے تین عدد بچوں کے لیے کپڑے آج ہی جا کر لے آئے تو بہتر ہو گا کیونکہ پھر انہیں ساتھ لے کر جانا پڑتا تھا اور موصوفہ ان سونوں پر ہاتھ رکھتیں جس کی قیمت سے وہ چار پانچ سوٹ بنا لیتی تھی۔ اس لیے ان کی آمد سے پہلے ہی شاپنگ کرنے چلی آئی۔ ایک گھنٹے کی خواری کے بعد اسے مناسب قیمت پر کپڑے مل گئے تھے وہ خاصی مطمئن سی ہو کر پارکنگ کی طرف جا رہی تھی جب اس نے اتفاق سے ہی شاپنگ مال سے انہیں ٹکٹے دیکھ لیا تھا۔

”طیبہ! تمہیں میری باتیں بری لگی ہوں تو سوری! لیکن میں تمہیں اس لیے بتا رہی تھی کہ تمہارے گھر کے حالات میرے سامنے ہیں۔ افضل بھائی تو ویسے ہی اپنی ماں بہنوں کی آنکھوں سے دیکھتے اور ان ہی کے کانوں سے سنتے ہیں۔ بیڈ کی چادر ورسٹ کرتے ہوئے وہ جلدی جلدی کام ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”نہیں بھابھی! آپ کی باتیں کیوں بری لگیں گی مجھے۔ آپ تو میرے بھلے کے لیے ہی کہتی ہیں۔ افضل کی کزن نیچرواڑ تو بہت اچھی ہیں۔“

”اگر اتنی ہی اچھی ہوتیں تو تمہاری ساس افضل بھائی سے ان کی نسبت ختم ہی کیوں کرتیں۔“

اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ اپنے سامنے افسانے کو حقیقت بنا دیکھ رہی تھی مگر اسے پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے شاپنگ بیگ بونٹ یہ رکھ کر آنکھیں مسل کر دوبارہ دیکھا۔ بلکہ ایک نہیں کئی بار دیکھا اور ہر بار وہ منظر تھا۔ اس شاپنگ مال میں وہ بھی کبھار ہی آئی تھی وگرنہ تو اپنی قریبی مارکیٹ سے خرید و فروخت کر لیتی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا۔ آج اسے یہ منظر بھی دیکھنا پڑے گا۔ ویسے تو آج کے دن کا آغاز ہی بہت برا ہوا تھا۔ صبح سات بجے ہی اس کی نند نے فون کھڑکایا تھا کہ وہ آج شام کی ٹرین سے بال بچوں سمیت آ رہی ہے اور اس کی کوئی ٹاویل اور جواز سنے بغیر کھٹ سے فون بند کر دیا تھا۔ وہ اگلے دس منٹ تک مسلسل بدبختی رہی تھی کیونکہ اللہ کے فضل سے اس کی چھ منڈیں تھیں۔ ہر ماہ ہی کوئی نہ کوئی چھوٹے بھائی سے ملنے کی غرض سے آتی رہتی اور وہ تو ان دن دو ڈھائی سالوں میں جی بھر کر بیزار ہو چکی تھی۔ کل اس کا ارادہ اپنی امی کے گھر جانے کا تھا لیکن آج اس کی منجھلی نندنے آنے کا مڑوہ سنا دیا تھا۔ وہ نندن میں دھت عامر کو صلواتیں سا کر اپنا غصہ اس غریبہ اتار رہی تھی لیکن وہ کون سا سن رہا تھا۔

دس بجے تک وہ ماسی کا انتظار کرتی رہی مگر اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ ناچار سارے گھر کی صفائی خود کرنی پڑی۔ کوکنگ کے لیے تو عامر نے اس پہ ترس کھاتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ وہ باہر سے لے آئے گا۔ اس نے کلمہ شکر پڑھا تھا تاہم اپنی کنجوس فطرت کے باعث چند

شادی میں دو دن ہی رہ گئے تھے۔ یہ مریم کی برین واشنگ کا اثر تھا کہ طیبہ افضل کی ہر حرکت پر نظر رکھنے لگی تھی۔ آج مایوں کی رسم تھی اور مریم کچھ دیر قبل ہی آکر بیٹھی تھی اور اب طیبہ کی ساس سے ان کے دور کی باتیں سن کر جی بھر کر رور ہو رہی تھی لیکن لبوں پر انی مسکان ہی سمجھی تھی۔ اس کی یہی خوبی تمام خویوں پر حاوی تھی۔ وہ ہمیشہ ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر جانتی تھی اور عامر کو بھی اس عادت نے دیوانہ کیا تھا۔ ہاں شادی کے بعد بس یہ ہوا تھا کہ وہ عام خواتین کی طرح تنقید بہت کرنے لگی تھی۔ ہنستے ہنستے ہی بہت کچھ جتا جاتی تھی۔

”خالہ جی! مانا کہ شادی والا گھر ہے مگر آپ کی چار عدد ہویں ہیں! ماشاء اللہ آج تو سب جمع ہیں یہاں پھر بھی سمجھا بے چاری مایوں کا جوڑا اپنے کچن میں برتن دھو رہی ہے۔“ وہ ہال کمرے میں ان کے تخت پر بیٹھی تھی مگر نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

”اے ہے۔۔۔ پانی کا گلاس لینے گئی ہے میرے لیے۔“ حلق خشک ہو رہا تھا تو اس سے کہہ دیا۔ ہویں تو سب ہی مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگی ہیں۔ یہ طیبہ بچاری تو دوسرے جی سے ہے۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی پھر بھی سب کے کپڑے اسی نے استری کیے۔

مریم نے بہت کم انہیں اپنی ہویوں کی برائیاں اور بد خوئیاں کرتے دیکھا تھا اور ایسے عالم میں اسے اپنی ساس یاد آجاتیں جن کے ساتھ وہ بمشکل تین ماہ رہی تھی اور تین ماہ میں ہی انہوں نے اسے زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ انہیں خاموش ہونے کی تو عادت ہی نہیں تھی ہر وقت بولتی ہی رہتی تھیں۔

”یہ آپ کی بھی زیادہ تر آرام ہی فرماتی رہتی ہیں۔“ وردہ سے تو اسے جانے کیوں اتنی چڑھی (شاید اس لیے کہ وہ اسی کے مزاج کی تھی)

”نہیں تو ابھی ہی بیٹھی ہے بچاری۔“ انہوں نے جلدی سے سائیڈل۔

”خالہ جی! آپ کو تو پوری دنیا ہی بے چاری لگتی

”جی جی۔ بھابھی کا گھر تو ہر وقت ہی چمکتا رہتا ہے۔“ طیبہ جلدی سے سر ہلا کر اس کی تعریفیں کرنے لگی تھی اور وہ ان کی خاطر مدارت کے لیے کچن میں چلی گئی تھی۔

”وہ برا سامنے بنا کر ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ پھر شادی تک اس کا زیادہ تر وقت طیبہ کے ہاں گزرا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب وہ ان سب کے مزاج عادات سے واقف ہوئی تھی واپس آکر وہ تمام رپورٹ عامر کے گوش گزار کرتی تھی اور چونکہ اس میں تنقیدی پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ اس لیے عامر تو آدمی داستان بن کر ہی جمائیاں لینے لگتا تھا۔

اسکے دن وردہ کو جانا تھا وہ مریم سے ملنے آگئی۔ اس نے اس وقت مشین لگا رکھی تھی۔ پورا گھر ہی الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ وردہ سے اس کے تعلقات ہرگز بھی اس قدر خوش گوار نہ تھے کہ وہ اس کی آمد کی منتظر رہتی اس لیے اسے دیکھ کر کھس گئی مگر لبوں پر وہی رسمی مسکان۔۔۔

”آپ نے ماسی نہیں رکھی ہوئی ہے کپڑے دھونے کے لیے؟“ وردہ نے آتے ہی جملہ اچھالا تھا۔ ”نہیں۔ مجھے ماسیوں کے ہاتھ سے دھلے کپڑے پسند نہیں آتے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی اور اسے ڈرائنگ روم میں لے کر آگئی جو تین چار دن کی مصروفیات اور غفلت کی وجہ سے زیادہ بہتر حالت میں نہ تھا۔

”آپ نے تو پورے گھر میں ہی کارپٹ بچھا رکھا ہے۔ آپ کو علم ہے کارپٹ مضر صحت ہے۔ ڈسٹ الرجی ہو جاتی ہے اس سے اور سانس کی بیماریاں بھی۔“ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وردہ مریم ہی کے انداز میں بولی تھی۔

”جو میری طرح صفائی کا خیال رکھتے ہیں ان کے لیے مضر صحت نہیں۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بول گئی تھی پھر خیال آنے پر کھسیا گئی۔

”جی۔۔۔ جی لگ رہا ہے۔ آپ بہت صفائی پسند ہیں۔“ ”یہ تو شادی کی مصروفیت کی وجہ سے ایسا ہے۔ وردہ طیبہ سے پوچھ لو، میں اپنا گھر کتنا صاف ستھرا رکھتی ہوں کیوں طیبہ؟“ اس نے پکھا فل اسپید میں چلا دیا تھا۔

”جی جی۔ بھابھی کا گھر تو ہر وقت ہی چمکتا رہتا ہے۔“ طیبہ جلدی سے سر ہلا کر اس کی تعریفیں کرنے لگی تھی اور وہ ان کی خاطر مدارت کے لیے کچن میں چلی گئی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتی تھیں بھابھی! مگر میری آنکھوں پر ہی افضل کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔“ یہ تقریباً شادی کے ایک ہفتہ بعد کی بات تھی جب طیبہ منہ لٹکا کر اس کے پاس آئی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ اس وقت کچن میں اپنے لیے چائے بنانے لگی تھی طیبہ کو آتے دیکھ کر ایک کپ پانی اور ڈال دیا۔

”افضل واقعی پہلے سے بہت بدل گئے ہیں۔ جب سے وردہ آئی گئی ہیں وہ چپ چاپ سے ہو گئے ہیں مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔“ وہ رو دینے کو لگی تھی۔

”ہیں اچھا! دیکھا میرا اندازہ درست نکلا نا۔“ اسے اپنے اندازے کی درستی پر خوشی ہوئی تھی پھر طیبہ کی شکل دیکھ کر بولی۔

”تم ہی بڑا وردہ آئی وردہ آئی! کرتی ان کے آگے پیچھے پھرتی تھیں اب کیا ہوا؟“

”مجھے لگ رہا ہے افضل ان سے محبت کرتے تھے۔“ وہ افسردگی سے کہتی کر سی پر ٹنگ گئی۔

”ایسا ہو بھی سکتا ہے۔“ آخر ڈال وہ ان کی منگیترہ چکی ہے۔“

”لیکن بھابھی! افضل مجھ سے کہتے ہیں تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔“ وہ بہت زور دے رہی تھی۔

”ہا ہا۔۔۔ اور تم نے یقین کر لیا۔“ وہ ہنسی۔ ”تو اور کیا کرتی؟“

”یہ تو مرد ہر اس لڑکی سے کہتے ہیں جو ان کی زندگی میں آئے۔“

”کیا عامر بھائی بھی آپ سے ایسا کہتے ہیں؟“ اس نے ایک دم ہی سوال پوچھا تھا اور مریم کو تو اپنے عامر پر خود سے زیادہ بھروسہ تھا۔

”دن میں ہزار بار کہتا ہے وہ تو۔۔۔“ ”آپ یقین کر لیتی ہیں؟“ وہ الجھن میں تھی۔

”لیس آف کورس۔ کیونکہ ایسا ہی ہے۔ مجھے عامر کی آنکھوں میں اس بات کی سچائی نظر آ جاتی ہے طیبہ!“ وہ کپوں میں چائے اندیلنے لگی۔

”سچے تو مجھے افضل بھی لگتے ہیں لیکن اب اتنے دن ہو گئے ہیں وہ جیسے مجھ سے نظریں چرانے لگے ہیں۔ اکثر کسی نہ کسی سوچ میں گم بیٹھے ہوتے ہیں۔۔۔ میں بلاؤں بھی تو ہوں ہاں کرتے رہتے ہیں۔“

”یہی تو بات ہے ساری۔“ اس نے سلیب پر ہاتھ مارا پھر رے سمیت اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”وہ تمہاری تک چڑھی وردہ آئی ان کے ذہن و دل یہ سوار ہو کر رہ گئی ہے۔ انہیں وہ رہ کر اپنی پہلی محبت یاد آتی ہوگی۔ وہ تم میں اس کی شبیہ ڈھونڈتے ہوں گے اور نا کامی پر ملال ہونا ہوگا۔“

”ہاں بھابھی! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر میں اب کیا کروں۔“

”میں ایک عامل بابا کو جانتی ہوں۔۔۔ تم ان سے تعویذ لے کر آنا۔ دو دن میں ان کے مزاج درست ہو جائیں گے۔“ اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

”استغفر اللہ بھابھی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں ان تعویذ وھاگوں پہ یقین نہیں رکھتی۔“ وہ جیسے دہل کر بولی تھی۔

”عواب اس میں کیا ہے۔ آخر ان عامل لوگوں کے تعویذوں میں اثر ہوتا ہے اسی لیے تو لوگ ان کے پاس بھاگے جاتے ہیں۔ بلکہ سچ بتاؤں تمہیں میں نے بھی عامر کے لیے تعویذ لا کر رکھے ہوئے ہیں۔ میری آپنی مجھے ان کے پاس لے کر گئی تھیں اس لیے تو مجھے عامر پر اتنا بھروسہ ہے۔ وہ کبھی میرے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا۔“

”اللہ کو مانیں بھابھی! کیوں اس کی ذات میں کسی کو شریک کرتی ہیں۔ وہ وحدہ لا شریک ہے۔ یہ تو لوگوں کے عقیدے کی کمزوری ہے جو ان کے دلوں میں رہتا ہے اس کی ذات سے غافل ہو کر ویسے تلاش کرتے ہیں۔ میں ایسی باتوں پر عمل کرتا تو کیا انہیں سنتا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔“

”اپنے اپنے یقین کی بات ہے۔“ ”مریم بد مزہ سی ہو کر رہ گئی تھی۔“

”ہاں واقعی بھابھی بھیک کہا۔ اپنے اپنے یقین کی بات ہے اور اللہ کا شکر ہے مجھے صرف اللہ پر یقین ہے۔ میرا ایمان سلامت ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے مزید استقامت دے۔ بھابھی! خود سوچیں اگر یہ عامل اور نجوی لوگ ہی خدائی کا دعوا کرنے لگیں تو ایمان کس پر رکھا جائے؟“

”خدائی کا دعوا کب کس نے کیا ہے؟“

”یہ خدائی کا دعوا ہی تو ہو گیا ہے ایک ہی تعویذ میں کام ہو جاتا ہے جو دوسرے نہیں کر سکتے وہ ہم ایک تعویذ میں کر دکھائیں۔۔۔ جادو ٹوٹے بندشوں کے عملیات کے ذریعے توڑ۔ کتنے فخر سے یہ اپنے کالے کرتوتوں کے اشتہار لگواتے ہیں۔۔۔ مجھے تو بہت دکھ ہوا بھابھی یہ جان کر کہ آپ بھی ان باتوں پر یقین رکھتی ہیں۔“ اسے واقعی میں دکھ ہوا تھا۔

”میں تو بس آپ کی کہنے پر ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔“ ”مریم کو اس کے کہنے پہ قدرے شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔“

”اگر میں آپ سے کسی درس کی محفل میں یا قرآن کی تفسیر کی کلاس اینڈ کرنے کے لیے ساتھ چلنے کو کہتی تو آپ کے پاس سو سو بہانے موجود ہوتے نہ جانے کے۔ مگر ایسی باتوں پر ہمیں فوراً یقین آ جاتا ہے۔ فوراً ہی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔“

”یہ تم کیا قصے لے کر بیٹھ گئیں۔ افضل بھائی کا مسئلہ تو بیچ میں ہی رہ گیا اور یہ چائے تو پی لو۔“

”چھوڑیں بھابھی! ہونا تو وہی ہے جو قسمت میں

لکھا ہے پتا نہیں کیسے میں افضل سے متفر ہو گئی ہو ہو سکتا ہے انہیں کوئی کاروباری مسئلہ ہو۔ سیر شادی پہ انہوں نے ایک دوست سے قرضہ لیا تھا اس کی فکر نہ ہو۔۔۔ یہی تو بری عادت ہے ہم عورتوں کی عقیدے اور ایمان کی کمزوری فوراً بہک جاتی ہیں۔ وسوسوں میں پڑ جاتی ہیں۔ اپنے لیے خود پریشانیاں پیدا کر لیتی ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”یہ طیبہ جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو آنکھ بند کر کے بیٹھی رہتی ہیں اور جب شوہر کسی اور طرف لگ جائے تو خود ہی اندر اندر گھلتی رہتی ہیں۔“ وہ فون پر اپنی بہن کو طیبہ کے متعلق ہی بتا رہی تھی۔

”مجھے تو صاف لگ رہا تھا کہ افضل بھائی اپنی کزن میں انٹرسٹڈ ہیں۔ اسے ضرورت سے زیادہ توجہ دیتے۔ اس کے ساتھ خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے تھے اور جب میں اس بے وقوف سے کہتی تو سر جھٹک دیتی کہ آپس میں فرسٹ کزن ہیں۔ بچپن کی بے تکلفی ہے۔ اب اتنے دن سے شکل لٹکا رکھی ہے۔ مجھے تو کہہ کر گئی تھی کہ عورت دوسروں کی باتوں میں آ کر بہک جاتی ہے۔ اب جو اس کا شوہر بہک گیا ہے وہ آخری بات پر اس نے قبضہ لگایا تھا۔“

”اچھا۔۔۔ وہ فرح چڑیل۔۔۔ وہ تو زہر لگتی ہے مجھے۔ وہ آپ کو کہاں مل گئی۔ انتہائی چلتا باز اور تیز طرار لڑکی ہے آپ! پورے خاندان کے لڑکوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے اور شادی کسی سے بھی نہیں کی۔ میری نندیں تو خار کھاتی ہیں اس سے۔“

”ارے آپ! کہاں پھنس گیا آپ کا غریب دیو۔۔۔ وہ تو اچھے اچھوں کو گھاس نہیں ڈالتی اسے کہاں۔ ہاں۔۔۔ پوسٹ تو کافی اچھی ہے ایسی لوڑ کریکٹر عورتیں پیسہ ہی دیکھتی ہیں مردوں کا۔“

”دو ہفتے ہو گئے۔ آپ کے کہنے پر تعویذ پلا رہی ہوں ورنہ وہ طیبہ تو مجھے خوب باتیں سنا کر گئی ہے۔ بس آپ! انسان جس طرف کو اپنا ذہن لگالے۔ میں

چوہے پر چنے کی دال اٹھنے کے لیے رکھ کر آئی تھی آپ! مجھے چلنے کی بو آ رہی ہے غالباً“ نیچے لگ رہی ہے۔ آپ ہولڈ کریں میں ابھی آئی ہوں۔“

ریسیور سائیڈ پر رکھ کر وہ سرعت سے چلی منزل کی سیڑھیاں اترنے لگی تو سامنے طیبہ کے گھر میں طیبہ اور افضل بائیک کے پاس کھڑے کہیں جانے کی تیاریوں میں تھے۔ اسے دیکھ کر طیبہ نے ہاتھ ہلایا۔

”گلتا ہے ان کی صلح ہو گئی ہے۔ کافی خوش لگ رہے ہیں دونوں وہ ان ہی کے متعلق سوچتی برنرینڈ کر کے دوبارہ اوپر آئی۔ لائن منقطع۔۔۔ ہو چکی تھی۔ شاید اس کی آپ کی ابھی کچھ جل گیا تھا۔“

اور یہ اسی رات کی بات تھی جب اس نے عامر کے کوٹ کی جیب میں ادھ کھلے گلاب کی کلی کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ بڑی فرصت میں تیار ہوتے ہوئے سیٹی کی شوخ دھن پر کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔

”میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟“ اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے ارادہ ظاہر کیا۔

”ارے نہیں یار۔۔۔ آفیشل گیٹ نوکیر ہے۔ تم وہاں جا کر بور ہو جاؤ گی اور ہو سکتا ہے میں کچھ لیٹ بھی ہو جاؤں۔“ وہ فراخ دلی سے خود پر نفوس کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

”اب بس بھی کرو۔“ ”مریم کو یہ فضول خرچی پسند نہیں آئی۔“

”لیس محترمہ! بس کیا۔“ وہ آج بہت موڈ میں تھا۔

”میں گھر پر رہ کر بھی پور ہی ہوں گی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ اسے جانے کیوں بے چینی سی ہو رہی تھی۔

”پھر وہی بات ڈارنگ! پہلے کبھی منع کیا ہے میں نے تمہیں۔ اب بھی کسی وجہ سے ہی کہہ رہا ہوں۔“

”عجبت جھاڑنے لگا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ اس کے رومینٹک موڈ پر

برف ڈال کر وہ وجہ میں الجھنے لگی جو اسے اگلی صبح نظر آنی تھی۔



ادھ کھلے گلاب کی کٹی اس کے ذہن پر بری طرح سوار تھی۔ وہ سرخ گلاب اگر عام اس کے لیے نہیں لایا تھا تو پھر کس کے لیے لایا تھا۔ اسی لمحے میں ابھی وہ طیبہ کی طرف آگئی اور اسے باہر بلایا کہ سڑک پر پہل لیں۔ طیبہ فاسغ ہی تھی اس لیے فوراً چلی آئی۔

”اور بھابھی! سنا میں کیا حال چال ہیں؟“

”میرے تو حال ٹھیک ہی ہیں۔ تم سناؤ معاملات سلجھے کیا؟“

”الحمد للہ بھابھی! مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ہیفیشل پر ابلم ہی ہے اور یہی حقیقت تھی۔ افضل کے آفس میں ورکرز کو نکالا جا رہا تھا۔ افضل پریشان تھے کہ کہیں ان کا نام بھی نہ آجائے مگر اللہ کا شکر ہے اس نے عزت رکھ لی۔“

”اور وہ ورورہ صاحبہ کا قصہ۔“ وہ اپنا دھیان بٹانا چاہ رہی تھی۔

”وہ تو میرے ذہن کا شیطانی وسوسہ تھا بھابھی! افضل نے مجھ سے کہا کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تم کن

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دکلش ناول

کتاب کا نام	قیمت
دو چھٹی سی دیوانی سی	600/- روپے
آرزو نکھر آئی	500/- روپے
تمھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناشر منگولے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

منگولے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

خداشات میں الجھ رہی ہو لیکن ورورہ کے ساتھ میرا بھائیوں جیسا تعلق تھا۔ ہماری منگنی بھی ہماری مرضی کے برخلاف کی گئی تھی کیونکہ ورورہ پہلے ہی کسی میں انوالو تھی اور میں یہ بات جانتا تھا۔ اس لیے ہم دونوں چاہتے تھے کہ بات ختم ہو جائے اور ایسا ہی ہوا اور تھینک گاڑ کہ میں نے اس سلسلے میں افضل سے خود کو کوئی بات نہیں کی تھی ورنہ بہت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔“

وہ مطمئن اور آسودہ تھی جبکہ مریم کا دل پریشان تھا۔ یہی شیطانی وسوسے آج کل اسے پریشان کرتے تھے۔ طیبہ سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ ابھی ابھی سی رہی جسے طیبہ نے بھی محسوس کر لیا تھا اور وہ ہنس کر ٹال گئی۔ اور جب رات کو عامر اس کے لیے گھرے اور آئس کریم لے کر آیا تو وہ آئس کریم کی طرح ہی پکھل گئی تھی۔



”رات گئی بات گئی“ کے مصداق وہ بھول ہی گئی تھی کہ وہ رات عامر سے کتنی متنفر ہو رہی تھی۔ وسوسوں اور واہموں نے اس کی جان عذاب کر دی تھی اور پھر اس کی قوت میں وہ سب فراموش کر گئی تھی یہ بھی کہ اس نے ادھ کھلے گلاب کی کٹی کے دی تھی۔

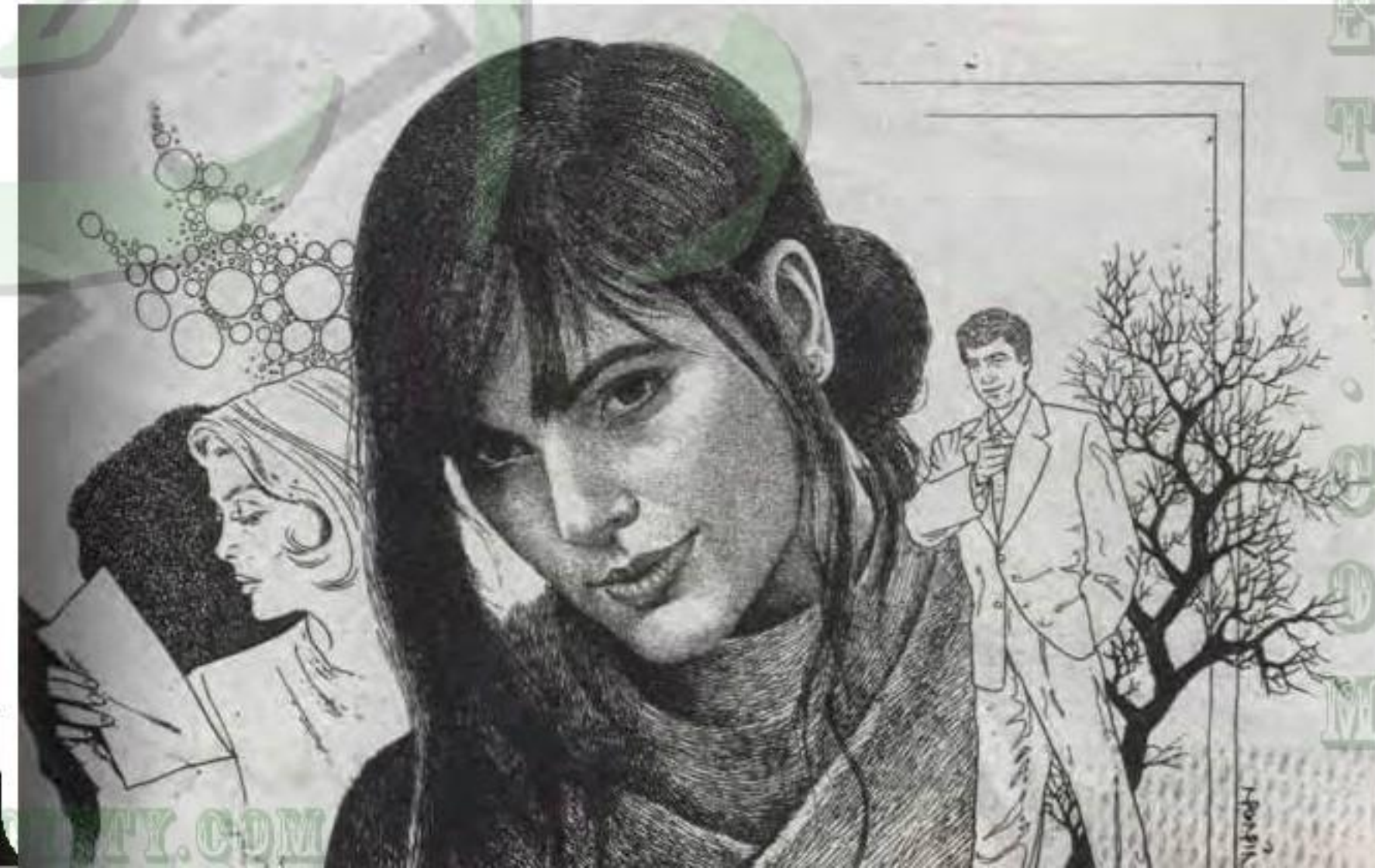
اور اب اس کا واہمہ اور خدشہ حقیقت کی صورت اس کے سامنے تھا۔ شاپنگ مال کی سیڑھیوں پہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے وہ دونوں چہرے اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔

عامر۔ اس کا شریک حیات جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی۔ وہ جو دن میں ہزار بار اسے یقین دلاتا تھا کہ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ وہی عامر اس وقت فرح کے پہلو میں کھڑا بہت مسرور اور شاداب لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ اسے دوسروں کے گھر کی فکر بھی کہ کہیں اس میں نقب نہ لگ جائے مگر نقب تو اس کے اپنے گھر میں ہی لگ چکی تھی۔





سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سابر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے، وہاں۔ مگر احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ داور کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولید والے دن حیا سے بیہوشی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست پنکی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکا لرشپ پر اپنی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شہر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبداللہ حیا اور ڈی جے کی دعوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرزمین جی سے ملتا ہے، تاہم سین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ



اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست مقتسم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو پیش پہنچاتا ہے تو وہاں ”اے آر پی“ لکھا ہوتا ہے۔ حیا جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے پر اے آر پی لکھا ہوتا ہے۔ ایک بچہ حیا کا پرس چھین کر اسی بنگلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ حیا اس کے پیچھے پیچھے اس بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور۔ مجراحمہ سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو بنائی تھی۔ مجراحمہ کرل گیلانی کا بیٹا ہے جسے جہان کے ابا چھٹا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا کچھ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آ جاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سرد مری سے ملتے ہیں، تاہم آخر

میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔
مہوش کی شادی والے دن پنگی حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبہ دیتا ہے جو ایک پہلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی ڈولی اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ وہ چھ حنی کو ڈکھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے جہان سے بھی کہتی ہے پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبہ کھولنے کے لیے حیا، مقتسم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہراقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر who لکھ دیتا ہے۔ حیا عثمان شبر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشہ اور ہمارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پسیلوں پر رکھے گئے کوڈ والے وہ ڈبے عائشہ اور ہمارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے مجراحمہ کے۔ مجراحمہ حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی پنگی ہے اور ڈبے پر پسیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور رو حیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ رو حیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو کوئی گئی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی ممکن ہو جاتی ہے۔ عائشہ اور ہمارے کی غیر موجودگی میں حیا پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

ہمارے کا پزل باکس کھل گیا۔ اس میں سے نیکلس نکلتا ہے مگر وہ سمندر کی لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ حیا کو پتا چلتا ہے کہ پاشا کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے جو بظاہر یونان میں ہے۔
پاشا اپنی سیکریٹری دیمت سے اپنے مسئلے پر مشورہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے زبان بند رکھنے کے لیے اس کے ایک راز سے اپنی واقفیت بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

جہان بیوک ادا آتا ہے۔ حیا اس کا پیچھا کرتی ہے مگر کچھ جان نہیں پاتی۔ اخبار میں چھاپنے کے لیے ایک کہانی وہ جہان اور پاشا کو سناتی ہے۔ جہان اسے شائع کروانے سے منع کرتا ہے جبکہ پاشا بھڑک اٹھتا ہے۔ پاشا بیوک ادا آتا ہے تو اسے حیا کا پزل باکس ملتا ہے۔ وہ اسے چھپا لیتا ہے۔ ہمارے کو علم ہوتا ہے پھر جب عائشہ گل اور حیا اسے ڈھونڈتی ہیں تو ہمارے چپکے سے اسے لا کر دے دیتی ہے۔ اس پر پاشا ہمارے سے ناراض ہوتا ہے۔

سلیمان صاحب ترکی آتے ہیں۔ حیا ہوٹل مرمر میں ملنے جاتی ہے تو ان کے ساتھ ولید لغاری اور اس کا۔۔۔ باپ موجود ہوتا ہے۔ حیا جہان کو فون کر کے بلا لیتی ہے۔ وہاں جہان اپنا تعارف حیا کے شوہر کی حیثیت سے کروا تا ہے۔ حیا اپنا موبائل مرمت کرانے جاتی ہے تو دوکان والا بتاتا ہے کہ اس کے فون میں ٹریسر لگا ہے۔ حیا اسے لگا رہنے دیتی ہے۔ سلیمان

صاحب اپنی بہن کے ساتھ مل کر حیا اور جہان کی باقاعدہ منگنی کرتے ہیں۔
مانچے گل کے کہنے پر حیا اسکا راف پہننا شروع کر دیتی ہے۔ ایک کافی شاپ میں پاشا سے سامنا ہوتا ہے تو حیا اس کے کافی پھینک کر بھاگ جاتی ہے۔
ایک سینار میں شرکت کرنے کے بعد حیا باقاعدہ نقاب لینا شروع کر دیتی ہے۔ حیا کا پزل باکس کھل جاتا ہے مگر اندر ایک اور پزل نکلتی ہے۔ جس کے سلسلے میں وہ سسلی امانت لا کر جاتی ہے۔ وہاں اسے پاشا کا میسج ملتا ہے کہ برگر کنگ میں ایک سربراہ ہے۔ وہ سب چھوڑ کر جہان کے ریسٹورنٹ پہنچتی ہے۔ وہاں پاشا اور جہان ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ حیا جہان کا پاشا سے تعلق نکلنے پر بے حد خفا ہوتی ہے اور ترکی چھوڑ کر فوراً پاکستان آ جاتی ہے۔

توین قیظ

یاد نہیں کرنا چاہتی تھی مگر تمام واقعات اٹلڈ کر آنکھوں کے سامنے چلتے نظر آ رہے تھے۔
بے اعتباری کا دکھ زیادہ بڑا تھا یا خود کو جہان کے لیے بلیک میلنگ کا ہتھیار بنائے جانے کا خوف، وہ فیصلہ نہیں کر سکی۔ البتہ ایک بات طے تھی۔ اگر ان پچھلے پانچ ماہ میں اس نے کچھ فیصلے صحیح کیے تھے تو پاکستان واپس جانے کا فیصلہ ان میں سے ایک تھا۔ اپنے گھر، باپ اور بھائی کے تحفظ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ اسے ترکی اب بھی اتنا ہی پسند تھا، مگر ترکی کے کچھ لوگوں سے اب اسے خوف آنے لگا تھا۔ بس بہت ہو گئے ایڈو سچرز، اب اس نے ہار مان لی تھی۔ وہ جہان کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی چلی آئی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ یہی صحیح تھا۔ اس کو سمجھنے اور سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔

جہان کے لیے بھی شاید یہ درست تھا۔ اب کم از کم پاشا اسے حیا کی وجہ سے بلیک میل نہیں کر سکے گا۔ جہان سکندر سے شدید ناراضی کے باوجود لا شعوری طور پر بھی اس نے اس کا اچھا ہی سوچا تھا۔
گجر کے قریب وہ اسلام آباد پہنچی۔ ابا کو آنے سے منع کر دیا تھا، سو اس کی تاکید کے مطابق انہوں نے ڈرائیور بھیج دیا تھا۔
سردرد، بخار اور بوجھل دل۔۔۔ وہ گولی لے کر سوئی تو ظہر کے قریب اٹھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ میں ڈلی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا۔ اندر سیاہ ٹمبل۔ ایک چھوٹی سی فلیش ڈرائیور رکھی تھی۔ اس نے فلیش ڈرائیو اٹھا کر کھولی۔ ڈرائیو کا سلور میو ایس بی بلیک چمک رہا تھا۔ حیا نے ڈھکن بند کیا، اور اپنے صلیب سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ انگلی کے دو پوروں برابر ننھی سی ڈرائیو کا گور سیاہ تھا وہاں کہیں کچھ نہیں لکھا تھا۔
اس میں کیا ہو سکتا تھا بھلا؟ تصاویر؟ ڈاکو منٹس؟ کتابیں؟ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی میموری کتنی ہے یونکہ اس کے اوپر لکھا نہیں تھا، مگر یہ تو واضح تھا کہ اس میں دنیا جہاں کی چیزیں سما سکتی تھیں۔ اندر جو بھی تھا وہ تب ہی کھلتا، جب وہ اسے کمپیوٹر سے جوڑتی اور کمپیوٹر۔۔۔ اوہ۔۔۔ ایڈی جے کو خراج دیتے ہوئے وہ یہ ٹاپ اپنے پاس نہیں رکھ سکی تھی۔ اب اس میں جو بھی تھا وہ اسے گھر پہنچ کر ہی دیکھ سکتی تھی۔

اس نے فلیش ڈرائیو واپس ڈبیا میں ڈالی اور احتیاط سے پرس کے اندرونی خانے میں رکھ دی یہ قیمتی چیز تھی اور اسے اس کی حفاظت کرنی تھی۔

جانے سر سیٹ کی پشت سے نکا دیا اور جلتی ہوئی موند لیں۔ صبح کے واقعات اور اس ہنگامہ خیز ڈیٹے و تیاری نے اسے تھکا دیا تھا۔ بخار، سردرد اور ٹھکان، ان سب کی تکلیف اس تکلیف سے کہیں بھول تھی جو آج جہان نے اسے دی تھی۔ وہ کچھ بھی

”اتنا بڑا سر راز!“ اسے ہاتھوں سے بال لپیٹتے ہوئے لاؤنج میں آتے دیکھ کر فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔ صبح وہ سو رہی تھیں اور ان کی ملاقات اب ہو رہی تھی۔

”ماں!“ وہ آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ گھر تحفظ امان۔ اس کے آنسو اٹھ کر آ رہے تھے۔

”سین پریشان ہو رہی تھی کہ اتنی اچانک حیا کیوں چلی گئی؟“

اپنے بیٹے سے پوچھنا تھا! ”جہان کو بتایا تھا وہ شاید بتانا بھول گیا ہو۔ کچھ کھانے کو ہے؟“ وہ نگاہیں چرا کر کچن کی طرف جانے لگی۔ وہی سبائچی سے بڑی ہر کام خود کرنے کی عادت۔ فاطمہ نے ہاتھ سے پکڑ کر واپس بھلیا۔

”آرام سے بیٹھو۔ نور بانو کھانا لگا رہی ہے۔“ پھر ذرا چونکیں ”تمہیں بخار ہے۔“ جب وہ گلے لگی تھی تو اس وقت اتنے عرصے بعد ملنے کے جوش میں انہیں محسوس نہیں ہوا تھا شاید۔

”نہیں، سفر کی وجہ سے۔“ اس نے دھیرے سے ہاتھ چھڑایا۔

پچھلی دفعہ جب وہ پاکستان آئی تھی تب بھی اسے بخار تھا۔ تب اس نے استقلال اسٹریٹ میں ڈی جے کو کھویا تھا۔ اب بھی اسے بخار تھا۔ اور اس دفعہ شاید اس نے جہان کو کھویا تھا۔ اسی جگہ استقلال اسٹریٹ میں۔ آزادی کی گلی۔ جس سے وہ کبھی اپنی زندگی آزاد نہیں کر سکتی تھی۔

شام میں جب وہ عصر بڑھ کر جائے نماز تہہ کر رہی تھی تو لاؤنج کی چوکھٹ پہ تایا فرقان نے ہولے سے دستک دی۔ وہ چونک کر مڑی، پھر مسکرا دی۔

”تایا ابا!“ وہ آگے بڑھ کر ان سے ملی۔

”ارے یہ ترکی والے کہاں سے آگئے؟“ انہیں جیسے اس کا نماز کے انداز میں لیا دہ پٹا بہت اچھا لگا تھا۔

”بس ایگزائمز ختم ہو گئے تھے۔ آخری مہینہ ترکی گھومنے کے لیے تھا۔ میں نے سوچا اس میں پاکستان

آجاتی ہوں، پھر جولائی میں کلیئر نس کروانے چلی جاؤں گی۔“ اس نے رساں سے وہ وضاحت دی جو اب اسے بہت سی جگہوں پہ دینی تھی۔

”یہ تو بہت اچھا کیا۔ ابا کدھر ہیں تمہارے؟“ پو کا کام تھا۔

”پتا نہیں! آفس میں ہوں گے۔ گھر پہ تو نہیں ہیں۔“

”اچھا! میں کال کر لیتا ہوں۔“ وہ کہہ کر مڑنے لگے تو وہ جائے نماز رکھ کر ان کے ساتھ ہی چلی آئی مگر سب سے ملے۔

صائمہ تالی اپنے مخصوص ”مسکراتے“ انداز سے ملیں۔ ارم کمرے میں تھی۔ اسے دیکھ کر ذرا حیران ہوئی۔

”خیر! اچھا کیا اب کم از کم تم میری ”منگنی“ تو اٹینڈ کر رہی لو گی۔“ صبح مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی مگر اسے خوش گواری حیرت ہوئی۔

”تمہاری منگنی، کب؟“

”ایک ڈیڑھ ہفتے تک ہے۔ ان کے کچھ رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی روائی سے پہلے پہلے ہی فنکشن ہو گا۔“ ارم بہت ناخوش لگ رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر اس کے پاس بیٹھ نہیں سکی اور باہر آ گئی۔

سویا کچن میں تھی۔ اس سے اپنے فطری خوش خلق انداز میں ملی۔ بیٹھنے کو کہا، مگر وہ بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ پاکستان اور خاندان والے۔ وہی پرانی زندگی لوٹ آئی تھی، ترکی اور ترکی کے وہ چار ماہ کسی ست رنگے بلبلے کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔



اسٹڈی روم کی کھڑکی کے سامنے کھڑا وہ نیچے نظر آتی گلی کو دیکھ رہا تھا۔ پتھر ملی سڑک پہ ایک کبھی سیاحوں کو لیے جا رہی تھی۔ اولاد کی سب سے شاہانہ سواری۔ مگر اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کھلے دروازے سے عائشے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں پرچ پیالی تھی۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ اس نے

سٹڈی ٹیبل پہ پیالی رکھی۔

”عبدالرحمن! تمہاری کافی۔“

عبدالرحمن نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ روئی روئی سبز آنکھیں، شیشے کے دیکھنے پہ اس نے نگاہیں جھکا دیں۔ اس کا مطلب تھا آنے اسے مطلع کر چکی تھیں اور وہ دکھی تھی۔

”میں امید کرتا ہوں، تم میرے ساتھ تعاون کرو گی۔“ وہ اپنے انڈی خشک انداز میں کہتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ”آنے کو ان کا بیٹا واپس مل رہا ہے، اس سے زیادہ بڑی خوشی ان کو کبھی نہیں مل سکتی۔ تم ان میں بیٹے کے فیصلے میں ان کا ساتھ نہ دے کر ان کی خوشی ختم کر دو گی، مگر میں جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔“

عائشے نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں جانتی ہوں کہ مجھے اور ہمارے کو وہیں رہنا ہے، جہاں آنے کو رہنا ہے۔ اگر وہ اولاد تمہیں آ سکتا۔ اور یہ ضروری ہے کہ ہم سب یہاں سے چلے جائیں تو میں رکاوٹ نہیں ہوں گی۔ میں نے پیکنگ شروع کر دی ہے۔“ وہ لمحے بھر کو رکی۔ ”کیا واقعی سب ایسا ہی ہو گا، جیسا تم کہہ رہے تھے؟ کیا واقعی باہر جا کر وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا؟“

”ہاں! اور تم جانتی ہو، میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔“ وہ اب بھی کھڑکی سے باہر ہی دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے! میں ہمارے کو سمجھا دوں گی۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ ہم اتنی ہی خاموشی سے ترکی سے چلے جائیں گے۔ جتنی خاموشی سے تم چاہتے ہو۔“

”ٹیور! کیا اب تم مجھے اکیلا چھوڑ سکتی ہو؟“

عائشے سر ہلا کر پلٹ گئی۔ عبدالرحمن نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا۔ اور پھر دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ کاریڈور کے سرے کے آگے غائب ہو گئی۔ پھر رات گہری سانس لی اور بولا۔

”ہمارے گل! کیا تم میز کے نیچے سے لکھنا پسند کرو گی؟“

اور اسٹڈی ٹیبل تلے بیٹھی، کان لگا کر باتیں سنتی ہمارے گل نے بے اختیار زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ اللہ، اللہ، وہ ہر بار کیوں پکڑی جاتی تھی؟ جب وہ دونوں باتیں کر رہے تھے تب وہ اتنی خاموشی سے دبے قدموں آئی تھی اور میز تلے چھپ گئی تھی۔ زمین تک لٹکتے میز پوش نے چاروں اطراف سے اسے ڈھانپ دیا تھا، مگر عبدالرحمن پھر بھی جان گیا تھا۔

”ہمارے گل!“ وہ ذرا سختی سے بولا تو وہ ریگتی ہوئی باہر نکلی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے یا کر وہ معصومیت سے مسکراتے ہوئے کپڑے جھاڑتی اٹھی۔

”کیا کر رہی تھیں تم؟“

وہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ باندھے خاموشی سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”کچھ بولو گی نہیں؟“

ہمارے نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ ہمارے گل چپ زیادہ اچھی لگتی ہے۔“

عبدالرحمن سر جھٹک کر واپس کھڑکی کی طرف مڑ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا یا شاید پریشان تھا۔

”میں ادھر بیٹھ جاؤں؟“ ہمارے نے اسٹڈی ٹیبل کی ریو الونگ، چیر جس کے ساتھ ہی عبدالرحمن کھڑا تھا کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے دھیرے سے گردن اٹات میں ہلائی۔ وہ بڑی سی کرسی پہ بیٹھ گئی اور میز کی سطح پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔

”جب حیا ادھر تھی تو وہ یہیں بیٹھ کر اپنے پنل باکس پہ غور کیا کرتی تھی۔“ وہ چونکا۔

”وہ چلی گئی۔“

ہمارے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں حیرت پنہاں تھی۔

”کہاں؟“

”اے ملک واپس۔“
 ”مگر کیوں؟ اس نے بتایا بھی نہیں۔ میرا ٹیکس بھی نہیں خریدا۔ میں اسے فون کروں؟“
 ”نہیں! بالکل نہیں۔“ وہ سختی سے بولا تو ہمارے کرسی سے اٹھتے اٹھتے ٹھہر گئی۔
 ”اور اب تم اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔ سمجھیں؟“
 ”میں نے کیا کیا ہے؟“ اس کے چہرے پر اسی اثر آئی۔ وہ ان ہی سخت شبیہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”بس! کہہ دیا تو کہہ دیا۔“
 چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ جیسے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے بولی۔
 ”کیا ہم کہیں جا رہے ہیں؟ نہیں! میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں تو بس دیکھ رہی تھی کہ تمہاری میزینچے سے کیسی لگتی ہے۔ بس! تھوڑا سا خود بخود سنائی دیا تھا۔“ وہ جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔
 ”تمہارا خود بخود“ سمجھتا ہوں میں اچھی طرح۔“ اسے گھور کر وہ واپس باہر دیکھنے لگا۔ ہمارے کی سمجھ میں نہیں آیا اس کا موڈ کس بات پہ خراب تھا۔
 ”عبدالرحمن!“
 ”ہمارے! میری بات غور سے سنو۔ بعض دفعہ انسان کو اپنا گھر، شہر، ملک، سب چھوڑنا پڑتا ہے۔ قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تم سے ایک قربانی مانگ رہا ہوں۔ میں تمہارے انکل کو واپس لے آیا ہوں۔ وہ اب تمہارے ساتھ رہے گا، مگر اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اولاد میں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس نے ایک دوسرے ملک میں تم سب کے رہنے کا انتظام کیا ہے۔ وہ اوہر ہی ہے اور تمہارے عائشے اور آنے کے لیے گھریٹ کروا رہا ہے۔ اسی ہفتے تم لوگ اوہر چلے جاؤ گے۔ اور پلیز! نہ روؤ گی، نہ ہی شور ڈالو گی، نہ تم مجھے تنگ کرو گی۔ تم اولاد چھوڑ دو گی اور میرے خلاف جانے کی ضد نہیں کرو گی، سمجھیں؟“ وہ باہر دیکھتے ہوئے بے چک، سرواندا میں کہتا گیا۔ ہمارے کا چہرہ

بجھتا چلا گیا۔
 ”پہ رہا تمہارا پاسپورٹ۔“ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک ننھی سی کتاب نکال کر ہمارے کو تھمائی۔ ہمارے نے بے دلی سے اسے کھولا۔ اندر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔
 ”ہم یہاں کیوں نہیں رہ سکتے؟“
 ”سوال نہیں کرو گی تم سنا تم نے؟“
 ہمارے کا سر مزید جھک گیا۔ وہ پڑھو گی سے پاسپورٹ کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ ایک جگہ وہ ٹھہری گئی۔ وہ نہ پاسپورٹ کے رنگ کو دیکھ رہی تھی نہ ہی دوسری تفصیلات کو۔ وہ صرف ان دو حروف کو پڑھ رہی تھی جو وہاں نمایاں کر کے لکھے تھے۔
 ”Hannah Kareem“
 ”عبدالرحمن! غلطی ہو گئی ہے۔ میرا نام غلط لکھ دیا ہے۔“
 ”حنہ کریم۔ یہ تو میرا نام نہیں ہے۔“ وہ حیرت اور الجھن سے نفی میں سر ہلانے لگی۔
 ”اب یہی تمہارا نام ہے۔“
 ہمارے حیرت زدہ رہ گئی۔ کبھی وہ اس پاسپورٹ کو دیکھتی تو کبھی عبدالرحمن کے بے تاثر چہرے کو۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
 ”اور ایک آخری بات۔“ وہ اس کی طرف مڑا اور سابقہ انداز میں بولا۔ ”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“
 سفید محل، اولاد، ترکی، اپنا نام، شناخت، ہمارے گل ہر چیز چھوڑ سکتی تھی، مگر اس آخری بات نے تو اس کی سانس ہی روک دی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر عبدالرحمن کا چہرہ دیکھنے لگی۔
 ”تم۔ تم۔ تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟“
 ”نہیں! اور تم کوئی رونا نہیں ڈالو گی۔“
 ”مگر تم ہمیں ایسے نہیں چھوڑ سکتے۔ تمہیں۔ تمہیں میری ضرورت ہے۔“ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
 ”اوہ کم آن! مجھے تمہاری بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ برہمی سے کہتے ہوئے مڑا اور باہر نکل گیا۔

ہمارے کو اپنے اندر سے ایک آواز آئی تھی۔ جیسی مر مرا کے پانی میں پتھر پھینکنے کی ہوتی ہے۔ جیسی دل نوٹنے کی ہوتی ہے۔
 آنسو لڑیوں کی صورت اس کے رخساروں پہ مرنے لگے۔ عبدالرحمن کو اس کی ضرورت تھی تب ہی تو اس نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو ہمارے اسے جنازہ دے گی اور اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ چاہے پورا ترکی اسے چھوڑ دے، ہمارے گل اسے کبھی نہیں چھوڑے گی۔
 اس نے اپنی کمر سے بندھے گلانی پرس کو کھولا اور پاسپورٹ اس میں ڈال دیا۔ پھر وہ کرسی سے اترتی اور بے قدموں میز کے نیچے چلی آئی۔ چاروں طرف سے گرتے میز پوش نے پھر سے اسے ڈھک دیا۔
 وہ لکڑی کی ٹانگ سے سر نکائے بیٹھی ہوئے ہوئے سسکنے لگی۔ وہ سب کچھ چھوڑ سکتی تھی، مگر عبدالرحمن کو نہیں۔ پھر اب کیوں۔۔۔
 آنسو اس کی گردن سے پھسلتے ہوئے فراک کے کنارے جذب ہو رہے تھے۔ اس نے دیکھنا چاہا کہ نیچے سے میز کیسی لگتی ہے، مگر وہ اسے دھندلی ہی دکھائی دی۔
 ”بھگی، آنسوؤں سے لدی۔“
 عبدالرحمن نے باہر نکلتے ہوئے جب آخری دفعہ گردن موڑ کر دیکھا تھا تو ہمارے اسے کرسی پہ سن سی بیٹھی، بے آواز روتی دکھائی دی تھی۔ وہ اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا تھا، سوتیزی سے باہر آ گیا۔
 پچھلے باغچے میں وہ عائشے کی ورک ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھا اور یوں ہی آسمان کو دیکھنے لگا۔ اس کا اپنا دل بھی بہت دکھی تھا۔ ان دونوں بہنوں کو اس کی وجہ سے اتنی تکلیف اٹھانی پڑے گی، اس نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ وہی اس سب کا ذمہ دار ہے۔ اس کی اور اس کے کاموں کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ بے قصور تھا۔ ہمارے سے سختی اور سردی اس سے بات کر کے اس نے اپنے تئیں ان کی روانگی

آسان بنانے کی کوشش کی تھی، شاید یوں کرنے سے ہمارے اس سے محبت کرنا چھوڑ دے اور پھر جلد اسے بھول جائے۔ یہ سب آسان نہیں ہو گا، مگر عائشے سنبھال لے گی اسے۔
 اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے باغچے میں بیٹھے دیکھ کر عائشے نے بے اختیار سوچا تھا کہ ہمارے کو تو وہ سنبھال لے گی، مگر خود کو کیسے سنبھالے گی؟ چند ماہ قبل اس کی اور عبدالرحمن کی شدید لڑائی کے بعد اسے علم ہو گیا تھا کہ جلد یا بدیر وہ عبدالرحمن سے الگ ہو جائیں گی۔ وہ ان کا کبھی نہیں تھا۔ وہ ان کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے، مگر اب وہ فطری طریقے پہ واپس آ جائیں گے۔ داوی، چچا، چھوٹی بہن۔۔۔ عائشے کے تین ساتھی، فیملی ممبرز۔ اصل زندگی، حقیقی گھر، مکمل فیملی۔
 اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا بھگا گوشہ صاف کیا اور المیاری کی طرف بڑھ گئی۔ آنے سے تیاری میں لگی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں، سوا سے بھی اب تیاری مکمل کر لینی چاہیے۔
 رہی محبت۔۔۔ تو وہ اچھی لڑکیوں کو بھی ہو ہی جاتی ہے، لیکن جب انہیں یہ پتا چل جائے کہ وہ محبت انہیں مل ہی نہیں سکتی، تو وہ خاموش رہتی ہیں۔ اچھی لڑکیاں خاموش ہی اچھی لگتی ہیں۔
 دکھی دل کے ساتھ اس نے دراز سے اپنی قیمتی چیزیں نکالنی شروع کیں۔ وہ ان سب کو ایک جیولری باکس میں ڈال رہی تھی۔ سب سے اوپر اس نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر رکھی۔ یہ اسے عبدالرحمن نے اس کی سالگرہ پہ تحفے میں دی تھی اور وہ اسے کبھی نہیں اتارتی تھی۔ جواب میں اس نے عبدالرحمن کو اپنی سالگرہ پہ کیا دیا تھا۔ اس نے اپنے جیولری باکس کی سب سے آخری، چھوٹی سی دراز کھولی۔ وہ خالی تھی۔ کبھی اس میں وہ شے ہوتی تھی جو اس نے عبدالرحمن کو دے دی تھی۔ مگر اس بے رحم آدمی نے اس کے تحفے کے ساتھ کیا کیا؟

عائشہ نے آزدگی سے سر جھٹکا۔ زندگی میں سب سے زیادہ خوف اسے اسی بات پر آتا تھا کہ کہیں وہ جانتا تو نہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ مگر نہیں وہ کبھی نہیں جان سکتا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ وہ غلط تھی۔

زار اس سے ملنے آئی تھی۔ اتنے عرصے میں زارا کو تو وہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔ اب دونوں مل کر بیٹھیں تو وہ ترکی کی باتیں ہی کیے گئی۔ بس یہی وہ موضوع تھا جس پر۔ وہ زارا سے بات کر سکتی تھی۔ بعض دفعہ دوست تو وہی ہوتے ہیں مگر وقت انسان کو اتنا آگے لے جاتا ہے کہ وہ اپنے دوست کے مدار سے ہی نکل آتا ہے۔ پھر کتنا ہی میل ملاقات رکھ لے وہ درمیانی فاصلہ ناقابل عبور بن جاتا ہے۔ وہ بھی زارا کے مدار سے نکل آئی تھی۔ اس کی دوستیں تو صرف عائشہ گل اور ہمارے گل تھیں جن کو وہ بتا کر بھی نہیں آئی تھی۔

آج فون کیا تو عائشہ کا میل آف تھا سو اس نے میل کر دی۔

زار اگلی تو فاطمہ نے اسے بلا لیا۔ صائمہ تائی آئی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

”شکر ہے بیٹا! تم ہو۔۔۔ ورنہ میں کیا کرتی۔ ارم کے سسرال والوں کی شائنگ کرنی ہے۔ منگنی کے تحائف وغیرہ۔ ارم کو تو کچھ سمجھ نہیں ہے تمہارا ٹیسٹ اچھا ہے۔ میرے ساتھ چلو تائی کی زبان میں جو حلاوت تھی چکنائی بھری حلاوت عائشہ ہمارے ہالے معصوم ڈی جے یہ لوگ اس چکنائی سے کتنے دور تھے نا۔

”شیور تائی اماں! میں ذرا عبا لے آؤں۔“ وہ ہاں بھر کر اٹھنے لگی تو فاطمہ جو نکلیں۔

”تم نے عبا لیا ہے؟“

”جی اماں! ایک فریڈ نے گفت کیا تھا۔ میں نے سوچا اب باہر جاتے ہوئے لے لیا کروں گی۔“ وہ بظاہر بہت لاروائی سے کہتی اٹھ آئی۔

پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے پاؤں کو چھوتے، حریر کے عبا میں سیاہ اسٹول سلیقے سے چرے کے گرد لپیٹ کر باہر آئی تو وہ دونوں پل بھر کو حیران رہ گئیں۔

”یہ اچھا کیا تم نے۔۔۔ تم پہ اچھا بھی بہت لگ رہا ہے۔“ فیشن بھی ہے آج کل عبا کا۔“ صائمہ تائی مسکرا کر بولیں۔ ”ویسے! تمہارے تایا نے دیکھا تو بہت خوش ہوں گے۔“

(مجھے تایا سے سرٹیفکیٹ تو نہیں چاہیے تائی اماں!)

”ہاں! عبا تو اچھا ہے مگر بہت سہل نہیں ہے؟“ فاطمہ ذرا متذبذب تھیں۔

چونکہ اس کا عبا سادہ تھا اور سوائے آستین کے سبز اسٹونز کے جو اتنے مدھم تھے کہ توجہ نہ گھیرتے، کوئی کام نہ تھا سو انہیں قلق تھا۔

”اور میں جب حج پہ گئی تھی تو کتنا کہتی رہی کہ تمہارے لیے عبا لے آؤں مگر تم نے انکار کر دیا تھا۔“ فاطمہ تین سال پرانی بات دہرانے لگیں۔ وہ اس لیے اصرار کرتی رہی تھیں کہ ان کی بھابھی جو ان کے ساتھ حج پر تھیں اپنی بیٹیوں کے لیے قیمتی اور کاہلار عبا لے رہی تھیں۔ حیا نے صاف منع کر دیا تھا۔ عبا کے بجائے اس کی کزنز کے برقعے عروسی ملبوسات لگتے تھے۔

”بس! اب دل چاہ رہا تھا۔“ وہ نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھنے لگی۔

”تم نے نقاب بھی شروع کر دیا؟“ صائمہ تائی کو اب واقعتاً جھٹکا لگا تھا۔

”چلیں تائی!“ وہ گاڑی کی چابی پرس سے نکالتے ہوئے بولی۔ اس کے نظر انداز کرنے کے باوجود تائی کہنے لگیں۔

”چلو! اچھا لگ رہا ہے مگر دیکھتے ہیں کہ تم کتنے دن

کرتی ہو۔“ اس نے دو دن بعد ہی چھوڑ دینا ہے۔“ فاطمہ مسکرا کر بولیں۔

”چلیں! دیکھتے ہیں لیڈیز۔“ وہ شانے اچکا کر کہتی بہر نکل آئی۔

استنبول بلا شک و شبہ ایک بہت خوب صورت اور شاندار قسم کا شہر تھا۔ وہ مانتی تھی، مگر جو بھی ہو، پاکستان، پاکستان تھا۔ اپنے ملک کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ بہت عرصے بعد وہ اپنے اسلام آباد کی سڑکیں، درخت اور مارکیٹ دیکھ رہی تھی۔

تائی کو پورا ایف میں پھرا کر وہ دونوں شام ڈھلے واپس آئیں تو ابا اور تایا فرقان لان میں ہی بیٹھے تھے۔ حیا شایر اٹھائے چلتی ہوئی آئی تو تایا ذرا سیدھے ہوئے۔ شاید انہیں لگا کوئی مہمان ہے۔

”میں ہوں تایا!“ اس نے سر کے پیچھے بندھی پٹی اتار کر نقاب چرے سے علیحدہ کیا تو وہ دونوں واقعی حیرت زدہ رہ گئے۔

”تم نے کب سے برقع لینا شروع کر دیا؟“ ”ترکی میں شروع کیا تھا اور بس! ایسے ہی شروع کر دیا تھا۔“ وہ بہت عام سے انداز میں اپنے برقعے کی بات کر رہی تھی۔ تاکہ کوئی مذاق نہ اڑا پائے۔

مگر صائمہ تائی کسی اور ہی موڈ میں تھیں۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے حیا کے برقعے کی تعریفیں کرنے لگیں۔ ابا اب مسکرا رہے تھے۔ انہیں کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ تایا البتہ بہت خوش ہوئے۔

”ہم آج حیا سے کہہ رہے تھے کہ دیکھتے ہیں! کتنے دن تم برقع کرتی ہو۔“

”نہیں! ان شاء اللہ میری پٹی قائم رہے گی۔“ تایا البتہ وہ پشیمکا سا مسکرا دی اور اندر چلی آئی۔

برقع ہی تھا اتنا کیوں ڈمکس کرنے لگے تھے سب۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا، مگر شاید وہ بھی حق بجانب تھے۔ وہ پہلے اس کے برعکس لباس پہنتی تھی، سوان کی حیرانی بجا تھی۔

خیر! جو بھی ہے۔ عبا یا اتار کر لٹکانے تک وہ ان تمام سوچوں سے چھٹکارا پا چکی تھی۔ اب اسے وہ کام کرنا تھا جس کے لیے وہ سارا دن مارکیٹ میں مضطرب رہی تھی۔ کل اسے یاد ہی نہیں رہا۔ تھکاوٹ ہی اتنی تھی اور آج موقع نہیں ملا۔ مگر اب مزید انتظار نہیں۔

اس نے لیپ ٹاپ آن کر کے بیڈ پہ رکھا اور پرس سے وہ نمٹلیں ڈبی نکالی۔ وہ جب بھی اسے کھولتی دل عجیب طرح سے دھڑکتا تھا۔

پتا نہیں کیا ہو گا اس میں؟

اس نے فلیش ڈرائیو کا پلگ لیپ ٹاپ میں لگایا۔ روشن اسکرین پہ ایک چوکھٹا بھرا۔ اس پہ ایک مختصر سا پیغام تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس فائل پہ پاس ورڈ لگا تھا اور پاس ورڈ درج کرنے کے لیے ایک ہی کوشش کی جاسکتی تھی۔ صحیح پاس ورڈ درج کیا تو فائل کھل جائے گی۔ غلط درج کیا تو فائل خود کو خود ہی ختم کر دے گی یعنی وہ کبھی نہیں جان سکے گی کہ اس میں کیا تھا۔

پیغام چند لمحوں بعد ہی غائب ہو گیا۔ اب اسکرین پہ ایک خالی چوکھٹا چمک رہا تھا، جس میں آٹھ خانے بنے تھے۔ کسی آٹھ حرفی لفظ کے لیے یا کسی آٹھ ہندسوں کے عدد کے لیے۔

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ابھری۔ اسے ایک نئی پہلی دیکھ کر بالکل بھی غصہ نہیں چڑھا۔ میجر احمد نے اسے چیخ کیا تھا اور اسے اب یہ چیخ جیت کر دکھانا تھا۔ کہیں نہ کہیں سے اسے اس کا پاس ورڈ مل ہی جائے گا اور پھر وہ اسے کھول لے گی۔

اس نے فائل کو آگے پیچھے ہر طرح سے کھولنے کی کوشش کی مگر اس کا پروگرام خاصا پیچیدہ تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے یہ عجیب بات تھی کہ اس دفعہ احمد نے پہلی نہیں دی تھی۔ اب وہ پاس ورڈ کیسے ڈھونڈے؟ خیر! کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ وہ پر امید تھی۔

ترکی سے واپس آنے کے بعد آج اس نے فون آن

کیا تھا۔ اپنی پرانی سہم وہ نکلا چکی تھی۔ ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ فون بجنے لگا۔ وہ جویپ ٹاپ پہ اپنی اور ڈی جے کی تصاویر دیکھ رہی تھی، چونک کر سیدھی ہوئی جلتی بجھتی اسکرین پہ چمکتے الفاظ دیکھ کر ایک گہری سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

”خبر مل گئی آپ کو۔ مگر صاحب؟“ فون کان سے لگاتے ہوئے وہ بولی۔

”مل تو گئی، مگر میں کافی حیران رہ گیا۔ آپ واپس کیوں آگئیں؟“ وہی نرم، دھیمے، شائستہ انداز وہ جیسے اس کے انداز پر مسکرایا تھا۔

”حیرت ہے، آپ کو پہلی دفعہ پوری بات کا علم نہیں ہوا۔“

”لگتا ہے آپ بہت غصے میں ہیں۔ کیا ہوا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ وہ بے زاری بولی۔ پہلی بار اسے شدید احساس ہوا کہ وہ مگر احمد سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔

”آپ کی آواز کافی بو جھل لگ رہی ہے۔ اداس بھی ہیں اور پریشان بھی۔ اگر آپ وجہ نہیں بتائیں گی تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ بس اتنا بتائیں! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ وہی فکر مند انداز وہ کیوں کرتا تھا اس کی اتنی فکر۔

”جی! میں ٹھیک ہوں اور کچھ نہیں ہوا۔“ اگر اسے نہیں معلوم تھا تو وہ خود۔ اپنے شوہر کی کسی کمزوری سے اسے آگاہ نہیں کرے گی۔

اور بتاتی بھی تو کیا، کہ اس نے عبدالرحمن کے ساتھ دیکھا ہے جہاں کو؟ اور وہ ان کی باتیں؟

ان ساری باتوں کو از سر نو یاد کرتے ہوئے وہ ٹھہری گئی۔ عبدالرحمن نے اسے ٹیکسٹ کر کے بلایا تھا۔

جب وہ پینٹری کی کھڑکی کے قریب پہنچی تو اسے وہاں سے پاشا کا چہرہ سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے

اس نے اسے آتے ہی دیکھ لیا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ جان بوجھ کر یہ سب کہہ رہا ہو تاکہ وہ بد دل ہو جائے اور جہاں کو چھوڑ دے۔ ہو سکتا ہے اس نے حیا کو ”سیٹ

اپ“ کیا ہو۔ آخر! اس نے جہاں کی طرف کی کہانی نہیں سنی تھی۔ ابھی پورا مہینہ حائل تھا، اس کی اور جہاں کی ملاقات میں۔ تب تک وہ۔۔۔

”حیا؟“ وہ چونکی، پھر سر جھٹکا۔

”یہ جو آپ کی فلیش ڈرائیو پہ پاس ورڈ ہے اسے کھول کر کوئی اور پزل بھی نکلے گا کیا؟“

”نہیں! یہ آخری لاک ہے۔ پھر میری امانت آپ دیکھ لیں گی۔“

”اور اس کاپاس ورڈ کیا ہے؟“

”وہ آپ جیسی ذہین خاتون کو چند منٹ میں ہی مل جائے گا۔“

”اچھا! آپ طنز کر رہے ہیں؟“ وہ بے اختیار ہنس دی۔

”نہیں! سچ کہہ رہا ہوں۔ بہت ہی آسان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے پزل کا آخری ٹکڑا ابھی جوڑ لیں گی۔“

”ٹھیک ہے! اگر مجھے مزید آپ کی ضرورت نہیں ہے تو پھر آپ آئندہ مجھے کال مت کیجئے گا۔ میں مزید آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔“ اس کا لہجہ بہت خشک ہو گیا تھا۔ چند ثانیے وہ کچھ کہہ نہیں پایا۔

”مگر آپ کے شوہر کو علم تو ہے پھر۔۔۔؟“

”میں بغیر کسی ضرورت کے آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی اور اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے آئندہ میں آپ کی کال اینڈ نہیں کروں گی۔ خدا حافظ“

کس لمبی بحث سے بچنے کے لیے اس نے از خود فون بند کر دیا۔ احمد نے فوراً دوبارہ کال کی تھی۔ اس نے نہیں اٹھائی۔ اب اسے احمد کی مزید کال نہیں اٹھانی تھی۔ کل کو کوئی اونچ نیچ ہوئی تو سب سے پہلے اس کا جواب بدنام ہو گا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس نے موبائل تکیے پہ ڈال دیا۔ احمد سے قطع تعلق کر کے اسے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس

کے لیے ابھی بھی کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ مطمئن تھی۔

اس شام وہ کچن میں کھڑی سلاوتیار کر رہی تھی۔ پہلے بھی ساتھ ہی کام میں مصروف تھیں۔ نور بانو برتن دھو رہی تھی۔ ابالائونج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ ذرا بلند آواز میں ان تین افراد کی مصروفیت سے بے نیازان کو ترکی کی باتیں بنا رہی تھی۔ جب اپنے اندر کی اداسی، جہاں کی موشی اور یادوں سے تنگ آجاتی تو اسی طرح بولنے لگ جاتی اور آج کل تو اس کی ہر بات ترکی سے شروع ہو کر ترکی پہ ختم ہوتی تھی۔ سفر نامہ استنبول، یہ وہ موضوع تھا جس سے گھر والے اب بور ہو چکے تھے۔ مگر وہاں بردا کے تھے۔

اپنے گھر میں یہ سہولت تھی کہ کوئی مرد ملازم نہ تھا۔ تایا فرقان کا کلک ظفر بہت ہی کم اوھر آیا کرتا تھا۔ ان کا خاندان ویسے بھی روایتی تھا۔ تایا کی تربیت تھی کہ رو حیل نہیں ہے تو ان کے بیٹوں کو اوھر نہیں آنا اور خود بہت کم، سوائے کسی کام کے، اوھر نہیں آتے تھے۔ سو وہ اپنے گھر میں آزادی سے گھوم پھر سکتی تھی۔

”پتا ہے نور بانو! وہاں توپ فہمی پیس کے پیچھے والے ریسٹورنٹ میں کیا ملتا تھا؟“

اب نور بانو کے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ توپ فہمی پیس کس جگہ کا نام ہے۔ وہ بے چارگی سے نفی میں سر ہلائے گئی۔ مگر وہاں جواب کا انتظار کر کون رہا تھا۔ وہ کٹنگ بورڈ پہ سبزیاں کھٹ کھٹ کاٹی ہوئے چلی جا رہی تھی۔

”وہاں ایک مشروب ملتا تھا، ایران نام کا۔ بالکل لسی بی ٹریج ہوتا تھا۔ اتنا مزے دار کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ میں دس بیبی لائی ہوں۔ کبھی مل کر بتائیں گے۔“

لائونج میں رکھا لینڈ لائن فون بجنے لگا تو ابانے ہاتھ

برہما کر ریسور اٹھایا۔ چپانے گردن اٹھا کر ان کو دیکھا۔
لاؤنج اور کچن کی درمیانی دیوار اوپر سے آدھی کھلی تھی۔
”ہاں بیٹن! کیسی ہو؟“ وہ اب مسکرا کر بات کرنے
لگے تھے۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ لمحے بھر کو اسے توپ
قہی اور ایران بھول گیا۔ وہ بالکل چپ سی ہوئی، ذرا
ست روی سے ہاتھ چلانے لگی۔ سماعت ادھر ہی لگی
تھی۔

”کیا۔۔۔ کب؟“ ابا کے تاثرات بدلے۔ وہ ایک دم
سیدھے ہو کر بیٹھے۔

اس نے چھری گاجر میں لگی چھوڑ دی اور پریشانی
سے ابا کو دیکھا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

”انا للہ وانا الیہ راجعون!“ وہ بہت دکھ سے کہہ
رہے تھے۔ فاطمہ بھی جیسے گھبرا کر ہر گئیں۔ تب تک
ابا فون رکھ چکے تھے۔

”کیا ہوا؟“ فاطمہ پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔ حیا
اسی طرح مجسمہ بنے کھڑی، سانس روکے ان کو دیکھ
رہی تھی۔

”سکندر کا انتقال ہو گیا ہے۔“

ابا کے الفاظ نے پورے لاؤنج کو سکتے میں ڈال دیا۔
ملال بھرے سکتے میں۔ حیرت، شک، دکھ، وہ ملی جلی
کیفیات میں گھری کھڑی تھی۔

”وہ لوگ دو ایک روز میں باڈی لے کر آرہے ہیں۔
میں فرقان بھائی کو بتا دوں۔“ ابا تاسف سے کہتے فون
اٹھا کر نمبر ملانے لگے۔

ایک لمحہ، بس ایک لمحہ انسان سے اس کی شناخت
چھین کر اسے باڈی بنا دیتا ہے۔

اس کے اندر کہیں بہت سے آنسو گرے تھے۔
بے اختیار اسے ڈی جے یاد آئی تھی۔

سلیمان صاحب کے بنگلے پہ فوتگی والے گھر کی
سوگواریت چھائی تھی۔ لان میں قنات لگا کر مردوں کے

بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جبکہ خواتین اندر لاؤنج میں
تھیں، جہاں فرنیچر ہٹا کر چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں
درمیان میں کھجور کی ٹکھلیوں کا ڈھیر تھا۔ رشتے دار
خواتین سادہ حلیوں میں تھیں، مگر عابدہ چچی، سحرش اور
ثنا بالکل سفید، نئے لباس پہن کر آئی تھیں۔ پتا نہیں
یہ رواج کہاں سے چل نکلے تھے۔ اس نے البتہ
چاکلینی رنگ کی لمبی قمیص، جوڑی وار کے ساتھ پہن
رکھی تھی۔ ہم رنگ دوپٹا ٹھیک سے سر پہ لیے،
گٹھلیاں پڑھتے وہ لاشعوری طور پہ ایسی جگہ پہ بیٹھی
تھی، جہاں سے کھڑکی کے باہر لان صاف نظر آتا تھا، ہر
والوں کو اندر نہیں نظر آتا تھا کہ دوپہر کا وقت تھا۔ لان
میں خاندان کے مروجہ تھے۔ ابا، تایا اور کچھ کزنز البتہ
نہیں تھے۔ وہ لوگ پھپھو اور میت کو لینے ایرپورٹ
گئے تھے۔ آج تین روز بعد سکندر انگل کی باڈی
کلیئر نس حاصل کر کے اپنے ملک لائی جا رہی تھی۔
اور وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ وہ جہان کا سامنا
کیسے کرے گی؟

خیر! خفت اسے ہونی چاہیے، نہ کہ حیا کو۔ وہی
قصور وار تھا، وہی پاشا کا سا تھیں اور اتنی تو وہ مضبوط
تھی ہی کہ اپنے تاثرات چہرے پہ نہیں آنے دے گی۔
جو بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔ اس کے باوجود جب باہر
شور مچا اور وہ لوگ پہنچ گئے تو اس کا دل اتنی زور سے
دھڑکنے لگا کہ وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔

اتنے برس بعد پھپھو آئی تھیں، وہ بھی تابوت کے
ساتھ۔ لاؤنج کے دروازے پہ خواتین ان سے ملتے
ہوئے رو رہی تھیں۔ اونچا بین، بلند سسکیاں، وہ دور
دراز کی رشتہ دار عورتیں جو ہر شادی میں سب کی
طرف سے گاتی اور ہر فوتگی میں سب کی طرف سے
روتی تھیں، سب سے آگے تھیں۔

پھپھو بہت نڈھال لگ رہی تھیں۔ بھگی آنکھوں
کے ساتھ وہ فاطمہ سے مل رہی تھیں۔ وہ سب ہی
کھڑے ہو چکے تھے۔ لڑکے تابوت اندر لا رہے تھے
حیا ذرا ایک طرف ہو گئی۔ اور دوپٹے کا پلو ذرا ترچھا کر
کے چہرے پہ ڈال کے، ہاتھ سے پکڑ لیا۔ وہ پٹا پیشانی

کافی آگے تھا اور یوں ترچھا کر کے ڈالنے سے گال،
ہونٹ، ناک، سب چھپ گیا تھا۔ یہ اس کا غیر محسوس
سانقہ تھا۔ اب اگر وہ نقاب کرتی ہی تھی تو منافقت
کیسی کہ باہر کے مردوں سے کرے اور کزنز سے نہ
کرے؟ ایک فیصلہ کیا ہے تو اسے صبح سے نبھائے
بھی۔

مرد باہر چلے گئے تو وہ آگے بڑھ کر پھپھو کے گلے
لگی۔

”حیا۔۔۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟ جہان بہت اپ
سٹ تھا۔“ بے آواز آنسو بہاتی پھپھو اس سے الگ
ہو کر آہستہ سے بولی تھیں۔ وہ سخت شرمندہ ہوئی۔ کیا
تھا اگر پھپھو کو ایک فون ہی کر لیتی؟ اس نے جواب
نہیں دیا۔ جواب تھا بھی نہیں۔

پھر جب وہ اپنی جگہ پہ آکر بیٹھی تو نگاہ کھڑکی پہ پھسل
گئی۔ باہر لگے مجمع میں وہ جہان کو کھوجنے لگی اور پھر
ایک دم وہ چونکی۔

اس نے بہت سی باتیں سوچی تھیں۔ جہان اتنا غیر
متوقع تھا کہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس کے
ساتھ کیسا رویہ رکھے گا، مگر جو جہان نے کیا وہ سوچ بھی
نہیں سکتی تھی۔

جہان سکندر پاکستان آیا ہی نہیں تھا۔
”جہان نہیں آیا چچی!“ فرخ پتا نہیں کب اندر آیا
تھا اور قریب ہی کھڑا فاطمہ کو بتا رہا تھا۔ ”پھپھو بتا رہی
تھیں کہ وہ کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔“

فرخ بتا کر آگے بڑھ گیا۔ فاطمہ تو فاطمہ، وہ خود بھی
شدد رہ گئی۔ ایسی بھی کیا مجبوری کہ بندہ باپ کے
جنازے پہ بھی نہ آئے۔ وہ اتنی حیران تھی کہ گٹھلیاں
بھی نہیں پڑھ پا رہی تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا۔
صرف حیا کا ساتھ دینے وہ ڈی جے کے وقت آسکتا تھا تو
پاپا کے ساتھ کیوں نہیں؟

”جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا ہو کر
نہیں دیکھتا اسے پوری بات سمجھ نہیں آتی۔“
کہیں دور سے جہان کی آواز ابھری تھی۔ شاید وہ
وضاحت اس نے اسی لمحے کے لیے دی تھی۔

سب بہت متاسف اور غمزہ سے تھے۔ گھر میں
خاموشی نے سوگواریت طاری کی ہوئی تھی۔

اگلے روز قتل تھا۔ گھر میں کچھ کرنے کے بجائے تایا
اور ابا نے وہی کیا تھا، جس کا رواج آج کل اسلام آباد
میں چل نکلا تھا۔ تمام عزیز واقارب کو کسی فائو اسٹار
ہوٹل میں ڈنر کے لیے فیملی ڈاؤنجرز دے دیے گئے کہ
جمع خاندان جا کر ڈنر کریں اور مرحوم کے ایصال ثواب
کے لیے دعا کریں۔ اسلام آباد بھی، کبھی اسے لگتا
کہ استنبول بنتا جا رہا ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ لوگوں کے
سوال اور گڑے سروے اکھاڑے جانے سے تایا اور ابا
محفوظ رہے۔ مگر حیا نے سوچا ضرور کہ تایا فرقان کے
اسلام کو اب کیا ہوا؟

فاطمہ فون سننے اٹھیں تو وہ کافی کا کپ لیے پھپھو
کے پاس آگئی۔ وہ اکیلی بیٹھی تھیں۔ خاموش، تنہی
ہوئی۔ ایک سفر تھا جو تمام ہوا۔ ایک مشقت تھی جو ختم
ہوئی۔

”تھینک یو بیٹا!“ اس نے کپ برہمایا تو وہ چونکیں،
پھر بھگی آنکھوں سے مسکرائیں اور کپ تھام لیا۔
”تمہارے ساتھ بیٹھ ہی نہیں سکتی۔“

”شرمندہ مت کریں پھپھو! میری ہی غلطی ہے،
میں نے سوچا، جہان کو میرا میسج مل گیا ہو گا اور وہ
آپ کو بتا دے گا۔“ ایک مبہم سی وضاحت دے کر وہ
اپنا کپ لیے ان کے ساتھ آ بیٹھی۔

”نہیں! وہ کہہ رہا تھا، تم بغیر بتائے چلی گئی ہو۔ بہت
پریشان تھا۔ شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“
”وہ۔۔۔ آیا کیوں نہیں؟“ سرسری سے انداز میں
اس نے پوچھ ہی لیا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہیں، جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی
ہوں کہ وہ کتنا جانتی ہے۔

”وہ ترکی سے باہر گیا ہوا تھا۔ فلائٹ کا مسئلہ تھا کچھ
ابھی ایک دو روز میں آجائے گا۔“
”پھر آپ کو تو بہت مشکل ہوئی ہوگی، اکیلے سب

کچھ مینج کرنا۔

”حیا! میں نے ساری زندگی سب کچھ تنہا ہی مینج کیا ہے۔ میرے ساتھ تب بھی کوئی نہیں تھا جب میں اور میرا بیٹا جلا وطنی کاٹ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ نرمی سے کہہ رہی تھیں۔ ”اور اب تو میں اتنی مضبوط ہو چکی ہوں کہ اپنے مسئلے حل کرنے کے لیے مجھے اپنے خاندان کے مردوں کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔“

وہ بس ان کو دیکھے گئی۔ ان کے چہرے کی لکیوں میں برسوں کی مشقت کی داستان تھی جسے پڑھنے کی آنکھ حیا کے پاس نہیں تھی۔

”تمہیں بھی اتنا ہی مضبوط بننا چاہیے۔“
ان کی آخری بات پہ بے اختیار وہ چوٹیں کھتی تھیں۔
یہ ماں بیٹا بعض اوقات کتنی مبہم باتیں کر جاتے تھے۔

وہ گہری نیند میں تھی جب کوئی آواز سیٹی کی طرح اس کی سماعت میں گونجی۔ کافی دیر بعد اس نے بھاری پوٹے بمشکل اٹھائے اور اندھیرے میں جلتے بجھتے روشنی کے منبع کی طرف دیکھا۔

موبائل۔
بدقت اس نے بازو بڑھا کر بجتا ہوا موبائل اٹھایا۔
جہان کانگ۔

اس کی ساری نیند اڑ گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھی اور کال پک کی۔ ساری ناراضی رات کی خاموشی میں تحلیل ہو گئی تھی۔
”جہان؟“ اس کی آواز ابھی بھی نیند سے بو جھل تھی۔

”حیا! وہ رکاوٹ کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں اور تم؟“ بیڈ کراؤن کے ساتھ نیک لگاتے ہوئے اس نے ریموٹ اٹھا کر اسے آف کیا۔ کمر بہت ٹھنڈا ہو چکا تھا۔
”فائن تم سو رہی تھیں؟“

”ہاں!“

اس وقت میں فٹ بال تو کھیلنے سے رہی اس نے سوچا۔

”مچی سو رہی ہیں؟“

”ظاہر ہے! اٹھاؤں انہیں؟“

”نہیں! انہیں! ان کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔“

ماموں ہیں یا ڈرائیور؟“ وہ جیسے سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

”نہیں! ایسا اور اماں شام میں لاہور گئے ہیں۔ کوئی فوننگی ہو گئی تھی۔ صبح ہی آجائیں گے کیوں؟“ وہ ایک دم چوٹیں ”تم کہاں ہو؟“

”میں ایرپورٹ پہ ہوں اور مجھے تمہارے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ تم مجھے لینے آ سکتی ہو؟“

”اوہ ہاں! تم رکو۔ میں آ رہی ہوں۔“ وہ لحاف پھینک کر تیزی سے بستر سے اترتی۔

منہ دھو کر عبا یا پہن کر وہ چابی لیے خاموشی سے باہر نکل آئی۔ ڈرائیور ابا کے ساتھ گیا تھا۔ ویسے بھی وہ پارٹ ٹائم تھا۔ ایسے میں وہ خود جائے اس کے علاوہ کوئی دوسرا حل نہیں تھا۔

اسلام آباد کی خوب صورت صاف ستھری سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ ابھی رات باقی تھی۔ اسٹریٹ پولز کی زرد روشنی سڑک کو جگمگا رہی تھی۔ ایرپورٹ پہ پہنچ کر اس نے جہان کو کال کر کے آنے کا پیغام دیا۔ اس کا ترکی کا نمبر روٹنگ تھا۔

”السلام علیکم!“ چند ہی منٹ بعد وہ دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا۔ ایک چڑے کا بھورا دستی بیگ اپنے قدموں میں رکھا اور سیٹ بیلٹ لینے لگا۔

”وعلیکم السلام!“ گنیشن میں چابی گھماتے ہوئے حیا نے ذرا کی ذرا نگاہ پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ پینٹ پہ آدھے آستین والی گرے لی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہی ماتھے پر گرتے ذرا بکھرے بکھرے سے بال۔ ایرپورٹ کی بتیاں اندھیرے میں اس کے چہرے کو نیم روشن کئے ہوئے تھیں۔ وہ اسے پہلے سے ذرا کمزور لگا۔ اسے ترکی سے آئے ڈیڑھ ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی

ذرا واضح تھا۔

کار سڑک پہ رواں دواں تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ آخری ملاقات کا بو جھل پن اور تناؤ ابھی درمیان میں مائل تھا۔

”مچی! انہیں تو نہیں؟“

”نہیں!“ وہ ذرا دیر کو رکی۔ ”تم آئے کیوں نہیں؟“

”سب بوجھ رہے تھے۔“

”منصوف تھا۔“ وہ گردن ذرا ترچھی کے باہر دران اندھیری سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کہنے کو جیسے کچھ نہیں تھا۔

”کیا تم مجھے پہلے قبرستان لے جاسکتی ہو؟“

حیا نے سر ہلا دیا۔ قبرستان گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ جلد ہی وہ پہنچ گئے۔ باہر نیلا سا اندھیرا چھایا تھا۔ سوالیہ نشان کی صورت بنے سات۔ سن بھائی ستارے آسمان چمک رہے تھے۔

”پھوپھا کی قبر آپ کے دادا کی قبر کے ساتھ ہی ہے۔ حیا نے اسے بتایا۔“

احاطے میں جہان کے والد اور دادا کی قبریں داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک طرف تھیں۔ ایک درخت اس کے دادا کی قبر پہ سایہ کر رہا تھا۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے قبرستان کے داخلی دروازے پر ہی کھڑی ہو گئی۔ یہاں سے وہ جہان کو بہ آسانی دیکھ سکتی تھی۔ جہان آہستہ آہستہ قدم اٹھا تا دونوں قبروں کے پاس آیا پھر دھیرے سے وہ سکندر شاہ کی قبر کے سامنے بچوں کے بل بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اب وہ دعا مانگ رہا تھا۔ حیا اس کے عقب میں تھی سو اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

دعا کے بعد وہ کافی دیر سر جھکائے ایک بچے کے بل قبر کے سامنے بیٹھا رہا۔ انگلی سے وہ مٹی پہ لکیریں کھینچ رہا تھا پھر جب وہ اٹھا تو حیا جانے کے لیے بیلٹ گئی۔ گھر آ کر وہ اندر داخل ہوا تو حیا نے آستین سے لاؤنج کا دروازہ بند کیا اور دو انگلیوں سے نقاب نیچے کھینچتے ہوئے اتارا۔

”تم آرام کر لو۔ میں اوپر کمرادکھاتی ہوں۔“ وہ

اجنبی سے انداز میں کہتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جہان خاموشی سے اس کے پیچھے اوپر آیا۔ دستی بیک ہاتھ سے پکڑ کر کندھے پہ ڈال رکھا تھا۔

حیا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی صاف ستھرا سا گیٹ روم۔

”کچھ کھاؤ گے؟“ اس نے چوکھٹ پہ کھڑے کسی رسمی میزبان کے لہجے میں پوچھا۔ جہان نے بیک بیڈ پہ رکھا اور ساتھ بیٹھا۔

”بس! ایک کپ چائے۔ میرے سر میں درد ہے۔“ وہ جھک کر جوگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔

وہ اٹے قدموں واپس پلٹی۔ چند منٹ بعد جلدی جلدی چائے بنا کر لائی۔

وہ بیڈ پہ نیم دراز آنکھوں پہ بازو رکھے ہوئے تھا۔ ”چائے!“ اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔ وہ ہلا تک نہیں۔

”جہان!“ مگر وہ سوچکا تھا۔

حیا کی نگاہیں اس کے پاؤں پہ پھیلیں۔ جوگرز کے تسمے کھول چکا تھا مگر اتارے نہیں۔ پتا نہیں کیوں اسے ترس سا آیا۔ شاید وہ تھکا ہوا تھا۔ شاید بیمار تھا۔ اس نے اسے سی آن کیا اور دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ صبح وہ دیر سے اٹھی۔ لاؤنج میں آئی تو فاطمہ اور پھوپھو چائے پی رہی تھیں۔ گیارہ بج چکے تھے۔

”نور بانو! میرا ناشتا!“ نور بانو کو پکار کر وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ فاطمہ لاہور والوں کا تذکرہ ہی کر رہی تھیں۔

”آپ لوگ کب آئے؟“
”صبح آٹھ بجے پہنچ گئے تھے۔ تم سو رہی تھیں۔“ فاطمہ مسکرا کر کہنے لگیں۔

”ہوں! اچھا! جہان اٹھ گیا؟“ حیا کی نگاہ سیڑھیوں کے اوپر پھیلی تو یونہی لبوں سے نکلا وہ دونوں ایک دم اسے دیکھنے لگیں۔

”جہان؟“

”اوہ۔“ وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔ ”وہ صبح پہنچ گیا تھا۔ اوپر کمرے میں ہے۔ آپ کو نہیں پتا چلا؟“
”نہیں۔۔۔ وہ آگیا؟“ سنین سکندر کے چہرے پہ

ایک دم چمک سی ابھری۔ خوش گواہی حیرت۔ وہ باب کے جنازے کے تیسرے دن پہنچ رہا ہے، مگر ادھر کوئی ناراض نہیں۔

”جی! میں دیکھتی ہوں۔“ وہ خود ہی اٹھ آئی۔ اوپر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بخستہ ہو چکا تھا۔ اے سی تب کا آن تھا۔ اس نے جلدی سے اسے سی بند کیا اور پنکھا چلا دیا۔

جہاں اسی حالت میں جوتوں سمیت لیٹا تھا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے۔ وہ شاید نیند میں بھی کسی کو اپنی آنکھیں پڑھنے نہیں دیتا تھا۔ تپائی پہ دھری چائے ٹھنڈی اور پرانی ہو چکی تھی۔ سوچا اٹھالے، پھر خیال آیا کہ رہنے دے۔ اس کو پتا تو چلے کہ وہ اس کے لیے چائے لے آئی تھی۔

وہ دوپہر کے کھانے تک بھی نہیں اٹھا۔ پھپھو اس کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھیں، سو اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ سہ پہر میں زارا آگئی۔ موسم اچھا تھا۔ دونوں نے شاپنگ پلان کر لی، مگر جب وہ عبا یا پین کر باہر آئی تو پھر سے ایکشن ری لے شروع ہو گیا۔

”تم نے عبا یا کب سے لینا شروع کر دیا؟“ وہی حیرت، سوال، تفتیش، تشویش۔ ایک لہا اور جامع سا جواب دے کر بھی اسے لگا کہ زارا غیر مطمئن ہے اور غیر آرام وہ بھی۔ شاپنگ کرتے جوتے دیکھتے، کپڑے نکلواتے اور پھر آخر میں راحت بیکرز کے سامنے پارکنگ لاث میں بیٹھے ”اسکوپ“ کا سلسلش میتے ہوئے زارا بار بار ایک غیر آرام وہ نگاہ اس پہ ڈالتی جو پورے اعتماد سے عبا یا اور نقاب میں بیٹھی سلسلش لی رہی تھی۔

”یار! چہرے سے تو اُتار دو۔“ زارا! میرا نہ دم گھٹ رہا ہے، نہ ہی مرنے لگی ہوں۔ میں بالکل کمفو ٹیبل بیٹھی ہوں۔ اگر تم نہیں ہو تو تباؤ۔“ وہ ایک دم بہت سنجیدگی سے کہنے لگی۔

وہ حیا سلیمان تھی۔ وہ عائشہ کی طرح ہر بات نرمی سے مسہر جانے والی نہیں تھی۔ جب وہ اپنے زمانہ جاہلیت کے لباس پہ کسی کو بولنے کا موقع نہیں

دیتی تھی تو اب نقاب پہ کیوں کسی کو بولنے دے؟ صرف حجابی لڑکی صبر کیوں کرے؟ اس کی رائے میں بہت زیادہ خپ رہنے کو بھی کمزوری سمجھا جاتا تھا۔

”نہیں، تمہیں! میں تو تمہارے لیے کہہ رہی تھی۔“ زارا ذرا ابو کھلا گئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر سلسلش پینے لگی۔ باہر پارکنگ لاث میں چند ماہ پہلے کے مناظر اب بھی رقم تھے۔ ڈول اسے سب سے پہلے اسی جگہ پہ ملا تھا۔ میجر احمد یعنی پنگی سے مل کر جو اسے الجھن ہوتی تھی کہ وہ پنگی کیسے بنا، اب وہ ختم ہو گئی تھی۔ وہ تو اس کی جاب کا حصہ تھا۔ پتا نہیں وہ یہ بات پہلے کیوں نہیں سمجھ سکی؟

وہ واپس آئی تو دل ذرا ابو جھل تھا۔ زارا اور اس کا مدار اب مختلف ہو گیا تھا۔ پتا نہیں ڈی جے اگر ہوتی تو کیسا رد عمل دیتی؟ اب اجنبی کا ٹیک جو پیشانی پہ لگ گیا تھا۔

لاؤنج میں سب بڑے بیٹھے تھے۔ تایا، تائی، ابا، اماں، پھپھو اور سامنے ایک صوفے پہ سنجیدہ سا بیٹھا جہاں۔ وہی صبح والے کپڑے، مگر بال جھیلے تھے۔ شاید ابھی ابھی فریش ہو کر نیچے آیا تھا۔ وہ سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پہ پہنچ کر اسے لگا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ جہاں تایا فرقان کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اندر آگئی۔ دوبارہ اس کی جہاں سے ملاقات رات کے کھانے پہ ہوئی۔

وہ ذرا دیر سے ڈاننگ ٹیبل پہ پہنچا تھا۔ ابا مرکزی کرسی پہ تھے۔ حیا، فاطمہ کے ساتھ ایک طرف تھی۔ جہاں نے جو کرسی کھینچی وہ حیا کے بالقابل تھی، مگر وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ بھی یہی کر رہا تھا۔ بلکہ وہ تو شاید ہمیشہ سے یہی کرتا آیا تھا۔

”کتنی چھٹی ہے تمہاری؟“ ابا کھانے دوران پوچھنے لگے۔ وہ سر جھٹکائے، کانٹے سے سلاوا کا ٹکڑا اٹھانے ہوئے بولا۔

”کچھ کفرم نہیں ہے۔“ ”چھٹی کیسی؟ اپنا ریٹورنٹ ہے اس کا۔ بلکہ پاشا“ اس نے منجی سے سوچا۔ ”ایک ڈیڑھ ہفتہ تو ہوں، پھر شاید چلا جاؤں۔“ می کو بیس اپارٹمنٹ لے دوں گا۔“

حیا نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”پھپھو! آپ اب یہیں رہیں گی؟“ اس کے ہرے پہ خوش گواہی حیرت اُٹھ آئی تھی۔ سین پھپھو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔ ”صرف سکندر کے لیے وہاں تھی۔ اب ادھر رہنے کی جواز نہیں ہے۔“

”تو جہاں! آپ بھی یہیں شفٹ ہو جاؤ۔“ فاطمہ نے ذرا دبے دبے سے جوش سے کہتے ہوئے ایک نظر سلیمان صاحب کو دیکھا۔ وہ بھی ذرا امید سے جہاں کو دیکھنے لگے۔ وہی بیٹی کو اپنے قریب رکھنے کی خواہش۔

”اور اپارٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے؟ یہی گھر ہے بین کا۔“ جہاں ہلکا سا مسکرایا۔ وہ پورے دن میں پہلی دفعہ مسکرایا تھا۔

”رہنے دیں ماما! میرے نصیب میں پاکستان میں رہنا لکھا ہی نہیں ہے۔“ اس کی آواز میں کچھ تھا کہ حیا ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سر جھٹکائے کھانا کھا رہا تھا، مگر چہرے پہ وہی مسکراہٹ، وہی چمک تھی، جو وہ کبھی کبھی اس کے چہرے پہ دیکھا کرتی تھی۔ خاص موقعوں پہ، خاص باتوں پہ۔

خیر، کبھی نہ کبھی وہ اس کی وجہ بھی جان ہی لے گی۔ وہ دھیرے سے سر جھٹک کر کھانا کھانے لگی۔

صبح فجر پڑھ کر سونے کی بجائے وہ اوپر آگئی۔ جہاں کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک نظر سامنے بند دروازے پہ ضرور ڈالی تھی۔ کچھ چیزیں

کرنے سے انسان خود کو کبھی روک نہیں پاتا۔ چھت پہ ہر طرف اہلا تے گملوں کی سرحد بنی تھی۔ ابا کا شوق، منڈیر وہاں سے کافی اونچی تھی۔ منڈیر کے ساتھ ہی کین کا ایک جھولا رکھا تھا۔ اس خوب صورت صبح میں وہ جھولے پہ آ بیٹھی اور گردن موڑ کر منڈیر کے سوراخ سے باہر دیکھا۔ منڈیر اس کے سر سے اونچی تھی، مگر ڈیزائن کے طور بنے بڑے بڑے سوراخوں سے نیچے کالونی اور سڑک صاف نظر آتی تھی۔ وہ یوننی تر چھی ہو کر بیٹھی کالونی پہ اترتی صبح دیکھے گئی۔ ہر سو خاموشی اور تازگی تھی۔ کبھی کبھی پرندوں کے بولنے کی آواز آ جاتی یا پھر کسی کے بھاگنے کی۔

وہ ذرا چونکی۔ دور سڑک پر کوئی بھاگتا آ رہا تھا۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس، جاگنگ کرنا شخص۔ اسے ایک لمحہ لگا تھا پہچانے میں۔ ”جہاں!“

وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ کب اٹھا، کب گھر سے نکلا، معلوم نہیں۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ جہاں اب گھر کے سامنے سے گزر کر مخالف سمت دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ گردن پوری موڑ کر اس کو دیکھے گئی۔

چند قدم دور وہ رکا، اور ٹھٹک کر پیچھے سڑک کو دیکھا۔ جیسے اسے محسوس ہوا ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ سڑک پر ہی دیکھ رہا تھا، اوپر نہیں۔ وہ جلدی سے جھولے پر سے اٹھی اور اندر دوڑ گئی۔

وہ پھر سے پکڑے نہیں جانا چاہتی تھی۔ سبز ٹیولپ، پھولوں کی مارکیٹ اور وہ دکاندار۔ اسے سب یاد تھا۔



جب جہاں نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کتابیں کھولے بیٹھی تھی۔ دستک پہ چونکی اور پھر اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اسے سامنے کھڑے دیکھ کر دل عجیب سی متضاد کیفیات کا شکار ہونے لگا۔

”حیا! کیا تم فارغ ہو؟“ وہ بہت دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”ہاں! کیوں؟“ اس نے دروازہ ذرا زیادہ کھول دیا

ناکہ وہ بستر پر پھیلی اس کی کتابیں دیکھ کر جان لے کہ وہ ہرگز بھی فارغ نہیں ہے۔
 ”اوکے! تم فارغ ہی ہو ٹھیک۔“ اس نے سمجھ کر سر ہلایا۔ ”یعنی تم میرے ساتھ مارکیٹ چل سکتی ہو؟“
 ”شیور!“ اس نے شانے اچکا دیے۔
 حالانکہ اسے اس پر بہت غصہ تھا۔ وہ اس سے مخاطب بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے ہمیشہ غلط بیانی ہی کی تھی۔ اسے جہان سے بہت کلمے تھے مگر پھر بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اسے انکار نہیں کر سکتی تھی۔
 ”کیا خریدنا ہے؟“ ناکہ اسی حساب سے مطلوبہ جگہ پہ جائیں۔
 ”کپڑے وغیرہ۔ جلدی میں نکلا تھا۔ زیادہ سامان نہیں اٹھا سکا۔“
 ایک تو جب وہ مہذب اور شائستہ ہوتا تھا تو اس سے زیادہ نرم خو کوئی نہیں تھا۔ وہ اندر ہی اندر تلملاتی ہوئی باہر آئی تھی۔ کوئی اور نہیں ملا تھا اسے ساتھ لے جانے کے لیے۔ اسے ضرور گھسیٹنا تھا اپنے ہمراہ۔
 شاپ یہ اس کا ساتھ دینے کے لیے وہ بھی ریک پر کپڑوں کے ہینگز الٹ پلٹ کے دیکھتی رہی۔ جہان ایک کرتے کا ہینگز کندھے سے لگاتے ہوئے سامنے قد آور آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس کے قریب ہی کھڑی تھی سو آئینے میں وہ بھی نظر آرہی تھی۔ اس کا عکس دیکھتے ہوئے جہان ذرا سا مسکرایا۔
 ”تم نے وہ کارٹون دیکھے ہیں ننجا ٹرلز؟“ وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے پوچھنے لگا تو اس نے سادگی سے سر اثبات میں ہلادیا۔
 ”ہاں تو؟“ وہ جواب دیے بنا بے ساختہ اٹھ آئی مسکراہٹ دباتے ہوئے ہینگز پکڑے پلٹ گیا۔
 چند لمحے وہ ابھی کھڑی رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ پھر قد آور آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو فوراً ”سمجھ میں آگیا۔ غصے کا شدید ابال اس کے اندر اٹھا تھا۔ بمشکل ضبط کرتے ہوئے اس نے نگاہوں سے جہان کو تلاشا۔ وہ وہی کرتا لیے کاؤنٹر کی طرف جا رہا

تھا۔
 وہ بد تمیز انسان اس کے نقاب کو ننجا ٹرلز کی آنکھوں کی پٹی سے تشبیہ دے گیا تھا؟ اس کا موڈ واپسی کا سارا راستہ آف رہا مگر وہاں پروا کسے تھی۔



کچن میں شام کی چائے دم پہ چڑھی تھی۔ لائیچی اور تلے کبابوں کی ملی جلی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ وہ نور بانو کے سر پہ کھڑی ٹرائی میں برتن رکھوا رہی تھی۔ ذمہ دار وہ پہلے بھی تھی مگر ترکی سے آنے کے بعد ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے لگی تھی۔ اب بھی نور بانو سے زیادہ وہ کام کر رہی تھی۔

باہر لاؤنج میں تیار فرکان اور صائمہ تائی آئے بیٹھے تھے۔

اماں! اب! پھپھو اور جہان بھی وہیں تھے۔ کام کرتے ہوئے مسلسل اسے احساس ہوتا رہا کہ جہان اسے دیکھ رہا ہے مگر جب وہ رک کر گردن موڑ کر دیکھتی تو وہ کسی اور جانب دیکھ رہا ہوتا۔

جہان کے ساتھ ایک ہی گھر میں وہ دو دفعہ رہی تھی۔ ایک جب ڈی جے کی بار وہ اکٹھے پاکستان آئے تھے تب اسے اپنے عم سے وقت نہ ملا تھا۔ دوسرا جب اپنی ”منگنی“ کی رات وہ پھپھو کے گھر رک گئی تھی اور تب جہان کو اپنی فون کال کے انتظار سے وقت نہ ملا تھا۔ یوں اب نارمل حالات میں پہلی دفعہ وہ ایک چھت تلے تھے اور اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ بہت بے ضرر خاموش اور دھیمسا انسان تھا۔

یہ اس کا ایلی ٹیوڈ نہیں فطرت تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ سلام کر لیتا، حال احوال پوچھتا اور بس۔ ہاں! گھر میں فارغ رہ رہ کر وہ آکٹا جاتا تو نور بانو کے ساتھ کچن میں کبھی برتن دھونے لگ جاتا تو کبھی اسے سبزیاں کاٹ کر دیتا۔ نور بانو بے چاری حق دیتی جاتی۔ اگر باہر جاتا تو صبح جاگنگ۔

اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ وہ جاگنگ ’واک‘ ورزش ’ان چیزوں کا بہت خیال رکھتا تھا‘ پھر جب گھر

میں بہت بور ہو گیا تو ایک دفعہ فاطمہ کے کہنے پہ حیا اسے باہر لے گئی مگر وہ اتنا تنگ کر دینے والا تھا ”یہاں سے مڑ جاؤ وہاں لے جاؤ“ نہیں! اب پیچھے چلو۔ لیفٹ سے کیوں مڑ رہی ہو، رائٹ سے مڑو“ اب اس نے اپنی گاڑی کی چابی جہان کو دے دی تھی۔ جہاں جانا ہے خود چلے جاؤ جیسے تاثرات کے ساتھ۔ اس کے پاس انٹرنیشنل لائسنس تھا سو مسئلہ نہیں تھا۔

اب وہ کبھی کبھی باہر نکل جاتا۔ گھر کے قریب اس نے جم بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ جہان کے ساتھ رہنے میں ایک مسئلہ تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے بنا چاہ پیدائے گھر میں داخل ہوتا کہ پتا ہی نہ چلتا اور وہ آپ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ اب آتے جاتے چند ایک رسمی باتوں کے علاوہ ان کی بات نہ ہوتی۔ چاندی کے مجسمے یا تو جچ چکے تھے یا بالکل پتھر چکے تھے۔

آج بھی وہ اسے دیکھ رہا تھا، مگر وہ اسے پکڑ نہیں پاتی تھی۔ وہ کچھ کہتا نہیں ہے۔ اسے الجھن ہوتی۔ وہ اسے بے اعتبار قرار دے کر چھوڑ آئی تھی۔ وہ گلہ کیوں نہیں کرتا۔ صفائی نہ دے، مگر شکایت تو کرے۔ لیکن وہاں ازلی خاموشی تھی۔

وہ ٹرائی دھکیلتی لاؤنج میں لائی۔ دوپٹا شانوں پہ پھیلا کر اس نے لمبے بالوں کو سمیٹ کر کندھے پہ آگے کو ڈالا ہوا تھا۔
 ”واقعی! دل تو نہیں کرتا۔ سکندر بھائی کو گئے ہفتہ بھی نہیں ہوا، مگر وہ لوگ سمجھتے ہی نہیں۔ جلدی عجائی ہوئی ہے۔“ صائمہ تائی کہہ رہی تھیں۔ شاید ارم کی منگنی کا معاملہ تھا۔

حیا بچوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھی، چائے کے کپ پرچ میں رکھ کر باری باری سب کو پکڑانے لگی۔

”بھابھی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ جب ہمیں اعتراض نہیں ہے تو لوگوں کا کیا ہے۔ آپ اللہ توکل کر کے فنکشن کی تیاری شروع کریں۔“ پھپھو بہت رسلان سے واضح کر رہی تھیں کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔
 ”اصل میں اسجد کے بھائی اور بھابھی باہر سے آئے

ہوئے ہیں۔ ان کی موجودگی میں وہ فنکشن کرنا چاہتے ہیں تھیں کس!“
 تائی نے مسکرا کر اس سے کپ پکڑا تو وہ واپس آئی اور آخری کپ جہان کی طرف برہمایا۔ وہ جو غور سے اب تائی کی بات سن رہا تھا، ذرا سی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور کپ پکڑ لیا۔
 ”وہ اسی اتوار کا کہہ رہے تھے۔“
 ”تو بھائی! آپ ہاں کر دیں نا۔ مجھے خوشی ہوگی۔“
 ”اتوار کا فنکشن!“ حیا نے سوچا۔ کیا پہنے گی؟ وہ چائے سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی اور الماری کھول کر کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگی۔ کوئی سیلیویس تھا۔ کسی کی آستینیں شیفون کی تھیں۔ کسی کا دوپٹا باریک تھا۔ اس کا ایک جوڑا بھی ”آئیڈیل جلابی لباس“ پہ پورا نہیں اترتا تھا۔
 دوسری الماری کو لاک لگا تھا۔ اس نے چابی نکالنے کے لیے پرس میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں مٹھلیں ڈلی سے ٹکرائیں۔ وہ مسکرا اٹھی۔ میجر احمد کا چیلنج ڈولی کی امانت۔
 اس نے ڈلی کھولی۔ سیاہ بوالیس بی فلیش اندر محفوظ رکھی تھی۔ بزل باکس کھل گیا۔ جواہر کالا کر بھی کھل گیا، مگر اس لاک کو کیسے کھولے؟ آخری لاک۔ اس کی تو پہلی بھی نہیں تھی، مگر پہلی ہونی چاہیے تھی۔ میجر احمد نے پہلی کے بغیر کبھی کوئی بزل اسے نہیں دیا تھا۔ وہ تالے کے ساتھ اس کی چابی بھی ہمیشہ دیا کرتا تھا۔
 ”اوہ۔۔۔ ڈلی تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔“ ایک دم اسے خیال آیا۔
 وہ بیڈ پہ آ بیٹھی اور فلیش باہر نکالی۔ وہ صاف تھی۔ کوئی لفظ نشان وغیرہ نہیں۔ اب اس نے ڈلی اوپر نیچے سے دیکھی۔ کچھ بھی نہیں۔ اس نے اندر رکھے مٹھلیں فوم کواٹلیوں سے پکڑ کر باہر نکالا۔ نیچے ڈلی کے پینڈے پہ سیاہ مٹھل کا ایک اور ٹکڑا رکھا تھا۔ اس نے ٹکڑا نکال کر پلٹ کر دیکھا۔
 وہاں سنہری دھاگے سے دو الفاظ لکے تھے۔

”اسٹوری سوپڈ؟“ اس نے اچنبھے سے دہرایا۔ یہ فلیش ڈراموں کی پہلی تھی۔ اس کو حل کر کے ہی وہ آخری تالا کھول سکتی تھی۔ مگر اس سطر کا مطلب کیا تھا۔ کہ کہانی کو ”swap“ کرنے سے کیا مراد ہوا بھلا؟ کیا یہ سطر انگریزی گرامر کے لحاظ سے درست بھی تھی؟ اول بدل کی گئی کہانی؟ کہانی کو swap کرنے سے مراد تو یہی ہوتا ہے نا کہ آپ اپنی کہانی کسی کو پڑھنے دیں اور وہ جواب میں اپنی کہانی آپ کو پڑھنے دے۔ اس عجیب سی سطر کا یہی مطلب نکلتا تھا۔ مگر کون سی کہانی؟ شاید پروفیسر گوگل کچھ کر سکے۔ یہی سوچ کر اس نے کمپیوٹر آن کیا اور گوگل پہ یہی الفاظ لکھ کر ڈھونڈا، مگر لا حاصل۔ دو متفرق سے الفاظ تھے جن کو احمد نے جمع کر دیا تھا۔ یہ کل بارہ حروف تھے، سو پاس ورڈ نہیں ہو سکتے تھے، مگر پاس ورڈ ان ہی میں چھپا تھا۔

رات سونے سے پہلے تک وہ ان ہی دو الفاظ کو سوچتی رہی تھی۔ مگر کسی بھی نتیجے پہ پہنچنے سے قبل ہی نیند آگئی۔



ارم کی منگنی کا فنکشن تیار فرقان کے لان میں منعقد کیا گیا تھا۔ فنکشن خواتین کا تھا۔ مردوں کا انتظام باہر تھا، مگر تیار ہوتے وقت وہ جانتی تھی کہ یہ فنکشن بھی اتنا ہی سیکرٹیمینڈ (غیر مخلوط) ہوگا جتنا داور بھائی کی مہندی کا فنکشن تھا۔ برائے نام ”زنانہ حصہ“ جہاں ویٹرز، مووی میکر، لڑکے، کزنز، سب آ جا رہے ہوں گے۔ پتا نہیں پھر بے چارے باقی مردوں کو علیحدہ کیوں بٹھایا جاتا تھا، یا پھر ایسی شادیوں کو سیکرٹیمینڈ کہنے کی منافقت کیوں تھی؟ سوسائٹی کے معیارات جن پہ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں کبھی کوئی مکمل طور پر سیکرٹیمینڈ شادی نہیں دیکھی تھی۔ تایا کی سختی تھی کہ منگنی پہ دلہا نہیں آئے گا، انگوٹھی ساس پھنسائے گی، مگر جو خاندان کے لڑکے کام کے بہانے چکر لگا رہے ہوں

گے ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ باہر وہ عبا لیتی تھی۔ اصولاً اسے ادھر بھی عبا لیتا چاہیے تھا، مگر منگنی کا فنکشن برائے نام ہی سہی تھا تو سیکرٹیمینڈ۔ لڑکے وغیرہ تھے، مگر وہ ذرا دور تھے۔ وہ مکمل طور پہ مکسڈ گید رنگ نہیں تھی۔

”عبا کا مقصد نہ منت چھپانا اور نہ چھپانا ہی تھا تو وہ یہ کام اپنے لباس سے بھی کر سکتی تھی، سو اس نے عبا نہیں لیا، مگر لباس کا انتخاب عبا کے متبادل اور مترادف کے طور پہ کیا۔

کچے سیب کے رنگ کا سبز پاؤں کو چھو تا فراک، نیچے ٹراؤزر اور کلائی تک آتی آستین۔ یہ ایک مشہور برانڈ کا جوڑا تھا اور اس کے ساتھ میٹ کا دوپٹا تھا، سو اس نے الگ سے بڑا سا دوپٹا بنوایا تھا، کچے سیب کے رنگ کا۔ یوں گلے کا کام دوپٹے میں چھپ گیا۔ چہرے کے گرد بھی دوپٹا یوں لپیٹا کہ وہ پیشانی سے کافی آگے تھا۔ کان بھی چھپ گئے۔ سہولت تھی کہ کسی آدمی کو دیکھتے ہی وہ تھوڑی سی انگلی سے دوپٹا پکڑ کر اوپر لے جا کر نقاب لے سکتی تھی۔ یوں عبا کے بغیر بھی نہ منت چھپ گئی، نقاب بھی ہو گیا اور اچھا لباس بھی پہن لیا۔ بیٹھی تھی وہ ذرا کونے کی میز پہ تھی۔

گلابی پھولوں سے آراستہ اسٹیج پہ ارم کا مدار گلابی لباس میں گردن اونچی کیے اور نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ ارم کو جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ زبردستی بٹھائی گئی ہے۔ اس کی ساس اب اسے انگوٹھی پہنا رہی تھیں۔ مووی میکر مووی بنا رہا تھا۔ پتا نہیں یہاں تایا کے اسلام کو کیا ہوا تھا۔ ویٹرز، مووی میکرز، یہ بھی تو مرد تھے، مگر وہی سوسائٹی کے دہرے معیارات۔ حجاب کپڑے کا ایک ٹکڑا تو نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک مکمل الگ طرز زندگی ہوتا ہے۔ اور یہ طرز زندگی اتنا آسان نہیں تھا۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا۔

”تم نے دوپٹا سر پہ کیوں لے رکھا ہے؟“

”گلے کا کام ہی نظر نہیں آ رہا۔“

”چہرے سے تو ہٹاؤ۔“ مووی میکر ویڈیو بنا رہا تھا، سو وہ چہرے کو ڈھکے، رخ موڑے بیٹھی تھی اور فاطمہ جو

ذرا دیر کو ادھر آئی تھیں، اپنی حیرت ظاہر کرنے میں ساتھی خواتین کے ہمراہ مل گئی تھیں۔

”نہیں ہٹا سکتی لیڈیز! میں اب نقاب کرتی ہوں۔“

وہ رساں سے جواب دے رہی تھی مگر پھر۔

”کیوں؟ اور یار! فنکشن پہ تو خیر ہوتی ہے۔“

”خیر؟ مجھ سے پوچھو کہ کتنا بڑا شر ہوتا ہے۔“ وہ اب بدل ہو رہی تھی۔ حجاب سے نہیں لوگوں سے۔

”یا اللہ! لوگ خاموش کیوں نہیں رہتے؟ اتنا کیوں سوال کرتے ہیں؟“

سحرش، شائلا اور اسجد کی بہنیں اب ڈانس کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہیں کوئی نہیں ٹوک رہا تھا، سیلیولس بنے پھرتی کسی لڑکی کو کوئی نہیں ٹوک رہا تھا، مگر حجابی لڑکی کے سب پیچھے بڑ گئے تھے۔

”کیا لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے؟“

وہ اپنے آنسو اندر ہی اتارتی رہی۔ لڑکیاں رقص کے لیے پوزیشنز سنبھالے کھڑی تھیں۔ مووی میکر کا کیمرہ ریڈی تھا۔ اس نے رخ موڑ لیا۔ دل اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ وہ کسی کو منع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی کوئی نہ سنتا۔

تباہی۔ تباہی کتنی قریب تھی اور سب بے خبر تھے۔ ہر اقلیطس کی دائمی آگ، بھڑکتے لادو، دھکتے انگارے انسان بھی خود ہی اپنے لیے کیا کیا کما لیتا ہے؟

اور یادیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ جب بندہ اندھیرے سے نور میں آتا ہے تو ہر شے سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ اسے یاد آ رہا تھا، شریعہ، اینڈلاء کے دوسرے سمسٹر میں اصول الدین ڈپارٹمنٹ کے ہی ایک پروفیسر ڈاکٹر عبد الباری نے یونہی ایک قصہ سنایا تھا۔ اسے وہ قصہ آج پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔

”میری بیٹی کی جب شادی ہونے لگی تو میں نے اسے منع کیا کہ بیٹا مووی اور فوٹو سیشن وغیرہ مت کروانا، مگر وہ مجھ سے بہت خفا ہوئی۔ وہ مجھ سے لڑتی رہی کہ اب میں نے ہمیشہ پردہ کیا۔ آپ کی ساری باتیں مانیں۔ اب میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہ مجھے

بدول نہ کریں۔ میں خاموش ہو گیا۔ اصرار نہیں کیا کہ میں زبردستی کا قائل نہیں تھا۔ شادی ہوئی۔ اس کی سرال نے فوٹو سیشن کا مکمل انتظام کروا رکھا تھا۔ میں چپ رہا۔ شادی کے چوتھے روز میں اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی بیٹھا تھا کہ میری بیٹی آئی اور میرے قدموں میں بیٹھ کر چپ چاپ رونے لگی۔ میں نے بہتر اپوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہا۔

”ابا! آپ ٹھیک کہتے تھے۔“

میری بیٹی کے آنسو میرے دل پہ اس دن سے گڑ گئے ہیں اور میں یہی سوچتا ہوں کہ پتا نہیں ہم اپنی خوشی کے موقع پہ اللہ کو ناخوش کیوں کر دیتے ہیں؟

جب ڈاکٹر عبد الباری نے وہ قصہ سنایا تھا تو اس نے چند حجابی لڑکیوں کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے تھے تب کندھے اچکا کر وہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ یہ کیوں رو رہی ہیں؟

اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ کیوں رو رہی تھیں۔ فنکشن ختم ہونے تک اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ رات اپنے کمرے میں ڈرنگ نیبل کے سامنے وہ بالیاں اتارنے کے ارادے سے بے دلی سے کھڑی تھی۔ کچے سیب کے رنگ کا دوپٹا کندھے پہ تھا اور بال کھول کر آگے کو ڈال رکھے تھے۔ ہمارے بھی اس کی نقل میں کھنگریاں پونی آگے کو ڈال لیتی تھی۔

”پتا نہیں وہ ہمیں فون کیوں نہیں اٹھاتیں اور میل کا جواب بھی نہیں دیتیں۔ خیر! دو ہفتے ہی تو رہ گئے تھے جا کر پوچھ لوں گی۔“

دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ چوکی، پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہاں جہان کھڑا تھا۔ زمر درنگ کرتا اور سفید شلوار پہنے۔ پتا نہیں کہاں سے کرتا خرید کر لایا تھا، مگر اچھا تھا۔ آستین عادتاً ”کنیوں تک موڑے وہ ہاتھوں میں دو مگ لیے کھڑا تھا۔

”کانی پیو گی؟“ وہ پھر سے وہی دوستانہ سے انداز والا جہان سکندر بن چکا تھا۔

”میں سونے سے پہلے کافی نہیں پیتی۔“ کہہ دینے

کے بعد اسے لمبے کی سرد مہری کا احساس ہوا تو رکی پھر
 زبردستی مسکرائی
 ”ہاں! لیکن اگر استنبول کے بہترین شیفٹ
 مکنیک اور کارپینٹر نے بنائی ہے تو ضرور پھولے گی۔“
 ”تم ایک لفظ کا اضافہ کرتے کرتے رہ گئیں۔
 کرمند۔“ وہ مسکرایا تو حیا کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔
 ”کیا مجھے اس لفظ کا اضافہ کرنا چاہیے؟“
 ”ہم اس بارے میں بات کر سکتے ہیں؟“
 دو ہفتے بعد اسے بالآخر اس کے متعلق بات کرنے کا
 خیال آئی گیا تھا۔
 ”ٹھیک ہے! چھت پہ چلتے ہیں۔“
 اس نے کانوں سے بالیاں نہیں اتاریں جن میں
 موتی پروئے تھے۔ جہان کے موتی۔ وہ سچ نہیں بولتا تھا
 تو اس کے موتی کیسے نکل آئے؟ وہ ان دو ہفتوں میں یہی
 سوچتی رہی تھی۔ نامحسوس طور پر بھی وہ عبدالرحمن
 پاشا سے متفق تھی کہ وہ ”سچے موتی“ ہی تھے۔ مگر
 جہان کو تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ یہ وہی موتی ہیں۔
 چھت پہ اندھیرا تھا۔ دور نیچے کالونی کی بتیاں جل
 رہی تھیں۔ وہ دونوں منڈیر کے ساتھ لگے جھولے پہ
 آ بیٹھے۔ ہلکا ہلکا جھولا ان کے بیٹھنے سے بالکل ٹھم
 گیا۔ حیا نے کافی کام لبوں سے لگایا۔
 ”ہوں! اچھی بنی ہے۔“
 ”آخر! استنبول کے بہترین شیفٹ مکنیک اور
 کارپینٹر نے بنائی ہے۔“
 ”اوہ! تم نے بھی کرمند کا اضافہ نہیں کیا۔“
 ”کیونکہ میں کرمند ہوں بھی نہیں۔ کیا تمہیں
 میرا اعتبار ہے؟“
 ”ہاں!“ اس نے سوچنے کا وقت بھی نہیں لیا۔
 سامنے دیوار پر ابا کے گملوں سے اوپر ان دونوں کے
 سائے گر رہے تھے۔ پودوں کی ٹہنیوں سے اوپر وہ
 عجیب سی ہیئت بنا رہے تھے۔
 ”ٹھیک ہے! پھر تم مجھے بتاؤ کہ تم اس شخص کو کیسے
 جانتی ہو جو اس روز میرے ساتھ تھا؟“
 ”عبدالرحمن پاشا؟ امت اللہ حبیب پاشا کا بیٹا؟“

اس نے آنے کا پورا نام لیا۔ وہ ذرا چونک کر اسے دیکھنے
 لگا۔
 ”آ۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم کیسے؟“
 ”لمبی کہانی ہے۔ سنو گے؟“ اس نے بے نیازی
 سے شانوں کو جنبش دے کر پوچھا۔ وہ سامنے دیوار پر
 ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے دوسرے سائے کو اثبات
 میں سر ہلاتے دیکھا تو وہ کہنا شروع ہوئی۔ اپنے سائے
 کے ہلنے لب دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی کان میں
 پڑی بالی کے موتی کی چمک۔ اگر دکھائی دے رہی تھی تو
 وہ پریشانی، اذیت اور اضطراب جیسے وہ پچھلے پانچ ماہ سے
 اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی۔ جس کا ایک حصہ
 اس نے ڈی جے کے ساتھ بانٹا بھی تھا اور اب اس نے
 پورا ہی بانٹ دیا۔ سبائچی کی طرف سے میل وصول
 ہونے والی رات جب پہلی دفعہ پھول آئے تھے، سے
 لے کر اس روز کے واقعے تک، اس نے سب کچھ
 سنایا۔ وہ بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ اگر بولا تو صرف
 اس وقت جب اس نے استقلال جدی میں پاشا کے
 چہرے پہ کافی لٹنے کا واقعہ بتایا۔
 ”اچھا! تم نے پاشا بے کے اوپر کافی لٹ دی؟“
 ”ہاں! تم اسے پاشا بے کیوں کہتے ہو؟“
 ”اسے سب پاشا بے کہتے ہیں، مسٹر پاشا۔ شوق ہے
 خود کو مسٹر کہلوانے کا۔“
 کافی کے مک خالی ہو کر زمین پہ پڑے تھے۔
 دیوار پر سائے ویسے ہی چپکے بیٹھے، ساری داستان
 سنتے رہے۔ پووے بھی متوجہ تھے۔ جب وہ خاموش
 ہوئی تو وہ جیسے سوچتے ہوئے بولا۔
 ”یعنی کہ اس نے تمہارے بارے میں معلومات
 حاصل کیں، مجھے بلیک میل کرنے کے لیے، مگر میں
 صرف ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ اتنا سب کچھ ہوا اور
 تم نے کبھی اپنے پیرنس کو نہیں بتایا۔ کیوں؟ تم نے
 کسی سے مدد کیوں نہیں لی؟“
 ”میں کبھی بھی ان کو یہ سب نہیں بتا سکتی جہاں!
 اب تو معاملہ ختم ہو گیا ہے، مگر جب یہ شروع ہوا تھا تو
 مجھے ترکی جانا تھا۔ اگر میں بتاتی تو وہ مجھ سے فون لے

لیتے اور گھر سے نکلنے پہ پابندی لگا دیتے۔ ترکی تو جانے کا
 سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی میں جانتی تھی کہ جو
 میرے گھر کے اندر پھول رکھ کر جا سکتا ہے، میرے
 فون میں ٹریسر لگاوا سکتا ہے، اس کے خلاف ابا بھی کچھ
 نہیں کر سکتے اور ابا کو بتانے کا مطلب تھا کہ تایا فرقان کو
 بھی بتا دیتا ہے، یعنی پورے خاندان میں تماشہ ابا، تایا
 ابا کو نہ بتائیں، یہ نہیں ہو سکتا اور اتنی بہادر تو میں تھی
 ہی کہ خود اپنے مسائل حل کر سکتی۔“
 ”سو تو ہے!“ اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ ”کیا تم
 واقعی جانتا چاہتی ہو کہ میں پاشا بے کو کیسے جانتا ہوں؟“
 ”دیکھ لو! تم نہ بھی بتاؤ، میں نے جان تب بھی لینا
 ہے۔ تمہارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔“
 ”اللہ! اللہ! یہ اعتماد۔“ وہ پہلی دفعہ ہنسا تھا۔ وہ
 ہولے سے مسکرا دی۔
 ”اصل میں میں نے کچھ عرصہ ہوٹل گرینڈ پہ کام
 کیا ہے۔ اس لیے میں ان سو کالڈ ہائیوں کو قریب سے
 جانتا ہوں۔ یہ سب بھائی نہیں ہیں۔ یہ مافیا بھائی ہیں،
 ایک ہی مافیا فیملی کا حصہ، مگر یہ بات اولار میں اگر کوئی
 میرے علاوہ جانتا ہے کہ وہ سب بھائی نہیں ہیں تو وہ
 امت اللہ حبیب پاشا ہیں۔ خیر! میرا پاشا بے سے کچھ
 مسئلہ ہو گیا اور میں استقلال اسٹریٹ پہ آ گیا۔ وہ
 ریسٹورنٹ اس کا ہی ہے اور وہ عورت جس کو میں اپنی
 لینڈ لیڈی بتاتا ہوں، اس کو وہی بھیجتا ہے۔ وہ اس کی
 ساٹھی شیئر ہولڈر ہے۔ وہ مجھے ریسٹورنٹ کی قسطوں
 کے لیے تنگ نہیں کرتا۔ یہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔
 سوری! مگر اس نے میرے ذمے ایک کام لگایا تھا جو
 میں کر نہیں سکا، جس کی وجہ سے اس روز ہماری تلخ
 کلامی ہوئی تھی۔“
 ”کون سا کام؟“ وہ چونکی۔
 ”وہ اپنی فیملی کو بیرون ملک شفٹ کروانا چاہتا تھا۔
 اس کے لیے اسے اس ملک کی جعلی دستاویزات اور نئی
 شناختیں چاہیے تھیں۔ میں اپنے ایک دوست سے
 اس کے لیے وہی بنوا رہا تھا۔ اینڈ تھینکس ٹو یو! میں
 نے اب وہ بنوا دیے ہیں اور اس کی فیملی ترکی سے جا

چکی ہے۔“
 ”کیا؟“ اسے جھٹکا لگا۔ ”عائشے اور ہمارے چلی
 گئیں؟“
 ”ہاں! مزید میں کچھ نہیں جانتا، اس لیے اس
 موضوع کو ختم کر دو۔“
 ”اور۔۔۔ اور وہ اس کا بھائی؟ وہ کہاں چلا گیا؟“
 ”میں نہیں جانتا، وہ اب کہاں ہے۔“ اس نے
 شانے اچکا دیے۔ وہ جیسے اس موضوع سے بچنا چاہتا
 تھا۔ پھر حیا نے دیکھا، اس کا سایہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
 پودوں کے اوپر سے ہوتا، پوری دیوار پہ پھیل گیا۔ اس
 نے سائے میں اس کا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر
 ناکام رہی۔ کتنا سچ تھا، کتنا جھوٹ، سائے میں سب گڈ
 مڈ ہو چکا تھا۔
 ”تم کیا کرتے پھرتے ہو جہان! مجھے یقین ہے کہ تم
 کرمند نہیں ہو، مگر تم ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ
 رکھا کرو پلیز۔“
 ”جو آپ کا حکم!“ سایہ مسکرایا تھا۔
 وہ بس ناسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی ساری
 کتھاسن کر بھی وہ اپنی دفعہ پھر بہت کچھ چھپا گیا تھا۔
 اور عائشے ہمارے وہ کہاں چلی گئی تھیں؟
 وہ دونوں آگے پیچھے زینے اترتے نیچے آرہے تھے،
 جب اس نے ابا کو لاؤنچ میں کھڑے اپنی جانب متوجہ
 پایا۔
 ”جہان!“ وہ صرف جہان کی طرف متوجہ تھے۔
 ”جی ماموں!“ وہ پرسکون انداز میں قدم اٹھاتا
 سیڑھیوں سے نیچے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
 ”مجھے کچھ پوچھنا ہے تم سے۔“ وہ بہت سنجیدہ لگ
 رہے تھے۔ وہ پہلی سیڑھی پہ رینگ رہے تھے کہ کھڑی
 ان کو دیکھنے لگی۔
 ”میں سن رہا ہوں۔“
 ”تم روجیل سے ان ٹیچ ہو، یہ میں جانتا ہوں، مگر کیا
 کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہو، جو کہ میں نہیں
 جانتا؟“ جہان نے لمبے بھر کی خاموشی کے بعد نفی میں
 سر ہلایا۔

”نہیں! میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔“
”یعنی کہ کوئی بات ہے؟“

”ماموں! میں دوسروں کے معاملے میں مداخلت کبھی نہیں کرتا اس لیے خاموش رہوں گا۔ البتہ آپ اپنے طور پر کسی سے بھی پتا کروا سکتے ہیں۔“
”پتا کروا لیا تھا۔ تم سے تصدیق چاہ رہا تھا، بہر حال مجھے اپنا جواب مل گیا ہے۔ تم آرام کرو۔“
اس کا شانہ تھپتھا کر وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی اور اطمینان پہلے سے بڑھ چکا تھا۔ جہان واپس بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا کہ اس کا کمر اوپر تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔
”کیا ہوا؟“

جواباً جہان نے ذرا سے شانے اچکائے۔
”تمہیں پتا چل جائے گا۔ اب ذہن پر زور مت دو۔ سو جاؤ۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سایہ غائب ہو گیا، روشنی عیاں تھی۔
وہ اب بھی ہوئی واپس کمرے میں آئی تھی۔ جہان کے ساتھ رہنے کا مطلب تھا انسان بہت سے رازوں کے ساتھ رہے اور پھر صبر سے ان کے کھلنے کا انتظار کرے۔
وہ تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر عائشہ کو ای میل کرنے لگی۔

جہان نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے پتا چل جائے گا، مگر حیا کو انداز نہیں تھا کہ اسے اتنی جلدی پتا چل جائے گا۔ اسی رات وہ ابھی کچی نیند میں ہی تھی کہ سین پھپھو نے پریشانی کے عالم میں جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا۔
”حیا۔۔۔ جلدی اٹھو۔“
وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔
”تمہارے ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ چلو! اسپتال چلنا ہے۔“
وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پھپھو کو دیکھ گئی۔ زندگی

ایک دفعہ پھر استقلال اسٹریٹ میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے سامنے ڈی جے گری تھی اور کسی کا جوتا اس کی عینک پہ آیا تھا۔ ایک آواز کے ساتھ عینک ٹوٹی تھی۔ وہ آواز جو کالج ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔ وہ آواز جو زندگی کی ڈور ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔

سلیمان صاحب کو شدید قسم کا دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ سی سی۔لو (کارڈیالوجسٹ) میں تھے اور ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ باقی سب کہاں تھے اسے کچھ نہیں پتا تھا۔ وہ تو بس دونوں ہاتھوں میں سر تھا۔ پیچھے بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ کارڈیالوجسٹ میں کون آ جا رہا تھا اسے ہوش نہ تھا۔ وہ پھر سے ناقص فرسٹ ایڈ اسپتال کے سرور، موت کے سانے جیسے کارڈیالوجسٹ میں پہنچ گئی تھی۔

”وہ اب بہتر ہیں۔ یقین کرو! وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ جہان اس کے ساتھ پیچھے بیٹھتے ہوئے بولا۔ رات سے وہی تھا جو ساری بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ تیار وغیرہ تو صبح آئے تھے اور اب تک پورے خاندان کو وہ وچہ بھی پتا چل چکی تھی جو ابا کی بیماری کا باعث بنی تھی۔
روحیل نے شادی کر لی تھی۔

ٹھیک ہے! بہت سے لڑکے امریکا میں شادی کر لیتے ہیں۔ سب کے والدین کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا، مگر روحیل نے دو سال سے شادی کر رکھی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اس نے ایک نیپالی بدھسٹ سے شادی کی تھی۔ ابا قدرے روشن خیال تھے، مگر اپنی اقدار اور مذہبی حدود کا پاس انہیں بہت تھا۔ روحیل کے حوالے سے انہوں نے بہت خواب دیکھے تھے۔ بہت مان تھا ان کو اس پر۔ وہ ایک دفعہ کہتا تو سہی، مگر اس نے خود ہی سارے فیصلے کر لیے۔ شاید وہ جانتا تھا کہ کہنے کا فائدہ نہیں ہے کیونکہ وہ لڑکی بدھ مت کی پیروکار تھی۔ مسلمان تو چھوڑ وہ تو اہل کتاب بھی نہ تھی کہ ایسی شادی جائز ہوتی۔ وہ مسلمان ہونے کو تیار

نہ تھی اور روحیل اس کو چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ اپنی حدود کا مذاق بنانے پر ابا کا دکھ الگ۔ جہان سے تصدیق کر لینے کے بعد انہوں نے روحیل کو فون کر کے جب باز پرس کی تو پھر تلخ کلامی سے ہوتی ہوئی بات باپ بیٹے کے ایک سنگین جھگڑے تک پہنچ گئی۔ ابا نے غصے میں اسے سخت برا بھلا کہا اور پھر ہر تعلق توڑ دیا، مگر فون کال کی ڈور ٹوٹنے سے قبل ہی وہ ڈھسے گئے تھے۔ پھپھو اور فاطمہ اس سارے معاملے کی گواہ تھیں۔ معلوم نہیں وہ کیوں سوئی رہ گئی۔

”جب میں روحیل کے پاس رات رہا تھا تب اس لڑکی نے مجھے ٹرینمنٹ دی تھی۔ انہوں نے کچھ نہیں بتایا، مگر میں جان گیا تھا کہ ان کے درمیان کیا ہے۔ اس کے کوئی سال ڈیڑھ بعد انہوں نے شادی کی تھی۔ یہ مجھے بعد میں امریکا میں مقیم ایک دوست نے بتایا۔ کتنی دیر ایسی باتیں چھپتی ہیں۔ ماموں کو بھی کسی عزیز سے خبر مل ہی گئی۔“

وہ غم آنکھوں سے سر ہاتھوں میں دیے سنتی رہی۔ اسے روحیل یا اس کی بیوی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے صرف ابا کی فکر تھی۔ ڈھائی ماہ قبل کا واقعہ پھر دہرایا جانے لگا تھا کیا؟ وہ پھر علامتی خوشبو میں ایک محبت کو کھونے لگی تھی کیا؟

جب بمشکل انہیں ابا سے ملنے کی اجازت ملی تب وہ غنودگی میں تھے اور وہ ان کے قریب بیٹھی اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ آنکھیں خشک ہو چکی تھیں، مگر ہر آنسو آنکھ سے تو نہیں گرنا تھا۔ شاید اگر ابا کے دوست نشان انکل ملنے نہ آئے ہوتے تو وہ آنکھوں سے بھی رونے لگ جاتی، مگر ان سب کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنا تھا۔ فاطمہ نڈھیاں تھیں، مگر سین پھپھو بہت ہمت سے کام لے رہی تھیں۔

”سلیمان بہت مضبوط ہے بیٹا! فکر نہ کرو، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“
نشان انکل کو چھوڑنے وہ فاطمہ کے ساتھ باہر تک آئی تو وہ تسلی دینے لگے۔
وہ ابا کے سب سے اچھے دوست تھے۔ وہ ان کو زیادہ

نہیں جانتی تھی، مگر فاطمہ واقف تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی تھی، پندرہ سولہ سالہ رجا جو قد اور ذہنی طور پر اپنی عمر سے پیچھے تھی۔ قدرے اہلکار مل چکی جو گھنگھریالے بالوں والا سر جھکائے مسلسل اخبار پر فلم سے کچھ لکھتی رہی تھی۔

”رجا بہت ذہین ہے۔“ اس کی نگاہوں کو اپنی بیٹی پر پا کر نشان انکل مسکرا کر بتانے لگے۔ ”اسے ورڈ پزل اور کراس ورڈز کھیلنے کا بہت شوق ہے۔ پورا چارٹ حل کرنے میں کئی دن لگاتی ہے، مگر کر لیتی ہے۔“

وہ پھپھو سی مسکراہٹ کے ساتھ سنتی رہی۔ وہ اپنی بیٹی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، چاہے گھر ہو یا آفس محبت تھی یا فلکریا پھر دونوں۔
ان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے گھر آئی تھی۔ گھر پر وحشت اور ویرانی چھائی تھی۔ جیسے سب کچھ تھم گیا ہو۔ وہ ابھی عیاں آتا رہی تھی کہ فون بجنے لگا۔ پرائیویٹ نمبر کالنگ۔

اس روز کے بعد میجر احمد نے آج کال کی تھی، مگر اس نے کال کاٹ دی۔ وہ بار بار فون کرنے لگا، مگر حیا نے فون بند کر دیا۔ وہ اس آدمی سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ ضرورت ہی نہیں تھی۔

ابا ابھی اسپتال میں تھے۔ آج سین پھپھو اور فاطمہ ان کے پاس تھیں، سو وہ اور جہان گھر پہ تھے۔ وہ شام کا وقت تھا، مگر روشنی باقی تھی۔ حیا چھت پر منڈیر کے ساتھ لگے جھولے پہ بیٹھی ابا کے گملوں کو دیکھ رہی تھی۔ آج ان پہ سائے نہیں گر رہے تھے، مگر وہ پھر بھی مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان کا اس گھر میں خیال رکھنے والا جو تھا، وہ اب خیال رکھنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے۔ ابا کے پوے اکیلے ہو گئے تھے۔

”کیسی ہو؟“ جہان ہولے سے اس کے ساتھ آکر بیٹھا۔
”تمہارے سامنے ہوں۔ تم نے کھانا کھا لیا؟“
”ہاں! نور بانو میرا کھانا لے آئی تھی۔ اور تم نے؟“

”موڈ نہیں ہے۔“ وہ ابھی تک گملوں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ اسے سرزنش کرنے ہی لگا مگر رک گیا۔ منڈیر کے سوراخ سے اسے جیسے کچھ نظر آیا تھا۔

”سنو! یہ آدمی کون ہے؟“

”کون؟“ حیانے ذرا چونک کر گردن پھیری۔ منڈیر کے سوراخ سے نیچے تایا کے لان کا منظر واضح تھا۔ وہ اپنے ڈرائیوے پہ کھڑے ایک صاحب کے ساتھ باتیں کر رہے تھے جو سیاہ سوٹ میں ملبوس، بریف کیس ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ انہیں نہیں پہچانتی تھی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے لا تعلق سے شانے اچکائے۔

”میرا خیال ہے وکیل ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا؟ اس کے سوٹ کا رنگ تو سہل بلک ہے لائٹ زوالا تو نہیں ہے۔“

”مگر ٹائی دیکھو! جیٹ بلک ہے۔ وکیل کی مخصوص ٹائی۔“ وہ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے ان کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اور میرا خیال ہے وہ ابھی ادھر آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ حیانے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔

”وہ اپنے ڈرائیوے پہ کھڑے ہیں، تمہیں کیسے پتا کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟“

”غور سے دیکھو! فرقان ماموں کے جوتوں کا رخ کس طرف ہے؟“

حیانے گردن ذرا اونچی کر کے دیکھا۔ تایا ابا کے جوتوں کا رخ نا محسوس سے انداز میں ان کے گھروں کے درمیانی دروازے کی طرف تھا۔

”انسان جدھر جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے پاؤں خود بخود ادھر ہی مڑ جاتے ہیں، چاہے وہ ساکن کھڑا یا بیٹھا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر دوران گفتگو تمہارے مخاطب کے جوتے تمہاری مخالف سمت ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ پور ہو رہا ہے تم سے۔“

حیانے بے اختیار جہان کے جوتوں کو دیکھا اس کے سیاہ کسے والے بوٹ میڑھیوں کے دروازے کی سمت تھے۔

”اس فائل میں کیا ہو سکتا ہے؟“ اب وہ ذرا الجھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حیانے گردن پھر سے منڈیر کی جانب موڑی۔ نیچے وکیل صاحب اپنے بریف کیس سے ایک فائل نکال کر تایا ابا کو دکھا رہے تھے۔

”سلیمان ماموں کمپنی کے ایم ڈی ہیں نا؟“

”ہاں۔۔۔ اور باقی لوگ شیئر ہولڈرز ہیں۔“

”ہوں! اس کا مطلب ہے کہ ماموں کی بیماری کے باعث کچھ کام رک گئے ہوں گے، سو باقی شیئر ہولڈرز ان سے کچھ دستخط کروانا چاہتے ہوں گے۔ ماموں کا پاور آف اٹارنی کس کے پاس ہے۔“

”میرے پاس!“ وہ بے اختیار بولی۔ جہان ذرا سا چونکا۔

”اصل میں بہت پہلے ابا نے مجھے اپنا اٹارنی ان فیکٹ بتایا تھا اور وہ صرف اس صورت میں جب وہ خدا نخواستہ کام کرنے کے اہل نہ رہیں۔“

”یعنی کہ میں اس وقت اصغر اینڈ سنز کی ایم ڈی سے مخاطب ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”ارے نہیں! میں تو بس اٹارنی ان فیکٹ ہوں۔ ابا ٹھیک ہو جائیں گے تو خود سنبھال لیں گے۔ سب کچھ۔“

”اور جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوتے؟“

”تب تک تایا فرقان سنبھال لیں گے۔“ اس نے کہنے کے ساتھ نیچے دیکھا۔ تایا فرقان اب سمجھتے ہوئے اثبات میں سرہلاتے فائل کے صفحے پلٹ رہے تھے۔

”اس کے لیے انہیں سلیمان ماموں کا پاور آف اٹارنی چاہیے ہو گا۔ اور شاید وہ ان سے اسی پہ دستخط کروانا چاہتے ہوں گے۔“

”جہان! ہو سکتا ہے، یہ ان کا کوئی دوست ہو اور تمہارے سارے اندازے غلط ہوں۔“

”اور اگر میرے اندازے درست ہوئے تب؟ تم

انہیں پاور آف اٹارنی لینے دوگی؟“

”ہاں! کیوں نہیں؟ تایا فرقان ابا کے بھائی ہیں آخر! جہان نے جیسے افسوس سے اسے دیکھا۔

”مادام! ایک بات کہوں؟ جب باپ کسی قابل نہیں رہتا تو اولاد کے لیے زندگی بدل جاتی ہے۔ یہ جو آج تمہارے ساتھ ہیں نا، ایک دفعہ کاروبار تمہارے ہاتھ سے گیا تو تمہیں کنارے سے لگا دیں گے۔“

”ہر کسی پہ شک مت کیا کرو جہان!“ وہ بے زار ہوئی۔

”یہ فرقان ماموں ہی ہیں نا، جن کی ہم بات کر رہے ہیں؟ آنکھیں کھولو اپنی، تم انہیں اپنے باپ کی کرسی نہیں دے سکتیں حیا! اور دیکھو! وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔“

وہ بے اختیار چونکی۔ وہ دونوں حضرات واقعی تیز قدموں سے درمیانی دیوار کے منقش لکڑی کے دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ ذرا سیدھی ہوئی۔ جہان کے لبوں پہ ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

”مگر جہان۔۔۔ ابا کی غیر موجودگی میں ان کے علاوہ کون سنبھال سکتا ہے کاروبار؟ مجھے تو بزنس اینڈ منسٹریشن کا کچھ نہیں پتا۔“ وہ مضطرب سی کھڑی ہو گئی۔

تایا ابا نے گھٹی بجائی۔ نور بانو کچن سے نکل کر دروازہ کھولنے بھاگی۔

”پتا ہو یا نہ پتا ہو تم انہیں اپنی کرسی نہیں لینے دوگی اپنی جگہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ ہوٹل گرینڈ کی مثال یاد رکھو۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جھولادھیرے دھیرے ہٹنے لگا۔

”اب چلو! وہ اندر آرہے ہیں۔“

وہ الجھی الجھی سی جہان کے ساتھ میڑھیاں اترتی نیچے آئی۔ تایا ابا وکیل صاحب کو باہر چھوڑ کر خود لابی میں آکر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں فائل تھی، مگر حیا کو تب بھی لگ رہا تھا کہ جہان کے اندازے غلط ہیں۔

”چند دن کی ہی تو بات ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔



رات وہ ابا سے ملنے گئی۔ جب فاطمہ قریب نہیں تھیں تو ان کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے انہیں اس نے اپنے فیصلے کا بتایا۔ ساری بات سن کر وہ نحیف سے انداز میں ہلکا سا مسکرائے۔

”باقر صاحب سے مل لیتا، وہ تمہیں کام سمجھا دیں گے۔“ بہت دھیمی آواز میں وہ بس اتنا سا کہہ پائے تھے۔ ”اور ذیشان میرا دوست ہے۔ کوئی مدد چاہیے ہو تو اسے کہہ دینا۔“

پھر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ بیماری واحد شے نہیں ہوتی جو انسان کو ڈھاکا سکتی ہے۔ دکھ زیادہ زور آور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ٹوٹ چکے تھے۔ اسے روحیل پہ پہلے سے بھی زیادہ غصہ آیا۔

فاطمہ سے سامنا ہوا تو بس سرسری سا بتایا۔ ”کل میں ابا کے آفس جاؤں گی۔“ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

”ابا نے کہا تھا۔ اچھا! آپ یہ کاروباری باتیں ان سے مت کیجیے گا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔“ وہ نگاہ بچا کر پاس سے نکل گئی۔ وہ فاطمہ کو جانتی تھی اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے فیصلے بہت خوش نہیں ہوں گی اور خوش تو شاید وہ خود بھی نہیں تھی۔ وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔ یہ تو جہان تھا جس نے اسے پھنسوایا تھا اور پھر خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔



سلیمان صاحب کا آفس نہایت پر تعیش انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ گرے اور گرے نیلے کی تھیم کے ساتھ چمکتے ٹائلز، قیمتی برودے، شاہانہ سافرینچر اور اس اونچی، سیاہ، گھومنے والی گری کی تو شان ہی الگ تھی، جس پر وہ اس وقت بیٹھی تھی۔

اپنے سلک کے سیاہ عبا میں ملبوس، دونوں کہنیاں

ہیں۔ اب پہلی دفعہ اسے فکر ستانے لگی۔ تایا کے سامنے جو بڑے بڑے دعوے کیے تھے، ان کو ثابت کرنے کے لیے وہ کیا کرے گی؟ ایک دم سے بہت سا بوجھ اس کے کندھوں پہ آگرا تھا۔

”حیا! جب تم نے اس رات مجھے وہ ساری باتیں بتائی تھیں، تو میں نے تمہارے بارے میں دو آراء قائم کی تھیں۔ پہلی یہ کہ جو لڑکی کسی کی مدد لیے بغیر اتنا کچھ خود ہی تنہا سستی ہے، وہ بہت مضبوط لڑکی ہوتی ہے۔ شاید چند ماہ قبل تم اتنی مضبوط نہ ہو، مگر اب ہو گئی ہو۔“

وہ نرمی سے کہتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

”اور دوسری یہ کہ تم نے اس آفیسر کا پزل حل کر لیا جس سے مجھے لگا کہ تم ایک سمجھ دار اور ذہین لڑکی ہو، جو معمولی سی باتوں سے بھی اپنے مسائل کے حل ڈھونڈ لیتی ہو۔ یقین کرو! بزنس سنبھالنے کے لیے کسی ڈگری سے زیادہ کامن سینس، مضبوط اعصاب اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب تمہارے پاس ہے، پھر فکر کیسی؟“

اس نے دروازے سے نگاہیں ہٹا کر جہان کو دیکھا۔ ”کیا تم میری مدد کرو گے؟“ بہت پر امید انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ جو کرنا ہے، کیلے کرو اور خود کرو کیونکہ تم کر سکتی ہو۔“ ایک لا تعلق سا تبصرہ کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے تمللا کر اسے جاتے دیکھا۔ آخر! اس نے مدد مانگی ہی کیوں اس آدمی سے؟ سوچا بھی کیسے کہ وہ اس کی مدد کرے گا؟ وہ تو جہان تھا، وہ تو ہمیشہ سے اسے تنہا چھوڑ کر چلے جانے کا عادی تھا۔

اب وہ کیا کرے گی؟ سر ہاتھوں میں تھامے وہ صوفے پہ گر سی گئی۔ اس کی انا کا سوال تھا۔ تایا کے سامنے اتنے دعوے کر کے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ پیچھے ہٹنے کا راستہ اب بند تھا۔ اسے کل سے واقعی آفس جانا پڑے گا، وہ جانتی تھی۔

سارا کام کیسے چلے گا؟ کیا میں ذرا ذرا سی بات کے لیے تمہارے پاس ادھر آتا رہوں گا؟“

”اوہ! نہیں تایا ابا! میں آپ سب کو اپنی وجہ سے رحمت نہیں دوں گی۔ کسی کو ادھر نہیں آنا پڑے گا۔ میں کل سے خود ہی آفس آ جاؤں گی۔“

”انٹر سٹنگ!“ آخری زینے پہ مطمئن سے بیٹھے تماشائی نے دلچسپی سے انہیں دیکھا جو آمنے سامنے کھڑے تھے۔

”تم۔۔۔ تم آفس آؤ گی؟ تمہیں کیا پتا بزنس ایڈمنسٹریشن کا؟“ دبے دبے غصے سے انہوں نے ہاتھ سے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

”کیا فرق پڑتا ہے تایا ابا! دادور بھائی جب پولیٹیکل سائنس میں شمول ایم اے کر کے آج بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہو سکتے ہیں تو پھر چند دن کے لیے ابا کی کرسی میں بھی سنبھال سکتی ہوں۔“

وہ لب بلیج کر بمشکل ضبط کر کے رہ گئے۔ ”ہمارے خاندان کی بچی اب آفس آئے گی، لوگ کیا کہیں گے آخر؟“ وہ ذرا سے دھیمے پڑے۔

”جب وہ اپنے تایا، چچا اور تایا زاد بھائی کے ہمراہ آفس آئے گی تو لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔“ وہ پہلی دفعہ ذرا سی مسکرائی۔

”عجیب رواج چل نکلے ہیں۔“ تایا ابا تھے۔ بل لیے پلٹ گئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ اپنے پیچھے دروازہ انہوں نے زوردار آواز سے بند کیا تھا۔

”کیا بات ہے!“ وہ مسکرا کر ستائشی انداز سے کہتا سیڑھی سے اٹھا۔

”تایا ابا نے مجھ سے کبھی ایسے بات نہیں کی۔“ وہ ابھی تک ملال سے دروازے کو دیکھ رہی تھی، جہاں سے وہ گئے تھے۔

”آہستہ آہستہ وہ اس سے بھی زیادہ تحقیر سے بات کرنے لگیں گے۔ بس! دیکھتی جاؤ۔“

”مگر وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں کیسے ابا کی سیٹھ پہ بیٹھ سکتی ہوں؟ مجھے واقعی ان کے کاروبار کا کچھ نہیں

”حیا۔۔۔!“ تایا نے غلٹ بھرے انداز میں اسے پکارا۔ ”تمہارے ابا اس کنڈیشن میں سائن کر سکتے ہیں؟“

وہ آخری سیڑھی پہ ٹھہری گئی۔ حالات اتنے حساس ہو چکے تھے کہ معمولی سی بات بھی بہت زور سے لگتی تھی۔ اب بھی لگی۔ انہوں نے ابا کا حال پوچھنے کے بجائے صرف دستخط کا پوچھا۔

”آپ کو کیا سائن کروانا ہے؟“ سیاٹ سے انداز میں پوچھتی، وہ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ جہان بہت سکون سے آخری سیڑھی پہ بیٹھ گیا تھا اور اب گویا تماشا دیکھ رہا تھا۔

”تمہارے کام کی چیز نہیں ہے۔۔۔ اور وہ سائن کر سکتے ہیں یا نہیں؟“ تایا ابا کو اس کا سوال کرنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ جہان ہلکا سا مسکرایا، مگر حیا تایا ابا کی طرف متوجہ تھی۔

”وہ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر نے ان سے زیادہ بات چیت سے منع کیا ہے۔“ وہ دانستہ لمحے بھر کور کی۔

”آپ مجھے بتا دیں تایا ابا! شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔ آخر میں ابا کی اٹارنی ان فیکٹ ہوں۔“

تایا فرقان کو جیسے جھٹکا لگا۔ وہ حیرت بھری الجھن سے اسے دیکھنے لگے۔

”تم؟ سلیمان نے تمہیں کب اٹارنی ان فیکٹ بنایا؟“

”بہت پہلے ابا نے اپنا ڈیور ایبل (durable) پاور آف اٹارنی مجھے دیا تھا اور اس کے مطابق میں ابا کی جگہ کام کر سکتی ہوں۔“ پر اعتماد وہ ہمیشہ سے تھی اور اب بھی تایا فرقان کی بارعب شخصیت کے سامنے کھڑی بہت اطمینان سے انہیں بتا رہی تھی۔ خلاف توقع وہ ایک دم غصے میں آگئے۔

”داغ خراب ہے سلیمان کا۔ وہ اس طرح کیسے کر سکتا ہے؟“

”اب تو وہ کر چکے ہیں۔ آخر! میں ان کی بیٹی ہوں۔ انہیں مجھ پہ بھروسہ ہے۔“

”کیا مذاق ہے یہ؟“ وہ جیسے جھنجھلائے تھے۔ ”اب

کرسی کے ہتھ پہ جمائے انگلیوں سے دوسرے ہاتھ میں موجود پلاٹینم گھماتے ہوئے ٹیک لگا کر بیٹھی وہ سنجیدگی سے سرہلائی باقر صاحب کی بریفنگ سن رہی تھی۔ نفاس سے کیے گئے نقاب میں سے جھلکتی آنکھیں متوجہ انداز میں سکڑی ہوئی تھیں۔ وہ ادھیڑ عمر اور شریف النفس سے انسان لگتے تھے اور اب پوری جانفشانی سے اسے ابا کی کنسٹرکشن کمپنی کے بارے میں آگاہی دے رہے تھے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز، شیئر ہولڈرز، کمپنی کے زیر تعمیر پروجیکٹس، ٹینڈرز وہ سن سب رہی تھی، مگر بعض اصطلاحات بہت مشکل تھیں۔ اسے سب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے کاروباری معاملات میں اپنی کم علمی کا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ خود کو سمجھا رہی تھی کہ یہ افسوس بھی کم علمی کا ہے نہ کہ تباہ کو یوں چیلنج کرنے کا، مگر شاید آخر الذکر اسے زیادہ افسوس تھا۔

”کمپنی میں چالیس فیصد شیئرز آپ کے والد کے ہیں میم! بیس فیصد فرقان صاحب کے، بیس فیصد زاہد صاحب کے اور دس فیصد سیٹھی صاحب کے ہیں۔“

”اور آخری دس فیصد؟“ پہلی دفعہ اس نے زبان کھولی اور ساتھ ہی آفس کا دروازہ کھلا۔ حیا نے چونک کر دیکھا اور پھر ناگواری کی ایک لہر نے اسے سر سے پاؤں تک گھیر لیا۔ اگر اسے تھوڑا سا بھی خیال آتا کہ آخری دس فیصد شیئرز ہولڈر ولید لغاری ہو سکتا ہے تو وہ کبھی آفس نہ آتی۔

”اوہ! آپ۔۔۔ آفس آئی ہیں؟“ وہ ”آپ“ یہ زور دیتا، طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بہت اعتماد سے چلا اندر آیا۔ باقر صاحب کے چہرے پہ ناگواری ابھری، مگر وہ خاموش رہے۔

”تو سلیمان انکل کی سیٹ آپ سنبھال لیں گی؟“ اس کے سامنے کرسی چھینچ کر وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ ”کیا بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری آپ نے ترکی سے لی ہے؟ مگر ابا کو تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ ایل ایل بی کر رہی ہیں؟“

تسخرانہ انداز میں کتاہ واضح طور پہ اس رات کا

حوالہ دے رہا تھا۔ یہ طے تھا کہ پہلی دفعہ نقاب میں دیکھ کر اگر وہ فوراً اسے پہچان گیا تھا تو وجہ یہی تھی کہ اس نے باہر اشاف سے اس کی آمد کے بارے میں سنا تھا، تب ہی وہ اتنے ہی اعتماد سے بے دھڑک اس آفس میں داخل ہوا تھا جس سے وہ غالباً ہمیشہ ہوتا تھا۔

”تو میڈم ایم ڈی! کیا ارادے ہیں آپ کے؟ کیا اب اس آفس میں طالبانائزیشن رائج ہو جائے گی؟“ وہ جو خاموشی سے لب بھیجے اس کی بات سن رہی تھی، اس نے وا میں ابرو سوالیہ اٹھائی۔ سیاہ نقاب سے جھلکتی آنکھوں کی سختی واضح تھی۔

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ کی تعریف؟“

باقر صاحب! یہ صاحب کون ہیں؟“

”میم! یہ لغاری صاحب کے۔۔۔“

”پہچان تو خیر آپ گئی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا، آپ کبھی بھول پائیں گی۔ ولید لغاری کہتے ہیں مجھے اور۔۔۔“

”ولید صاحب! میری ایک بات کا جواب دیں۔“ متوازن لہجے میں بات کاٹتے ہوئے وہ آگے کو ہوئی اور ایک دوسرے میں پھنسے ہاتھ میز پر رکھے۔ وہ جو استہزائیہ انداز سے بولے جا رہا تھا، رک گیا۔

”ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو اپنے آفس میں بلایا تھا؟“ ولید نے ہنس کر سر جھٹکا۔

”میڈم حیا! بلکہ مسز حیا! اب جب آپ کو ادھر کام۔۔۔“

”ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو بلایا تھا؟“ وہ پہلے سے بلند اور درشت آواز میں بولی۔ ولید کی بھنویں سکڑیں۔

”سلیمان انکل کے آفس میں آنے کے لیے مجھے اجازت۔۔۔“

”ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو بلایا تھا؟“ وہ بے حد اونچی آواز میں کہتی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باقر صاحب بھی احتراماً ساتھ ہی اٹھے۔ تابعداری کا ثبوت۔ وفاداری کا احساس۔ ولید کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔ وہ تیزی سے اٹھا۔

”سلیمان انکل میرے ساتھ یہ سلوک کبھی برداشت نہ کرتے۔“

”میں آپ کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کر سکتی ہوں۔ باقر صاحب! ان صاحب کو باہر جانا ہے۔ پلیز! دروازہ کھول دیں۔“

باقر صاحب نے ذرا تذبذب سے اسے دیکھا، پھر پلٹنے ہی لگے تھے کہ ولید نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”میں دیکھتا ہوں، آپ اس آفس میں کتنے دن رہتی ہیں۔“ ایک خشکیں نگاہ باقر صاحب پہ ڈالتا وہ تیزی سے پلٹا۔

حیا نے کرسی پہ واپس بیٹھتے ہوئے انٹرکام کا ریسپورس اٹھایا۔

”درخش! اگر یہ آوی مجھے دوبارہ بلا اجازت اپنے آفس میں داخل ہوتا نظر آیا تو آپ کی چھٹی۔ سن لیا آپ نے!“ اور سنایا تو اس نے ولید کو تھا، جو اس کی بات ختم کرنے کے بعد ہی باہر نکلا تھا۔

”جی۔۔۔ جی میم! ابا کی سیکریٹری بول کھلا گئی تھی۔“

”بیٹھے!“ ریسپورس واپس رکھتے ہوئے اس نے باقر صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”باقی دس فیصد شیئرز ان کے پاس ہیں میم!“ باقر صاحب نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ تب تک وہ چند گہرے سانس لے کر خود کو کمپوز کر چکی تھی۔

”پہلے عمید لغاری آفس آیا کرتے تھے، مگر گزشتہ ایک ماہ سے وہ علاج کے سلسلے میں بیرون ملک ہیں۔“

چند مزید تفصیلات کے بعد وہ اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی آج متوقع میٹنگ کے بارے میں بتانے لگے۔

”میم! ایک ٹریڈ سینٹر کا پروجیکٹ ہے۔ ہمیں وہ اصل کرنا ہے اور۔۔۔“

”یعنی کہ ٹینڈر کی نیلای ہے اور ہمیں نیلای جیتی ہے؟“ اس نے دے دے جوش سے ان کی بات کاٹی۔ گزرتے گزرتے کبھی کوئی سوپ سیریل دیکھتی تھی تو اس میں عموماً ”ٹینڈر کی نیلای ہو رہی ہوئی اور مخالف کمپنیاں بولی لگا رہی ہوتیں۔ سو کم از کم کچھ تو پتا تھا“

اسے کنسٹرکشن کمپنی کے متعلق۔

باقر صاحب لمحے بھر کو خاموش ہوئے، پھر نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں میم! ٹینڈر کی نیلای کا معاملہ نہیں ہے۔“

”اچھا!“ اس نے خفت چھپاتے ہوئے سر ہلادیا۔

اب وہ درمیان میں نہیں بولے گی۔ خاموش رہ کر بس سنے گی۔

”اصل میں ایک گروپ ٹریڈ سینٹر بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ اس کے لیے مختلف کمپنیوں کے آئیڈیا ز دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون ان کی زمین کو بہترین طور پہ استعمال کر کے ٹریڈ سینٹر بنا سکتا ہے۔ اگر ہمارا آئیڈیا ابرو ہو گیا تو پروجیکٹ ہمیں مل جائے گا۔ میں ہیڈ آرکٹیکٹ کو بھیجتا ہوں۔ وہ آپ کو مزید بریف کر دیں گے۔“ باقر صاحب مودب انداز میں اٹھتے ہوئے بولے۔

ہیڈ آرکٹیکٹ رضوان بیگ صاحب درمیانی عمر کے تجربہ کار انسان تھے، مگر ان کا انداز یوں تھا گویا ان کے سامنے کوئی ان پڑھ لڑکی بیٹھی ہو، جس کو بریف کرنا وہ اپنی شان میں توہین سمجھتے ہوں۔ جان بوجھ کر مشکل اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے وہ بہت لاپرواہی سے اس کو اپنا کام دکھا رہے تھے۔

”یہ ٹریڈ سینٹر ہے، یہ پارکنگ لاٹ ہے، یہاں ہم یوں کریں گے، یہاں یوں۔۔۔“ حیا اسی انداز میں کمر سیٹ سے نکائے ہتھیلیاں ملائے بیٹھی بہت محل سے ان کی بات سن رہی تھی۔

”اب آپ کو تو اتنا پتا نہیں ہو گا میم! بہر حال یہ اتنا شان وار پروجیکٹ ملان ہے کہ عمارت دیکھتے ہی گاہک فوراً سے کار اوپر پارک کرے گا اور شاپنگ شروع کر دے گا۔“

”خیر! میں تو اس موت کے کنویں میں کبھی کار پارک نہ کروں۔ کار کو کچھ ہو گیا تو رو حیل کبھی نہیں چھوڑے گا کہ وہ اس کی کار تھی، مگر اب تو رو حیل نے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ اور کار تو جہان کے پاس تھی۔ پتا نہیں، وہ اس وقت کیا کر رہا ہو گا۔۔۔ اف حیا کام پہ توجہ دو۔“

وہ سر جھٹک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ڈیزائن کی اسے واقعی کچھ سمجھ نہیں تھی، لیکن اگر وہ اتنے قابل آرکیٹیکٹ اس کی اتنی تعریف کر رہے تھے تو یقیناً وہ بہت اچھا ہو گا وہ قائل ہو گئی تھی۔

بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ اس کی توقع سے زیادہ بری رہی۔ جب وہ کانفرنس روم میں داخل ہوئی تو لمبی کانفرنس ٹیبل کے دونوں اطراف کرسیوں کی قطاروں پر سوئیڈ بوئڈ افراد منتظر سے بیٹھے تھے۔ سربراہی کرسی خالی تھی۔ وہ قائل سنبھالے تیز تیز قدموں سے چلتی کرسی تک آئی۔ کوئی اس کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ اس نے میز پر پرس رکھا اور کرسی سنبھالتے ہوئے قائل کھولی۔ پھر گردن اٹھا کر دیکھا تو سب مرد حضرات اسی کی طرف متوجہ تھے۔ تایا فرقان، زاہد چچا، داور بھائی، ولید، چند غیر شناسا چہرے۔ لمحے بھر کو اس کا اعتماد ڈانواں ڈول ہوا۔

”جو لڑکی اتنا کچھ تنہا سہتی ہے۔ وہ بہت مضبوط لڑکی ہوتی ہے۔“ اس نے فوراً سے خود کو سنبھال لیا۔ تمہید کے بعد وہ اپنے اڑنی پر اعتماد اور دو ٹوک میں انداز میں کہنے لگی۔

”سلیمان اصغر کی انٹارنی ان فیکٹ ہونے کے ناتے ان کی صحت یابی تک میں ان کی سیٹ سنبھالوں گی۔ مجھے امید ہے کہ کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔“

”اعتراض تو خیر ہے، مگر کیا کیا جا سکتا ہے؟“ تایا فرقان نے ناگواری چھپانے کی کوشش کیے بغیر ہاتھ جھلا کر کہا۔ اس نے گردن موڑ کر بہت سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

”جی سر!“ میں جانتی ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اعتراض ہو گا، مگر چونکہ آپ میرے ساتھ ہیں، اس لیے مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔ اب کام کی بات پہ آتے ہیں۔“

ان کو کچھ اس طرح سے گھیرا کر کہ نہ وہ ہاں کر سکے نہ ہی نہ۔ وہ میٹنگ کے مقاصد کی طرف آگئی۔ اس کی غلط فہمی تھی کہ ولید دوبارہ اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ ولید سمیت قریباً سب ہی جتنی کہ

داور بھائی بھی تمام عرصے میں اس سے بات بہ بات سوال کرتے رہے۔ جان بوجھ کر کنفیوژ کرنے والے سوال اور پھر اس کی توجیہ پہ استنزا ئیہ انداز میں سر جھٹک دیا جاتا۔ غصہ اسے آیا، مگر اسے عائشے گل کی اچھی لڑکی کی طرح تحمل سے کام لینا تھا۔ لیکن آخر میں اس کا صبر جواب دے گیا، جب داور بھائی نے بہت جیسے ہوئے انداز میں کہا۔

”میڈم! آپ کا تو ایل ایل بی بھی مکمل نہیں ہوا، تو آپ ایک کنسٹرکشن فرم کی پیچیدگیاں کیسے سمجھ پائیں گی؟“

”جب آپ چار سال میں دو دفعہ انگلش لینگویج میں سہیلی لے کر بی اے کر سکتے ہیں اور سہیل ایم اے کر کے آج ادھر بیٹھ کر مجھ سے سوال و جواب کر سکتے ہیں تو پھر مجھے یقین ہے کہ میں بھی جلد ہی کمپنی کی ساری پیچیدگیاں سمجھ جاؤں گی۔“

بہت سکون سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کانفرنس روم میں سیناٹا چھا گیا۔ داور بھائی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہاں پروا کسے تھی۔

وہ ”السلام علیکم“ کہہ کر اپنی چیزیں اٹھا کر اسی اعتماد اور وقار کے ساتھ چلتی دیروازے کی سمت بڑھ گئی جس کے ساتھ وہ اندر آئی تھی۔

”سلیمان اصغر کی مغرور بنی۔“

پیچھے سے اس نے کسی کو کہتے سنا تھا، مگر وہ باہر نکل آئی۔ اب اسے اپنے پروجیکٹ پلان پہ محنت کرنی تھی۔ پرسوں پر پرنٹیشن تھی اور اگر وہ اچھی سی پرنٹیشن دے کر پروجیکٹ اپرو کروالے تو وہ ان شاؤنٹ مردوں پہ یہ ثابت کر دے گی کہ سلیمان اصغر کا انتخاب درست تھا۔



بیڈ پہ لیپ ٹاپ کے۔ اس نے بیٹھی کی بیڈ پہ انگلیاں تیز تیز چلاتی وہ پورے انہماک سے اپنے کام کی طرف متوجہ تھی۔ پرنٹیشن کے لیے وہ مکمل تیاری سے جانا چاہتی تھی تاکہ کوئی اس پہ انگلی نہ اٹھا سکے۔

مسلل کام کے باعث اس کے ہاتھوں میں درد ہو رہا تھا۔ سر کے پچھلے حصے میں بھی ہلکی ٹھسٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا ارادہ کام ختم کر کے دوائے کر سونے کا تھا۔

”جیا!“ فاطمہ اسے پکارتے ہوئے کمرے تک آئیں۔ صبح ابا کو گھر شفٹ کر دیا گیا تھا، جس کے باعث اب وہ بالآخر سب ایک چھت تلے تھے۔

”کیا کر رہی ہو؟“ اس کے گرد کاغذوں، فائلز اور لیپ ٹاپ کو دیکھ کر فاطمہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟ صائمہ بھابھی بہت خفا ہو رہی تھیں کہ جب تایا کی موجودگی میں تم خود یہ کرو گی تو سب کہیں گے کہ ان پہ بے اعتباری ظاہر کی جا رہی ہے۔“

”مجھے یہی بہتر لگا تھا اماں! ابا نے مجھے اپنا انٹارنی ان فیکٹ بنایا تھا تو کچھ سوچ کر ہی بنایا ہو گا۔“ وہ اسکرین سے نگاہیں ہٹائے بنا بولی۔

”اچھا! کل ارسل کا ولیمہ ہے۔ کیا پہنوں گی؟“

”اف! یہ شادیاں۔“ جب سے ابا بیمار ہوئے تھے، ان چیزوں کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔ ارسل ان کا سیکنڈ کزن تھا، پھر بھی ہندی و شادی پہ وہ اور فاطمہ نہیں گئی تھیں۔ اب ولیمہ پہ جانا ضروری تھا۔

”کچھ بھی پہن لوں گی۔ مکسڈ گید رنگ ہو گی؟“ اس کی انگلیوں سے درواب کلائیوں تک سرایت کر رہا تھا۔

”ہاں! مکسڈ ہی ہے، مگر پلیر! اس دن کی طرح دوپٹا مت لپیٹا۔“ فاطمہ اس کے قریب بیڈ پہ بیٹھتی نزدیکی سے بولیں۔

”پر اماں! مکسڈ گید رنگ جو ہے۔ نقاب تو کرنا پڑے گا۔“ وہ ابھی تک اسکرین کی جانب متوجہ تھی۔ اسے بتا نہیں چلا کہ اس نے کس شے کو دعوت دے ڈالی تھی۔

”نقاب کس لیے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ وہاں کس سے کرنا ہے نقاب؟ کزن کی شادی ہے۔ وہاں سب اپنے ہی ہوں گے۔“ وہ حیرت اور غصے سے بولیں۔ جیا

نے رک کر انہیں دیکھا۔

”اپنا تو کوئی نہیں ہوتا اماں! وہ کزنز ہیں۔ سگے بھائی تو نہیں۔ اب جب کرتی ہوں نقاب تو ٹھیک سے کروں نا۔“ اسے سر کے پچھلے حصے سے درد اپنے بازو تک بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، یوں جیسے اس کی ان دیکھی انگلیاں ہوں اور وہ اس کے سر کو آہستہ آہستہ اپنے شینے میں لے رہا ہو۔

”تم یا گل ہو گئی ہو؟ تم فنکشن میں برقع اوڑھو گی؟“

”برقع نہیں اوڑھ رہی۔ بڑے دپٹے سے ہی کام چلا لوں گی۔ مکسڈ گید رنگ جو ہے۔“ اس نے حتی الوسع لمبے کوزم اور دھیمار کھنے کی کوشش کی۔

”مگر مکسڈ گید رنگ میں بھی مردوں اور عورتوں کی ٹیبلز الگ الگ ہوتی ہیں جیا! مرد دور ہوتے ہیں۔“

”دور کہاں! سامنے ہی تو بیٹھے ہوتے ہیں سب۔ درمیان میں اسکرین تو نہیں حائل ہوتی۔ اور پھر جو ڈیزائن عورتوں کی طرف پھر رہے ہوتے ہیں اور ارسل کے بھائی۔۔۔ وہ تو ہمیشہ ہی عورتوں کی طرف ہوتے ہیں۔“

”وہ تو بچے ہیں جیا!“

”بیس بیس سال کے بچے ہیں؟“

”تم بحث کیوں کر رہی ہو؟“

درو کی لمبی انگلیاں اب اس کی کپٹی سے ہوتی، پیشانی کو اپنے شینے میں لے رہی تھیں۔ تکلیف ہر بل بڑھتی جا رہی تھی۔

”نہیں اماں! بحث تو نہیں کر رہی صرف وضاحت کر رہی ہوں اپنے نقاب کی۔“

”اچھا! پہلے تو تم نقاب نہیں لیتی تھیں۔ پہلے تو تم بہت ماڈرن تھیں۔“

وہ چپ ہو گئی۔ زمانہ جاہلیت کا طعنہ کیسے چابک کی طرح لگتا ہے۔ کاش! یہ طعنہ دینے والوں کو معلوم ہو سکے۔

”جی! میں پہلے نہیں لیتی تھی، لیکن اگر اب کرتی ہوں تو مجھے پراپر طریقے سے کرنا چاہیے۔“

”تم شادی پہ نقاب لوگی تو لوگ کیا کہیں گے؟“ وہ جھنجھلا کر کہی۔
 ”میں لوں گی تو اللہ تعالیٰ کیا کہے گا؟“
 ”کچھ نہیں ہوتا حیا! ایسے بھی تو کتنے گناہ کر لیتے ہیں۔ غیبت گلے یہ سب گناہ نہیں ہوتا؟ کیا صرف نقاب نہ کرنا گناہ ہے؟“
 درد کی فولادی گرفت اس کے سر کو جکڑ لینے کے بعد اب گردن تک پھیلتی جا رہی تھی۔ اسے کندھوں پہ شدید دباؤ محسوس ہونے لگا۔
 ”اماں! میں نے کب کہا کہ میں بہت نیک ہوں یا کوئی گناہ نہیں کرتی، لیکن اگر میں کوئی نیک کام کرنا چاہتی ہوں تو مجھے مت روکیں۔“ اسے لگا وہ التجا کر رہی ہے، منت کر رہی ہے۔ وہ بنو قریظہ سے منت کر رہی ہے۔
 ”اچھا! پہلے تو تم نے کبھی احساس نہیں کیا گناہ ثواب کا۔ جب ابا اور تایا کہتے تھے تب تو تم نہیں مانتی تھیں۔“ پھر وہی پہلے کا طعنہ۔
 ”تو اماں! اگر میں تایا کے کہنے پر اللہ کی مانتی تو میں قابل قبول ہوتی، مجھے شاباش بھی ملتی اور واہ واہ بھی، لیکن اگر میں اپنی مرضی سے اللہ کی مانوں تو میں قابل قبول نہیں ہوں؟“ اس نے دکھ سے انہیں دیکھا۔ وہ ماس کو برچھی کی طرح زخمی کرتی اذیت کندھوں سے گزرتی، سینے میں اتر رہی تھی۔
 ”مجھے بے کار کے دلائل مت دو۔ اپنا اہل اہل بی مجھ پہ مت آزماؤ۔ ارم کی منگنی پہ تھوڑے لوگ تھے، بات دب گئی، لیکن اگر اب اتنے بڑے فنکشن پہ نقاب لوگی تو جانتی ہو لوگ کتنی باتیں بنائیں گے؟“
 ”آپ لوگوں سے ڈرتی ہیں، جبکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ اور لوگوں کا کیا ہے۔ صائمہ تائی تو پہلے بھی مجھ پہ باتیں بناتی آئی ہیں۔“ مگر فاطمہ بے زار ہو چکی تھیں۔
 ”حیا! شادیوں پہ کون حجاب لیتا ہے؟“
 ”میں لیتی ہوں۔ اور میں لے کر دکھاؤں گی۔ نہیں! میں کوئی دعو نہیں کر رہی، لیکن اگر میں اپنے

خاندان کی وہ پہلی لڑکی ہوں جو شادیوں میں بھی حجاب لے۔ تو میں وہ پہلی لڑکی بنوں گی اماں!“
 تکلیف اب اس کی شریانوں میں کسی سیال مادے کی طرح تیرتی اندر سب کچھ جلاتی، دل میں قطرہ قطرہ گرنے لگی تھی۔
 ”حیا! شادیوں پہ تو خیر ہوتی ہے۔“
 ”نہیں اماں! شادیوں پہ ہی تو۔۔۔ ان تقریبات سے ہی تو خیر کم اور شر زیادہ نکلتے ہیں۔“
 ”کتنا برا لگے گا، تم نقاب میں بیٹھی ہوگی؟“ نہیں رہ رہ کر اس کی کم عقلی پہ افسوس ہو رہا تھا۔
 ”کس کو برا لگے گا۔۔۔ لوگوں کو؟ مگر اللہ تعالیٰ کو اچھا لگے گا۔“
 ”اچھا! یعنی ہم جو نقاب نہیں کرتے تو ہم سب کافر ہوئے۔۔۔ ہاں! ہم سب بہت برے ہوئے؟“
 ”میں نے یہ کب کہا ہے اماں؟ میں خود نقاب لیتی ہوں، مگر کسی دوسرے پر تو تنقید نہیں کرتی۔ میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتی اماں!“
 اس کی آواز بھیک گئی۔ درد اب اس کے دل کو کاٹ رہا تھا۔ الٹی چھری سے ذبح کر رہا تھا۔ خندق کی کوئی جنگ بنو قریظہ کے بغیر نہیں لڑی جاتی۔ اسے بھی بنو قریظہ مل گیا تھا اور وہاں سے ملا جہاں سے اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔
 ”تم مت کہو، مگر تمہارا حجاب چیخ کر بھی کہتا ہے کہ میں بہت اچھی ہوں اور باقی سب برے ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر چمک کر کہا۔ وہ کہیں سے بھی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔
 ”اماں! اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کے اپنے اندر کی ان سکیورٹی ہے۔ میرا کیا تصور؟ میں تو کسی کو برا نہیں سمجھتی۔ میں تو بس آگ سے بچنا چاہتی ہوں۔“
 ”تو یہ سب پہلے کیوں نہیں کرتی تھیں؟ بچپن سے علم تھا تمہیں جہنم کی آگ کا یا نہیں علم تھا؟“
 ”پہلے صرف علم تھا اماں! اب یقین آگیا۔“ اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے۔

کیا لوگوں نے واقعی سمجھ لیا ہے کہ وہ کہیں گے ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے؟
 ”اچھا! صرف پردہ نہ کرنا گناہ ہے، ماں کی بات نہ ماننا گناہ نہیں ہے؟“ کیا قرآن نہیں پڑھا تم نے کہ والدین کو ان بھی نہیں کرتے؟“
 اس نے جواب میں ایک گہری سانس لی۔
 ”اماں! آپ کو بھی پتا ہے اور مجھے بھی پتا ہے کہ آپ اس آیت کو غلط جگہ پہ غلط طریقے سے کوٹ کر رہی ہیں۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی، مگر میں اللہ تعالیٰ کو بھی ناراض نہیں کر سکتی۔“
 ”بس کرو! پتا ہے مجھے یہ سب تم جہان کے لیے کر رہی ہو۔ وہی ہے ایسی دقیانوسی سوچ کا حامل۔ ترکی میں رہ کر بھی فرق نہیں پڑا اسے۔ دیکھتی ہوں میں، کس طرح روزِ فجر پہ مسجد جا رہا ہوتا ہے۔“
 ”اماں! کوئی لڑکی اپنی مرضی سے حجاب لینے لگے تو سب یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کسی کے دباؤ میں آکر یہ کر رہی ہے؟ کوئی یہ ماننے کو تیار کیوں نہیں ہوتا کہ اس لڑکی کا اپنا دل بھی کچھ کہہ سکتا ہے؟“
 ”مگر پہلے تو تم نہیں کرتی تھیں نا۔“ وہ غصے سے کہتی اٹھیں۔ ”اور کرو! جس سے بھی کرنا ہے نقاب۔ میں کون ہوتی ہوں کچھ کہنے والی۔“ وہ تن فرن کرتی باہر نکل گئیں۔
 الٹی چھری ابھی تک اس کے دل کو کاٹے جا رہی تھی۔ خون کے قطرے اندر ہی اندر گر رہے تھے، سامں بھی بعض دفعہ کتنا دل دکھاتی ہیں، مگر انہیں کبھی احساس نہیں ہوتا۔
 اس نے آنکھوں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑا، مگر تسو پھر بھی اہل پڑے۔
 ”جاڑے اور بھوک کی تکلیف میں خندق کھودنا کھن، ہوتا ہے یا بنو قریظہ کی بے وفائی سہنا؟ اس نے خود سے پوچھا۔“ اور اگر یہ دونوں ساتھ مل جائیں تبسے؟“
 اس کا دل ابھی تک تکلیف سے رس رہا تھا۔

پریرنٹیشن اچھی چلی گئی، جبکہ ولیمہ کا فنکشن اس سے بھی اچھا۔ آج اس نے نیوی بلو لباس پہنا تھا اور بڑا سا دوپٹا ویسے ہی لیا، جیسے ارم کی منگنی پہ لیا تھا۔ بیٹھی بھی ذرا الگ تھی، مگر یہ نہیں کہ کٹ کر رہی، بلکہ ہر ایک سے ملی۔ وہی سوال و جواب کا سلسلہ البتہ جاری رہا۔
 ”چہرے سے تو ہٹاؤ۔“ یہ وہ فقرہ تھا جو حیرت اور اجنبی سے بہت سے لوگوں نے آکر دہرایا اور جواب میں وہ ایک سادہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتی رہی۔
 ”مختینک یو! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
 البتہ سب کی باتیں دل پہ بہت زور سے لگتی تھیں۔ فاطمہ نے کتنی ہی دفعہ اسے آنکھ سے اشارہ کیا کہ چہرہ پورا کھول لے مگر وہ جواب میں وہ ابرو سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتی، جہاں مووی میکر مووی بنا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گئیں۔
 ”اوہو! قیمتی ویڈیو ہے۔ اپنوں میں ہی رہے گی۔ باہر تھوڑی دکھائیں گے۔“
 ”بالکل!“ وہ اثبات میں سر ہلا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔
 صرف شہلا تھی جو اسے یوں ملی جیسے کوئی تبدیلی ہی نہ آئی ہو۔ اس کی آنکھیں البتہ اب بھی ویسی ہی اداں اور تکان سے بھرپور تھیں۔ مگر اب حیا کو وجہ جاننے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے ابھی ایک دو فنکشنز حجاب میں اینڈ کیے تھے، کل فاطمہ سے بحث کی تکلیف کا اثر ابھی تک دل پہ تھا اور شہلا تو پچھلے دو برس سے ہر غمی، خوشی میں اسی طرح شرکت کرتی رہی تھی۔
 اور پھر جب انسان کہتا ہے کہ وہ ایمان لایا ہے تو وہ آزمایا بھی ضرور جاتا ہے۔ جانے شہلا کی تکلیف کتنی تھی اور کب سے تھی۔
 ”سلام ہو، ہم اجنبیوں پہ!“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔
 شادی کے لیے دوسرے شہلوں سے آئے کچھ رشتہ دار تیار فرقان کے گھر کھڑے ہوئے تھے۔ تایا نے

رات میں سب کا کھانا کیا تھا۔ اس وقت بھی ان کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا جب وہ پریزنٹیشن کتابت کے ان کی طرف آئی۔

لان میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ تایا برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ اندر جانے والا دروازہ کھلا تھا، مگر اس پاس کوئی نہ تھا۔ اندر سے البتہ گھما گھمی اور رونق کی سی آوازیں آرہی تھیں۔

”آج پریزنٹیشن اچھی ہو گئی ہے۔ امید ہے پروجیکٹ ہمیں ہی ملے گا۔“

وہ نرمی و شائستگی سے بتانے لگی۔ جو سرد مہری کی دیوار ان دونوں کے بیچ در آئی تھی۔ وہ اسے گراتا چاہتی تھی۔ جو بھی تھا اسے فطری طور پر اپنے تایا سے بہت محبت تھی۔

”خیر! مجھے تو اتنی امید نہیں ہے۔ پتا نہیں تم ٹھیک سے کر کے بھی آئی ہو یا نہیں۔“ وہاں ہنوز رکھائی تھی۔ وہ بہت اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے تھے۔

”نہیں تایا! اب سب بہت اچھا ہو گیا۔ میں پورا ہوم ورک کر کے گئی تھی۔“

وہ خاموش رہے۔ تنے ہوئے ابرو اور ماتھے کے بل۔ وہ اس سے خوش نہیں تھے۔ اس نے ایک اور کوشش کرنی چاہی۔

”اچھا! باقر صاحب بتا رہے تھے کہ سائٹ بی میں وینڈر کچھ مسئلہ کر رہا ہے۔ سپلائی روک دی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر میں خود۔۔۔“ وہ ایک دم رکی۔ دروازہ کھول کر دیا اور بھائی باقر آ رہے تھے۔ حیا کسی میکا کی عمل کے تحت دوپٹا دو انگلیوں سے تھوڑی سے اٹھا کر ناک تک لے گئی۔ تایا نے چونک کر اس کی حرکت کو دیکھا اور پھر اندر سے آتے دیا اور بھائی کو بوجو اسے دیکھ کر رک گئے تھے جیسے متذبذب ہوں کہ کھڑا رہوں یا واپس چلا جاؤں۔

”تم میرے بیٹے سے پروہ کر رہی ہو؟“

”تایا! میں تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ ایک دم بہت بلند آواز میں بولنے لگے۔

”میرے بیٹے آوارہ ہیں؟ لو فر لنگے ہیں؟ بد نیت ہیں؟ کیا کیا ہے میرے بیٹوں نے جو تم ان کے سامنے پروہ ڈالنے لگتی ہو؟“ کوچی غصیلی آواز نے اندر باہر خاموشی طاری کر دی۔

وہ بالکل ساکت سی بنا پلک جھپکے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

”تم میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر میرے بیٹوں کو گھٹیا اور بیچ ثابت کرنا چاہتی ہو؟ تم میرے بیٹوں کو ذلیل کر رہی ہو۔“ وہ غصے سے دھاڑے۔ دواور بھائی نے نفی میں سر ہلایا جیسے انہیں قطعاً نہ لگا ہو کہ ان کو ذلیل کیا گیا ہے۔

اندر سے لوگ باہر آنے لگے۔ کوئی کچن کے دروازے سے باہر نکلا۔ کوئی برآمدے کے دروازے سے۔ تماشاج کیا تھا۔ اور تماشائی جمع ہو رہے تھے۔

”میرے بیٹوں نے ساری عمر بھائیوں کی طرح خیال رکھا تمہارا۔ اپنا بھائی تو اس کا فر عورت کے ساتھ منہ کالا کر کے بیٹھ گیا ہے نا! مگر تم الٹا میرے بیٹوں کے خلاف محاذ بنا رہی ہو؟ پورے ترکی میں آوارہ پھرتے تمہیں پروہ کا خیال نہیں آیا تھا؟“

اس کا جیسے سانس رک گیا۔ اسی پل ان کو دیکھا۔ بمشکل وہ چند لفظ کہہ پائی۔

”زائد چچا! آپ تایا ابا کو سمجھائیں انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو۔۔۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی! یہ ڈھکوسلے تم کس کے لیے کرتی ہو؟ پہلے ساری زندگی خیال نہیں آیا اب کہاں کا اسلام شروع ہو گیا ہے تمہارا؟“ وہ جواباً اتنے ہی غصے سے بولے۔

”پورے خاندان میں ہمارا تماشاج بنا کر رکھ دیا۔ سب پاتیں بنا رہے ہیں کہ حیا بی بی نقاب میں کھانا کھا رہی تھیں۔“

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ارد

”آج میرا چالان ہوتے ہوتے بچا۔ پوچھو میں؟“ کسی اور ہی دھن میں محفوظ سا بتا رہا تھا۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ جہان نے حیرت سے سر

دنگے مجمع کی نظریں، تحقیر، طنز و زلت۔ اس نے کیا کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔

”آپ سب کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ بولنا چاہتی تھی مگر بول سے بس یہی نکلا۔

”تایا! آپ کو تو حجاب بہت پسند تھا۔ آپ تو۔۔۔“

”جو اس مت کرو میرے سامنے اور میری بات کان کھول کر سن لو! اگر تم آئندہ میرے گھر آؤ گی تو منہ لینے بغیر آؤ گی۔ اگر تمہیں میرے بیٹوں کو اس طرح ذلیل کرنا ہے تو میرے گھر میں آئندہ قدم مت رکھنا۔“

انگی اٹھا کر متنبہ کرتے وہ سرخ چہرہ لیے بولے۔ س سے مزید کھڑا نہیں ہوا گیا۔ وہ ایک دم پلٹی اور اپنے گھر کی طرف دوڑتی چلی گئی۔

چچے تماشائیوں کے مجمع میں کہیں فاطمہ بھی تھیں، مگر وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ ان سب نے اسے اندھیری خندق میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اپنے لان میں وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ ہی گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور قدموں میں سکت نہیں رہی تھی۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو ابل کر گرتے جا رہے تھے۔

اتنی ذلت؟ اتنی تحقیر؟ اتنا تماشاج؟

یہ تایا فرقان تھے۔ ساری عمر اس حجاب پہ ہی اختلاف رکھنے والے تایا فرقان اب حجاب پر ہی اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان کا دین، شریعت، سب بھگ گیا تھا؟

اس کی گردن گھٹنوں پہ جھکی تھی۔ وہ روئے چلی پڑی تھی۔ پورے خاندان کے سامنے تایا نے اسے ذلیل کیا تھا اسے لگاؤ اب کبھی سر نہیں اٹھا سکے گی۔

تھے۔ اسے دیکھ کر ذرا سے مسکرائے۔

”کام کیسا جا رہا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے ابا!“ اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتار لیے اور نظارہ مسکرا کر بولی۔

”بہت محنت کر رہی ہے یہ لڑکی!“ پھپھو مسکرا کر کہتی ناشتے کے برتن اٹھا رہی تھیں۔ پتا نہیں، انہیں رات کے واقعے کا علم تھا یا نہیں۔ پھر بھی ان سے نگاہ نہ ملا سکی۔

☆ ☆ ☆

آفس میں ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ ٹریڈ سینٹر کا پروجیکٹ انہیں نہیں ملا تھا۔ اس بات نے تو اسے مزید شکستہ دل کر دیا۔ اس نے باقر صاحب کو بلوایا تاکہ ان کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دے اور وکیل صاحب کو بلواسکے، مگر پہلے اس نے بے اختیار ہی وہ تکلیف دہ موضوع خود ہی اٹھالیا۔

”اتنی اچھی پریزنٹیشن دی تھی، پھر ہمیں پروجیکٹ کیوں نہیں ملا؟“ رات کے واقعے کی تھکن اور اذیت اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

”ہمیں ہمارا پلان پسند نہیں آیا۔ وہ شاید کچھ اور چاہتے تھے۔“

”اچھا!“ وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے باقر صاحب سے کوئی بات نہیں کی اور انہیں بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سارا پروجیکٹ پلان نکالا اور از سر نو جائزہ لینے لگی۔ ٹھیک ہے کہ وہ آج آفس چھوڑ دے گی اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں، مگر وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی۔

تمام خاکے اچھے تھے۔ بقول آرکیٹیکٹ بے حد شان دار۔ مگر جب اس نے پہلی دفعہ ان کو دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں کیا بات آئی تھی؟ کچھ غیر آرام دہ لگا تھا اسے۔ اس نے ذہن پہ زور دیا اور ایک دم کسی بہتی ندی کی طرح وہ خیال اٹھ آیا۔

موت کا کنواں۔

اور اگلے ہی لمحے اسے غلطی نظر آ گئی۔

داور بھائی کی شادی کی کچھ شاپنگ خاتمہ اور اس نے لاہور سے کی تھی۔ کسی کام سے وہ شاہ عالمی مارکیٹ چلے گئے۔ غلطی یہ کی کہ اپنی کار لے گئی۔ وہاں ایک ملٹی اسٹوری پارکنگ بلڈنگ میں کار پارک کرنا پڑی وہ بھی چوتھی منزل پہ۔ گول گول گھومتی منزلیں، تنگ تاریک جگہ، گاڑی اوپر چڑھانا گویا یوں تھا جیسے موت کے کنویں میں ڈرا بیو کرنا۔ تب سے اسے ملٹی اسٹوری پارکنگ عمارات بہت بری لگتی تھیں اور اب اس کے پلان میں ٹریڈ سینٹر کی پارکنگ ایک چھوٹے رقبے پہ ملتی اسٹوری بنائی گئی تھی۔

اسے تعمیراتی کاموں کا تجربہ نہیں تھا۔ مگر شاپنگ کا ایک طویل اور وسیع تجربہ تھا، پھر یہ اتنی بڑی غلطی اسے پہلے کیوں نظر نہیں آئی؟ شاید اس لیے کہ وہ پہلے خود کو تم علم سمجھ کر آرکیٹیکٹ پہ بھروسہ کر رہی تھی۔ اندھی تقلید، مگر اب اپنی عقل سے سوچا تو چونک گئی۔ لوگ ایک ٹھکانا اور ”زمینی“ پارکنگ لٹا پسند کرتے ہیں اور ملٹی اسٹوری پارکنگ بلڈنگز تو ادھر کم ہی بنتی ہیں۔ پھر آرکیٹیکٹ نے ایسا کیوں کیا؟

وہ جا ہی رہی ہے تو ذرا ان صاحب سے دو ٹوک بات تو کر لے۔ یہی سوچ کر وہ باہر آئی۔ ترکوں سے اس نے خود چل کر جانا سیکھا تھا۔ وہاں کسی سے راستہ پوچھو تو وہ آپ کے ساتھ چل کر اخیر منزل تک چھوڑ آتا تھا۔ سو وہ خود آرکیٹیکٹ صاحب سے ملنے چلی آئی، لیکن کوریڈور کے سر پہ وہ ایک دم پیچھے ہوئی۔

ولید اور آرکیٹیکٹ رضوان صاحب کسی بات پہ بنے ہوئے اندر جا رہے تھے۔ وہ الٹے قدموں واپس آئی۔ ایک سرخ بتی جلنے بجھنے لگی تھی۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ کوئی گڑبڑ تھی۔

واپس اپنی سیٹ پہ بیٹھی وہ کتنی ہی دیر سوچتی رہی۔ پھر اپنے پرس میں موبائل کے لیے ہاتھ ڈالا تو وہ مائل کا ٹکڑا بھی نظر آ گیا جس پہ سنہری دھاگے سے دو الفاظ لکھے تھے۔ وہ اسے دو انگلیوں میں گھماتی، الٹ پلٹ کرتی، سوچتی رہی۔ فرار ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔

مسلوں کا حل ڈھونڈنا پڑتا ہے، راستہ تلاش کیا جاتا ہے۔ مجرا احمد کا سبق اسے یاد تھا۔

چند منٹ میں اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ پھر سے کام کرنے کے لیے تیار تھی۔ کوئی اس کے باپ سے غداری کر رہا تھا۔ اسے ساری گڑبڑ کے منبع کو ڈھونڈنا تھا۔

☆ ☆ ☆

کانفرنس روم میں سب جمع تھے۔ وہ بنا کسی کو دیکھے سربراہی کرسی پہ آکر بیٹھ تو گئی تھی، مگر سر اٹھا کر تپا فرقان، داور اور زاہد چچا کو دیکھنا، ان سے نگاہ ملانا کتنا اذیت ناک تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ رات کے زخموں سے پھر سے خون رسنے لگا تھا۔ مگر وہ کتنے آرام سے اس کے سامنے بیٹھے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”تو آپ نے پروجیکٹ ہار دیا۔“ تپا فرقان نے نخت بھری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ تپا فرقان کی بیٹی کی طرح رات گئے پکڑی نہیں گئی تھی۔ (جیسا کہ تپا نے ایک دفعہ اسے فون کیا تھا) کہ وہ سر اٹھانہ سکتی۔ نہ ہی وہ زاہد چچا کی بیٹی کی طرح پورے خاندان میں چیخ چلا کر داور بھائی کو بے عزت کرنے کی مجرم تھی۔ زاہد چچا نے اسے سخت سناتے ہوئے اپنی بیٹی کی حرکت کو کیوں فراموش کر دیا؟ اور تپا نے بھی کبھی داور کی اس بے عزتی پہ باز پرس کی؟ پھر اب۔۔۔؟ مگر وہ حجابی لڑکی تھی اور کوئی حجابی لڑکی یہ کتنا ہی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرے اسے میلا نہیں کر سکتا تھا۔

”جی سر! میں نے ہار دیا۔“ تپا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے سیاہ انداز میں کہا۔

”کیا آپ وجہ بتانا پسند کریں گی؟“ ولید کی بات پہ اس نے گردن موڑ کر اسی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں ولید صاحب۔“

”درست! پھر میں آپ کو مطلع کرنا چاہوں گا کہ ہم گرین ہاؤس اسکیم والا پروجیکٹ ڈیلے (Delay) سنہ پہ مجبور ہو چکے ہیں۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنا اہم پروجیکٹ تھا۔

”کیونکہ بجٹ نہیں ہے۔ فنڈز کم پڑ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اس کو کیری آن کرنے کے لیے اتنا پیسہ نہیں ہے۔“ اس نے ایک کانڈ حیا کی طرف برہمایا، جس پہ ایک لمبا سا فیکر لکھا تھا۔

اسی رقم کا انتظام کیسے ہوگا؟ وہ صبح میں مضطرب ہو گئی۔

”مگر اس طرح پروجیکٹ بند کرنے سے تو بہت نقصان ہوگا۔“

”پھر کیا کریں؟“

”یہ میرے ابا کا پروجیکٹ تھا۔ ہم اس کو یوں کل آف نہیں کر سکتے۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔

”تم ہمیں یہ اماؤنٹ لاؤ۔ ہم اس کو جاری رکھیں گے، بات ختم۔“ زاہد چچا نے بے زاری سے کہا۔ وہ دونوں تپا، چچا اسے یوں مخاطب کرتے تھے گویا وہ ان کے بھائی کی بیٹی نہیں، ملازمہ ہو۔

”واقعی؟ اگر میں آپ کو یہ اماؤنٹ لاؤں تو آپ کام جاری رکھیں گے؟ کیا آپ زبان دے رہے ہیں؟“ اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ان کا چیلنج کرتا، مذاق اڑاتا انداز اسے پہلے سے زیادہ برا لگا تھا۔ رات کے زخم پھر سے کھرنے لگے تھے۔

”بالکل!“ تپا فرقان نے شانے جھٹکے۔

”ٹھیک ہے! میں پیر کی صبح آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔“ وہ قائل بند کرتے ہوئے حتی انداز میں بولی۔

پھر جب وہ اپنے آفس واپس آئی تو موبائل بج رہا تھا۔ اس نے کرسی پہ تھکے تھکے انداز میں گرتے ہوئے فون اٹھایا۔ نمبر جہان کا تھا۔

”کیسی ہو؟“ وہ چھوٹے ہی فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے انگلیوں سے پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔ بے خوابی کے باعث سر بے حد درد کر رہا تھا۔

”چلو! پھر لچ ساتھ کرتے ہیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا اٹالین ریٹورنٹ دیکھا ہے۔ تمہیں ایڈریس سمجھاؤں؟“

سارے دن میں وہ پہلی دفعہ ہنسی تھی۔

”یہ میرا شہر ہے جہاں بے! مجھے اس کے سارے راستے معلوم ہیں۔ ریٹورنٹ کا صرف نام بتاؤ۔“ وہ بھی ہلکا سا ہنس دیا۔

”اوہ سوری! ایف ٹین میں اٹالین اوون پہ آجاؤ۔“

کار ڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ پچھلی نشست پہ بیٹھی سیل فون پہ نمبر ملا رہی تھی۔ اس نے ابا کی نصیحت پہ عمل کرنے کا سوچا تھا۔ کال ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ صد شکر کہ انہوں نے کال ریسیور کر لی۔

”السلام علیکم زیشان انکل! میں حیات بات کر رہی ہوں۔“

کار ٹریفک کے ساتھ بہتی چلی جا رہی تھی۔ اسی طرح اس کے تھے پریشان اعصاب ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ان سے بات ختم کی تو آفس سے فون آگیا۔ وینڈر مال کی سپلائی کھولنے پہ تیار نہ تھا اور پرانی قیمت پہ تو ہرگز نہیں۔ سراسر بلیک میلنگ تھی اور بلیک میلرز سے تو اسے نفرت تھی۔

”کل میری میننگ ارتج کرواؤں وینڈر سے۔ میں ان صاحب سے خود بات کرنا چاہوں گی۔“ اس نے بند کر دیا۔ کار ریٹورنٹ کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

وہ اطالوی ریٹورنٹ کی بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمام میزیں خالی تھیں۔ ہال کی ایک دیوار شیشے کی بنی تھی جس سے نیچے ڈبل روڈ اور اس کے پار گرین ہیلٹ کے درخت و سبزہ نظر آ رہا تھا۔ شیشے کی دیوار کے ساتھ کونے کی میز پہ وہ بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ بنا کسی وقت کے اسے نقاب میں بھی پہچان لیتا تھا۔ پہلی دفعہ جب وہ نقاب میں اس کے پاس گئی تھی فریڈم فلوٹیلہ کے احتجاج کے دن تب بھی اس نے کوئی حیرانی

ظاہر نہیں کی تھی۔ شاید وہ حیران کم ہی ہوتا تھا۔

”پہلے فیصلہ کر لو کہ لچ کس کی طرف سے ہے؟“

کرسی چھینچ کر بیٹھے ہوئے اس نے میز پہ اپنا پرس رکھا۔

”آف کورس! تمہاری طرف سے ہے۔ اصغر اینڈ سنز کی قائم مقام ایم ڈی مجھ غریب آدمی کو لچ تو کر دہی سکتی ہے۔“

”شیور!“ اس نے بشارت سے کہتے ہوئے موبائل پرس میں رکھنے کے لیے پرس کھولا۔ ٹھٹھل کا ٹکڑا اندرونی جیب میں ہزار کے ایک نوٹ کے ساتھ رکھا تھا۔

ہزار کا نوٹ؟ وہ زپ بند کرتے ہوئے چونکی۔ پھر ہٹا محسوس سے انداز میں پرس کو اندر سے دیکھا۔ اس کا روپوں والا پاؤچ آفس میں ہی رہ گیا تھا۔ اب سوائے اس لاوارث سے نیلے نوٹ کے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اللہ! اللہ! کاروباری الجھنوں میں پاؤچ اٹھانا یا دی نہیں رہا۔ اب کیا کرے؟

”کیا ہوا؟ ایم ڈی صاحبہ! پیسے تو نہیں بھول آئیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک تو اس آدمی کی عقابلی نظریں اس نے سنبھل کر پرس بند کیا۔

”تم ایم ڈی صاحبہ سے ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی توقع کر سکتے ہو؟“ بظاہر مسکراتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔

”نہیں! خیر! آرڈر کرو۔ تمہارا شہر ہے۔ تمہیں زیادہ پتا ہوگا۔“ وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

حیات نے ”شیور“ کہتے ہوئے مینو کارڈ اٹھالیا۔ اس کو لچ کروانا تھا اور وہ بھی ہزار کے اس نوٹ سے۔ اسے لی ایم بھی پاؤچ میں تھا اور وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی تھی جس سے جہان کو پتا چلے کہ وہ پیسے واقعی بھول آئی ہے ورنہ ادائیگی کر دے گا۔ سوال انا کا تھا۔

”لیکن ایک ہزار میں اسے اطالوی لچ کسے کرواؤں؟“ اس نے قدرے اضطراب سے فہرست دیکھی۔

”سنو! صرف مین کورس منگوانا، سلاڈ، کشارڈ اور

زرنکس کے فالتو اخراجات مجھے پسند نہیں ہیں۔“ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، مسکراہٹ دبائے سے بغور دیکھا کہ رہا تھا۔

”اوکے! مجھے تو کوئی خاص بھوک نہیں ہے، دل ہی نہیں چاہ رہا۔“ آرڈر دے کر اس نے کارڈ رکھ دیا۔ جہان نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سمجھ کر سر ہلادیا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ وہ شیشے کی دیوار سے باہر دیکھنے لگی۔ اس شیشے سے تو کوئی پرندہ نہیں آکر آیا تھا۔ شاید پرندے تعمیر کے بعد صرف پہلے موسم میں ٹکراتے ہوں۔ بعد میں عادی ہو کر راستہ بدل لیتے ہوں۔ راستہ پرندوں کو ہی بدلنا پڑتا ہے دیوار کی ہی کھڑی رہتی ہے۔

”کل کیا ہوا تھا؟“

حیات نے نگاہیں موڑ کر اسے دیکھا۔

”اب تک تم نے پتا تو کر ہی لیا ہوگا۔ سہرا حال! تیا نے سارے خاندان کے سامنے میرے پردے کی وجہ سے مجھے بے عزت کیا، تماشا بنایا اور گھر سے نکال دیا۔ اس کے علاوہ کچھ خاص نہیں۔“

جہان نے قدرے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔

”یرانی عادتیں آسانی سے نہیں جاتیں۔ اس طرح لوگوں کو ذلیل کرنے کے وہ عادی ہیں۔ کتنا آسان ہے ان کے لیے اپنی انا کے پیچھے رشتے توڑ دینا۔“

”جو بھی ہے میں ابا کی کرسی ان کے لیے خالی نہیں کروں گی۔ یہ فیصلہ میں نے کر لیا ہے۔ اب اس قصے کو بند کر دیتے ہیں۔ تم بتاؤ! تم نے ترکی واپسی کا کیا سوچا ہے؟“

”سب مجھ سے یہی پوچھتے ہیں کہ واپسی کا کیا پروگرام ہے۔ لگتا ہے مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ دل کرتا ہے میرا کہ ”ماہ سن“ کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔“ اس نے غالباً ”کوئی ترک محاورہ“

”خیر! ابھی کچھ دن ادھر ہوں۔ تمہیں کب جانا ہے؟“

”دلالتی شروع ہو چکا ہے۔ مجھے پانچ جولائی کے بعد

کلیئر نس کروانی ہے۔ ابا کی طبیعت ذرا سنبھل جائے، پھر جاؤں گی۔“

”لچ آگیا تو وہ اپنے نقاب سے بہ آسانی چھری کانٹے کی مدد سے کھانے لگی۔ پھر کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”جہان! تمہیں میرا نقاب۔ میرا مطلب ہے تمہیں اچھا لگتا ہے میرا نقاب لینا؟“

وہ ذرا چونکا تھا۔

”آہ۔ ہاں! اٹھیک ہے۔“ اس نے ذرا الجھتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ مطمئن ہو کر کھانے لگی، مگر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔

بل آیا تو اس نے ایک مطمئن سی سانس اندر کو اتاری۔ نو سو پچاس صرف دو مین کورس منگوا۔ تھے اس لیے۔ ثابت ہوا کہ اگر پیسے کم ہوں تو بندے کو دل ڈنکس، سلاڈ اور اشار ٹر جیسے فالتو لوازمات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ایکایک کسی خیال کے تحت وہ چونکی۔

”فالتو لوازمات؟“ اس کا ذہن آفس کی طرف بھٹک گیا۔ جہان نے نرمی سے اس سے بل لے لیا۔

”میں پے کروں گا۔“

وہ چونکی۔ ”نہیں! یہ تو مجھے۔“

”میں مذاق کر رہا تھا، لچ میری طرف سے تھا۔“ وہ جتا ایک لفظ سے فائل میں پیسے رکھنے لگا۔ اس نے اصرار نہیں کیا۔ اس کا ذہن کسی اور ہی طرف الجھا تھا۔

”فالتو لوازمات؟“

ادھیڑ عمر صاحب نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر ایک طرف ہٹ گئے۔ وہ پر اعتماد اور سبک قدموں سے چلتی اندر آئی۔ دروازے سے جمی صاحب (وینڈر) کی کرسی میز کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ وہ سیدھ میں چلتی میز تک آئی اور بیٹھنے کے لیے کرسی کھینچی۔

جمی صاحب نے انگلیوں میں پکڑی سگریٹ لبوں میں دبا کر سانس اندر کو کھینچی اور سر سے پاؤں تک سیاہ عبایا میں ملوس دراز قد لڑکی کا جائزہ لیا جو بہت اطمینان

سے کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھی۔ انہوں نے سگریٹ ہٹائی، دھوئیں کا مرغولہ اڑ کر فضا میں تحلیل ہوا۔
”میں حیا سلیمان ہوں، اصغر اینڈ سنز کی مینجنگ ڈائریکٹر۔“ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھے کہنیاں ہاتھ پر جما کر تھیلیاں سلائے بیٹھی وہ بہت سنجیدگی سے بولی۔

نجی صاحب نے کندھوں کو ذرا سی جنبش دی، یعنی وہ جانتے ہیں اب آگے بات کرے۔ ادھیڑ عمر صاحب اس لڑکی کے پیچھے ہاتھ باندھے مٹوب سے آکھڑے ہوئے تھے۔ ان کے لیے دوسری کرسی موجود نہیں تھی۔ نجی صاحب نے کرسی منگوانے کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔

”ہماری سائٹ پہ سلائی آپ نے روک رکھی ہے جس سے ہمارا پروجیکٹ تاخیر کا شکار ہو سکتا ہے۔“
”دیکھیں بی بی! میں نے اپنی ڈیمانڈ آپ کے۔“
”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی، نجی صاحب!“
اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک دم بہت سخت لہجے میں انہیں روکا۔ اس کی آواز میں کچھ تھا کہ وہ رک گئے۔

”چند باتیں ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔“
ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بنا کسی تمہید کے وہ کہہ رہی تھی۔

”آپ کے پیچھے جو کھڑکی ہے، اس سے جھانک کر دیکھیں تو دا میں جانب، دور کہیں ایک زیر تعمیر منصوبہ دکھائی دے رہا ہے۔ کس چیز کا منصوبہ ہے وہ باقر صاحب؟“ لڑکی نے رک کر پیچھے کھڑے آدمی کو مخاطب کیا، مگر دیکھ وہ ابھی تک نجی صاحب کو رہی تھی۔

”اور ہیڈ ہے میم!“ انہوں نے فوراً بتایا۔
”بالکل! اور ہیڈ تعمیر ہو رہا ہے وہاں اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اس میں سینڈ (sand) اور سلیٹ (Slit) استعمال ہو رہا ہے، اور وہ بھی کس کی جگہ؟“
Crasher میٹرل کی جگہ!

نفیس سے نقاب سے جھلکتی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مسکرائی تھیں۔ نجی صاحب نے سگریٹ

والا ہاتھ نیچے کر دیا۔ ان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے اور وہ پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ تھے۔
”آپ اس اور ہیڈ سے دو میل دائیں چل جائیں۔ تو ایک سکس اشار ہوٹل زیر تعمیر نظر آئے گا، اس کی تکمیل آخری مراحل میں ہے مگر اس کے مالکان کو یہ علم نہیں ہے کہ اس کی دو فلنگ (roofing) اور واٹر پروفنگ میں سب اسٹینڈرڈ میٹرل استعمال کیا گیا ہے۔ بے حد سستا اور گھٹیا میٹرل۔“ اس کی مسکرائی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

نجی صاحب نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔“ وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔ پیشانی پہ بلوں کا اضافہ ہونے لگا۔
”ایک روڈ بھی حال ہی میں مکمل ہوئی ہے اور اس کا بھی ان دونوں پروجیکٹس سے تعلق ہے۔“
نگاہیں ان پہ جمائے وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”جو تعلق ہے وہ آپ بہتر جانتے ہیں، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس سڑک کے اطراف کو سیمنٹڈ (Cemented) نہیں کیا گیا اور اندر ہولز چھوڑ دیے گئے ہیں۔ وہ کون سا مسئلہ ہو گا جو سب سے پہلے چند دن میں منظر عام پہ آئے گا باقر صاحب؟“

نجی صاحب کو اپنے سابقہ انداز میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ وہ اسی تابع واری سے بولے۔

”ڈورین ایچ کا مسئلہ میم!“
”بالکل! ڈورین ایچ کا مسئلہ۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ کون سا ہو گا؟ انپکشن کا مسئلہ۔ چار انپکشن ٹیمیں ان تینوں پروجیکٹس کو چند روپے رشوت لے کر اپروڈ کر چکی ہیں، لیکن وہ کیا ہے نجی صاحب! کہ جو ہمارا میڈیا ہے نا، وہ ذرا سی رینٹنگ کے لیے ایسی خبروں کو خوب اچھالتا ہے اور یوں اس وینڈر کی ساکھ تباہ ہو کر رہ جاتی ہے، بالخصوص تب جب ان کے ہاتھ ڈاکو منٹس پروف بھی لگ جائے۔ باقر صاحب!“

س نے انگلی سے اشارہ کیا تو باقر صاحب نے چند ہدایت میز پر رکھے۔ نجی صاحب ان کو اٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھے۔ وہ بمشکل ضبط کرتے ہوئے

”مجھے یہ ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے۔“
”ارے!“ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت ابھری۔
”آپ کی بات کس نے کی؟“ پھر وہ ذرا سا مسکرائی۔
”میں تو اپنی سلائی کی بات کر رہی تھی۔ کل ہفتہ ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ سوموار کی صبح مجھے اپنی ٹرانسکشن سائٹ پہ سلائی کی بحالی کی خبر مل جائے گی۔“ اپنا پرس اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی۔
”اور وہ بھی میری پرانی قیمت پہ۔“ چلیں باقر صاحب!

وہ مزید کچھ کہے بنا پلٹی ادھیڑ عمر صاحب نے آگے بھا کر دروازہ کھولا۔ وہ ان ہی سبک قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔

سگریٹ نے نجی صاحب کی انگلی کو جلایا تو وہ پونکے پھر غصے سے اسے الیش ٹرے میں پھینکا اور میز پر رکھے کاغذات اٹھائے۔

جیسے جیسے وہ انہیں پڑھتے جارہے تھے ان کی پیشانی پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

”مجھے آپ کو ایک اچھی خبر دینی تھی جنٹلمین!“
”بٹنگ کے آغاز پہ اس نے مسرور مطمئن انداز میں انہیں مخاطب کیا جو اپنے سابقہ رویے کو برقرار رکھے اس کی طرف متوجہ تھے۔“

”ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ وینڈر عارف نجی نے لیا، بحال کر دی ہے اور وہ بھی پرانی قیمت پہ۔“
”واقعی؟“ فرقان تایا حیران ہوئے تو زاہد چچا بدھے ہو بیٹھے۔

”مگر اس نے تو اس روز فنانس ڈیپارٹمنٹ کے انف صاحب سے خاصی بد تمیزی کی تھی اور وہ سراسر بد میلنگ پہ اتر اہوا تھا۔ میں نے خود اسے فون کیا تھا

مگر وہ تو سیدھے منہ بات کرنے کا روادار بھی نہیں تھا۔

”پھر آپ کو بلیک میلرز سے نپٹنے کا فن سیکھ لینا چاہیے سر! کیونکہ میں نے اس سے بات کی ہے اور وہ غیر مشروط طور پہ سپلائی بحال کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔“

زاید چچا خاموش ہو گئے۔ ان کے لیے یہ سب خاصا غیر متوقع تھا۔ اگر سلیمان صاحب ان کو آگرتا تے کہ انہوں نے وینڈر کو راضی کر لیا ہے تو انہیں حیرانی نہ ہوتی، کیونکہ وہ اس قابل تھے تب ہی تو اپنے بڑے بھائی سے زیادہ مضبوط شیئر ہولڈر اور ایم ڈی تھے مگر حیا۔۔۔ یہ بات لگنا بھی دشوار تھا۔

”آپ کو گرین ہاؤس اسکیم کے لیے بجٹ کم پڑ رہا تھا اس لیے میں نے بجٹ کو ری شیپ کیا ہے۔“ وہ اپنے کاغذات آگے پلٹ کرتا نہ لگی۔ ”ہمیں جتنی رقم چاہیے وہ ہمارے بجٹ کے اندر ہی پوری ہو سکتی ہے اگر ہم فالتو لوازمات کو نکال دیں۔“

”مطلب؟“ تایا فرقان نے ابرو اٹھائے۔

”ہم ہر سال تمام شیئر ہولڈرز کو سالانہ پروفٹ کا ایک منقسم حصہ دیتے ہیں جبکہ بہت سی کمپنیاں شیئر ہولڈرز کو سالانہ پروفٹ dividend دینے کے بجائے اس کو ری انویسٹ کرتی ہیں۔ ہم بھی اس دفعہ شیئر ہولڈرز کو وہ حصہ دینے کے بجائے اسے اس پروجیکٹ میں لگا دیں گے۔“

”مگر اس طرح تو مطلوبہ رقم پوری نہیں ہوگی۔“

”ولید! آپ ان کو بات مکمل کرنے دیں۔“ سیٹھی صاحب نے پہلی دفعہ ولید کو ٹوکا۔ پہلی دفعہ بورڈ میٹنگ میں اس کی سائیڈ لی گئی تھی۔ سب خاموش ہوئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

”ہم اپنے بجٹ کا پندرہ سے بیس فیصد حصہ مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزمنٹ پر خرچ کرتے ہیں۔ ہم فی الحال بھی یہی کر رہے ہیں۔ ہم مارکیٹنگ کر رہے ہیں تاکہ مستقبل میں ہمیں پروجیکٹس ملیں۔“ وہ لمحے بھر کو رکے۔ بی میز کے گرد موجود تمام ایگزیکٹوز اب

واقعتاً بغور اسے سن رہے تھے۔

”مستقبل کے پروجیکٹس جو ابھی ملے نہیں اور جن پہ کام کرنے کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں ان کے لیے ہم اپنے حالیہ پروجیکٹ کو قربان کر سکتے ہیں۔ میں نے مارکیٹنگ بجٹ کو گھٹا کر پانچ فیصد کر دیا ہے۔ یوں ہم بہ آسانی وہ رقم آہستہ آہستہ اس پروجیکٹ میں منتقل کر سکتے ہیں۔ کیا کسی کو کوئی اعتراض ہے؟“

پچھلے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اس نے ذرا مسکرا کر خاموش بڑے کانفرنس روم پہ نگاہ دوڑائی۔ وہ جانتی تھی کہ اب کوئی اس پہ اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا انتخاب درست ثابت کر رہی تھی۔



آج تایا فرقان کے گھر حیا کے دادا کی برسی کی قرآن خوانی تھی۔ خیرات کی دیکھیں الگ تھیں۔ سب بدعو تھے سوائے اس کے۔ اس کو جانے خواہش بھی نہیں تھی۔

وہ مغرب پڑھ کر لاؤنج میں آئی تو فاطمہ جہان سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

”اچھا! میں جا رہی ہوں۔“ سرسری سا مطلع کر کے وہ باہر نکل گئیں۔ پھپھو پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ابا کمرے میں سو رہے تھے۔ ان کے پاس نرس تھی۔

وہ خاموشی سے صوفے پہ آ بیٹھی اور بی وی کا ریموٹ اٹھایا۔ کنکھیوں سے اس نے لاؤنج کی بڑی کھڑکی کے پار اماں کو لان عبور کرتے دیکھا۔ وہ اس سے ناراض نہیں تھیں بات بھی ٹھیک سے کرتیں مگر ایسے جیسے کہ انہیں بہت دکھ پہنچایا گیا ہو۔

باہر بجلی زور کی چمکی۔ پل بھر کو کھڑکیوں کے باہر سارا لان روشن ہو گیا۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھا۔ حیا نے بی وی نہیں چلایا۔ وہ ریموٹ پکڑے بیٹھی بس اس کو دیکھتی رہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا شاید۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب سائٹ آپ کیلئے جاری رکھ سکیں۔

پاکستانیوں کی ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



LIBRARY FOR PAKISTAN

”ماں کیا کہہ رہی تھیں؟“ اس نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ جہان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ نیلی جینز پہ سیاہ فی شرٹ پہنے، گیلے بالوں کو پیچھے کیے، وہ جیسے کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہا تھا۔

”وہ چاہتی ہیں کہ میں تمہیں سمجھاؤں کہ تم یہ برقع وغیرہ چھوڑ دو۔“ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ اس کی پشت پر لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکی پہ ٹپ ٹپ قطرے گرنے لگے تھے۔ تاریک پڑا آسمان پہلے ہی بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔

”تو تم نے کیا کہا؟“ وہ اسی طرح مطمئن سے انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی جیسے وہ اپنے آفس میں بیٹھا کرتی تھی۔

”بات تو ٹھیک ہے ان کی۔ تم ایک برقعے کے لیے اپنے اتنے رشتے نہیں کھو سکتیں۔“ ماہر بادل زور سے گرجے تھے کھڑکی کے شیشوں پہ

تڑا تڑکرتے قطروں کی اب آوازیں آنے لگی تھیں۔ ”دوسروں کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو جہان۔ کیا تم بھی میرے حجاب سے خوش نہیں ہو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بست رہی تھی۔

”اگر میں کہوں کہ میں نہیں ہوں تب؟ اگر میں کہوں کہ تم میرے لیے اسے چھوڑ دو تب؟“ دور کہیں زوردار آواز آئی تھی۔ جیسے بجلی گرنے کی ہوتی ہے۔ جیسے صدمہ پہنچنے کی ہوتی ہے۔ ”کیا تم مجھے چوائس دے رہے ہو؟“ یکایک اس کی آواز میں سرد مہری در آئی۔

”اگر میں کہوں ہاں تب؟“ وہ اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی دیوار گیر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے سیاہ لمبی قمیص اور جوڑی وار پن رکھا تھا۔ بال بھی سیدھے کر رہے تھے۔ قمیص اور بالوں کے رنگ کا فرق غیر واضح سا تھا۔ سیاہی جس کا نہ آغاز تھا نہ اختتام۔

”مجھے بھی کسی نے کہا تھا کہ خندق کی کوئی جنگ بنو قریظہ کے بغیر وجود میں نہیں آئی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میرے سارے قربات وار تو میرے ساتھ ہی ہوں گے۔“ وہ بھگتے شیشے کے پار تاریک لان کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔

”نایا ابا حجاب کے سب سے بڑے علم بردار، اماں جن کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاؤں اور میرا شوہر جو روز صبح فجر پڑھنے مسجد جاتا ہے، لیکن آج مجھے پتا چلا ہے کہ عائشہ ٹھیک کہتی تھی۔ خندق کی جنگ بنو قریظہ کے بغیر وجود میں آتی نہیں سکتی۔“

بارش کے ٹپ ٹپ گرتے قطرے شیشے سے لڑھک کر زمین پہ گر رہے تھے جب بجلی چمکتی تو بل بھر کو ان میں قوس قزح کے ساتوں رنگ جھلکتے اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ وہ صوفے سے نہیں اٹھا تھا۔ بس گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”اگر میں لوگوں کے لیے حجاب لیتی ہوتی تو لوگوں

کے کہنے پہ چھوڑ بھی دیتی، لیکن میں اب نہیں چھوڑ سکتی۔“ آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر گال پہ پھسلتا گیا۔

”کیوں؟ میں یہی نہیں سمجھ پا رہا کہ آخر کیوں؟“ وہ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ بادل ابھی تک گرج رہے تھے۔

حیا نے جواب نہیں دیا۔ اس نے ایک نظر جہان کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر کونے میں رکھی منی پلانٹ کی سبز بوتل اٹھائی۔ پودے کی نیل جھٹک کر نکال پھینکی اور بوتل کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے دیوار پہ مارا۔ کانچ ٹوٹا۔ ٹکڑے کرتے گئے اور ایک نوک دار بڑا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

”یہ پکڑو۔“ اس نے بوتل کی گردن کا وہ ٹکڑا جہان کی طرف بڑھایا۔ ”اور جا کر اپنی ماں کی گردن اتار دو۔“

”حیا!“ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ حیا نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا اور آخری ٹکڑا باقی ماندہ کرچیوں پہ پھینک دیا۔

”نہیں کر سکتے نا؟ کانٹ اٹھتا ہے نا دل؟ لگتا ہے نا جیسے آسمان پھٹ پڑے گا اگر تم نے ایسا سوچا بھی؟“ اس نے گردن موڑ کر بھیگی آنکھوں سے باہر برستی موسلا دھار بارش کو دیکھا۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ بولی تو اس کی آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے جہان! اللہ نے امانت کو آسمان و زمین پہ پیش کیا تھا، مگر دونوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور اسے انسان نے اٹھالیا تھا۔ تمہاری ماں، ایک انسانی جان تم پہ امانت ہے۔ ایسے ہی مجھ پہ میرا وعدہ امانت ہے۔ میں نے زندگی میں بس ایک دفعہ کوئی وعدہ کیا تھا اللہ تعالیٰ سے۔ کوئی مجھے اسے نبھانے کیوں نہیں دیتا؟“

بجلی نے اپنی چاندنی پھر سے ہر سو بکھیر دی۔ بس لمحے بھر کی چاندنی اور پھر۔ اندھیری رات چھا گئی۔ ”مجھے کسی نے کہا تھا کہ دل مارے بغیر نور نہیں ملتا

اور میں سوچتی تھی کہ نور کیا ہوتا ہے؟ جانتے ہو نور کیا ہوتا ہے؟“ آنسوؤں نے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا، دم گھونٹنے والا پھندا۔

”نور قرآن ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم جن کو پورے کا پورا لیا جاتا ہے۔ ایک حصہ لے کر دوسرے سے انکار نہیں کیا جاتا جہان! میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ اللہ کیوں کہتا ہے کہ اگر وہ قرآن کو پہاڑ پہ نازل کرتا تو وہ ٹوٹ جاتا۔ مجھے کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ مگر آج آگئی ہے۔“

گرم، ابلتے آنسو اس کی ٹھوڑی سے پھسلتے ہوئے، گردن تک لڑھک رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی اور وہ اسے۔

”جانتے ہو پہاڑ کیوں ٹوٹتا؟ کیونکہ وہ قرآن کو پورے کا پورا لیتا۔ اور جو شخص قرآن کو پورے کا پورا اپنے دل پہ اتارتا ہے نا، اسے ایک بار ٹوٹنا پڑتا ہے۔“ اس نے جلتی آنکھیں بند کیں۔ اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ پل بھر کو بجلی چمکتی بھی تو اسے پروا نہیں تھی۔

”لوگوں نے مجھے اس لیے چھوڑا، کیونکہ میں نے اللہ کو نہیں چھوڑا۔ تو مجھے واقعی ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں چاہیے۔“

اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ واپس پلٹ رہا تھا۔ اس نے دھندلی بصارت سے گردن موڑ کر اس شخص کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا، جس سے اس نے زندگی کا ایک حصہ محبت کرنے میں گزارا تھا۔ وہ اوپر چلا گیا، مگر حیا اسی طرح سیڑھیوں کو دیکھتی رہی۔

چند منٹ بعد وہ اترتا دکھائی دیا۔ اس کا دستی بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بنا اس کی طرف دیکھے، بنا کچھ کہے، باہر نکل گیا۔ اس نے اسے نہیں روکا، آواز تک نہیں دی۔ دے ہی نہیں سکی۔ آنسوؤں نے ہر راستہ روک دیا۔ وہ جا رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میرے سناٹے دھند

”ہو ہو..... بابا..... بابا..... کیا حکم ہے میرے آقا۔ وہ سچ سچ کا جن تھا، مگر میں اس سے ذرا بھی نہیں ڈری، بلکہ انہیں نے اسے ڈانٹ دیا۔“
”تم نے جن کو ڈانٹ دیا؟“ لڈو کی ڈرائنگ بناتے ہوئے صنڈل نے چونک کر اسے دیکھا۔
”ہاں تو اور کیا، تمہیں پتا ہے میں بد تمیزی بالکل برداشت نہیں کرتی۔“
”جن نے تمہارے ساتھ کیا بد تمیزی کی تھی؟“

ہوگی۔ ”صنڈل نے ڈرائنگ بناتے ہوئے سر دھنکا۔
”حالانکہ اس نے بد تمیزی کی تھی۔“ صنوبر نے ناخنوں پر برش پھیرتے ہوئے کہا۔
”کوئی اور ہوتا تو ڈر کے بھاگ جاتا۔“ صنڈل نے پینسل چھیلے ہوئے کہا۔
”مگر ہماری بیا بزدل تھوڑا ہی ہے۔“ صنوبر نے ناخنوں پر پھونک مار کر کہا۔
”بکواس نہ کرو تم دونوں۔ ویسے ہی میرا موڈ آف

نکولٹ

صنوبر بھی نیل پالش لگانا بھول گئی۔
”اس نے مجھے آقا کیوں کہا۔ میڈم کیوں نہیں کہا؟“ وہ دھپ سے صنوبر کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔
”مگر تم نے صرف ڈانٹا کیوں اسے۔ سزا کیوں نہیں دی بیا!“ صنوبر لطف لینے لگی۔
”وہ۔ بس ایسے ہی۔ مجھے ترس آگیا تھا اس پر۔“
بوکھلا گئی۔

ہے۔ ”اس نے صنڈل کو کشن کھینچ کر مارا۔
”جن کو ڈانٹ کر بھی تمہاری کشنی نہیں ہوئی۔ تم کیا اسے بوتل میں بند کر کے یہاں لانا چاہ رہی تھیں۔“ صنڈل نے کشن کھینچ کر لیا۔
”میں سوچ رہی ہوں اسے سزا دے ہی دیتی۔“ اس نے صنوبر کی نیل پالش اٹھالی۔
”تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ ابھی بلا لوار مان کو۔“ صنڈل نے فوراً مشورہ دیا۔ جواباً اس نے ایک اور کشن صنڈل کو دے مارا۔ اس نے وہ بھی کھینچ کر لیا۔ ان تینوں کے درمیان پھیلے جناتی فسوں کو لڈو کی تیز آواز نے توڑا۔
”آئی! میری ڈرائنگ بن گئی؟“ وہ چونک گئی۔

”ہاں یہ بات تو صحیح ہے۔ رحم دل تو بہت ہو تم۔“
صنوبر نے متاثر ہونے کی اداکاری کی اور — نیل پالش کا برش اٹھا کر دوبارہ اپنے ناخنوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”جن کو معاف کر دیا۔ اس سے بڑی رحم دلی اور کیا



شاہد

گھرے رنگ کا لٹو صرف نیکر پہنے اسی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اس کا نام لٹو کے بجائے گلاب جاسن ہو تا تو زیادہ اچھا ہوتا۔“ اس نے غور سے لٹو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”آئی! یہ لیس حلوہ امی نے بھجوا دیا ہے اور آپ نے لٹو کی ڈرائنگ بنا دی۔ میری نہیں بنائی۔“

لٹو کے ہم عم اور ہم رنگ بھائی نے صندل کے قریب آکر لاڈ سے شکوہ کیا۔

”لٹو کی امی اپنے بچوں کی پیدائش پر افریقہ چلی جاتی ہیں کیا؟“

گو نگلو کی آمد پر اس نے باری باری دونوں بچوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور حلوے کا پیالا اٹھالیا۔ وہ دونوں اس کی بات سمجھ کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑیں۔

”بری بات بیا!“ صندل نے اسے ٹوکا پھر بچوں سے مخاطب ہوئی۔

”نہیں گو نگلو! میں نے تمہاری بھی بنائی ہے دیکھو!“ اس نے دو ڈرائنگ بکس دونوں بچوں کی طرف بڑھائیں۔ دونوں نے آگے بڑھ کر لی اور وہیں بیٹھ کر شوق سے دیکھنے لگے۔

”حلوہ مزے کا ہے۔“ اس نے چمچ بھر کر کھاتے ہوئے کہا۔

”لٹو کی امی افریقی کھانے بہت اچھے بناتی ہیں۔“ صندل نے کہا۔ صنوبر زیر لب مسکرا دی۔

”حلوہ افریقی دُش ہے؟“ اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔

”افریقی ہو یا جاپانی، تم چپ کر کے کھاؤ۔“ صنوبر نے دو تین چمچے کھانے کے بعد اپنا چمچ الگ رکھا اور صوفے پر سے اٹھ گئی۔ صندل بھی اٹھ کر اپنے پاس جمع ہو جانے والے کُشن ان کے ٹھکانے پر رکھنے لگی۔ وہ حلوہ صاف کرنے میں مصروف تھی۔

”تم دونوں کی ڈرائنگ بن گئی تو چلو۔“

بھاری، مردانہ، کُرخت آواز پر اس نے یوں ہی پلیٹ کر دیکھا۔ حلوے کا پیالا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ زور کی چیخ ماری اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگی۔ صندل اور صنوبر ہڑبکا کر متوجہ ہوئیں۔ لٹو اور گو نگلو بھی دہشت زدہ سے ہو کر اپنی بکس چھوڑے باہر کی جانب لپکے جبکہ اشفاق بھائی حیرت سے منہ کھولے یہ ساری افراتفری دیکھ رہے تھے مگر سمجھنے سے قاصر تھے۔

”کیا ہوا اشفاق بھائی!“ صنوبر تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

”میں بھی یہی پوچھنا چاہ رہا ہوں۔“ انہوں نے بھی حیرانی سے صنوبر کو دیکھا۔ وہ بتانے والی کیفیت میں نہیں تھی۔ صندل نے صورت حال کا اندازہ لگایا اور اس کے کان میں کہا۔

”بیا نے اشفاق بھائی کو دیکھ کر چیخ ماری ہے۔“

”کیوں؟“ صنوبر نے فوراً کہا مگر اشفاق بھائی کو دیکھ کر فوراً سمجھ بھی گئی۔ لمبے ترنگے، کالے بھنگ اشفاق بھائی کو دیکھ کر بیا کو یقیناً ”جن یاد آگیا ہوگا۔“ لیکن وہ تو جن سے نہیں ڈری تھی۔ ”صنوبر نے سرگوشی میں کہا۔

”صنوبر! وہ ہماری بیا ہے۔ وہ کبھی بھی کچھ بھی کہہ بھی سکتی ہے اور کر بھی سکتی ہے۔“

”اوہ!“ صنوبر نے سمجھ کر سر ہلایا۔ ان دونوں کی کھسر پھر پہلے تو اشفاق بھائی دیکھتے رہے پھر جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو چپ چاپ مڑ گئے۔ ان کے دونوں بچے پہلے ہی شور مچاتے ہوئے بھاگ گئے تھے۔ اب نبیہا کو ڈھونڈنا تھا کہ وہ بھاگ کر کہاں پہنچی ہے۔

* * *

”بڑے بھائی! نانو کا گھر کب آئے گا۔“

”بس چھوٹے بھائی! آنے ہی والا ہے۔“

”میرا تو خیال ہے اسٹیشن سے نانو کے گھر تک جانے کے لیے بھی ایک ٹرین پکڑ لیتے۔“

”ٹرین! کیا تم جلدی پہنچنا چاہتے ہو۔ میں سمجھا تھک گئے ہو۔“

ارسل نے عمر کے تھکن سے ہیمنہ ہیمنہ ہوتے چہرے کی طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ خود اس کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں مسلسل دو گھنٹے سے پیدل چل رہے تھے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد عمر یہی پوچھتا اور وہ بھی یہی جواب دے دیتا۔

عمر نے خفگی سے ارسل کو دیکھا۔ جسے اس کی تھکن نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنا بیگ دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے مماسے صحیح ایڈریس لیا تھا نا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بھٹک گئے ہوں۔“

”ہاں لے لیا تھا۔ بیا نے کہا تھا، نانو کا گھر تقریباً آٹھ دس میل دور ہے اسٹیشن سے۔ اور ابھی تو ہم صرف تین چار میل ہی چلے ہوں گے۔ ہے نا تمہارا کیا خیال ہے؟“

ارسل نے اطمینان سے کہا۔ عمر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے اپنا بیگ زمین پر پٹخ دیا۔

”تھوڑی دور۔ تھوڑی دور کہہ کر تم مجھے تین میل سے پیدل چلا رہے ہو۔ تم ٹیکسی نہیں کر سکتے؟“ اس نے زمین پر زور سے پاؤں مار کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”یار! میں نے سوچا تھوڑی آونٹک ہو جائے گی۔ ٹرین میں اٹھارہ گھنٹوں سے بیٹھے تھے۔ کمر اکڑ گئی تھی۔ پھر بیا بھی تو کہہ رہے تھے کہ تم موٹے ہو رہے ہو۔ سو واگ ہو گئی تھوڑی سی بس۔“ ارسل نے سکون سے کہا اور عمر ایک بار پھر سلگ گیا۔

”میں موٹا ہو رہا ہوں۔ میں؟“ اس نے شرٹ سے نکلتی ہوئی ارسل کی چھوٹی سی توند دیکھی اور ساری جان سے جل گیا۔

”تمہارا بس چلتا تو مجھے لاہور سے ہی پیدل چلا کر لاتے۔“ وہ بنگلوں کے سامنے سڑک کے عین بیچ میں کھڑا تھا۔ ”میں پہلی دفعہ آیا ہوں۔ اس لیے تم مجھے

بے وقوف بنا رہے ہو۔“

”بس چھوٹے بھائی! آنے ہی والا ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا، تم اتنی جلدی تھک جاؤ گے۔ اور اب تو تم اتنے بڑے بھی ہو گئے ہو کہ میں تمہیں گود میں بھی نہیں اٹھا سکتا۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ البتہ پیشانی پر اس کے بھی پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

”میں ٹیکسی روک پر رہا ہوں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”ان گلیوں میں ٹیکسی نہیں ملے گی یار! صبر کرو نا۔ جوان آدمی ہو اور اتنی جلدی تھک گئے۔ اتنی توڑکیاں بھی نازک نہیں ہوتیں۔“ وہ عمر سے چند قدم آگے ایک گھر کے پیڑ کے سائے میں کھڑا تھا۔

”سچ بتاؤ! ابھی تمہارے ساتھ کوئی لڑکی ہوتی تو تم اسے اتنا پیدل چلاتے؟“ اس نے جل کر پوچھا۔

”بڑے بھائی کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو؟ کیسے چھوٹے بھائی ہو۔ آستین کا سانپ لگ رہے ہو اس وقت۔“ ارسل الناس پر ناراض ہونے لگا۔

”تم اپنے صرف پانچ منٹ بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ خوا مخواہ رعب ڈال رہے ہو۔“

عمر نے بے بسی سے کہا۔ وہ پہلی دفعہ کراچی آیا تھا۔ جبکہ ارسل اس سے پہلے بھی ایک دفعہ آچکا تھا اور اس وقت وہ اپنا حافظہ آزمایا رہا تھا۔ وہ مکمل تفریح کے موڈ میں تھا مگر عمر کو ایسی سیاحت کا کوئی شوق نہیں تھا۔

”اور تم صرف پانچ منٹ چھوٹے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ خوا مخواہ لاڈ دکھا رہے ہو۔“

اس نے ٹٹنی جھکا کر ایک پھول توڑ لیا۔ عمر وہیں دھوپ میں کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا۔ اس کے کان کے پیچھے پھول پھنسیا اور اس کا بیگ اٹھا کر اس کے کندھے پر جما کر بار سے بولا۔

”بس چھوٹے بھائی! یہ چار گلیاں چھوڑ کر اپنی نانو کا گھر ہے۔“

”چار گلیاں۔ شیطان کی آنت جیسی لمبی لمبی چار گلیاں ابھی مزید بانی ہیں؟“

اس نے ایک بار پھر اپنا پاؤں پٹخا۔ ارسل چار چھ قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ عمر کو منہ بنائے وہیں کھڑے دیکھ کر بیٹا اور ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔
”چل نایار! حوصلہ پکڑ وہ دیکھ! وہ براؤن کلر کا بنگلہ۔ بس آگیا۔“

اس نے پچکارا، عمر نے دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا۔ وہ ابھی بھی بہت دور تھا۔ اس نے زچ ہو کر ارسل کو گھورا۔ اس کے گرمی سے سرخ ہوتے چہرے پر اطمینان تھا۔ سامنے ایک لمبی سڑک تھی۔ جس میں بارش کا پانی کھڑا ہوا تھا۔ ارسل فوراً ”بنگلوں کے آگے بنی فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ عمر احتجاجاً اس کھڑے ہوئے پانی میں چلنے لگا۔ ارسل نے دیکھ کر مسکراہٹ دہائی۔ اگر عمر دیکھ لیتا تو وہ یقیناً اسے بھی کھینچ لیتا۔
”دیکھنا! واپسی پر میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“ اس نے دھمکیا۔ ارسل نے کوئی جواب نہیں دیا اور ناراض بھائی کا ہاتھ پکڑ کر گنگنا لگا۔
”میں تیرے سنگ کیسے چلوں بچا! تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا۔“

☆ ☆ ☆

”تم نے تاج برادرز کو انوائس ابھی تک نہیں بنائی۔ نہایت سست آدمی ہو تم۔“ مجیب صاحب سخت غصے میں تھے۔ ارمان ان کے سامنے منہ بنا تا بیٹھا ہوا تھا۔

”جاؤ ابھی پانچ منٹ میں تیار کرو۔ اور مہران ٹریڈرز کی فائل لے کر آؤ۔ کیا شرائط ہیں ان کی۔ اگر ہم مان لیں تو ہمیں ان کے ساتھ بزنس کرنا ہے۔“
”سر! ان کے ساتھ بزنس کرنا ہمیں بلکہ آپ کو بہت منگناڑے گا۔ بہتر ہوگا آپ ان کے ساتھ بزنس نہ کریں۔“ ارمان نے نہایت اطمینان سے مشورہ دیا۔
”وہ کیسے؟“ انہوں نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی۔
”سر! ان کی شرائط بہت کڑی ہیں۔“

”پتا چلے۔“ مجیب صاحب ذرا متوجہ ہوئے۔

”نہیں سر! مجھے شرم آرہی ہے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ اگر آپ نے ان کے ساتھ بزنس کیا تو آپ مجھ جیسا گوہر نایاب کھودیں گے۔“ اس نے اترانے کی کوشش کی۔

”پھر تو میں ان کے ساتھ ضرور بزنس کرنا چاہوں گا۔“ انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

”سر! اچھی طرح سوچ لیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہاں تین تین لاشیں ایک ساتھ گریں گی۔“ ارمان نے میز پر مکا مارا۔

”تیسری کس کی ہوگی؟“ انہوں نے چشمہ اتار کر اب صحیح سے اسے گھورا۔
”پہلی دو معلوم ہیں آپ کو؟“

”شٹ اپ!“ انہوں نے دوبارہ چشمہ لگالیا۔
”تیسری لاش آپ کی ہوگی۔ آپ کی ہوگی سر! ایک ظالم شخص کی۔“ اس نے پھر میز پر مکا مارا۔
”میری کیوں ہوگی؟“ انہوں نے چونک کر چشمہ اتار لیا۔

”آپ پچھتاہیں گے اس وقت اور خود کو شوٹ کر لیں گے۔“ اس نے پیپر ویٹ گھماتے ہوئے یقین سے کہا۔

”مجھے پچھتاوا نہیں ہوگا۔“ انہوں نے اطمینان سے کہہ کر پھر چشمہ لگالیا۔

”لیکن خودکشی آپ کو کرنی پڑے گی سر!“ وہ روانی میں کہہ گیا۔ مجیب صاحب نے چشمے کی اوٹ سے پھر اسے گھورنا شروع کیا۔

”تم بالکل اضافی شخص ہو ارمان! میرے دفتر میں بھی اور میرے خاندان میں بھی۔ جاؤ اور مہران ٹریڈرز کی فائل لا کر دو مجھے فوراً۔“

”سر! میں آپ کی بیگم کی بھانجی کا ہونے والا شوہر ہوں۔ آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔“

اس نے میز پر مارنے کے لیے پھر ہاتھ اٹھایا، مگر اس وقت ہاتھ میں پیپر ویٹ تھا، سو آرام سے رکھ دیا۔

”اف میرے اللہ! تم مجھے پاگل کر دو گے ارمان! کیا

شرائط ہیں ان کی۔“ انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔
”سر! ان کی پہلی شرط یہ ہے کہ آپ ان کی سیکریٹری سے اپنے مینجر کی شاوی کرویں۔“ اس نے اپنے چہرے کے زوایے یوں بگاڑے جیسے بہت زود رنج ہو۔ مجیب صاحب نے ایک لمحے کا توقف کر کے کہا۔

”اس میں مجھے کیا خسارہ ہے۔ بلکہ میری بھانجی کو بھی تم سے لاکھ درجے اچھا۔ انسان مل جائے گا۔ مجھے اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جاؤ! اور انہیں اڑکے کرو۔“

”آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں خالو! وہ سچا گیا۔“

”یوے گو ناؤ۔“ مجیب صاحب دھاڑے۔ وہ تلملاتا ہوا ان کے کمرے سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

”کاش! ارمان جیسا ہمارا بھی ایک ایک منگیتر ہوتا۔“ صندل نے میگزین میں ایک خوب صورت ہیرو کی تصویر دیکھی تو حسرت سے کہا۔

”ایک ایک سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“ صنوبر نے چونک کر پوچھا۔ وہ وہیں بیٹھی اپنا مینی کیور کر رہی تھی۔ اس کے وہی شوق تھے۔ کوئنگ اور گرو منگ۔
”ہمیشہ غیر اہم بات پر اٹکنا۔ میں نے ارمان جیسا بھی تو کہا تھا۔ وہ ہمیں سنا تم نے۔“ صندل نے زور سے کہا۔

”اب اس پہ کیا اٹکنا۔ وہ تو ہماری بیا کے گھر لٹک گیا۔“ اس نے سیمپو اور ڈیوئل ملے پانی سے ہاتھ نکال کر پونچھتے ہوئے کہا۔

”ہاں مگر ہمارے ڈیڈی کے پاس کام کرتا ہے۔ اس طرح پہلا حق تو ہمارا ہونا اس پہ۔“ صندل نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ نظریں ابھی تک تصویر پر جمی تھیں۔
”ہاں یہ تو ہے۔ مگر صندل! یہ بھی تو سوچو ہمارے آفس میں کام کرنا ہے اس طرح تو وہ ہمارا ملازم ہی ہوا نا۔ ہمارا اور اس کا کیا جوڑ؟“

اس نے فائبر سے ناخنوں کو شہپ دیتے ہوئے اپنے تئیں بڑی اہم بات کی۔
”بری بات صنوبر! وہ بے شک ہمارے ڈیڈی کے پاس کام کرتا ہے، مگر یہ بھی تو دیکھو ڈیڈی اس پہ کتنا ٹرسٹ کرتے ہیں۔ پورا آفس اس نے سنبھالا ہوا ہے۔ ڈیڈی آدھے گھنٹے کی میننگ بھی اس کے بغیر نہیں کرتے۔ اور پھر وہ ہماری پیاری بیبا کا منگیتر بھی تو ہے۔ اس اعتبار سے ہمارا اس پر کوئی حق نہیں ہوا۔“
صندل نے رمان سے اسے سمجھایا تو وہ سر ملاتے ہوئے اپنے ہاتھوں پر مونچسچر اتر لگانے لگی۔
”ویسے اس کی جوڑی بیا کے ساتھ ہی بیچتی ہے۔“

دونوں کی نظروں میں ذہن اونچا لبا خوش شکل اور خوش مزاج سا ارمان گھوم گیا۔ ساتھ ہی معصوم سی پیاری سی ننٹ کھٹ شرارتی سی نیمہا عرف بیا۔
”کیا ہوا۔۔۔ جو بیا کو لمبی لمبی ہانکنے کی عادت ہے۔“
اس کے ذکر پر صندل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ صنوبر نے بھی مسکرا کر اپنے ہاتھوں کو دور کرتے ہوئے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ اس کا مینی کیور مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے نیچل نیل پالش کی شیشی اٹھائی ہی تھی کہ ثریا بیگم کی آواز آئی۔
”صندل۔۔۔ صنوبر!“

”جی دادو۔۔۔“ وہ دونوں وہیں سے چلا آئیں۔ صنوبر نے فوراً ”ساری کا سیدکس بیڈ کے نیچے دھکیلیں اور بیڈ کی چادر درست کرنے لگی۔ صندل نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا۔ سارے میگزین ٹیکے کے نیچے چھپائے اور خواہ مخواہ اپنے دوپٹے سے ٹیبل کلاک اٹھا کر جھاڑنے لگی۔ ثریا بیگم نے غور سے دونوں کی سرگرمی دیکھی۔ دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر صفائی میں مصروف تھیں، تاہم خاموش رہیں۔ جانتی تھیں کہ اس کے باوجود سارے کام اپنے وقت پر ہو جائیں گے۔
”میں یہ کہنے آئی تھی کہ پورے گھر کی صفائی کروالو“
کشن پردے بدلو اور کھانے کا بھی اہتمام کرلو۔“

”او کے دادو! مگر اتنا اہتمام کس لیے۔۔۔ کس کی دعوت ہے؟“
”تمہاری پھپھو آرہی ہیں لاہور سے۔“
”ہیں دادو! واقعی؟“ دونوں خوشی سے چیخیں۔
”گنتے عرصے بعد آرہی ہیں نا۔“ صندل کی آواز میں بے تابی تھی۔
”کل آرہی ہے عید ہمیں کرے گی۔“ ثریا بیگم کہہ کر جانے لگیں۔
”عید ہمیں کریں گی تو اتنی جلدی آنے کی کیا ضرورت ہے۔“
صندل کے منہ سے پھسلا۔ انہوں نے پلٹ کر گھورا۔

”میرا مطلب ہے دادو! بہت اچھا کر رہی ہیں اتنی جلدی آکر۔ انہیں تو دو مہینے پہلے ہی آجانا چاہیے تھا۔“ صندل نے سنبھل کر کہا۔
”اچھا دادو، مینو بتائیے۔ کیا کیا بنانا ہے۔“ صنوبر نے بات پلٹ کر ان کا دھیان ہٹایا۔
”ہاں، کچن میں چلو۔ فریج میں دیکھو کیا کیا ہے۔ جو چاہیے کریم سے منگوالو۔“
”جی دادو!“ دونوں فرماں برداری سے ان کے پیچھے چل پڑیں۔

”ہیلو ڈبل ایس ٹریڈرز!“
”مجھے یہ حوالے مت دیا کرو۔ میں جانتی ہوں یہ میرے خالو کی کمپنی ہے۔“
”اور مجھے جانتی ہیں آپ۔۔۔ میں آپ کے خالو کا مینجیئر کم۔۔۔ کمپیوٹر آپریٹر کم۔۔۔ ٹیلی فون آپریٹر کم۔۔۔“
”ارمان! ہر وقت فضول باتیں نہ کیا کرو، کبھی کام کی بات بھی کر لیا کرو۔“
”بیا! تم بھی ہر وقت کام کی باتیں نہ کیا کرو، کبھی پیار کی بات بھی کر لیا کرو۔“
”اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ کیا کر رہے تھے۔“
”حق ہا۔۔۔ مت پوچھو، تمہیں دکھ ہوگا۔“

”بتاؤ، پہلے کون سی خوشی ہوتی ہے۔“ کھٹ سے جواب ملا۔
”اچھا ایسی بات ہے تو سنو! میں مران ٹریڈرز والوں کی سیکرٹری کو اپنا پروپوزل بھجوا رہا ہوں۔“ اس نے فون پر ہی آنکھیں سکیڑ کر کہا۔
”کیا۔۔۔ مانغ ٹھیک ہے تمہارا؟ کیا فضول بول رہے ہو۔ میں ابھی خالو سے کہتی ہوں۔“ وہ چیخی۔
”تمہارے خالو نے ہی کہا ہے۔ وہی ہمیں جدا کرنے کی پلاننگ کر رہے ہیں۔“
”وہ ایسا کیوں کریں گے۔ میرے خالو مجھے بہت چاہتے ہیں۔“ وہ اتر کر بولی۔
”مگر میں تمہیں ان سے زیادہ چاہتا ہوں۔“
”اچھا تو پھر بتاؤ! اس عید پر تم مجھے کیا سربراہانہ دے رہے ہو؟“ فوراً ”اٹھلا کر پوچھا گیا۔
”ہمیشہ کی طرح۔۔۔ ڈھیر ساری۔۔۔ دعائیں!“
دوسری طرف سے بھی فوراً ”مسکرا کر جواب دیا گیا۔
”تم سے یہی امید تھی۔“ وہ جل کر بولی۔
”نہیں، نہیں۔۔۔ سنو تو! اس دفعہ میں نے سوچا ہے، عید کی نماز پڑھتے ہی تمہارے گھر آجاؤں اور تین دن تک تمہارے گھر میں ہی رہوں۔ کیا؟“
کافی دیر تک آگے سے کوئی جواب نہیں آیا۔
”بیا۔۔۔ بیا! مجھے پتا ہے خوشی کے مارے تمہاری آواز نہیں نکل رہی۔ مگر واقعی میں نے اس دفعہ یہی سوچا ہے، تمہاری قسم۔ اور مجھے پتا تھا، تم خوشی کے مارے پاگل ہو جاؤ گی۔ پلیز اپنا خیال رکھو سوٹ ہارٹ!“
”ارمان۔۔۔ تمہارا منہ دھلا ہوا ہے؟“ بہت چبا چبا کر پوچھا۔
”آف کورس بیا! صبح نہاتا ہوں تو ساتھ ہی منہ بھی دھل جاتا ہے۔“
”سنو! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس دفعہ عید پر تم مجھے بکرا گفٹ کرو گے۔ سمجھے!“
”بکرا۔۔۔ تمہیں پتا ہے تمہارے خالو کتنے کنجوس

ہیں۔“ وہ اس کی فرمائش پر چیخ اٹھا۔
”میں تم سے بکرا مانگ رہی ہوں، خالو سے نہیں۔“
”مگر مجھے تنخواہ تو وہی دیتے ہیں نا، اور کتنی کم دیتے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے، آخر تمہارے خالو کی کمپنی ہے۔“
”مجھے کچھ نہیں پتا ارمان! یہ میری عزت کا سوال ہے۔“ اس نے ناراضی سے کہا، پھر فوراً ”التجارت پر اتر آئی۔“
”دیکھو! اس سے تمہارا بہت رعب پڑے گا سب پر۔ خالو بھی متاثر ہو جائیں گے۔ وہ تمہاری تنخواہ بھی بڑھا دیں گے۔ مران والوں سے بھی تمہاری جان چھوٹ جائے گی اور میرا سر بھی فخر سے بلند ہو جائے گا۔“
”بیا! منگیتر کو عید پر بکرا دینا ایسا کام نہیں ہے، جس سے سر بلند ہو۔ میں بکرا گفٹ کروں گا۔ بکرا بناؤں گا نہیں۔“
”تم بکرا بناؤ، امپورٹ کرو، اگاف۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔ مجھے صرف بکرا چاہیے۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
”ایک دفعہ پھر سوچ لو بیا! تمہیں بکرا چاہیے یا میں؟“ اس نے جذباتی وار کیا۔
”بکرا۔۔۔ اور فون بند ہو گیا۔“

”وہ تو گائے کہہ رہا تھا۔ میں نے ہی منع کر دیا۔“ وہ آج پھر اپنی خالہ کے گھر میں تھی۔
”ہائے کیوں بیا! لے لینی بھی ناگائے۔ ج! خوب مزا آتا، گھمانے لے جاتے اسے۔“ صنوبر نے اشتیاق سے کہا۔
”دراصل میں اس پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔“
نیمہا نے بہت پیار سے کہا۔
”اوہو! بڑا خیال ہے بھی، کیا بات ہے۔“ صندل نے کہا تو وہ ایک اداس مسکرا دی۔
”میٹھی عید پر بھی وہ مجھے ڈائمنڈ رنگ دے رہا تھا

مگر میں نے منع کر دیا۔“
 ”ہاں اور پھر اس نے سونے کی لونگ بھی نہ دی۔“
 صنوبر نے اس کی بات کاٹ کر لقمہ دیا۔
 اس نے کراہ سا جواب دینے کے لیے منہ کھولا
 ہی تھا کہ ثریا بیگم کی آمد پر وہ دونوں ان کی طرف متوجہ
 ہو گئیں مگر نبیہا بریانی کھاتی رہی جو وہ خود ان دونوں
 کے لیے لائی تھی۔

”دیکھو لڑکیو! انتظام صحیح کر لینا سب کسی چیز کی کمی
 نہ ہو۔ کوئی انٹی سیدھی بات بھی نہ ہو۔ اپنی حرکتوں پر
 قابو رکھنا اور نبیہا کو بھی سمجھا دینا اچھی طرح۔ کوئی
 اول فول نہ بکے۔ سہلی کو برا لگ گیا تو پھر لینے کے دینے
 پر مجاہدیں گے۔ اتنی مشکلوں سے تو راضی ہوئی ہے۔“
 انہوں نے نبیہا کو دیکھا نہیں تھا۔ ان کی بات پر وہ
 بریانی چھوڑ کر جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

”میں اول فول بکتی ہوں دادو!۔“ صنوبر اور صندل کی
 طرح وہ بھی ثریا بیگم کو دادو کہتی تھی۔
 ”اوہ! تو تم موجود ہو یہاں۔“ وہ اس کی طرف
 گھومیں۔

”لو بھلا۔ میں بھی خواجواہ حیران ہو رہی ہوں۔ تم
 تو دستیاب ہی نہیں ہوتی ہو۔“

ان کی بات پر صندل اور صنوبر کھلکھلا کر ہنس
 پڑیں۔ اس نے تمل کر منہ بنایا تو وہ کہنے لگیں۔

”ہاں تو کیا غلط ہے اس میں۔ ہر وقت یہیں پائی جاتی
 ہو اور ان اپ شاپ بھی تم ہی بولتی ہو۔ کبھی صندل اور
 صنوبر کو دیکھا ہے انٹنا سیدھا ہاتھتے ہوئے۔“

انہوں نے ایک منٹ میں اچھا خاصا تار دیا اسے۔
 وہ برے برے منہ بنانے لگی۔

”دادو! کیا کہہ رہی ہے ارمان اس دفعہ عید پر اسے
 بکرا لگت کر رہا ہے۔“ صندل نے استیاق سے بتایا۔
 ارمان کے نام پر اس کے ہونٹوں پہ دلفریب سی
 مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اچھا۔ اسی نے فرمائش کی ہوگی اس بے چارے
 سے۔“

ثریا بیگم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ اس

کی مسکراہٹ پھر غائب ہو گئی جبکہ صندل اور صنوبر پھر
 قل قل کر کے ہنسنے لگیں۔ صنوبر قالین پر بیٹھی گلداران
 میں پھول سجاری تھی وہیں لوٹ لوٹ ہو گئی۔ صندل
 دیوار پر نیا ڈیکوریشن پیش نگار رہی تھی وہیں منہ پر ہاتھ
 رکھ کر کھی کھی کرنے لگی۔ نبیہا پاؤں پیچ کر وہاں سے
 جانے لگی۔

”اب نہیں آؤں گی آپ کے گھر۔ اچھا دادو! سن
 لیں۔“

انہوں نے ذرا سا ہاتھ اٹھا کر لاپرواہی سے ہلادیا۔ وہ
 بھناتی ہوئی لاؤنج سے نکل گئی۔ صندل اسے آوازیں
 دیتی رہ گئی۔

”دادو! ناراض کر دیا آپ نے اسے۔“
 ”اس کی ماں کا فون آیا تھا کام تھا کوئی ایسے ہی کہتی
 تو گھنٹہ لگا دیتی جانے میں۔“

”اچھا طریقہ ہے اسے بھگانے کا۔“ صنوبر پھر ہنسی۔

”اچھا اب تم دونوں بھی اپنی بتیسی بند کرو۔ سہلی
 آنے ہی والی ہوگی بس تمہاری صفائیاں ختم نہیں
 ہوئیں ابھی تک۔ ذرا خود بھی نہادو کر فریش ہو جاؤ۔
 اس جلے میں نہ آجانا اس کے سامنے۔ ابھی کچن بھی
 دیکھنا ہے۔ اور ہاں! شام کے کھانے پر لڑو کی ماں کو
 بھی بلا لینا یاد ہے۔ آخر کرائے داروں کا بھی حق ہوتا
 ہے۔“

وہ کہتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئیں۔

”اے۔۔۔ کیا بد تمیزی ہے۔ شرم نہیں آتی
 دوسروں کے گھروں میں جھانکتے ہوئے۔“

نبیہا نے ایک جوان لڑکے کو گیٹ کے اوپر سے
 جھانکتے ہوئے دیکھا تو غصے سے ڈانٹتے ہوئے آگے
 بڑھی۔ جب تک عمر گیٹ کے اوپر سے ہاتھ ڈال کر
 کنڈی کھول چکا تھا۔ گیٹ کھلا تو ارسل بیگ اٹھائے
 اطمینان سے اندر بڑھ گیا۔ نبیہا پہلے غصہ کر رہی تھی
 مگر جب دو لڑکوں کو اتنے اطمینان سے اندر گھستے دیکھا

تو ڈر گئی۔
 ڈاکو۔ خیال آیا مگر نہ بھاگنے کی ہمت ہوئی نہ چیخنے
 کی۔ وہیں بت بن گئی۔ ارسل نے سر اٹھا کر دیکھا تو
 ایک لمحے کو رک گیا۔ ”چھوٹے بھائی!“
 ”جی بڑے بھائی!“ عمر فوراً آگے بڑھا۔
 ”مما کو فون کرو۔ میں مہک کو چھوڑنے کو تیار
 ہوں۔“

وہ نبیہا پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ عمر نے ایک نظر
 ارسل پر ڈالی پھر سامنے کھڑی لڑکی پر۔ اس کا انداز بھی
 ارسل جیسا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے
 قریب گیا۔

”کیا تمہاری ممما کو بھی بول دوں؟“ اس نے نبیہا
 کے کان میں کہا۔

”کون ہے بھئی!“ ثریا بیگم کی آواز پر تینوں کا سکتہ
 ٹوٹا۔

”نانو۔!“ ارسل زور سے کہتا ہوا نبیہا کو بھول کر
 آگے بڑھا۔ عمر بھی اس کی تقلید میں آگے بڑھ گیا۔

نبیہا وہیں کھڑی رہ گئی۔

ثریا بیگم حیران سی کھڑی ان دو لڑکوں کو دیکھ رہی
 تھیں۔ کافی دیر بعد انھیں سمجھ میں آیا کہ ان کے
 نواسے ان کے سامنے ہیں۔ وہ بہت عرصے بعد انہیں
 دیکھ رہی تھیں۔ خوشی اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات
 لیے انہوں نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ ارسل اور عمر
 دونوں اپنا بیگ چھوڑ کر ان کی طرف لپکے۔

ثریا بیگم اپنے دونوں نواسوں کو پلٹائے اندر بڑھنے
 لگیں۔ دفعہ ”پلٹ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں ہونق
 بنی کھڑی تھی۔

”ہیا! عانتہ بلا رہی ہے تمہیں گھر جاؤ بیٹا! شام کو
 کھانے پر آنا۔ میں انتظار کروں گی۔“

”دادو نے پہلی دفعہ مجھ سے اتنے پیار سے بات کی
 ہے۔ چلو شکر ہے ان خوب صورت لڑکوں کے سامنے
 میری عزت رکھ لی۔ ورنہ میری بے عزتی کا تو کوئی ٹائم
 نہیں ہوتا۔“

اس نے دل میں سوچا اور ادب سے ”جی دادو“ کہہ

کر دروازے سے نکل گئی۔ ثریا بیگم دونوں لڑکوں کو
 ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں آئیں۔ کریم کو آواز دے
 کر ٹھنڈا لانے کو کہا اور دونوں لڑکیوں کو ڈھونڈنے کی
 غرض سے ادھر ادھر دیکھا۔ نظر نہیں آئیں تو کریم سے
 پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کچن میں چلا گیا۔
 ”بڑے بھائی! دو لڑکیاں اور بھی ہیں یہاں۔ میں
 بھی حرا کو بھول رہا ہوں۔ تم بھی ممما کو فون کرو۔“ اس
 نے ارسل کے کان میں گھس کر کہا۔

”سہلی کیوں نہیں آئی اور اس نے تو مجھے بتایا ہی
 نہیں کہ تم دونوں آرہے ہو۔“

”دراصل نانو! سیما انٹی امریکہ سے آئی ہوئی ہیں۔
 ممما کا پورا ارادہ تھا مگر ان کی وجہ سے نہیں آسکیں۔“

پھر بیانیے کہا کہ آپ سے وعدہ کر لیا ہے۔ نہیں جا میں
 گے تو آپ ناراض ہوں گی۔ اس لیے انہوں نے ہمیں
 بھیج دیا۔ اب وہ اور بیانا چاند رات کو آئیں گے اور۔۔۔
 آپ کو سربراہ کرنے کے لیے ہم نے آپ کو نہیں
 بتایا۔“ ارسل نے تفصیل سے جواب دیا۔ ثریا بیگم
 مسکراویں۔

”اچھا۔۔۔ یہ تو اور بھی زیادہ خوشی کی بات ہے۔
 میری خوشیاں دوبالا ہو جائیں گے۔ میں تو ترس گئی
 تھی۔ سہلی کی بے جاسد کی وجہ سے اتنی دوریاں بڑھ
 گئیں۔ دیکھو بھلا! میں تو پہلی نظر میں اپنے بچوں کو
 پہچان بھی نہ سکی۔ اتنی مدت بعد جو دیکھا ہے۔“ ان کی
 آنکھیں پھر بھر آئیں۔

”نہیں نانو! ایسی بات نہیں۔ اب آگے۔۔۔ ان
 شاء اللہ اب جائیں گے ہی نہیں۔“ عمر اٹھ کر ان کے
 پاس بیٹھ گیا۔ ارسل نے بھی ان کے گرد پیار سے بازو
 حمال کر دیے۔

”اچھا تم لوگ بیٹھو۔ میں کھانا لگواتی ہوں پھر آرام
 کر لینا۔“

وہ پیار سے کہتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ لڑکیوں کے
 پاس جا کر ان کو پہلے سمجھانا ضروری تھا ورنہ انہوں نے
 ضرور کوئی احقانہ بات کر دیتی تھی۔ ثریا بیگم بہت
 احتیاط سے کام لے رہی تھیں۔ اپنی بیٹی کی خیر ملی

طبیعت سے واقف تھیں، سو اس کے بچوں کے سامنے بھی احتیاط برت رہی تھیں کہ کہیں پھر وہ آپے سے باہر ہو جائے اور پھر سالوں کی دوری ہو جائے۔
 ”سہلی نہیں آئی۔ اس کے بیٹے آئے ہیں۔ ذرا ادب سے ملنا۔ تم لوگوں کو سارے حالات معلوم ہیں۔ ماشاء اللہ میری بچیاں بہت سمجھ دار ہیں۔ مجھے امید ہے سنبھل کر رہیں گی۔“
 انہوں نے نصیحت و ہدایت کے ساتھ ساتھ پیار بھی بتایا، تاکہ وہ براہِ اعتماد ہو جائیں۔
 صنوبر نے ثریا بیگم کو تسلی دی۔ خوشی ان کے چہرے سے چمک رہی تھی۔
 ”دادو! آپ بے فکر رہیں۔ پھپھو اس بار ناراض ہو کر نہیں جائیں گی۔“
 ”شباباش میری بچیو! چلو اب نیچے آؤ۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔ نیچے تھکے ہوئے ہیں۔ کھانے کے بعد ان کا کمر ایک دفعہ اور دیکھ لیتا، مگر پہلے سلام دعا کر آؤ۔“

”آئی! میری ڈرائنگ بنادیں۔“
 عمر شربت کا تیسرا گلاس بھر رہا تھا۔ آواز پر چونکا۔
 لٹور نظر پڑی تو مزید چونک گیا۔
 ”یہ کیا ہے بڑے بھائی!“ اس نے ارسل کو متوجہ کیا۔
 ”میرا خیال ہے کوئی بچہ ہے۔ سنو نیچے! کیا نام ہے تمہارا۔“ ارسل نے لٹو کو مخاطب کیا۔ دونوں نیچے بھی نئے چہرے دیکھ کر ٹھنک گئے تھے۔
 ”لٹو! اور یہ میرا بھائی ہے گونگلو۔“
 ”چھوٹے بھائی! یہاں کون لوگ رہتے ہیں۔“
 دونوں نے تعجب سے دیکھا۔
 ”یہ چھوڑو! میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ دونوں لڑکیاں بھی ایسی ہی ہوئیں، چاکلیٹ کیک کی طرح تو۔“
 ”میں بھی ماما کو فون نہیں کرتا۔“ دونوں نے بلند آواز

میں ایک ساتھ کہا، پھر فوراً اپنی آواز دبائی۔
 ”السلام علیکم! میں صندل ہوں اور یہ میری بڑی بہن صنوبر۔“
 ”وعلیکم السلام! میں شیشم ہوں اور یہ میرے بڑے بھائی شہتوت۔“
 عمر نے کھڑے ہوتے ہوئے اسی کے انداز میں برکت کہا۔ دونوں نے عجیب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 ”بڑے بھائی! یہ ہم کہاں آگئے ہیں۔ لٹو گونگلو۔ صندل، صنوبر۔ جنطلات، کھیت۔“ ارسل نے اسے کہنی ماری، مگر وہ باز نہیں آیا۔
 ”کیسی ہیں آپ دونوں اور کیچپ کیا ہے؟“
 ”کیچپ؟“ صنوبر نے صندل کی طرف دیکھا کہ شاید اس کے سننے میں فرق ہو۔
 ”اچھا! وہ نہیں ہوتا یہاں؟“ عمر نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”جی؟“ وہ دونوں سخت متعجب تھیں۔ کچھ ان کے نام انسانی نہیں لگے، کچھ ان کے سوال ایسے تھے۔ دادو کی ہدایت کے مطابق انہیں تیز سے پیش آنا تھا ورنہ ٹھیک ٹھاک جواب تیار تھے ان کی زبان پر۔
 ”ارے! تم لوگ ابھی یہیں کھڑے ہو۔ کھانا لگ گیا ہے۔ صندل! چلو ڈرائنگ روم میں لے کر چلو بھائیوں کو۔“
 ثریا بیگم نے انہیں اب تک وہیں کھڑے دیکھ کر کہا۔
 ”بھائیوں کو؟“ وہ چاروں رک گئے۔
 اپنی گریڈ نام کی بات پر چاروں کی سخت اعتراض ہوا تھا۔
 کھانے پر پُر تکلف اہتمام تھا۔
 ”نانو! بہت اچھا کھانا بنایا ہے آپ نے اور بہت سارا بھی۔“
 ارسل نے ثریا بیگم سے کہا، پھر مسکرا کر عمر کی طرف دیکھا۔ وہ جل گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اسے موٹا کہہ رہا تھا۔ ثریا بیگم مسکرائیں۔

”صنوبر نے کیا ہے یہ سارا اہتمام۔“
 ان کی بات پر صندل نے چیخے روک کر انہیں ناراضی سے دیکھا تو انہیں فوراً اپنی تصحیح کرنا پڑی۔
 ”نہیں، نہیں، صندل نے بھی بہت مدد کی ہے بھئی!“
 عمر نے ارسل کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی خوش خوراک سے واقف تھا۔ اس نے بھنویں اچکا کر ایک سوال کیا۔
 ”چھوٹے بھائی! ماما کو واقعی فون کرو۔“
 عمر مسکرا دیا۔ جبکہ ثریا بیگم سمیت وہ دونوں پھر حیران ہو گئیں۔ ارسل نے ہلکی سی مسکراتی ہوئی ایک نظر صنوبر پر ڈالی اور دوبارہ برائی کی پلیٹ بھری۔

”ارمان! ایسا کرو، یہ بیس ہزار پکڑو اور ایک گائے لے آؤ قربانی کے لیے۔“
 ارمان نے بھنویں سکڑ کر انہیں دیکھا۔ وہ مذاق کے موڈ میں ہرگز نہیں لگ رہے تھے۔
 ”سرا! اتنے سارے پیسے۔ بہت موٹی تازی گائے کی، بہت اچھی تصویر بھی پانچ سو روپے میں مل جائے گی۔ آپ نے بیس ہزار کیوں دیے ہیں۔ اتنی فضول خرچی؟“
 مجیب صاحب فون پر کوئی نمبر ملا رہے تھے۔ اس کی بات پر رک کر بہت غلغلے سے کہنے لگے۔
 ”تصویر نہیں، اصلی چاہیے، قربان کرنا ہے۔ بڑی عید آرہی ہے۔ تمہاری تو جائز نہیں ہے قربانی۔ نقص سے پاکی لازمی ہے نا۔“
 ”کیا قربانی کرنے والے کے بھی پورے دانت لازمی ہونے چاہئیں سرا!“
 ”نہیں۔“ انہوں نے بد مزہ ہو کر جواب دیا۔
 ”جی۔ مجھے بھی کچھ اندازہ تھا۔ ورنہ آپ کیوں کرتے قربانی۔“
 ”تم اور کتنا داغ چاٹو گے میرا؟“ انہوں نے چشمہ اتار کر میز پر ٹٹا۔
 ”ایزیدو لائیک، میرا مطلب ہے۔“

”تمہارا کوئی بھی کوئی مطلب ہو۔ تم جاؤ اور جو کہا ہے تم سے وہ کرو۔“
 ”سرا! مگر بیس ہزار میں تو وہ مجھے گائے کے کھر بھی نہیں دے گا۔“
 ”تم یقیناً بھول رہے ہو ارمان! میں نے پرسوں تمہیں کیش دیا تھا اسی سلسلے میں۔“
 ”وہ اچھا! میں سمجھاؤں میرا عید بونس ہے۔“
 مجیب صاحب ریسور رکھ کر اس کی طرف باقاعدہ متوجہ ہوئے تو وہ کھیا کر مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیابا! یا!“
 اس نے ٹیرس سے نیچے جھانکا۔ ارمان لان میں بکرا لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور نیچے آنے کا اشارہ کیا۔
 ”ہائے ارمان!“ وہ بکرا دیکھ کر وہیں سے چیخنی اور دوڑتے ہوئے نیچے آئی۔ ”تم واقعی میرے لیے بکرا لے آئے۔ ہاؤ سوٹ!“ اس نے آتے ہی اس کے ہاتھ سے بکرے کی رسی جھپٹی۔
 ”تم کمو اور میں نہ مانوں۔ ایسا کبھی ہوا ہے؟“ اس نے بڑے ردائیک انداز میں کہا۔
 ”ہاں کئی دفعہ مگر چھوڑو۔ تمہارے سارے جھوٹے وعدے اس بکرے پر قربان۔ اب میں صندل اور صنوبر کو دکھاؤں گی۔“ اس نے مزے سے کہا۔
 ”ہرگز نہیں۔ کسی کو مت دکھانا۔“ اس نے سختی سے کہتے ہوئے نبیہا کے ہاتھ سے رسی واپس لے لی۔
 ”کیوں؟“ اس نے منہ بنایا۔
 ”بیابا! میں صرف تمہارے لیے لایا ہوں۔ میری محبت کی تشیر مت کرو پلے! مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے وحید مراد بننے کی کوشش کی۔
 ”اچھا شام کو گھمانے تو لے جاسکتی ہوں نا۔“ اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔
 ”ہرگز نہیں۔ دن میں بہت دھوپ ہوتی ہے اور

دوسرے قربانی کے جانور کی نمائش کرنا بہت بری بات ہے۔ ثواب ختم ہو جاتا ہے سارا۔ اور ویسے بھی یہ بکرا صرف شام تک تمہارا ہے۔“

”اس کے بعد؟“ اس نے جھٹکے سے کہا اور ارمان کے ہاتھ سے رسی کھینچ لی۔

”اس کے بعد یہ اکیڈمی جائے گا۔“ ارمان مسکرایا۔
”اکیڈمی۔۔۔ یہ بکرا۔۔۔ وہ کیوں؟“ وہ سخت حیران ہوئی۔

”بات دراصل یہ ہے بیا! حکومت نے عوام کی ویرینہ شکایت پر قربانی کے جانوروں کی ٹریننگ کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ وہ جانور جو قربانی کے وقت

کو آبریت نہیں کرتے، بہت اودھم مچاتے ہیں اور رسی ترا کر بھاگ جاتے ہیں۔ جیسے پچھلے سال مرسلین صاحب کی گائے بھاگ گئی تھی۔ قیوم ماموں کا بکرا

بھاگ گیا تھا۔ شکور تایا کا دنبہ بھاگ گیا تھا۔ وہ آج تک واپس نہیں آئے مگر۔۔۔ تم لوگوں نے کبھی قربانی کی ہو تو پتا چلے گا۔ اس اکیڈمی میں ان جیسے جانوروں کو

ٹریننگ دی جائے گی کہ وہ قربانی کے وقت خاموشی سے سر جھکا کر کھڑے ہو جائیں، زیادہ شور نہ مچائیں اور

قصائی کو تنگ نہ کریں۔“ ارمان نے تفصیل بتائی۔
”اچھا! پہلے تو کبھی نہیں سنا ایسی اکیڈمیوں کے

بارے میں؟“ اسے اچنبھا ہوا۔
”بھی پندرہ دن پہلے ہی تو اسمبلی میں اس کا بل

منظور ہوا ہے۔ تم خیر نہیں دیکھتیں کیا؟“
نبیہا کو اپنی کم علمی پر سخت افسوس ہوا۔

”اس لیے میں نے سوچا کہ میں بھی اپنے بکرے کو اس اکیڈمی میں داخل کروا دوں تاکہ عید والے دن کوئی

تمہیں یہ طعنہ نہ دے سکے کہ ارمان نے بیا کو ایسا بکرا لا کر دیا ہے جسے ذرا مینوز نہیں تھے۔“ اس نے آرام

سے ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے رسی لے لی۔
”ہاں یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ کب داخل کرواؤ

گے اسے۔“ اس نے سمجھ داری سے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر اچانک جوش سے بولی۔

”بکرے کو اکیڈمی تو میں ہی لے کر جاؤں گی نا۔“

”ہرگز نہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو میں تمہیں یوں صبح شام بکرے کے پیچھے خوار ہونے دوں گا۔ کبھی نہیں یہ میری ذمہ داری ہے بیا! بکرے کو پک اینڈ ڈارپ میں ہی دوں گا۔“

”مجھے لگ ہی نہیں رہا کہ یہ میرا بکرا ہے۔ ملکیت ہی محسوس نہیں ہو رہی مجھے۔“ اس نے اداسی سے منہ لٹکا کر کہا۔

”مجھے سمجھو نا اپنی ملکیت۔“ اس نے گہیرے لہجے میں کہتے ہوئے تھوڑا قریب آ کر اسے بکرے کی رسی تھما دی۔

”مگر تمہاری رسی تو پکڑ کر میں تمہیں چارہ نہیں کھلا سکتی نا۔۔۔ تمہارے گلے میں گھنٹیاں نہیں باندھ سکتی۔ تمہیں گلی میں نہیں گھما سکتی۔“

اس نے بکرے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
”پیٹھ پہ ہاتھ تو پھیر سکتی ہو۔“ اس نے نبیہا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اچھا کب سے لے کر جاؤ گے۔“ اس نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

”کل سے ہی اس کی کلاسز شروع ہیں۔ میں فارم جمع کروا چکا ہوں۔ فکس پانچ بجے شام اسے لے جایا کروں گا اور صبح چھوڑ جایا کروں گا۔“

”انتا لیا نا تم؟“
”دن کم ہیں نا اور مہینے زیادہ ہیں ان کا۔ اچھا!

ایک بات غور سے سنو! کسی کو بتانا اور دکھانا نہیں۔ خاص طور پر صنوبر اور صندل کو۔“

اس نے قدرے جھک کر ارمانہ انداز میں کہا۔
”کیوں؟“ نبیہا کو سخت صدمہ ہوا۔ آخر انہیں ہی

تو دکھانا تھا۔
”کیونکہ مجھے لگتا ہے وہ تم سے جھلس رہی ہیں۔

اب جب انہیں پتا چلے گا میں نے تمہیں بکرا گفٹ کیا ہے تو وہ تم سے اور جھلس ہو جائیں گی اور میں یہ نہیں

چاہتا کہ وہ تم سے حسد کر کے جنم میں چلی جائیں۔“
نبیہا نے اس کی بات سمجھتے ہوئے فرماں برداری

سے سر ہلادیا۔

”ہائے ارمان! تم ہمارا بکرا لے آئے۔“ صندل نے دور سے ہی آواز لگائی۔

”مگر ڈیڈی نے تو گائے منگوائی تھی۔“ صنوبر نے ابرو اچکا کر کہا۔

”تمہارے ڈیڈی نے جتنے پیسے دیے تھے نا۔ اس میں گائے صرف گرائے پر مل سکتی تھی یا پھر آسٹریلوی بھیڑ خرید لی جاتی۔“ ارمان نے جل کر جواب دیا۔

”تم نے اپنے لیے وہی خریدی ہے کیا؟“ صنوبر نے اس کے غصے سے حفا اٹھایا۔

”نہیں۔ میں گائے کی تصویر سے کام چلاؤں گا۔“ اس نے پھر جھجھکیا جواب دیا۔

”صنوبر! بیا کو بتا دو۔ ہم نے بکرا لے لیا ہے۔“ صندل نے بکرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو بکرا دکھانے کی۔ قربانی کے جانور کی نمائش کرنا بہت بری

بات ہے۔ ثواب ختم ہو جاتا ہے سارا۔ اور پھر سرے بھی سختی سے منع کیا ہے کہ کسی کو نہ بتایا جائے۔ حتیٰ کہ

انہیں خود بھی۔“ ارمان نے فوراً سختی سے انہیں ٹوکا۔
”ڈیڈی نے کیوں منع کیا تھا؟“ نہیں حیرت ہوئی۔

”ایک تو تم دونوں سوال بہت کرتی ہو۔ بھی! اس طرح آس پاس والوں کو بتا چل جاتا ہے۔ وہ گوشت کے

ساتھ کھال بھی مانگنے لگتے ہیں۔ جبکہ اس سال سرے لیڈر گارمنٹس کا نیا بزنس شروع کرنے کا پلان کیا ہے تو

ظاہر سی بات ہے، ہمیں کھالوں کی ضرورت پڑے گی نا۔“

”ہاں یہ تو صحیح کہہ رہے ہو تم مگر بیا تو ہماری اپنی ہے۔ وہ کھال تھوڑا ہی مانگے گی۔“ صنوبر نے جتا کر کہا۔

”ہاں مگر جھلس ہو جائے گی کہ میں تم لوگوں کا اتنا خیال کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے قیل کرتی ہے وہ۔“

”ہاں مجھے بھی کبھی لگتا ہے۔“ صنوبر نے خواہ مخواہ اپنا خیال ظاہر کیا۔

”اچھا مگر ہم اسے رکھیں گے کہاں۔ ہمارے لان میں تو اتنی دھوپ ہوتی ہے۔“

”اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے میں نے۔ غور سے دیکھو! ہمارا بکرا کمزور ہے نا؟“

”ہاں وہ تو بہت ہے۔ جب ہی تو میں سمجھی کہ شاید تم صدقے کا بکرا لائے ہو۔“ اس کی بات پر ارمان نے

گھور کر اسے دیکھا، پھر منہ بنا کر صندل سے مخاطب ہوا۔

”یہ جو منڈی والے ہوتے ہیں نا۔ یہ جانوروں کو بیسن کا پانی پلاتے ہیں، جس سے وہ پھول جاتے ہیں

اور ٹھنڈے دکھائی دینے لگتے ہیں، پھر وہ اس کے زیادہ دام مانگتے ہیں۔ اس لیے میں نے سمجھ داری کا مظاہرہ

کیا اور کمزور بکرا لے آیا۔ اب ہم اسے ہیلتھ سینٹر میں داخل کروادیں گے۔ جہاں اس کی خوب اچھی کھلائی

پلائی ہوگی تو عید تک یہ گائے کی طرح ہو جائے گا۔“

صندل اور صنوبر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں ارمان کے لیے ستائش تھی۔

”تم کتنے سمجھ دار ہو ارمان!“ صنوبر کے لہجے میں مرعوبیت آگئی۔

”ہم یوں ہی تم پر بھروسہ تھوڑا ہی کرتے ہیں۔“ صندل نے بھی خوب اپنائیت دکھا ڈالی۔

”یہ بات اپنے ڈیڈی کو بھی سمجھاؤ۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”اچھا تو ہم کب لے کر جائیں اسے ہیلتھ سینٹر؟“ صنوبر نے اس کی بات نظر انداز کی۔

”پاگل ہو کیا تم دونوں؟ میں بھلا تم لوگوں کو اتنی تکلیف میں ڈالوں گا۔ میں خود لے کر جایا کروں گا

اسے۔ صبح دس بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک۔“ ارمان نے انہیں پیار سے ڈنڈا۔

”اتنی لمبی ٹائننگ؟“ صندل نے آنکھیں پھاڑیں۔

”دن کم ہیں ناں اور ڈائننگ چارٹ بڑا ہے۔“ اس نے تسلی کرائی۔

”ویسے پہلے کبھی نہیں سنا اس ادارے کے بارے

میں؟ مصنور مشکوک ہوئی۔

”بھی پندرہ دن پہلے ہی تو اسمبلی میں اس کا بل منظور ہوا ہے ڈبلیو ایچ او کا ادارہ ہے۔ تم خبریں نہیں دیکھتیں کیا؟“

نبیہا کی طرح انہیں بھی اپنی کم علمی پر سخت افسوس ہوا۔

”سنو! تمہارے ہاں کسی آئے گئے کو چائے پلانے کا رواج نہیں ہے؟“

دونوں لان میں کھڑی اس سے سوال پہ سوال کیے جا رہی تھیں۔ کافی دیر ہو گئی تو اسے خود ہی کہنا پڑا۔

”یہ چائے بھی پیتا ہے؟“ صندل نے بکرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ارمان ایک بار پھر جل گیا۔

”اچھا ایک بات غور سے سنو! کسی کو بتانا نہیں اس بارے میں۔“ ارمان نے رازداری سے کہا۔

”یہی کہ تم نے اپنے منہ سے چائے مانگی تھی؟“ مصنور نے معصومیت سے تصدیق چاہی۔

”نہیں۔۔۔ اپنے اس بھائی کے بارے میں۔“ اب اس نے بکرے کی طرف اشارہ کر کے دانت پیسے۔

”ڈیڈی کو تو بتا میں گے۔“ مصنور نے مزالیا۔

”ممت بتانا پلیز! بہن نہیں ہو۔۔۔“ وہ منمنایا۔

”نہیں۔۔۔“ دونوں ایک ساتھ چیخیں۔

☆ ☆ ☆

”چلو نا صنور! دیر ہو رہی ہے۔“

صنل نے کمرے میں تیسری بار جھانک کر قدرے کوفت سے کہا۔ وہ دونوں بیا کا بکرا دیکھنے جا رہی تھیں۔

”بس تھوڑی دیر اور۔۔۔“ اس نے جلدی سے کوئی کریم اٹھا کر چہرے پر لگائی۔ شکر تھا کہ بال بنا چکی تھی۔ بس میک اپ تھوڑا باقی تھا۔

”اس نے پانچ بجے بلایا تھا۔“ صنل نے یاد دلایا۔

”وہ تو اس نے اس لیے کہا تھا کہ صرف چائے پر رخصا سکے۔“ مصنور نے اسے شیشے میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”غیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ہماری بیا کنجوس نہیں ہے۔ بس اسے ارمان سے گفتگو لینے کا شوق ہے مگر

اس خیال بھی تو کتنا کرتی ہے۔“ صنل نے کمرے کے دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

صنور مسکرا دی۔

تیار ہو کر وہ نیچے آئی تو پونے چھ ہو چکے تھے۔ دونوں جلدی جلدی باہر نکلنے لگیں۔ ان کا بکرا اسیلٹھ سینٹر سے

آچکا تھا۔ اپنے بکرے پر ایک پیار بھری مسکراہٹ ڈال کر دونوں دو گلیاں چھوڑ کر نبیہا کے گھر پہنچیں تو اس نے منہ لٹکا کر ان کا استعمال کیا۔ اس کا بکرا اکیڈمی جا چکا

تھا۔ ان دونوں کے بھی منہ لٹک گئے۔

”میں نے کہا تھا نا پانچ بجے سے پہلے آنا۔“ نبیہا نے منہ بنا کر کہا۔

”تم آج چھٹی کرو الیتیں اپنے بکرے کی۔“ صنل نے مشورہ دیا۔

”ارمان نہیں مانتا نا۔“ اس نے بے چاری صورت بنا کر کہا۔

”اچھا ایسا کرو۔ اب تم ہمارا بکرا دیکھنے چلو۔ ہمارا بکرا

آگیا۔“ صنل نے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ وہ فوراً تیار ہو گئی مگر جب وہ تینوں اپنی گلی میں داخل ہونے لگیں تو سامنے سے عمر اور ارسل آرہے تھے۔

وہ دونوں جب سے آئے تھے گھر میں کم ہی نکلتے تھے۔ کبھی مجیب صاحب کے دفتر چلے جاتے۔ کبھی کراچی کی مارکیٹس کے ریٹ لیتے پھرتے اور کبھی کراچی گھومنے نکل جاتے۔ گھر میں ہوتے تو لیپ ٹاپ

کھولے اپنا کام کرتے رہتے۔ وہ دونوں لاہور میں اپنے پیپا کے ساتھ ہی بزنس سنبھالتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے کسی دورے سے واپس آرہے تھے۔ ان تینوں کو

دیکھ کر ارسل نے کہا۔

”چلو آؤں کریم کھانے چلتے ہیں۔“

وہ تینوں خوش خوشی چل پڑیں۔ پہلے انہوں نے آؤں کریم کھائی، پھر عمر کی فرمائش پر سی دیو کی طرف

نکل گئے۔ واپسی میں تھوڑی دیر ہو گئی تو نبیہا نے دوسرے دن بکرا دیکھنے کا وعدہ کر لیا اور وہیں سے اپنے گھر چلی گئی۔

دوسرے دن پورے چھ بجے وہ ان کے گھر میں تھی۔ آج صنور اور صنل کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔

”بیا! ارمان کا فون آیا تھا۔ وہ آؤں میں بہت بڑی ہے۔ آؤں میں کوئی اور بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا

بکرا ابھی تک ہیلٹھ سینٹر سے نہیں آیا۔“

صنور نے افسردگی سے اطلاع دی۔

”اچھا! اس کا مطلب ہے وہ صبح کہہ رہا تھا۔“ نبیہا کے کہنے پر صنور نے استفسار کیا۔

”میرے پاس بھی ارمان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا آج وہ بہت مصروف ہے۔ اس لیے بکرے کو اکیڈمی

نہیں لے جاسکے گا۔ بکرے کی تو خیر تھی مگر مجھے لگا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر اب یقین آگیا کہ وہ سچ کہہ رہا

تھا۔ میرا ارمان مجھ سے کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔“ وہ مطمئن ہوئی تو اترانے لگی۔

”مگر یہ بھی تو سوچو کہ ارمان پر کتنا لوڈ ہے کام کا۔ بے چارہ ہمارا بکرا بھی لاتا لے جاتا ہے۔ تمہارے

بکرے کو بھی پک اینڈ ڈراپ دیتا ہے۔“ صنل نے غائبانہ ہمدردی کی۔

”ہاں یہ تو ہے۔ ہمارا ارمان بہت کیئرنگ ہے۔ اپنی ساری ذمہ داریاں خود اٹھاتا ہے۔ کسی کو زحمت نہیں دیتا۔“

تینوں کی متفقہ رائے تھی۔

☆ ☆ ☆

فون پر گفتگو کے دوران مجیب صاحب اور فاروق صاحب نے ایک دوسرے کو بکرا دیکھنے کی دعوت دے ڈالی۔

فاروق صاحب دوسرے ہی دن صبح بینک جانے سے پہلے مجیب صاحب کے گھر پہنچ گئے اور بکرا دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”ارے بھی! یہ تو بالکل ہمارے جیسا ہے۔“

”آپ کے جیسا کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کے سینگ کہاں ہیں؟“

مجیب صاحب نے برجستہ کہا۔ فاروق صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا۔

”اچھا اب آپ ہمارا بکرا دیکھنے آئیے گا۔“

فاروق صاحب نے دعوت دی اور اسی دن شام کو چار بجے کے قریب لنچ سے فارغ ہو کر مجیب صاحب

آؤں سے اٹھ گئے۔ اپنی گلی میں مڑتے ہوئے انہیں اپنے ہم زلف کی صبح والی دعوت یاد آئی تو گاڑی وہیں

موٹی اور بکرا دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے۔

”آپ نے واقعی درست کہا تھا۔ یہ تو بالکل ہمارے بکرے جیسا ہے۔“

”ہو سکتا ہے خالو! صنل اور صنور کی طرح ہمارے بکرے بھی جڑواں بھائی ہوں اور پچھڑ گئے ہوں۔ آخر یہ بھی تو کسی کی اولاد ہیں نا۔“

نبیہا کی بات پر فاروق صاحب تو زور سے ہنس پڑے مگر مجیب صاحب ٹھٹھک گئے۔ ”جڑواں بکرے۔۔۔“

نبیہا اشتیاق میں دوسرے دن صبح صبح ناشتا کر کے صنل کے گھر پہنچ گئی۔ ابھی گلی میں داخل ہوئی ہی تھی کہ مجیب صاحب کے گھر سے بکرا لے کر

نکلتے ہوئے ارمان کی نظر اس پر پڑ گئی۔

”یہ صبح صبح یہاں کیا کر رہی ہے۔“ سمجھ میں نہیں آیا کہ بکرے کو واپس گھر چھوڑے یا۔۔۔ اس نے دوڑ کر

دوسری طرف سے گلی پار کی۔ گلی کے سرے پر پہنچا ہی تھا کہ نبیہا کی نظر ارمان کی پشت پر پڑ گئی۔ وہ حیران

ہوئی کہ ارمان اس وقت یہاں۔۔۔ ضرور اس کو دیکھنے یہاں آیا ہو گا۔ یہ سوچ کر وہ دوبارہ اپنے گھر کی طرف

پلٹ گئی۔ گلی کے کونے پر پہنچی۔ ارمان سے سامنا ہو گیا۔ وہ پھر سٹٹا گیا۔

”آج گئے بچھ۔۔۔“ وہ بریرایا۔ ”تم باہر کیا کر رہی ہو صبح صبح۔“

”میں خالو کے گھر جا رہی تھی۔ تمہیں دیکھا تو واپس آئی۔ آج تم لیٹ ہو گئے تھے نا اس لیے میں نکل گئی۔

میں سمجھی تم آج بھی بڑی ہو بکرا نہیں لاؤ گے۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

”اچھا یہ لو بکرا اور اب گھر جاؤ۔“ اس نے رسی پکڑائی۔

”اندر آؤنا۔ چائے تو پی لو۔“

”نہیں۔ میں لیٹ ہو گیا ہوں آفس سے۔ چلتا ہوں بائے!“ وہ ہاتھ ہلاتا ہوا نکل گیا۔

نبیہا دروازے میں داخل ہوتے ہوتے رک گئی۔ کیوں نہ میں اپنا بکرا خود ہی دکھا لاؤں۔ اس وقت خالو بھی ہوں گے۔

یہ سوچ کر وہ دوبارہ مجیب صاحب کی طرف چل پڑی۔ ان کی گلی میں پہنچی تھی کہ سامنے کی طرف سے ارمان آ رہا تھا۔ وہ پھر اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔

”اسے کیا پریشانی ہو گئی۔ صبح صبح کلیوں میں گھوم رہی ہے۔“

وہ پھر بڑبڑایا۔ نبیہا قریب آ کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا۔ تم گئے نہیں ابھی تک۔ لیٹ ہو رہے تھے نا۔“

”ہاں۔ وہ میں۔ میں نے سوچا سر کے ساتھ ہی چلا جاؤں۔ ایک ہی جگہ تو جانا ہے نا۔“

”اچھا تو چلو پھر۔ میں بھی اپنا بکرا دکھا دوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ارمان نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔

”میں نے منع کیا تھا تاہم نمائش نہیں کرنی بکرے کی۔“

”ارے! تمہیں نہیں پتا۔ خالو کا اور ہمارا بکرا ایک جیسا ہے اتفاق سے۔ میں نے سوچا صندل اور صنوبر کی طرح یہ دونوں بھی جڑواں ہوں گے۔ اب دونوں کا سامنا کروادوں گی۔ ہو سکتا ہے پہچان لیں ایک دوسرے کو۔ آخر خون جوش مار سکتا ہے۔“

”خون جوش مارے نہ مارے تمہارے خالو مجھے ضرور ماریں گے۔ تم اس بھائی چارے کو رہنے دو اور جا کر اس کے چارے کا بندوبست کرو۔ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

ارمان نے اس کا بازو پکڑ کر اسے واپسی کے لیے دھکیلا۔

”مگر ارمان سنو تو۔۔۔“ اس نے کچھ بولنا چاہا۔ اسی وقت گیٹ کھلا اور صنوبر نے جھانکا۔ وہ اخبار اٹھانے آئی تھی جو باکر ڈال کر گیا تھا۔ ان دونوں کو اپنے گھر کے پاس کھڑے دیکھ کر ہر نکل آئی۔

”کیا ہوا ارمان! تم ابھی تک یہیں ہو۔ تم تو کہہ رہے تھے تمہاری میٹنگ ہے۔ اور یہ ہمارا بکرا لے کر ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔ ہیلتھ سینٹر کیوں نہیں لے کر گئے۔“ اس نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

”نہیں صنوبر! یہ تمہارا بکرا نہیں ہے میرا ہے۔ ابھی ابھی اکیڈمی سے آیا ہے۔“

نبیہا نے اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

”نہیں یہ ہمارا بکرا ہے۔ ارمان صبح اسے ہیلتھ سینٹر لے کر جاتا ہے۔ تمہیں پتا تو ہے۔“ اس نے نبیہا کے ہاتھ سے بکرے کی رسی لے کر ارمان کو پکڑائی۔

”جاؤ ارمان! دیر ہو رہی ہے تمہیں۔ آفس بھی جانا ہے۔ ڈیڈی تو جا چکے۔“

”صنوبر! یہ میرا بکرا ہے اور ارمان اسے اکیڈمی سے لے کر آیا ہے۔ تمہیں بھی پتا ہے میرا بکرا اکیڈمی جاتا ہے ٹائٹ شفٹ میں۔“ اس نے ارمان کے ہاتھ سے رسی چھینی۔ صنوبر نے ابجھ کر ارمان کو دیکھا۔ وہ نبیہا کو دیکھ رہا تھا۔

”اوہ ہر بکھو ارمان! میری طرف۔“ اس نے ارمان کو متوجہ کیا۔

”ہاں بولو صنوبر! میں سن رہا ہوں۔“ وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ نبیہا جل گئی۔ اس نے غصے سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔

”میری طرف دیکھو اور صرف مجھے ہی دیکھا کرو۔ وہ غیر ہے۔“

وہ بات کو دوسری طرف لے گئی۔ ارمان نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔

”صنوبر غیر نہیں ہے بیا! تمہاری کزن ہے اور اسی لیے اس کا مجھ سے بھی بہت قریبی رشتہ ہے۔“ اس نے پیار سے صنوبر کی طرف دیکھا۔

”کوئی رشتہ نہیں ہے اس سے تمہارا یہ صرف میری بہن ہے۔“

”ہاں بہن تو تمہاری ہی ہے۔ میں نے کب اسے بہن کہا۔“

”ہاں تو کہو نا۔ بہن کیوں نہیں کہتے۔“

”لو۔ ابھی تو تم نے منع کیا ہے۔“

”میں نے۔۔۔“ وہ گڑبڑا گئی۔ صنوبر ہونقوں کی طرح دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا بکرا لے کر وہ دونوں بتائیں کیا کیا بول رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”صنوبر! اتنی اہم خبر لے کر تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔ جاؤ دادو کو بتاؤ ڈائٹ ہاؤس میں بم بلاسٹ ہو گیا ہے۔ دعا کریں اوہ پانا نہ بچے۔ جاؤ شاباش! اپنے وطن سے اتنی محبت تو ہوئی چاہیے تمہیں۔ جاؤ فوراً! یہ خبر پھیلا دو تاکہ لوگ دعا مانگنا شروع کر دیں۔ دیر ہو گئی تو اوہ پانا بچ جائے گا۔“

”ہیں۔۔۔ اوہ پانا۔ ہم پھنسا ہے؟“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا اور سب کچھ بھول کر اندر بھاگی۔

”تمہیں نہیں ہے اپنے وطن سے محبت۔ تم کیوں کھڑی ہو ابھی تک۔ جاؤ تم بھی دعا مانگو۔“ وہ اس کی طرف گھوا۔

”اور یہ بکرا۔“ وہ ابھی تک بوکھلائی ہوئی تھی۔

”یہ تمہارا ہے لے جاؤ۔ اور دیکھو! میں نہ کہتا تھا“ صنوبر جھلس ہو جائے گی تمہارا بکرا دیکھ کر۔ کیسے فوراً کہنے لگی کہ یہ اس کا بکرا ہے۔“

اس نے صنوبر کی نقل اتاری۔ نبیہا نے تاسف سے گردن ہلائی۔

”جاؤ اب چھپا کر رکھنا اسے اور خود کو بھی۔“

آخری جملہ اس نے آہستہ سے کہا مگر اس نے سن لیا۔ ایک شرمیلی سی مسکان اس کے ہونٹوں پر اٹکی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

”چلو۔“ اس نے ایک ہاتھ میں بکرے کی رسی پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے نبیہا کا ہاتھ تھام کر اس کے گھر کی طرف چل دیا۔

”زبردست! اگر تم یہ بلاسٹ آف پیرس سے بتاتیں تو یقین کرو۔ قربانی کے بعد بھی قصائی کو پتا نہیں چلتا کہ یہ اصلی نہیں ہے۔“

عمر نے ایک بڑی شیٹ پر صندل کے ہاتھ سے بنی بکرے کی تصویر دیکھ کر کہا۔ ارسل نے اس کے میاں لٹے پر اپنی ہنسی دیائی۔ تصویر بلاشبہ اچھی بنی تھی۔ ارسل کو ہنسی ضبط کرتے دیکھ کر صنوبر نے اپنی بہن کی حمایت میں کچھ کہنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نبیہا کی طیش بھری آمد ہوئی۔

”سہیل میرا بکرا لے کر تمہارے گھر کیوں آیا ہے۔“

”یہ تو سہیل سے پوچھو۔“ عمر نے بے ساختہ کہا۔

”سہیل ہیلتھ سینٹر سے ابھی لے کر آیا ہے ہمارا بکرا۔ صندل نے جواب دیا۔

”سہیل تھوڑی دیر پہلے میرا بکرا اکیڈمی لے کر گیا تھا مگر وہ یہاں لے آیا۔ کیوں؟“

”بیا! یہ ہمارا بکرا ہے۔ سہیل تمہارا بکرا اکیڈمی چھوڑ آیا ہو گا۔ آج ارمان بڑی تھا۔ اسی نے سہیل کو بھیجا ہے۔“ صندل نے وضاحت سے جواب دیا۔

”مجھے معلوم ہے۔ ارمان نے مجھے بھی فون کیا تھا کہ وہ آج نہیں آئے گا۔ سہیل کو بھیج رہا ہے مگر میں یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ میرا بکرا تمہارے گھر کیوں لے آیا۔“

اس نے زور دے کر اپنی بات سمجھائی۔

ابھی جب وہ صندل کے گھر آ رہی تھی تو ارمان کے آفس کالز کا مجیب صاحب کے لان میں بکرا باندھ رہا تھا۔ جبکہ اس سے کچھ دیر قبل وہ اس کا بکرا لے کر گیا تھا۔

”ابھی ارمان آنے والا ہے۔ اس سے پوچھ لیں گے کہ تمہارا بکرا کہاں گیا۔“ صنوبر نے قصہ مکاتے کی کوشش کی۔

”تم اس سے اپنے بکرے کے بارے میں پوچھو۔ میرا بکرا یہاں موجود ہے۔“ اس نے پورے یقین سے کہا۔

”ایسا کرو بیا! تم یہ والا بکرا لے جاؤ۔“ عمر نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا اصلی بکرا موجود ہے۔ اس سے آپ لوگ کام چلائیں۔“ اس نے جل کر کہا۔ سب ہنس پڑے۔ وہ جھنجھلاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

ثریا بیگم کے گھر میں عید کے علاوہ چاند رات بھی منائی جاتی تھی۔ جس میں ان کے خاندان کے سب افراد جمع ہوتے تھے اور ان کا خاندان تھا ہی کتنا بڑا۔ ایک بیٹا مجیب احمد اور ایک بیٹی سلمیٰ جولاہور میں رہتی تھیں یا پھر نیپہا کی فیملی کو بلا لیتیں۔ مگر بیس سال سے سلمیٰ ایک چھوٹی سی بات پر ایتھی ہوئی بیٹھی تھیں۔ مجیب احمد اور ثریا بیگم نے انہیں راضی کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانیں۔

سلمیٰ کی خواہش تھی کہ اپنے چھوٹے بھائی مجیب کی شادی اپنی نند سیمہ سے کراویں تاکہ اپنی سسرال میں ٹھکے سے رہ سکیں۔ مگر ان کی خیرلی پھوڑ اور عمر میں بڑی نند سے شادی کرنے پر مجیب احمد کسی طرح نہیں مانے۔

سلمیٰ کی بات پر ثریا بیگم کو بھی غصہ آیا تھا۔ مگر سلمیٰ کم سنتی تھیں زیادہ بولتی اور زیادہ منوائی تھیں۔ ثریا بیگم اور مجیب احمد ان کی پیشتریا میں مان لیا کرتے تھے مگر اس بات پر تو مجیب احمد اڑ گئے۔ انہیں لگتا تھا سیمہ کے ساتھ ان کی نہیں بنے گی، سوانہوں نے محض اپنی بہن کی خواہش کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگانے کی کوشش نہیں کی اور رابعہ سے شادی کر لی۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ دن بعد سلمیٰ مان جائیں گی مگر ایسا نہ ہو سکا۔

شادی میں مزے سے شرکت کرنے کے بعد وہ لاہور روٹھ کر بیٹھ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ثریا بیگم اپنے نواسوں کو دیکھنے کو ترس گئیں۔ عجیب غصہ و خفگی تھی۔ فون پر باقاعدگی سے رابطہ کر کے پوری خبر رکھا کرتی تھیں۔ صنوبر اور صندل کی پیدائش پر دوڑی چلی آئیں۔ خوب خفے تحائف بھی دیے۔ پھپھو بننے کا ننگ بھی لیا مگر بھائی بھانج سے بات نہ کی۔ بعد میں بھتیجیوں سے بھی رابطہ رکھا۔ حالانکہ مجیب احمد کی

شادی کے دو سال بعد سیمہ بھی بیاہ کر امریکہ چلی گئی تھیں اور اپنے میاں کے ساتھ خوش تھیں۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ خوش تھے بس سلمیٰ خفا رہیں۔

ثریا بیگم ہر عید پر انہیں بلاتیں۔ مجیب احمد خود دعوتیں دینے جاتے مگر وہ نہ آتیں۔ پہلے ثریا بیگم خود ہی لاہور۔ چلی جاتی تھیں پھر آہستہ آہستہ ان کا آنا جانا بھی کم ہوتا گیا۔

اب اچانک ان کے دل میں کیا سمائی کہ بقرعید کراچی میں منانے کا فیصلہ کر لیا، بلکہ کئی دن پہلے آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ تو سیمہ بھی بغیر اطلاع کے اچانک امریکہ سے آگئیں تو وہ نہ آسکیں مگر پھر انہوں نے اپنے دونوں بچوں کو بھیج دیا۔ سب خوش ہو گئے مگر ثریا بیگم اور مجیب احمد کو کھٹکا تھا کہ وہ ابھی بھی اپنی کوئی بات منوانے ہی آرہی ہوں گی۔

چاند رات والے دن وہ اپنے شوہر اکبر علی کے ساتھ ثریا بیگم کے گھر موجود تھیں۔

”ہاں تو کیا تھا، اگر مجیب مان جاتا سیمہ سے شادی پر۔ تو یہ سب نہ ہوتا۔“

ڈرائنگ روم میں سب موجود تھے۔ مجیب احمد ان کی بیگم نیپہا کے والدین ثریا بیگم اور ان کے شوہر بھی۔ مگر انہوں نے کسی کی پروا نہ کی۔

”چھوٹیے نا آ! اتنی پرانی بات ہو گئی ہے۔ اب تو سیمہ کی بھی شادی ہو گئی، ورنہ میں اس سے دوسری ہی شادی کر لیتا۔“

انہوں نے ماحول کی کشیدگی دور کرنے کی غرض سے ہلکا سا شغل کیا۔

”تو تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں۔ میں سیمہ کی شادی رکوا دیتی۔“

ان کی بات پر مجیب احمد اپنے مذاق پر خود ہی کھسیا گئے۔

”آپ! میں بہت خوش حال زندگی گزار رہا ہوں۔ اگر آپ کی نند سے شادی کر لیتا تو آج میں بزنس کے بجائے نوکری کر رہا ہوتا۔“

یہ بھی اچھا تھا کہ اکبر علی اونچا سنتے تھے۔ اگر اپنی

بہن کے بارے میں سن لیتے تو مزید بیس سال کے لیے لاہور جا بیٹھتے۔

”تو اب کون سا ڈالروں میں کھیل رہے ہو۔ ایک ہی تو بزنس ہے۔ وہ بھی صرف کراچی میں۔ کون سا چار پانچ شہروں میں شاخیں کھول رکھی ہیں تم نے۔“

انہوں نے تیکھی نظروں سے اپنی بھانج کی طرف دیکھا۔ رابعہ اپنی نند کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں، سو برا کم ہی مانتی تھیں۔ سلمیٰ کی طنزیہ بات پر جواباً صرف مسکرا دیں۔ وہ دونوں بہن بھائی کی اس بحث سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

”آپ کچھ نہیں بولیں گی میرے دفاع میں بیگم صاحبہ! مجیب احمد نے رابعہ سے آہستہ سے کہا۔

”میں تو یہ سوچ رہی ہوں کاش! اس وقت سیمہ اور اس کا شوہر بھی ہوتے تو زیادہ مزا رہتا۔“ انہوں نے مسکرا کر مجیب احمد کو دیکھا۔

”پاپا! میرا بکرا۔“ وہ روتے ہوئے فاروق صاحب کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا ہوا میری بیٹی کے بکرے کو؟“ انہوں نے پیار سے اس کے کندھے پر بازو پھیلائے۔

”صندل کہہ رہی ہے کہ اس کا بکرا ہے۔“ اس کے رونے میں اضافہ ہوا۔

”اوہو بیٹا! دراصل ہمارا اور ان کا بکرا ایک جیسا ہے۔ اس لیے تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔“ وہ ہنسے۔

”نہیں پاپا۔“

اسی وقت ارمان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ تھکا ہوا سالگ رہا تھا۔ آفس سے سیدھا آ رہا تھا۔ آج کی دعوت میں بھی مدعو تھا۔ جب سے ارمان سے رشتہ جڑا تھا۔ ثریا بیگم کے گھر کی ہر دعوت میں وہ بھی خصوصی طور پر بلایا جاتا تھا۔ ارمان کو دیکھ کر نیپہا فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ارمان! یہ میرا بکرا ہے نا؟“ اس نے روتے ہوئے تعین مانگا۔

”ہاں یہ تمہارا ہے۔“ اس نے سب کو سلام کیا پھر سونے پر بیٹھتے ہوئے آرام سے جواب دیا۔

”ارمان! یہ ہمارا بکرا ہے۔“ اسی وقت صنوبر نے ڈرائنگ روم میں آکر حق چٹایا۔

”ہاں یہ تمہارا بکرا ہے۔“ ارمان نے اسے بھی تسلی دے دی۔

”کیا مطلب۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تم صرف میرے لیے لائے ہو۔“ نیپہا نے چل کر کہا۔ ارمان کی بات پر باقی سب کی نظروں میں بھی تھوڑا سا استعجاب ابھر آیا۔

”ارے لڑکیو! سانس تو لینے دو بچے کو۔ ابھی تھکا ہوا آیا ہے۔ آتے ہی گھیر لیا اسے۔ پانی تو پوچھو اس سے۔“ ثریا بیگم نے دونوں کو گھر کا۔

”اچھا جلدی جلدی لے لو سانس۔“ نیپہا نے احسان کیا۔

”ارمان پرانی پاکستانی فلموں کی ہیروئن نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھنے دو اسے۔“ اس نے دونوں کو مخاطب کیا۔ کریم نے اسے جوس لاکر دیا۔

”ہاں ارمان! ابھی پہلے ان بچیوں کا مسئلہ حل کرو۔ بہت پریشان ہیں۔“ وہ تھوڑا ریلیکس ہوا تو مجیب صاحب نے کہا۔ اس نے ایک چھوٹی سی نظر نیپہا پر ڈالی اور گلا کھنکھار کر سنجیدگی سے مجیب احمد کی طرف متوجہ ہوا۔

”سر! آپ لیڈر کا نیا بزنس شروع کرنا چاہ رہے تھے نا؟“

”ہاں! مجیب احمد نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ ان کی برسوں کی خواہش تھی۔ کافی عرصہ پہلے انہوں نے ارمان سے اس کا اظہار کیا تھا مگر اس وقت ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا۔ اس وقت غیر متوقع طور پر ارمان نے اس بات کا ذکر کر کے انہیں حیرانی میں مبتلا کر دیا۔

”سر! میں نے اسی دن سے اس پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہماری کمپنی کے چاروں اکاؤنٹس میں اتنی اضافی رقم نہیں تھی، جتنی ہمیں ضرورت تھی۔ سو میں تقریباً ڈیڑھ سال سے چاروں اکاؤنٹس سے کچھ رقم اس طرح سے پس انداز کر رہا تھا کہ آپ کو کمی بیشی کا احساس بھی نہ ہو اور مطلوبہ رقم بھی جمع ہو جائے۔ تین

ماہ پہلے میں نے وہ اکاؤنٹ چیک کیا جس میں وہ رقم جمع کروا رہا تھا تو مجھے خوشی ہوئی کہ اس میں صرف تیس لاکھ روپے کم تھے۔ سراسر اس وقت سے میری بچت میں تیزی آگئی اور میں نے چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی جمع کرنا شروع کر دیں۔

میں ساتھ ساتھ کاغذی کارروائی بھی کر رہا تھا۔ اب سارا کام مکمل ہو گیا ہے سراسر! آپ کے سائن کی ضرورت ہے۔ میں فائل ساتھ لایا ہوں۔“

اس نے سیاہ رنگ کی ایک فائل ان کی جانب بڑھائی۔ حیرت اور مسرت کے باعث مجیب صاحب سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ارمان اس طرح ان کا خواب پورا کر دے گا۔

”تم نے تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں ارمان!“

بہت زیادہ خوشی کی وجہ سے ان کی آواز کانپنے لگی۔ ”سر! میں آپ کو سربراہ بنانا چاہ رہا تھا۔ آپ کو اچھا نہیں لگا؟“ اس کا چہرہ اتر گیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو ارمان! مجھے کیوں نہیں اچھا لگے گا۔ تم نے میری برسوں کی آرزو پوری کر دی۔ مجھے بھلا مجھے کیوں نہیں اچھا لگے گا۔ میں تو۔“

فرط مسرت سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بات مکمل نہ کر سکے۔ سب کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان تھی اور آنکھوں میں ارمان کے لیے ستائش۔

مجبیب صاحب نے بھیگ آنکھوں سے اپنی ماں، بیگم اور بسن کی طرف دیکھا۔ ماحول کا رنگ یکدم بدل گیا تھا۔ ارمان کا چہرہ بھی کامیابی اور سرشاری سے دمک رہا تھا۔

اس فسون کو نبیہا کی سنورتی ہوئی آواز نے توڑا۔

”میرا بکرا۔“ سب ہنس پڑے۔

گھبرا گیا۔ اس کا ارادہ ابھی ان لڑکیوں کو مزید تنگ کرنے کا تھا۔ مگر نبیہا کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں اور ناراض چہرہ دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور وضاحت کرنے لگا۔

”در اصل بات یہ ہے کہ سر ہر سال مجھے دو بیلوں کے پیسے دیتے ہیں۔ ایک اپنی اور ایک سلمیٰ پھپھو کی۔ ابھی جب سر نے مجھے پیسے دیے تو وہ میں نے الگ رکھ لیے۔ اسی دوران مجھے پتا چلا کہ پھپھو عید میں کریں گی تو مجھے تھوڑی سی آسانی ہو گئی۔ میں نے دونوں جانور چاند رات تک ملتوی کر دیے۔۔۔ دوسری طرف میرا ارادہ تھا کہ اس سال میں اور بیا مل کر قربانی کریں۔“ وہ سب کے سامنے اس کی فرمائش چھپا گیا۔

ارمان کی طرف سے دیے جانے والے مان پر اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپانہ سکی۔

”پھر مجھے صندل اور صنوبر کا خیال آیا تو میں نے ایک چھوٹا سا مذاق کر لیا، ایک بکرا۔۔۔ دونوں گھروں میں۔“ سب کے چہرے مسکرا اٹھے۔

”تو کیا وہ اکیڈمی۔۔۔ وہ ہیلتھ سینٹر۔۔۔ ڈراما تھا؟“ آنکھوں کے ساتھ ساتھ صندل کا منہ بھی کھل گیا۔

”جب ہی تو میں کہوں ہمارا بکرا تنگڑا کیوں نہیں ہو رہا تھا۔“ صنوبر کو یاد آیا۔

”ہاں اور میں بھی نوٹ کر رہی تھی کہ بکرے کو ذرا بھی ایٹی کیٹس نہیں آئے۔ ابھی بھی ٹکریں مارتا ہے۔“ نبیہا نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

”بھئی! یہ تو سوچنے والی بات ہے نا ہمارے ملک میں انسانوں کی صحت اور تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی کجا کے جانوروں پر۔“ عمر نے رائے دی۔

”ویسے یار! تم بکرے کو لانا لے جانا کیسے کر لیتے تھے کبھی ہیلتھ سینٹر کے نام پر بیا کے گھر تو کبھی اکیڈمی کے نام پر ماموں کے گھر۔“ ارسل نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”یار! نئے برنس کے سلسلے میں مجھے روز آفس سے نکلنا پڑتا تھا تو بس۔ لگے ہاتھوں میں نے بھی انجوائے

کر لیا۔“ وہ مسکرایا۔

”اچھا! اب کنفرم ہے نا کہ یہ میرا بکرا ہے۔“ نبیہا نے پھر تصدیق چاہی۔ ارمان نے مسکرا کر تائید کر دی۔

”مطمئن ہو کر مسکرا نے لگی۔“

”اور ہمارا بکرا۔“ صندل نے اس شکل بنائی۔

”بکرا نہیں گائے حسب روایت۔ میں نے سہیل کو کہہ دیا ہے۔ تمہاری اور سلمیٰ پھپھو کی گائے لے کر بس آتا ہی ہو گا۔“

”ارمان! تم نے سارے کام کر دیے۔ ایک رہ گیا۔ تم نے قصائی کا بندوبست نہیں کیا بیٹا!“ قاروق صاحب نے یاد دلایا۔

”اشفاق بھائی زندہ باد۔“ صندل نے نعرہ لگایا۔

”میں اپنا بکرا ارمان سے کٹواؤں گی۔“ نبیہا کی نئی فرمائش۔

”ٹھیک! اس کو فارغ بھی چھوڑ دیا کرو کبھی۔“ ثریا بیگم نے اسے ڈپٹ دیا۔ وہ منہ بسور نے لگی۔

سارے قصبے نیٹ چکے تھے۔ مجیب صاحب کی درینہ آرزویوں پایہ تکمیل کو پہنچی کہ وہ خود حیرت اور خوشی سے گنگ رہ گئے۔ قربانی کے حوالے سے بھی باسعادت رہے۔ برسوں سے روٹھی ہوئی بسن بھی آن ملیں۔ وہ خود کو بہت مکمل اور مطمئن محسوس کر رہے تھے۔ اچانک ان کی نظر انی بسن پر پڑی۔ وہ بوکھلا گئے۔ وہ گھور گھور کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”میں آج خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی مجیب! آج تمہیں میری بات ماننا پڑے گی۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ! اب اس عمر میں میں کہاں اچھا لگوں گا دوسری شادی کرتے ہوئے، جبکہ سیمابھی ابھی بیوہ نہیں ہوئی۔“ وہ منمنائے۔

”فضول باتیں نہ کرو مجیب! مجھے میری بھتیجیاں دے دو۔ میرے ارسل اور عمر کے لیے۔“ ان کی ہر بات دھماکا ہوا کرتی تھی۔

سرگوشی کی۔ وہ اس کے صوفے کی انتہی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”نہیں تو۔۔۔“ وہ خود حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

”بغیر فون کیے بات بن گئی۔ ممدادی گریٹ!“

دونوں ایک دوسرے کے کان میں گھس گئے۔

”ایک شرط ہے آپ!“ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کر کے سنجیدگی سے کہا۔ سب چونک گئے۔

”میں سیماسے شادی نہیں کروں گا۔“

اور حیرت کی بات تھی۔ سب کے ساتھ سلمیٰ بھی ہنس پڑیں۔

مجبیب احمد اب کھل کر طمانیت اور سرشاری محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت فخر اور مان سے ارمان کو دیکھا۔ وہ ارسل اور عمر سے باتوں میں مصروف تھا۔ انہوں نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ ارمان کی شکل میں اللہ نے ان کے بیٹے کی کمی پوری کر دی ہے۔

ثریا بیگم کے گھر میں موجود ہر شخص کا چہرہ اس وقت کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے ارمان کے لیے اپنے دل میں ڈھیر سارا پیار محسوس کیا۔ سب ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف تھے۔ ارمان نے نبیہا کو کمرے سے نکلتے دیکھا تو اس کے پیچھے ٹیرس پر چلا آیا۔

”کیسا لگا میرا سربراہ۔“ پشت پر ہاتھ باندھ کر اس نے مسکراتے ہوئے بہت پیار سے پوچھا۔

”اگر میں بکرے کی فرمائش نہ کرتی تو اس دفعہ تم مجھے کیا سربراہ بن دیتے۔“

”ہمیشہ کی طرح۔ ڈھیر ساری۔ دعائیں!“

اس نے بے ساختہ کہا۔ نبیہا زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔



داتا مال کی وسیع راہ داری میں ٹرائی میں سامان رکھتے وجاہت نے نہ جانے ایسا کیا کہا تھا کہ ساتھ چلتی ریکا کا ققمہ بلند ہو گیا۔ کئی لوگوں نے مرکبہ کھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ لیکن دوا ساز کے فاصلے پر بوتیک سے کپڑے پسند کرتا زوار واپس اپنے کام کی طرف دھیان دینے کے بجائے پوری طرح وجاہت اور ریکا کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”یہ تم ہو۔۔۔ سیٹھ نعمان ملک کی بیٹی اور سیٹھ وجاہت ملک کی خوش باش اور بے فکر بیوی۔“ نفرت کی چنگاری دیکھتے دیکھتے شعلہ بن کر لپکی تھی۔ ”تم تو کہتی تھیں تمہارے بنا جینے کا تصور محال ہے۔ کیوں نہ تمہارے یہ ققمے چرا لوں؟“

”پر تمہیں کیا ملے گا زوار حسین؟“ ضمیر نے آگے بڑھ کر اس سے سوال کیا تھا۔

”اپنی ہتک کا بدلہ لوں گا۔“ زوار نے ضمیر کو تھپکی دی۔

”ہتک کہاں خاندانی رسم و رواج تھے وہ۔“ دماغ نے سمجھایا۔

”اگر مجبوری ہی تھی تو شوہر کے ساتھ یوں خوشی کے شادیانے تو نہ بجائے جاتے نا۔“ ریکا کا ققمہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

”تم بھی تو شادی کر کے خوش و خرم زندگی گزار رہے ہونا۔“ ضمیر نے پھر ٹھنڈا کیا۔

”میں مرد ہوں۔ عورتیں تو اپنی محبت پر زندگی قربان کر دیتی ہیں۔“ محبت میں عورت و مرد کی تفریق کا یہ فلسفہ ہاتھ نہیں کہاں سے آیا تھا۔

دل و دماغ اور ضمیر کی ٹھٹھکیں جاری رہی۔ وجاہت

ملک بل ادا کر کے مارکیٹ کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں ریکا پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

”تم کیسی ہو ریکا؟“ زوار حسین نے دوسری جانب سے آکر اچانک ہی اسے متوجہ کیا اور ساتھ ہی بے تکلفی سے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ ریکا سیکنڈ کے سویرے میں در رہ گئی۔

”آپ کیسے ہیں زوار؟“ اس نے پلٹ کر پوچھا بھی نہ تھا کہ زوار خود ہی بول پڑا۔

”آہ ریکا! میں اور تم کوئی الگ الگ حالت میں تو نہیں ہو سکتے۔“

اس نے لمبے میں اپنا نیت اختیار کر کے بلند لمبے میں کہا کہ باہر آتے وجاہت ملک نے صاف طور پر سن لیا۔ وجاہت کو سنا کر زوار تیزی سے مڑ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”یہ کون صاحب تھے؟“ وجاہت کا لہجہ خاصا تیز تھا۔ وہ اندر تک تھرا گئی۔

”یہ وہ۔۔۔ وہ یہ یہ پاپا کی فیکٹری میں۔۔۔“ جملہ پورا نہ ہو پا رہا تھا۔

”پر تم انہیں اور یہ تمہیں کیسے پہچانتے ہیں جبکہ پاپا تو ملازمین کو گھر میں بلانے کے قائل ہی نہیں اور جہاں تک میرے علم میں ہے تم بھی فیکٹری نہیں جاتی تھیں۔ پھر تمہاری ان صاحب سے اتنی بے تکلفی کیسی؟“

ریکا کی غیر ہوتی حالت پھر شادی کے شروع شروع میں ریکا کا اچانک ڈپریشن میں چلے جانا انہیں کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ ریکا پر انہوں نے تن من دھن ڈال دیا تھا۔ لیکن عورت اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھولتی۔ کبھی کا رنڈھا ہوا جملہ اس وقت انہیں سچو کے لگا رہا تھا شک کے کانٹے سر اٹھائے انہیں زخمی کیے دے رہے تھے۔

”تمہاری اس سے اتنی بے تکلفی کہ وہ ”تم“ ”تم“ کر کے باتیں کر رہا تھا۔“ وہ تقریباً دھاڑے تھے۔ ریکا ”کیسے لفظوں میں بیان کروں کیسے خوفوں میں سمیٹوں“

دلی کیفیت میں آنکھیں پھاڑے وجاہت کو خالی ذہن کے ساتھ تک رہی تھی۔ ہری ہری گھاس پر محو خرام ریکا کے پیر میں کانا اس شدت سے چبھا تھا کہ اس کے پورے وجود کو لولہاں کیے دے رہا تھا۔

”وجاہت! ہمارا معاملہ صرف ایک دوسرے کو بندیدگی کے ساتھ دیکھنے تک ہی محدود رہا تھا اور کچھ بھی نہیں تھا ہمارے درمیان۔ نہ لمبی لمبا قاتیں نہ مدد کیاں۔“

”پھر وہ اتنا بے تکلف کیوں ہو رہا تھا؟“

”مجھے نہیں خبر کہ اس نے یہ آگ کیوں لگائی؟“

آگ نے انیسیت، محبت، اعتماد، الفت سب کو نگل لیا تھا اور اس کی راگھ سے ریکا اور وجاہت کے درمیان ٹک و اجنبیت کی دیوار حائل ہو گئی تھی۔

سامان کو جیسے تیسے گاڑی میں ڈال کر وجاہت نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو ریکا نے سکھ کا سانس لے کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولنا چاہا۔

”تم پیچھے بیٹھو۔“ وہ غرائے۔

”ہائی کی زندگی کا سفر دریا کے دوپٹوں کی طرح ہی گزرے گا۔“ وہ سسکی۔ ریکا نے بے دم ہو کر اپنی گردن سیٹ کی پشت سے ٹکا دی اور یادوں نے اسے آگھیرا۔

☆ ☆ ☆

زوار حسین کی مخصوص کال بیل پر مالی بابا بڑے صاحب کے کمرے کی طرف لپکتے صاحب سے چابیاں لیتے اور مین گیٹ کی طرف بڑھ جاتے۔ روزانہ کا ایک ہی معمول تھا اور یہ معمول کی تھنٹی چھوٹی بی بی کو بہت کھلتی۔ جب سے فیکٹری میں نیا چوکیدار رکھا تھا۔ زوار حسین کی ڈیوٹی میں چابی لے کر جانے کا مزید اضافہ کیا تھا۔

”بابا! اپنے ٹوکڑ سے کہیں کہ وہ آپ کو مسڈ کال دے لیا کرے۔ ڈور بیل بجا کر سب گھر والوں کی نیند مڑب کرتا ہے۔“ ریکا نے آج باپ سے اپنی ناراضی کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

”بھئی! وہ سونے کا وقت ہی کب ہوتا ہے۔“ سیٹھ نعمان نے مسکراتے ہوئے اس کے تراشیدہ بالوں کو اپنی انگلیوں سے بکھیر دیا۔

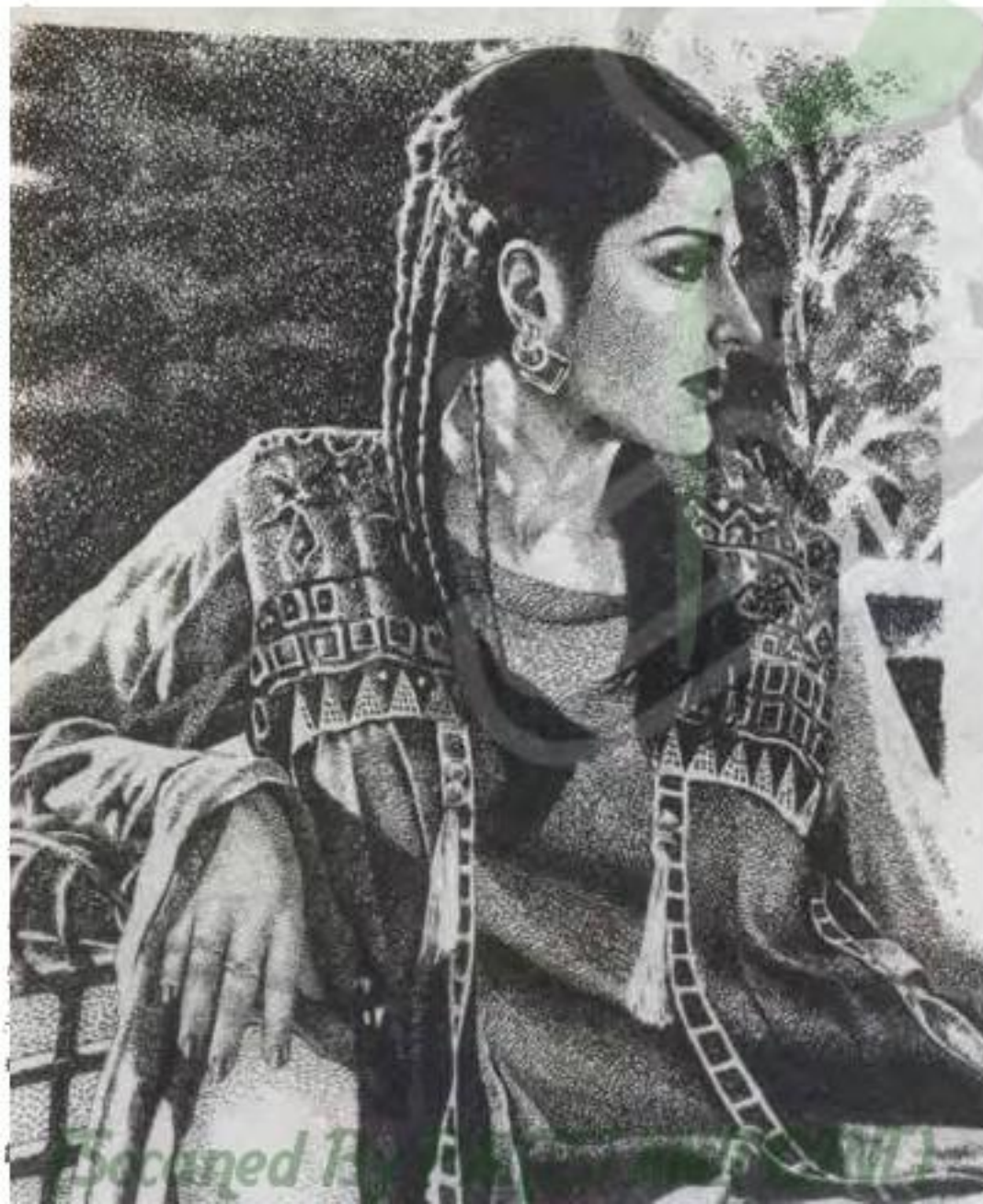
”بابا! آپ تو عادی ہیں سرشام سو جانے اور صبح پو پھنٹے اٹھنے کے۔“ ریکا خاصی برہم تھی۔

”اس وقت ٹھیک نو بج رہے ہوتے ہیں جب زوار حسین چابی لینے آتا ہے۔“ نعمان صاحب نے وضاحت کی۔

”چابیاں اسی کو دے دیا کریں تاکہ صبح ہی صبح اسے لانگ مارچ کرنے کا غصہ بیل پر نہ اتارنا پڑے۔“ وہ نرج ہو رہی تھی۔

”ایک تو وہ لانگ مارچ نہیں کرتا بلکہ اپنی آلٹو پر آتا ہے، آخر ہماری فیکٹری کا اکاؤنٹنٹ ہے۔“ انہوں نے تفصیل سے بتایا۔ ”اور رہا چابیوں کا سوال تو میں رات کے لیے کسی کو نہیں دے سکتا سو طرح کے ذہن ہوتے ہیں۔“ سیٹھ نعمان اپنی دور اندیشی بیان کر رہے تھے۔

”جو کچھ بھی ہو بس کل سے میری نیند ڈسٹرب نہیں ہوئی چاہیے اس کے بے وقت آنے سے۔“ وہ بے زار بے زار سی باپ کے پاس سے پلٹ آئی۔ وہ



نیند کے معاملے میں ہمیشہ کمزوری دکھا جاتی تھی۔ اس نیند کے سبب کالج کی حاضری بھی پچاس فیصد سے نہ بڑھتی تھی۔

ریکا تنگ ہو رہی ہو اور سیٹھ نعمان کچھ نہ کریں یہ ناممکن تھا۔ جب سے سبیکا اور وجیہ نعمان حادثاتی موت کا شکار ہوئی تھیں۔ نعمان صاحب ریکا کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اب اس کی ماں بھی وہی تھے اور بڑی بہن بھی۔ ارحام تو ویسے ہی بہت چھوٹا اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ اسے بھی بھرپور توجہ کی ضرورت تھی۔ نعمان صاحب بہت خوبی سے اپنی دہری ذمہ داریاں نبھاتے تھے۔

”زوار! تم کل صبح سے کال بیل کے بجائے مجھے کال کرنا۔“ انہوں نے بیٹی کی شکایت کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔

”بہتر جناب۔“ زوار نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔



”ٹرن ٹرن ٹرن“

”کون پاگل کا بچہ ہے؟“ نیند میں ریکا ہر لحاظ بالائے طاق رکھ دیتی تھی۔ اس نے فون ریسیو کرتے ہی دل کا غبار نکالا۔

”دیکھیں محترمہ! میں نعمان صاحب کی فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ آپ جو بھی ہیں مجھے جو چاہے کہیں لیکن باپ تک جانے کی اجازت نہیں۔“ ادھر سے درشت گجے میں تنبیہ کی گئی۔

”اچھا اچھا! کیا کام ہے؟“ پھر پھینکا گیا۔

”وہ سیٹھ صاحب جاتے ہوئے آپ کا نمبر دے گئے تھے کہ جو بھی کام ہو آپ سے رابطہ کروں۔“

”تو کیا ضرورت آپڑی اتنی صبح صبح۔ منہ اندھیرے؟“ وہ تھانے دار بنی ہوئی تھی۔

”آپ کو اگر نوبے بھی سورج نظر نہ آئے تو اس میں میرا کیا قصور؟“ یہ زوار حسین اچھا خاصا ڈھیٹ ہے۔

”صبح اس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلے۔ صبح

اس وقت ہوتی ہے جب آدمی جاگ جائے۔“ بڑبڑائی۔ نیند کے ٹوٹنے پر ابھی تک اس کے منہ کا ذائقہ بد مزہ ہی تھا۔

”میں تو روز اسی وقت آتا ہوں میڈم! آپ جاگتی ہیں یا سوئی؟ یہ میرا مسئلہ نہیں۔“ دوسری طرف بھی جھنجھلاہٹ عیاں تھی۔

”اچھا! کس لیے آئے ہیں کیا کام ہے؟“

”اس وقت فیکٹری کی چابیاں لینے آیا ہوں۔“

”آں ہاں! پیا رات جاتے ہوئے اسے کہہ گئے تھے کہ زوار حسین کو چابیاں دیتا اس کی ذمہ داری ہے۔

مالی بابا پھر اس کے سر پر کھڑے تھے۔

”اب کیا ہو گیا؟“ وہ بے زاری سے بولی۔

”وہ زوار صاحب کہہ رہے ہیں انہیں آپ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے۔ بہت اہم معاملہ ہے۔“

”عجیب آدمی ہے۔ کہہ دو! میرے سونے کا وقت ہے۔ شام کو ڈسکس کر لیتا۔“ اس نے کروٹ بدل لی۔

”نیند کا سارا مزا کر کر کر لیا۔ اس زوار کے بچے نے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

”چھوٹی بی بی! اچھوٹی بی بی!“

”کیا ہے؟“ وہ اتنے زور سے دھاڑی کہ مالی بابا دو فٹ اچھل پڑے۔

”وہ کہہ رہے ہیں بات ابھی کرنا بہت ضروری ہے۔ فون پر نہیں کی جاسکتی۔“

”اچھا ابلا لو اس آفت ناگہانی کو اندر۔“

وہ خاصی بد لحاظ ہو رہی تھی۔ جلدی سے واش بیسن سے ٹھنڈے پانی کے چھپکے لگا کر شب خوالی کا لباس تبدیل کر کے جیسے ہی وہ لان کی طرف آئی تو ایک دروازہ قندوجیہ نوجوان کو بے چینی کے عالم میں شعلتے پایا۔

”آپ؟“

”جی! زوار حسین۔“ ذہن میں بسا ”مالی بابا“ ایسا ملازم کہیں رن فوچر ہو گیا۔

”میڈم! نیند ڈسٹرب کرنے پر معذرت۔“

مسکرایا تو اس کے ہموار چمک دار دانت اس کی وجاہت میں مزید اضافہ کر گئے۔

”جی!“ وہ بولنا بھول رہی تھی۔ ویسے بھی کسی اجنبی سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

”جی بولیں! کیا پر اہم ہے کیا ہوا ہے؟“ ریکا نے اپنے آپ پر جلد ہی قابو پایا۔ وہ خاصی مہذب ہو گئی تھی یا مرغوب۔

”میڈم! بات یہ ہے کہ بڑے صاحب کے اے ٹی ایم نمبر کو ٹریس کر کے کسی نے اچھی خاصی شاپنگ کر ڈالی ہے اور صاحب کا اپنا سیل مسلسل بند جا رہا ہے۔ اگر کوئی دوسرا پرائیویٹ نمبر ہو تو انہیں اطلاع کر دیں۔“

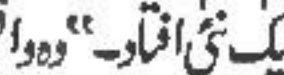
”کیا ہو گیا ہے لوگوں کو؟ روز؟ روز کی ہڑتالیں، لمبی لمبی لوڈ شیڈنگ، قسم قسم کے بھتوں نے ویسے ہی کمر توڑ رکھی ہے۔ یہ ایک نئی افتاد۔“ وہ واقعی خاصی پریشان ہوئی تھی۔

”میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ بس صاحب کو اطلاع کر دیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ سلی دیتا رخصت ہو گیا۔ لیکن وہ رخصت کب ہوا تھا؟ دراز قاسمی، خالص مردانہ وجاہت، کھلتا ہوا گندمی رنگ، گولون کی مہک، سب ہی کچھ تو جیسے لان میں چھوڑ گیا تھا۔

ریکا کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ کوئی اپنا تعہلاتی بت چھوڑ گیا ہو۔ سارا دن کوئی خوشگوار سا احساس ساتھ رہا تھا۔ اس نے کئی بار چونک کر ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی خود بخود دیو دیو پر آجانے والی اس مسکراہٹ کو دیکھ تو نہیں رہا۔ یہاں ہے ہی کون جو تمہاری کیفیت نوٹ کرے۔

رات پایا سے حسب معمول بات چیت میں زوار سین کی صلاحیت کی بات نکلی تو اس سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ دل کی کیفیت کو باپ سے چھپانا خاصا مشکل تھا۔



دوسری صبح زوار کی مسند کال پر بجائے چابیاں بھیج دینے کے اس نے فون پر بات کرنا شروع کر دی۔

”بابا! آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“ اس نے خواہ مخواہ ہی بات کرنے کا بہانہ تراشا۔

”آج آپ نیند سے بیدار ہو چکی ہیں؟“ اس سوال پر ریکا گڑبڑا گئی۔

”وہ آپ کو بابا کے خیالات سے آگاہ تو کرنا ہی تھا نا۔“ زوار کی محنت اور ایمان داری نے پہلے ہی نعمان صاحب اور اس کے درمیان سے آجروں و مزدوروں والے فاصلے سمیٹ دیے تھے۔ لیکن نفسانی خواہشات انسان کو مذہب ہی سے نہیں تہذیب سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔ سو زوار اور ریکا دو شریف اور مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے اسیر ہوتے چلے گئے۔

ریکا نعمان کی صبحیں ”مسند کال“ کی منتظر رہتیں۔ پہلے صبح نوبے ”منہ اندھیرے“ لگتا تو اب دن چڑھ چکنے کا شکوہ۔ روز صبح نعمان صاحب کو مسند کال دینے سے پہلے ایک کال ریکا نعمان کے لیے بھی ہوتی۔ دیدار ہونا ایک دوسرے کا اور پھر نعمان صاحب کو کال کرنے کا وقت ہوتا۔

مالی بابا سے چابی وصول کر کے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بھی ریکا کے کمرے کی کھڑکی کا طواف ہو جاتا۔

سیانے کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ گاڑی رکنے کی آواز پہلے اور کال کافی دیر بعد آتی تو نعمان صاحب کو کھونج لگی۔ نعمان ملک صاحب تو ریکا کو ماں کی نظروں سے بھی دیکھتے تھے جو جوان بیٹی کے ساتھ سوئی بھی ہے تو آنکھیں کھلی رکھتی ہے۔ بیٹی کے طور اور چال ڈھال سے اندازہ لگا چکے تھے۔ اب ایک ہی دن کی نگرانی نے معاملہ کھول کر سامنے کر دیا تھا۔

وہ گلاب کی کیاریوں کے پاس کھڑی خوشبو کو اپنے سانسوں میں اتار کر آنکھیں بند کیے کسی اور ہی دنیا کی سیر کر رہی تھی۔

مختصر اتنا کہ دو لفظوں سے بن جاتا ہے دل

ہے وسیع اتنا کہ اس میں دو جہاں کا راز ہے اس راز کو چھپائے وہ خاصی پریشان بھی ہو جاتی۔ کوئی دوست، کوئی بہن، ہوتی جو راز دل کہہ کر تھوڑا ہلکا ہوا جاتا۔ جب ہی مالی بابا اس کا بلاوا لے کر آگئے۔ پاپا نے اسے بلایا تھا۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا۔“
”ہوں بیٹھو! بڑا مشکل ہوتا ہے ایسے مواقع کو فیس کرنا۔“

اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔ ربیکا نے سوالیہ نظروں سے باپ کی جانب دیکھا۔ دل کی دھڑکن آج کل ویسے ہی بے قابو ہو ہو جاتی تھی۔

”بیٹا دیکھو! میں تمہیں باندھنے کا عادی نہیں ہوں۔ تم بتاؤ زوار تمہاری نگاہ میں کیسا لڑکا ہے؟“ انہوں نے بیٹی سے براہ راست سوال کر ڈالا۔

”بہت بہت ہی اچھا۔“ دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ لیکن دل کی بات زبان پر لانے کا موقع بھی تو یہی تھا۔ سو اس نے بلا تکلف باپ کی بات کا جواب دے دیا۔

”تم اس میں انٹرنل ہو؟“
”ہاں! اگر مجھے موقع دیا جائے تو میرا فیصلہ اس کے حق میں ہو گا۔“ باپ کے سیدھے سوال کا سیدھا ہی جواب آگیا تھا۔

”اچھا!“ پانی کے سر سے اونچا ہونے کے احساس نے انہیں خاصا فکر مند کر ڈالا تھا۔
”لیکن ربیکا! تمہیں اس بات کا علم ہے کہ ہماری فیملی میں اپنی ذات سے باہر رشتے نہیں ہوتے۔“

”جی!“ ربیکا رو دینے کو تھی۔ ”بیٹا! آپ نے آج تک میری کوئی خواہش رد نہیں کی۔ مجھے اپنے پیار پر بڑا مان ہے کہ وہ بیٹی کی خاطر اس فضول پابندی کو توڑ دیں گے۔“ اس نے بڑے ناز سے کہا۔

”نہیں، نہیں بیٹا! تم نے غلط اندازہ لگایا ہے۔“ انہیں اپنا ماضی یاد آگیا۔ اس روایت نے انہیں اور مرمم کو کیسا کیسا تڑپایا تھا۔ مگر بابا کے آگے ساری آد

زاریاں بے سود۔ ماضی اور حال کے درونے مل کر ان کی آنکھوں کو بھی نم کر دیا تھا۔
”بیٹا! میں ایک تمہاری خاطر اپنے پرکھوں کی روایات نہیں توڑ سکتا۔“ انہوں نے اضطراری کیفیت میں سر کو کئی مرتبہ نفی میں حرکت دیے ڈالی۔

”تمہارا! آپ تو خود ان روایات کے ڈسے ہوئے ہیں۔ انہیں پسند نہیں کرتے۔“ اس نے انہیں ان کا ماضی یاد دلایا۔

”بیٹا دراصل ہم سب منافقت کے اسیر ہیں۔ اپنا وقت ہو تو روایات کو برا کہتے ہیں، لیکن پھر بات دوسرے کی آتی ہے تو ان ہی روایات کی پابندی کرتے ہیں۔“ انہوں نے گویا بات ختم کر دی۔

گھر کے بانیوں میں تلاطم برپا ہو جائے تو وہ طوفان اٹھا دیتے ہیں، لیکن اس طوفان میں بھی سیٹھ نعمان پیر جمائے کھڑے تھے۔ نہ ربیکا کی سوچی سوچی متورم آنکھیں انہیں ہلا سکیں، نہ زوار حسین کا خاموشی سے سروس کو خیر یاد کہہ دینا۔

آج وہ کئی ماہ بعد اپنی دوست کی سالگرہ کے فنکشن میں شریک ہوئی بھلا کوئی کب تک دنیا سے ناپا توڑ کر سنیاں لیے بیٹھا رہ سکتا ہے جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ جذبات سے گندھی عورت تو شمع کی مانند پھل کر ختم ہو ہی جاتی ہے۔ اس کا وجود ایک بے شکل ڈھیر میں تبدیل ہو کر بس اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ فنکشن میں جس نے اسے دیکھا، تعجب سے ہی دیکھا۔

”اسے کیا ہو گیا؟“
وہ کوئے والی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔

حسن سوگوار کے متلاشی وجاہت ملک کی نظریں بڑی دیر سے اس کے تعاقب میں تھیں اور وہ بخل ہو رہی تھی۔ دیر پرے کی رشتہ داری تھی، اس لیے قریب آکر دعا سلام کرنے کا موقع وجاہت نے نہیں جانے دیا تھا۔ شمع کی مانند پھلتی سکتی ربیکا وجاہت کے دل کو روشنی عطا کرنے اس کی کوٹھی میں جا اتری۔ اپنی ذات اپنے لوگ اپنے ہم پلہ۔

”کیا ہوا ربی! آج تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟“ وجاہت نے اس کی آنکھیں دیکھ کر تشویش کے ساتھ پوچھا۔

”بس! یوں ہی ذرا سر میں درد ہے۔“ اس نے ہمانہ بنا دیا، ورنہ رات خواب میں زوار کو دیکھنے کے بعد جو کچھ کھلی تو نیند ہی کب آئی تھی۔ ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کے دھپک ایسے جلے کہ صبح ہو گئی۔

”لاؤ! میں سر دبا دوں۔“ وہ اپنے اندر کے تپتے صحرا کو چھپا کر ہی رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وجاہت ملک اسے ایسے ہی چھوڑ دیتے، ناممکن تھا۔ انہوں نے اس کا سر اپنے چوڑے شانوں پر رکھ کر اتنی نرمی سے دبایا کہ وہ واقعی پرسکون ہو گئی۔

وقت کے مرہم اور شوہر کی محبت کے اگلے چشموں نے اسے ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا۔ پارٹیز، فنکشنز، گھر، بازار وہ ہر جگہ وجاہت کے سنگ نظر آتی۔ وہ وجاہت ملک کے دل کی دھڑکن تھی تو وجاہت بھی تو اس کا دل تھا۔ یوں لگتا جیسے زوار حسین اس کی زندگی میں آیا ہی نہ ہو اور یہ ہے بھی حقیقت۔ عورت جب کسی کو بھلا دے تو اسے پہچانتی تک نہیں۔

”ارے ربی! یہ تم نے آج کیسے بد رنگ کپڑے پہن لیے؟ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے یہ بینگنی رنگ کے کپڑے، تم جیسی خوب صورت لڑکی پر پلیز۔“

لیکن شاید ”پلیز“ تو وجاہت ملک کے منہ سے بعد میں نکلا۔ وہ پہلے ہی اپنے وار ڈروب کی طرف بڑھ چکی تھی۔

”ہاں! بے شک آج کل فیشن ہے، مگر وجی! مجھے کمرے کی رنگ برنگی دیواریں پسند نہیں۔ ایک ہی کمرے میں پورا کمرہ اچھا لگتا ہے۔“

مینٹر کے چلے جانے کے بعد جب وجاہت اسے گھر کی نئی کمرہ اسکیم کے متعلق تفصیل سے بتا رہا تھا تو ربیکا نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”لوگے! کل مینٹر سے اسکیم درست کرائیں

گے۔“ وجاہت نے اس کی پسند کو مقدم جانا۔
جب ایک دوسرے کے جذبات و خواہشات کا احترام اس درجے میں ہو تو زندگی رشک جنت تو ہوتی ہے نا۔

ربیکا نے بے دم ہو کر اپنی گردن سیٹ کی پشت پر ٹکا دی۔ یادوں کی کونپلیں سر نکالتے ہی تادور درخت بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

”یہ تم کینڑوں والے چلے میں کہاں جا رہی ہو۔ بنا چادر لیے جانے کی تیاری پکڑتی، کاندھے پر بیگ لٹکائے جب وہ جھکی جوتیوں کے کسے باندھ رہی تھی تو ارحام نے اسے ٹوکا تھا۔ تقریباً ”گھنٹہ بھر سے تیار ہوتی گلابی گلابی سی ربیکا ایک دم غصے سے لال بھوکا ہو گئی۔“

”یہ تم نے کینڑ کس کو کہا؟“ وہ سیدھی کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

”اپنا! شاید میں آپ کو سمجھا نہیں سکا کہ وہ رب جو ہمارا مالک ہے، جس نے انسان کو اپنے ہاتھ سے تخلیق کیا ہے۔ کیا وہ ہی ہماری ضرورتوں کو نہ جانے گا؟“

”کیوں کیا میں نے کپڑے نہیں پہنے ہوئے جو ایک اور بوجھ لادلوں؟ میں نے سن گلاسز پہلے ہی لے رکھے ہیں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”حجاب صرف دھوپ کی تہا زت ہی سے نہیں بچاتا بلکہ ذہنی گندگیوں سے بھی دور رکھتا ہے۔“ ارحام نے اصل بات بتادی۔

”شک کیے جانا اپنی بصارت و عقل پر۔ پتا نہیں تم لوگ کیوں تاریک کونوں کھدروں میں دیکھنے کے عادی ہو۔ روخنیاں تمہیں دھوکا لگتی ہیں۔“ ربیکا پر روشن خیال ہونے کا خبط سوار تھا۔ لہذا بھائی کی درست بات بھی غلط لگ رہی تھی۔

”اگر آج میں حجاب میں ہوتی تو زوار حسین مجھے یوں عرش سے فرش پر پھینک سکتا تھا، یوں میرے اور وجاہت ملک کے درمیان بد اعتمادی اور شک کی وسیع دیواریں کھڑی کر سکتا تھا؟ کاش۔۔۔ وہ بری طرح سک رہی تھی۔“

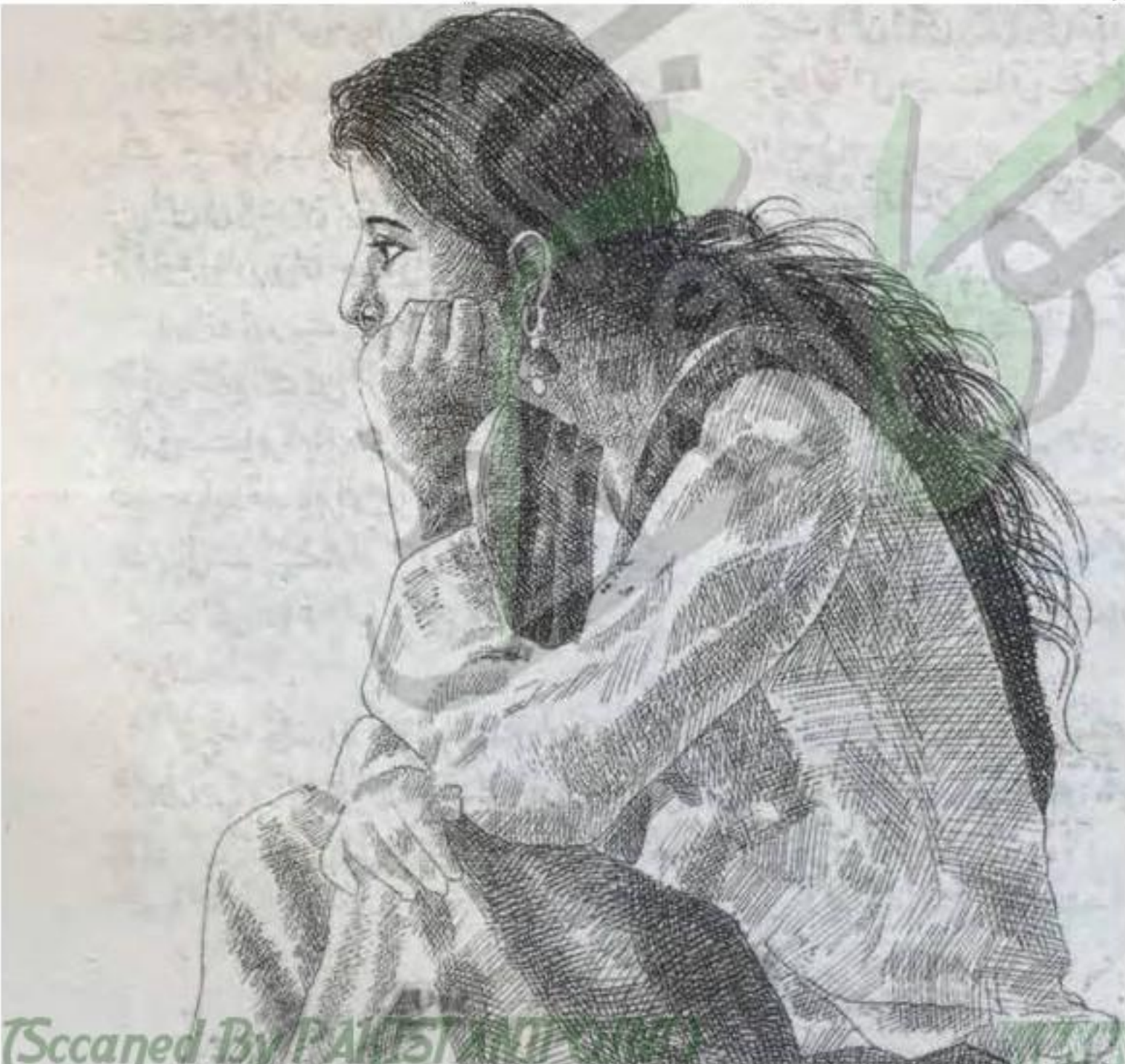


بات بتائی کہ ان کی لاڈلی نے کیسے مجھے دو ٹکے کا کر کے رکھ دیا۔
 ”ٹھیک کیا اس نے۔ بہت سمجھ دار بچی ہے وہ۔“
 امی کی بات پر میں مزید تپ گیا۔
 ”میں اس کے تایا کا بیٹا ہوں امی! گلی کا کوئی لوفر لڑکا نہیں ہوں جس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے ناراضی سے امی کو دیکھا، مگر وہ میری بات کو نظر انداز کر کے کچن میں چلی گئیں۔
 ”کیا بات ہے اشعر صاحب! پارہ کیوں ہائی ہے؟“ چائے کا کپ اٹھائے اندر آتے سفیان نے پوچھا۔
 ”یار! بابا میرا رشتہ کر رہے ہیں اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ۔“
 ”تو پھر کیا پر اہلم ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔
 ”وہ 1960ء کا ماڈل ہے۔ تجھے تو پتا ہے نا! مجھے تھوڑی ماڈرن لڑکیاں پسند ہیں۔“ میں نے اپنا مسئلہ بتایا۔
 ”او بھائی! شادی کے لیے ایسی ہی لڑکیاں ٹھیک رہتی ہیں۔“ سفیان مجھے مزید مشوروں سے نوازتا، مگر اس کا موبائل بج اٹھا۔
 ”کہاں تھیں تم؟ چار دنوں سے مسلسل تمہارا نمبر ٹرائی کر رہا ہوں، مگر ہر وقت آف ہوتا ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ چار دن ہو گئے میں نے کچھ نہیں کھایا۔“ سفیان کال ریسیو کرتے ہی شروع ہو گیا۔

امی کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔ آخر انہوں نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اس 1960ء کی ماڈل سے شادی کر لوں گا۔ انہیں دنیا میں ایک میں ہی بے وقوف نظر آیا تھا۔
 ”میں مکر بھی کرن سے شادی نہیں کروں گا۔“ میں نے اٹل لہجے میں کہا۔
 ”یہ تمہارے بابا کا فیصلہ ہے اور تمہیں پتا ہے نا! ان کا۔“ امی نے مجھے ڈراتا چاہا۔
 ”میں کرن سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“ میں نے موبائل بند کر کے دور پھینکا۔
 مجھے بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔
 کرن میرے اکلوتے چچا کی اکلوتی بیٹی تھی۔ مجھے لگتا تھا اس میں کوئی بوڑھی روح سمائی ہوئی ہے۔ نہ جانے کون سے دور میں رہتی ہے وہ۔ آج کے ماڈرن دور میں بھی ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے، بڑا سا تھان نما دھپٹا لیٹے رکھتی ہے۔ مجھے اس سے سخت چڑ ہے۔ چڑنے کی اصل وجہ پچھلے دنوں پیش آنے والا واقعہ ہے۔
 دو ہفتے پہلے جب میں چھٹیوں پر گھر گیا تھا تو چچی سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ کرن نے گیٹ کھولا اور کھولتے ہی مجھے دیکھ کر بولی۔
 ”اشعر بھائی! اماں! بابا گھر پر نہیں ہیں۔ آپ بعد میں آجائے گا۔“
 اپنی اتنی عزت افزائی پر میرا دماغ گھوم گیا۔ اسے مجھ پر اپنے سکے تایا کے بیٹے پر اتنا اعتبار بھی نہیں تھا کہ گھر کے اندر آنے دے۔ میں نے گھر جا کر امی کو ساری

میں آنکھیں پھاڑے اس کا جھوٹ سناتا رہا۔ ابھی پھر میں برائی کی ٹین پلیٹیں چٹ کر گیا تھا اور صبح میں حلوہ پوری کا ناشتا۔
 وہ اکثر لڑکیوں سے اسی طرح کے جھوٹ بولتا رہتا تھا۔ جانے یہ کون ہے۔ شہزاد، سدرہ، ماہ جبین یا وئی ادب۔
 ”کیا؟ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا سدرہ! تم صاف انکار کر دینا۔ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔ اگر تم کسی اور کی موٹیس تو میں اپنی زندگی ختم کر لوں گا۔“
 میں نے غور سے سفیان کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس کی آواز سے بالکل مختلف تھے۔ آواز سے وہ بہت بے چین اور پریشان لگ رہا تھا، جیسے اس کے چہرے پر سوائے ایک کھینچی سی مسکراہٹ کے کچھ نہ تھا۔ سفیان اب خاموشی سے دوسری طرف سے آتی آواز سن رہا تھا اور میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔
 ”سدرہ! مجھے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں ٹائم لگے گا۔ ایسے تو پاپا نہیں مانیں گے۔ چلو! ٹھیک ہے“

میں اپنے گھر والوں سے بات کروں گا۔ تم ہاں مت کرنا۔ اگر تم نے کہیں اور شادی کی تو تمہاری ڈولی سے پہلے تمہارے سفیان کا جنازہ اٹھے گا۔“ سفیان کی بات سن کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ ڈانٹہ لاگ میں نے کسی فلم میں سنا تھا۔
 ”اوکے۔ میں خود کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم کل آؤ گی تا پارک میں؟ وہیں بات ہوگی، بائے۔“ سفیان نے فون بند کیا تو میں نے اس سے پوچھا۔
 ”یہ سدرہ کا کیا چکر ہے؟“
 ”وہی جو ایک سو دس لڑکیوں کا مسئلہ ہے کہ ماں، باپ ان کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں، مگر وہ میرے سوا کسی سے شادی نہیں کریں گی۔“ سفیان نے شرارت سے کہا۔
 ”تو سدرہ کو کیوں ورغلا رہا ہے؟ کہہ دے کہ خاموشی سے جہاں اس کے ماں، باپ کہہ رہے ہیں، شادی کر لے۔“
 ”میں کیوں کہوں؟ جب اسے خود خیال نہیں ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ وہ میرے بغیر مرجائے گی تو میں نے



بھی کہہ دیا کہ میں بھی تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔
سفیان ڈھٹائی سے بولا تو مجھے اس پر غصہ آیا۔
”اسے سچ سچ بتا دے کہ تو اس کے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا۔ یار! اچھی خاصی عزت دار فیملی ہے۔ کیوں تماشا بنا رہا ہے ان کا۔“ میں نے اسے سمجھانا چاہا۔
”او نہ! عزت دار فیملی۔ اتنے ہی عزت دار ہیں تو اپنی بیٹی پر نظر کیوں نہیں رکھتے۔“ سفیان کے لہجے میں حقارت تھی۔ میں بس اسے دیکھے گیا۔ اسے سمجھانا بہت مشکل تھا۔

یونیورسٹی سے آتے ہی میں سو گیا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو سفیان آئینے کے سامنے کھڑا تیاری میں مصروف تھا۔
”کہاں کے ارادے ہیں یار؟“ میں نے اس کی تیاری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پارک جا رہا ہوں، سدرہ سے ملنے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ میں نے اسے سمجھانے کی نیت سے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ میرا ارادہ بھانپ گیا۔
”اشعر! دیکھ اب نا صبح نہ بن جاتا۔ تجھے پتا ہے نا مجھے نصیحت کرنے والے لوگ زہر لگتے ہیں۔“
اس کی بات سن کر میں نے اسے سمجھانے کا ارادہ ترک کر دیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔
دروازہ زور سے بند ہونے پر دوبارہ آنکھ کھلی۔ سفیان شدید غصے میں کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیا تو حیران رہ گیا۔ میں کتنی دیر تک سو رہا تھا۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اٹھا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر سستی کو کم کرنا چاہا۔ جب میں کمرے میں لوٹا تو سفیان کسی کو گالیاں دینے میں مصروف تھا۔

”ایڈیٹ“ بچہ۔ وہ سمجھتی کیا ہے خود کو۔ اس جیسی ہزاروں صبح و شام سفیان رضا کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ میں اس جیسی ٹل ٹلاس لڑکیوں کو گھاس تک نہیں ڈالتا۔“

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے اسے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے پوچھا۔
”سدرہ کی۔۔۔ پہلے مجھے پارک میں بلایا۔ پورے دو گھنٹے اس کا ویٹ کیا۔ فون کیا تو بولی، ”سفیان! میں نہیں آسکتی۔ میری مجبوری کو سمجھو۔“ سفیان نے اس کی نقل اتاری۔
”ہو نہ! بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی مجبوری۔ ایک بار مل جائے تو اس کا وہ حال کروں گا کہ یاد رکھے گی۔“ سفیان نے جوتے اتار کر دیوار پر دے مارے اور واش روم میں گھس گیا۔
جانے کیوں مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ سدرہ نہیں آئی۔

”یار! آج شام سعود کی طرف چلنا ہے۔ برفاں ہوگا وہاں آج۔“ میں نوٹس بنا رہا تھا، جب سفیان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

سعود یونیورسٹی کا کافی پانی گرامی لڑکا تھا۔ اس کی شہرت بالکل اچھی نہیں تھی۔ وہ کسی ایم پی اے کا بھتیجا تھا، اسی وجہ سے اس نے کھلی غنڈہ گردی چھائی ہوئی تھی۔

”نہیں یار! میں نہیں جاسکوں گا۔“ میں نے صاف انکار کیا۔

”کیا مطلب نہیں جاسکوں گا۔ اس نے تجھے لانے کا پیشل کہا ہے۔“

”مجھے کیوں؟“ میں حیران ہوا۔

”اس لیے کہ تو میرا دوست ہے۔ وہ کہتا ہے اس کے دوستوں کے دوست اس کے بھی دوست ہیں۔ تو آٹو میٹیکلی تو بھی اس کا دوست ہوا نا؟“ سفیان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سفیان! وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔ ایسے لڑکوں سے دوستی نہیں۔“ میں نے اسے سمجھانا چاہا، مگر اس نے میری بات کا شادی۔

”دیکھ اشعر! مجھے سمجھا مت۔ بس یہ بتا کہ میرے

ساتھ چلے گا یا نہیں؟“ اس نے جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

”ٹھیک ہے! چلوں گا۔ کتنے بچے جانا ہے؟“ میں نے ہار مانتے ہوئے پوچھا۔

”رات کھانے کے بعد۔ تو تیار رہنا۔ میں ذرا گھر دلوں سے بات کر لوں۔“ سفیان موبائل پر مہر ملا تے ہوئے ٹیرس پر چلا گیا۔

میں سفیان کی وجہ سے مان تو گیا تھا، مگر میرا سعود کی طرف جانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ آج کل میں بہت داس تھا۔ میں امی، ابا سے ناراض تھا۔ اس دن کے بعد گھر سے کوئی فون نہیں آیا تھا۔ حالانکہ میں منتظر تھا کہ امی مجھے منائیں، مگر لگتا تھا کہ امی کو کرن مجھ سے زیادہ عزیز تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور سفیان، سعود کے فلیٹ کی طرف چل پڑے۔ سعود بہت پر جوش انداز میں ملا۔ وہاں پہلے سے پانچ، چھ لڑکے موجود تھے، جنہیں میں اکثر یونیورسٹی میں دیکھتا رہتا تھا۔

”داوا! کوئی فن بھی ہو گا یا ایسے ہی بٹھائے رکھو گے؟“ گھر سے شرٹ والے لڑکے نے بے تابی سے پوچھا۔

”فن، کوئی ایسا ویسا۔ بڑے انتظام کیے ہوئے ہیں داوا نے۔ سر براڈ ہے عاصم بھائی!“ سعود کے پاس بیٹھے ہوئے لڑکے نے کہا۔

وہ سب ایک دوسرے سے معنی خیز گفتگو کر رہے تھے۔

سعود کا موبائل بجاتا تو نمبر دیکھتے ہی اس نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”لوں ہوں! یہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔“ اس نے حقارت سے کہا اور موبائل بند کر کے دور اچھال دیا۔

”کون ہے داوا؟“ سفیان نے اشتیاق سے پوچھا۔

”تمہارے ڈپارٹمنٹ کی حمیرا ہے یار! ذرا سی لفٹ کیا کر اوی۔ پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔“

حمیرا کا نام سن کر میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ وہ ہمارے

ڈپارٹمنٹ کی کافی لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے لگتا تھا کہ یہ میری آئیڈل ہے۔
”مہ۔ مگر وہ تو ایسی لڑکی نہیں ہے۔“ میں نے بے یقینی سے کہا۔

”اوئے! کون سی دنیا میں رہتے ہو شہزادے؟“ گھر سے شرٹ والے لڑکے نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”سفیان! تیرا دوست تو بڑا ہی بھولا ہے یار!“ سعود نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ کر کہا۔

”داوا! اسے چھوڑ۔ یہ بتا پارٹی کب شروع ہوگی؟ ہم بھی دیکھیں، کیا سر براڈ ہے۔“ سفیان نے باتوں کا رخ بدلا۔

وہ سب اپنی باتوں میں مصروف ہو چکے تھے، جبکہ میں اب تک شاک میں تھا۔ میں حمیرا سے بے حد متاثر تھا۔ میں تو یہاں تک سوچ چکا تھا کہ موقع پا کر حمیرا سے بات کروں گا کہ میں اپنی امی، بابا کو اس کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں، مگر۔

وہ ویسی نہیں تھی، جیسی نظر آتی تھی۔ یا شاید مجھے لوگوں کی پہچان نہیں تھی۔

مجھے اپنا آپ وہاں مس فٹ لگ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اچھے دیکھ کر سفیان نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”یار! طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔“

”کیا ہوا؟ میں گھر چھوڑ آؤں، مگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو؟“ سفیان کے چہرے پر پریشانی تھی۔ شاید میں چہرے سے بیمار لگ رہا تھا۔

”نہیں۔ میں خود چلا جاؤں گا تو انجوائے کر۔“ یہ کہہ کر میں رکا نہیں۔ جلدی جلدی سیڑھیاں اترتا نیچے پہنچا۔ کھلی فضا میں دو، تین لمبے لمبے سانس لے کر میں نے خود کو کافی بہتر محسوس کیا۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر میں نے جیب سے چالی نکالی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ میں نے فوراً ”مزکر“ دیکھا تو تھوڑے فاصلے پر کوئی لڑکی کھڑی تھی بڑی سی

چادر اوڑھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ بھی تھا۔ اس نے چادر سے منہ چھپایا ہوا تھا۔
”شعر بھائی! سفیان کہاں ہے؟“ آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔
”تم کون ہو؟“

”میں سدرہ ہوں۔ میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ آئی ہوں۔“

”کیوں؟“ میری آواز ایک دم تیز ہو گئی۔
”وہ لوگ میری شادی کر رہے ہیں۔ میں سفیان کے بغیر مر جاؤں گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ لوگ پیدا کرنے والے ماں باپ کے بغیر تو رہ سکتے ہیں، مگر ایک اجنبی شخص کے بغیر مرنے کا دعوا کرتے ہیں۔

میں نے ایک نظر اس کے سفری بیگ پر ڈالی۔ میرا دل چاہا اس کی بے وقوفی پر ماتم کروں جو ایک اجنبی شخص کے لیے رات کے اس پہر اپنا گھر چھوڑ آئی تھی۔

”تمہیں معلوم بھی ہے، تم جس لڑکے کے لیے گھر چھوڑ کر آئی ہو، وہ روزانہ پچاس لڑکیوں کو یہی کہتا ہے کہ وہ ان سے محبت کرتا ہے، اور ان کے بغیر مر جائے گا؟“

”نہ۔۔۔ وہ ایسا نہیں ہے۔“ سدرہ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔

”تم جانتی کتنا ہوا اسے؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، تمہیں اس سے بات کرتے ہوئے۔ وہ پرانا کھلاڑی ہے۔ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ وہ تمہارے بارے میں کیسے کیسے الفاظ استعمال کرتا ہے تو تمہارا دل چاہے گا کہ کسی قریبی نالے میں ڈوب کے مر جاؤ۔“

اور تم۔۔۔ تم منہ اٹھا کر اس طرح چلی آئیں۔ اپنے ماں باپ کی عزت کا پاس نہیں ہے تمہیں؟“ مجھے سدرہ پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔
مجھے محسوس ہوا، وہ رورہی ہے۔

”تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ واپس چلی جاؤ۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔“
وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے خیال آیا رات کے اس پہر اس کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں ہے۔

”رکو!“ میری آواز پر وہ رک تو گئی تھی، مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ”میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

میں اس سے تھوڑے فاصلے پر چلنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا، وہ مسلسل روئے جا رہی ہے۔
”چھاپ! ابھی رو لے۔ نہیں تو اسے پوری زندگی رونا پڑنا۔“

سڑک پر اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ میں اس کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ وہ اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی تو میں نے اسے پکارا۔
”سنو! آئندہ ایسی غلطی کبھی مت کرنا۔ لڑکیاں جب رات کے اس پہر اکیلی گھر سے نکل جاتی ہیں تو بے اماں ہو جاتی ہیں۔ جہاں تمہارے ماں باپ کہہ رہے ہیں، وہاں شادی کر لو۔ وہ کبھی تمہارا برا نہیں چاہ سکتے۔ کیونکہ دنیا میں صرف ماں باپ کا رشتہ ایسا ہے جو بے غرض ہے۔“

اس نے مڑ کر مجھے ایک نظر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔ وہ جلدی سے گھر کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ دروازے پر ذرا سا زور ڈالا تو وہ کھٹک چلا گیا۔ لگتا تھا اس کے گھر والوں کو ابھی تک خبر نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور فلیٹ کی طرف چل پڑا۔ مجھے اپنے اندر سکون اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے سوچ لیا تھا، صبح ہوتے ہی گھر فون کر کے امی بابا سے معافی مانگوں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ میں کرن سے شادی کے لیے تیار ہوں۔

مجھے ان کا فیصلہ منظور ہے۔ انہوں نے میرے لیے بہترین انتخاب کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی میرا برا نہیں سوچ سکتے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب سائٹ آپ کیلئے جاری رکھ سکیں۔

پاکستانیوں کی ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



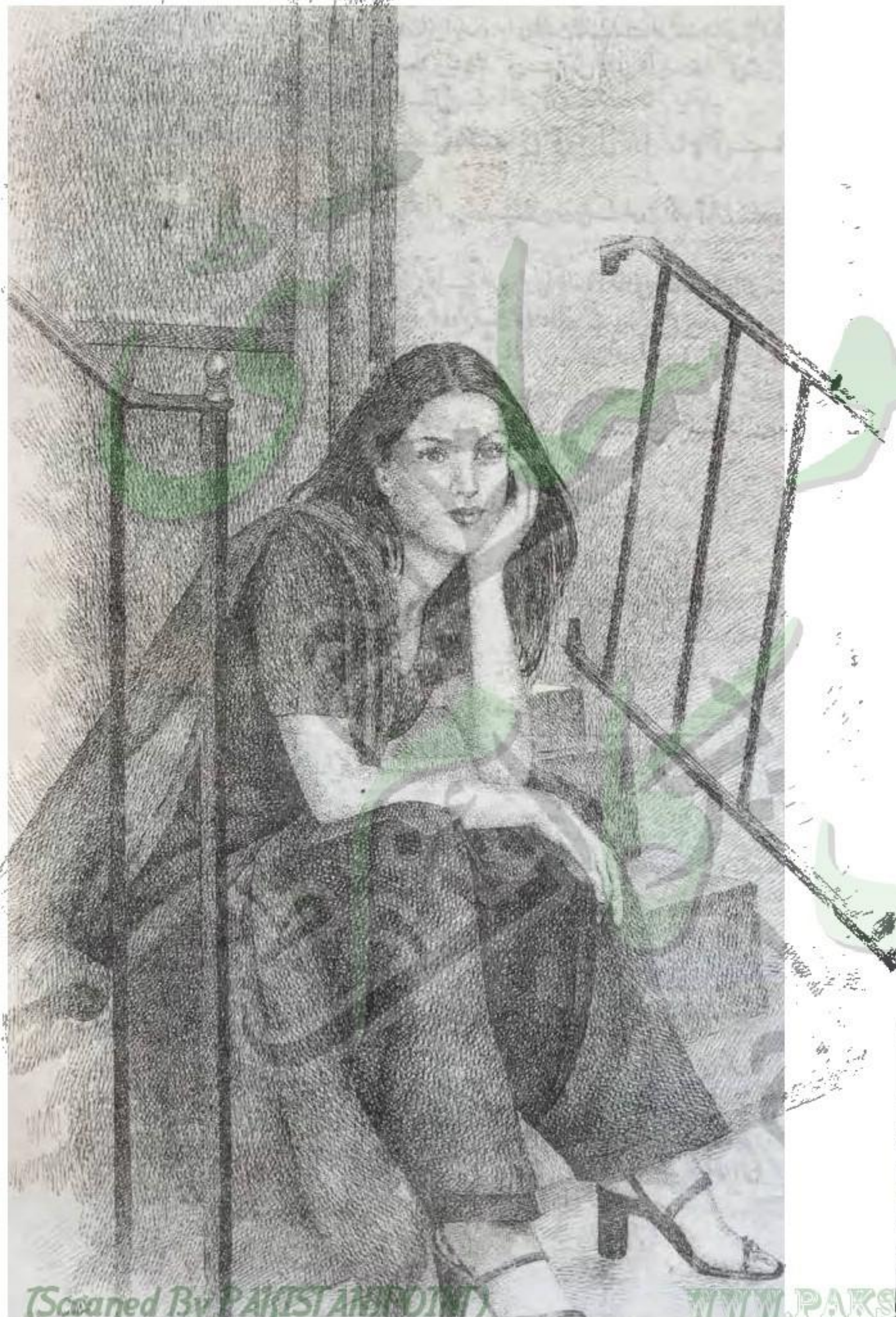
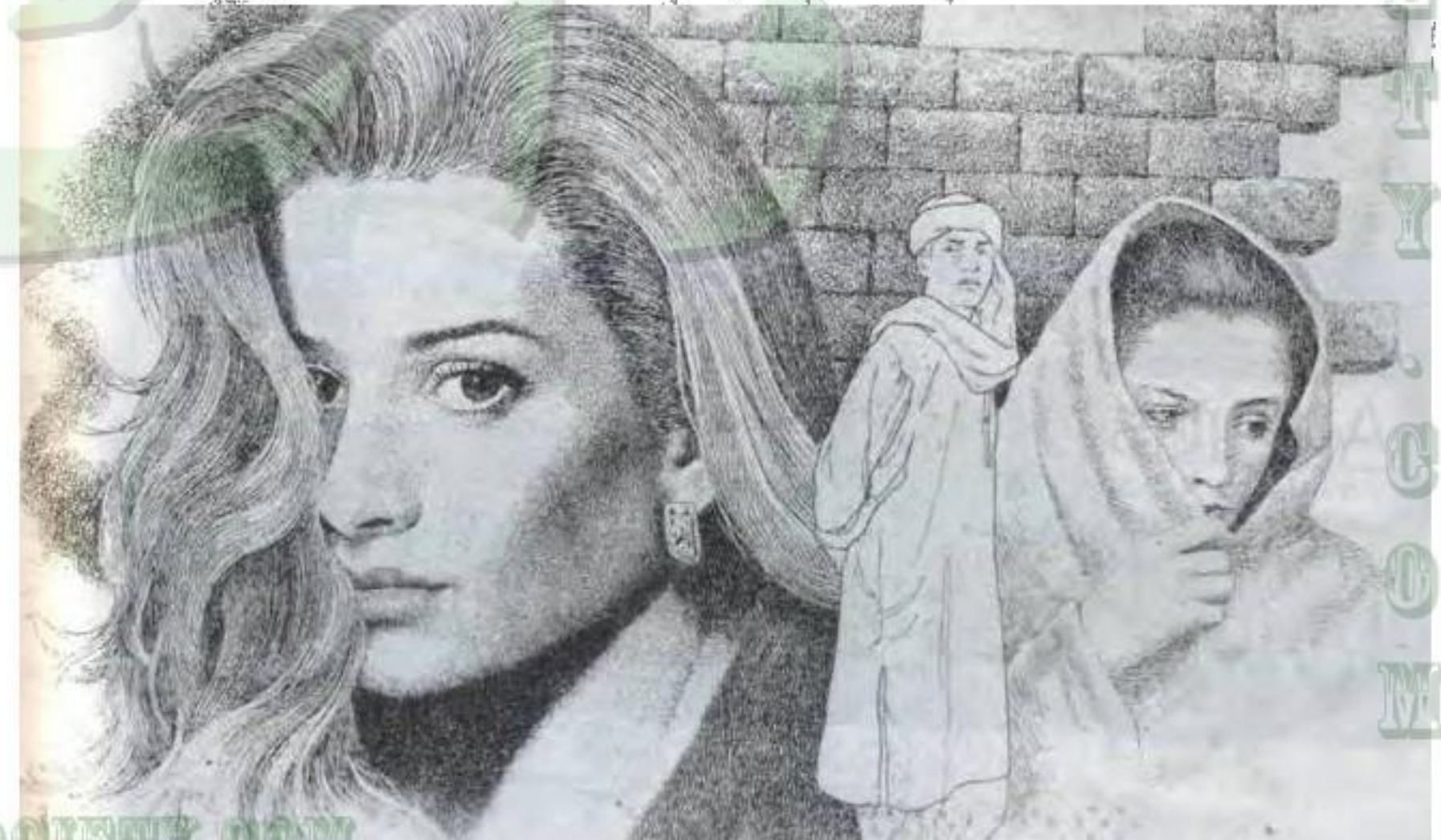
LIBRARY FOR PAKISTAN

اکتبی سیریل

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میٹھا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پر شکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مرنے سے قبول نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں زینبی اور امی کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی میٹرکارا کو چھوڑ کر مہر سے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر مہر واپس آگئی مگر وہ میٹھا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پر شکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میٹھا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مرنے میٹھا کی تعلیم چھڑا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میٹھا پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پر شکوہ خانم میٹھا کو گھر ہی میں پڑھانے لگیں۔ انہیں میٹھا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پر اسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

علاقے میں میٹھا کا تو مہر امی اور زینبی جوش و خروش کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ میٹھا بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر مہر اور گرینی نے اسے روک دیا۔

نکاح و طلاق



میشا نے تہہ کر لیا کہ خواہ سب سے چھپ کر سہی، میلے میں ضرور جائے گی۔ میشا نے پُر شکوہ خانم کی پرانی ساڑھی اور مہر کے کمرے کے پردے کاٹ کر ایک خوب صورت لباس تیار کیا اور چہرے پر بھونڈے انداز میں میک اپ تھوپ لیا مگر کوئی اسے دیکھے بھی تو پہچان نہ سکے۔ کانوں میں اس نے زینی کے بندے پہن لیے۔

میشا میلے میں گئی تو اسے وہاں دیر ہو گئی۔ اسے مائرنامی ایک نوجوان ملا۔ میشا نے اسے گھرتک ساتھ چلنے کا کہا، مگر اسے اپنا نام بتانے سے انکار کیا۔ وہ مائرنامی اپنے ساتھ کشتی میں لے گئی۔ میشا کشتی سے اتری تو اس کا ایک ہندو کشتی میں گر گیا۔ اس کے جانے کے بعد مائرنامی وہ ہندو سنبھال کر رکھ لیا۔ میشا نے اپنی بے ساختہ باتوں سے اسے متاثر کیا تھا۔

مہر نے کارا کو دعوت پر بلایا، کیونکہ وہ اس کے بیٹے مائرنامی سے اپنی کسی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ ساڑھو دعوت پر آیا تو میشا بیماری کے باعث اس سے مل نہیں سکی۔

زینی نے وہ ہندو اس رات میشا نے پہنا ہوا تھا اپنے دوپٹے میں بروج کے طور پر لگایا تو مائرنامی اسے وہی لڑکی سمجھا، جو اسے فیسٹول میں ملی تھی۔

کارا نے خاندان اور قرب جوار کی تمام لڑکیوں کو اسے گھر مدعو کیا تاکہ مائرنامی کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ پُر شکوہ خانم کا گھر انہ بھی مدعو تھا۔ مگر وہ لوگ میشا کو ساتھ نہیں لے گئیں۔

میشا گھر میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک وہاں رومان آگیا۔ اس نے اپنا تعارف پری زاو کی حیثیت سے کرایا۔ رومان نے پارٹی میں جانے کے لیے میشا کے لباس کا انتظام بھی کر دیا۔ زینی نے وہ ہندو الان میں پھینک دیا تھا۔ رومان نے وہ اٹھا کر میشا کے دوپٹے میں لگا دیا اور اسے دعوت میں لے گیا۔ میشا دعوت میں پہنچی تو مائرنامی اسے دیکھ کر چونک گیا۔

چھٹی قسط

اس کے ہاتھ اور زبان مسلسل چل رہے تھے اور رومان نے اسے بالکل بھی نہیں روکا۔

نہ مارنے سے نہ بولنے سے۔

وہ چپ چاپ مار کھاتا اسے دیکھتا رہا۔ میشا کا دوسرا بازو اس نے ابھی بھی مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور جب میشا بولتے بولتے اور اسے مارتے مارتے ہلکان سی ہو گئی تو اس تو نڈھال ہو کے اس نے اپنا ماتھا رومان کے سینے سے ٹکایا اور سسک کے رونے لگی۔

”برا میں نہیں ہوں میشا! بری یہ محبت ہے۔“

رومان نے اس کے سر کو ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”میں اس تک پہنچتے پہنچتے پیچھے کیوں رہ جاتی ہوں رومان! بتاؤ نا۔“ وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا میشا کہ نیت صاف رکھ کے اسے پانے کی کوشش کرو۔ اس میں ملاوٹ نہ کرو۔ تم نے پھر سے تو کوئی گڑبڑ نہیں کی؟“

اس کے سوال پر میشا نے روتے روتے سسکی سی بھری اور اس کے سینے سے اپنا سراٹھا کے دیکھا۔ اس

اس سے زیادہ نہ سننے کی تاب تھی میشا میں نہ دیکھنے کی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ پلٹ گئی۔ نگاہوں کے آگے سب منظر دھندلے سے ہو رہے تھے۔

رومان تشویش سے اس کے پیچھے لپکا۔

”میشا! رکو میشا!“

وہ نہیں رکی تو رومان نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کے تھاما جسے میشا نے جھٹکا دے کر چھڑانا چاہا۔

”چھوڑو مجھے۔“ اور جب کامیاب نہیں ہوئی تو دوسرے ہاتھ سے اسے مارنے لگی۔

”تم برے ہو، گندے ہو تم۔ مجھے تم پر اب بالکل بھی بھروسہ نہیں ہے۔ تمہاری ہر بات جھوٹی اور غلط نکلتی ہے۔ دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ کوئی مدد نہیں کر سکتے میری۔ چلے جاؤ اپنے فیری لینڈ میں۔ جاؤ۔ بہت برے ہو تم۔ جاؤ۔ جاؤ۔“

کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں شرمندگی عود کر آئی جسے محسوس کر کے رومان نے افسوس سے کہا۔

”یعنی کی ہے؟“

وہ لب چلتے ہوئے سر جھکا کے ذرا ایک قدم پیچھے ہٹ کے کھڑی ہو گئی۔



”اب تو مجھے سو فیصد یقین ہو گیا ہے کہ مائرنامی مجھ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔“ زینی نے لہجے میں فخر سمو کے کہا۔ ”چاہے میں کچھ بھی کر لوں۔ بس میرے دو آنسو یا ایک پیار بھری مسکراہٹ اسے چاروں شانے چت کر سکتی ہے۔ اتنا پیار کرتا ہے وہ مجھ سے۔“

”تم سے؟ یا اس سے؟ جس سے وہ جھیل پہ ملا تھا؟“

ایمی کے طنزیہ سوال پر وہ غصے سے چلا اٹھی۔

”شٹ اپ ایمی! وہ صرف اور صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔“

”تم اسے بھی دھوکا دے رہی ہو اور خود کو بھی۔“

”اور تم کیا کر رہی ہو؟ مجھے بلیک میل؟ میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں۔ اپنا منہ بند رکھو اور دوبارہ یہ ذکر مت کرنا۔ سمجھیں۔“

زینی نے اسے خوں خوار نظروں سے گھورا تھا۔



”تم نے کتنی غلط حرکت کی ہے میشا۔“ رومان کچھ کچھ ناراض لگ رہا تھا۔ اور وہ کچھ کچھ شرمندہ سی۔

”پہلے تو تم نے صرف دو لوگوں میں مس انڈرا سینڈنگ پیدا کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا اور اس بار کسی کو دوسرے کی نظر سے گرانے کے لیے جھوٹ بولا بلکہ اس کے کردار پر کیچڑ بھی اچھالی۔ تمہیں احساس ہے کہ یہ کتنی غلط بات ہے؟“

اس کی لعنت ملا مت یہ میشا نے منہ ہی منہ میں بدبدا کے صرف اتنا کہا۔ ”سوری۔“

”مجھ سے نہیں۔ اللہ سے کہو۔ کیونکہ دو سروں پہ

بہتان لگانا اللہ کو پسند نہیں ہے۔ اسی لیے تمہارا کام بننے بننے بگڑ جاتا ہے۔ اپنی نیت صاف رکھو میشا۔ اس میں کھوٹ نہ آنے دو پھر جو چاہو گی وہ ہو جائے گا۔“

اس کے تسلی دینے پر بھی میشا کے دل سے نہ غبار دور ہوا نہ چہرے سے مایوسی کے سائے ہلکے ہوئے۔ اس نے فقط ایک نظر رومان کو دیکھا اور پھر مرے مرے قدموں کے ساتھ گھر کی جانب جانے لگی۔ اس بار رومان نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دکھ اور ہمدردی بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”کھوٹ تو شاید میری نیت میں بھی ہے، تب ہی تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کیا رہا۔ میشا۔ میں نے سچ کہا تھا۔ محبت بہت بری ہے۔ یہ میری تم سے محبت ہی ہے جو تمہیں پانے کی خواہش بھی نہیں کرتی۔ مگر تمہیں کسی اور کو پانے بھی نہیں دے رہی۔“



مائرنامی کے ساتھ ہو کے بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ نجانے کیوں جب بھی اسے میشا کے ساتھ گزارے گزشتہ روز کے خوشگوار پل یاد آتے تھے تو وہ بو جھل اور شرمندہ سا ہو جاتا تھا۔ اسے ایک بے چینی سی گھیر لیتی تھی۔ سوچ کر کہ وہ اس معصوم اور سادہ دل سی لڑکی کو یہ کہہ کر آیا تھا کہ وہ اسے فون کرے گا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ اسے سچی دوستی کے قابل سمجھتی ہے یا نہیں، مگر اب اس دوستی کا اعتراف زینی کے سامنے کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ زینی کی فطرت سے واقف ہو تھا اور پھر میشا کے ساتھ اس کا جو رویہ تھا اس کی جھلک بھی کئی بار ملاحظہ کر چکا تھا۔ نہیں چاہتا تھا میشا محض اس کی وجہ سے زینی یا مہر کے زیر عتاب آئے اس لیے فون کرنے سے اس نے گریز کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ زینی کو کبھی یہ بات اچھی نہیں لگے گی کہ وہ میشا کی جانب بڑھے یا میشا سے اس کی دوستی ہو۔



میشا نے سب جاننے بوجھتے ہوئے بھی سارا دن اور

ساری رات اس کے فون کا انتظار کیا۔
بوجھل دل اور اترے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ
وہلے ہوئے کپڑے تار پہ پھیلا رہی تھی جب رومان
اس کے عقب میں آکر کھڑا ہو گیا۔
”تم ابھی تک او اس ہو؟“ وہ کل والی اداسی کے غلبے
سے نکل چکا تھا۔

”نہیں! مجھے تو بہت خوش ہونا چاہیے۔ ناچنا گانا
چاہیے۔“

وہ البتہ کل کی طرح ہی اکھڑی ہوئی تھی۔
”بالکل تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“
”تم پاگل ہو کیا؟“

”نہیں! میں نہیں تم پاگل لگوں اگر یہ روتا سورتا
چہرہ اور آنسو بھری آنکھیں لے کر مار کے سامنے گئیں
اس پہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہیں اس کی وجہ سے
کتنی تکلیف ہوئی ہے۔ یاد رکھو پیشا! اس پر یہ کبھی
ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم اس کی وقتی توجہ کا کوئی اور
مطلب سمجھی ہو۔ اس کے سامنے ایسے رہو جیسے
تمہیں اس بات کی بالکل پروا نہ ہو کہ وہ زینی سے محبت
کرتا ہے یا اس سے شادی کرنے والا ہے۔ اس کے
سامنے کبھی کمزور مت پڑو۔“

”کہنا آسان ہے۔ مگر کرنا بہت مشکل۔“
”اتنا بھی نہیں۔ جب کوئی ضبط کرنے پہ آئے تو
بس کر گزرتا ہے۔“ رومان کی جگنو بھری آنکھوں میں
ستارہ ٹوٹا تھا۔

”تم جانتی ہو وہ کون سی چیز ہے جس نے مار کو زینی
کی جانب دوبارہ پلٹنے پہ مجبور کیا؟“
”کون سی چیز؟“

”جیلسی۔ حسد۔ رقابت۔ جیسے ہی اسے
احساس ہوا کہ زینی کی زندگی میں اس کے علاوہ کوئی اور
بھی ہے یا ہو سکتا ہے وہ گھبرا گیا۔ تم بھی یہ احساس مار
کے دل میں جگا سکتی ہو۔“

”لو۔ اٹے مشورے تو کوئی تم سے سنے۔“ یشا
نے پہلے اسے تیکھی نظر سے گھورا پھر ہونٹ لٹکائے۔
”میں کیسے ولاؤں یہ احساس؟ میری زندگی میں تو کوئی

اور ہے ہی نہیں۔“
”حق لڑکی۔ زینی کو بھی اور کوئی منہ لگانے پہ تیار
نہیں ہے۔ جھوٹ بولا تھا اس نے۔ ڈراما کیا تھا۔ کچھ
سمجھیں۔“
”ہوں۔“ اب بیشا واقعی سمجھ گئی تھی۔

ایمی ہمیشہ کی طرح آج بھی وہیں اسی درخت سے
ٹیک لگائے بیٹھی رو رہی تھی۔ وہ مسکرایا اور اس کے
پاس آ کے بولا۔
”چاکلیٹ لاؤں تمہارے لیے۔“

”میں چاہیے۔“ وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو
صاف کر کے بولی۔
”کیوں ڈائننگ؟“

”اس سے کیا فرق پڑے گا۔ میں زینی جیسی تو پھر
بھی نہیں بن سکتی۔“
”اللہ نہ کرے جو تم زینی جیسی بنو۔ تم جیسی بھی
ہو۔ بہت اچھی ہو۔“

”تم میرا دل رکھنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہو۔“
”کاش۔ میں تمہارا دل رکھ سکتا۔ مگر کیا کروں
میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے۔“

اس کے سادہ سے انداز میں کہی بات نے ایم کو پھر
سے غصہ دلادیا۔
”پھر سے مذاق اڑا رہے ہو میرا؟“

”قسم سے نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں
پہلے ہی کسی کا دل رکھ چکا ہوں اور ایک وقت میں ایک
ہی دل رکھ سکتا ہوں۔ اتنی ہی جگہ ہے میرے سینے میں
ورنہ خوشی خوشی رکھ لیتا تمہارا دل بھی۔“

ایمی کا منہ مایوسی سے لٹک گیا۔
”اچھا۔ مطلب۔ تم کسی اور سے محبت کرتے ہو؟
اور ماما کا خیال ہے وہ تم سے میری۔“

کہتے کہتے وہ تورک گئی۔ مگر پلوں پہ سجے دو آنسوؤں
کو گرنے سے نہ روک سکی جن کو رومان نے اپنی انگلی کی
پور پہ چن لیا اور مسکرا کے کہا۔

”اف۔ یہ آنسو۔ یاد رکھو امی! ابھی بھی اس کے
لیے آنسو نہ بہاؤ جو تمہارے لیے آنسو نہ بہا سکے۔ ان
کو سنبھال کے رکھو۔ اس کے لیے جو تمہارے پیار
میں آنسو بہا سکے۔“

”مجھے نہیں لگتا اس دنیا میں کوئی ایسا ہو گا۔“
اس کے لہجے میں محرومیاں تھیں۔ رومان نے تسلی
دی۔

”ہو گا۔ ضرور ہو گا۔ یہیں کہیں۔“

یہ زینی کی غلط فہمی تھی کہ اب وہ جب چاہے مار کو
تغیر کر سکتی ہے اور اس کے آنسو ہر بار اس کو موم
کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا یہ گمان کچھ مرجھا سا گیا تھا
کیونکہ پچھلے دو دن سے وہ متواتر مل رہے تھے مگر ہر بار
مل کے بھی اسے لگتا تھا وہ مار سے نہیں ملی۔ مار تو جیسے
کہیں کھو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی
ساتھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ جھنجھلا نے لگی۔ چڑنے لگی۔
اور اس جھنجھلا ہٹ اور چڑچڑے پن نے رنگ
دکھانا ہی تھا کیونکہ دوسری جانب مار تھا جس کا اپنا مزاج
ہمیشہ آخری سرے پہ ہوتا تھا۔

”ہنی مون کے لیے کہاں جائیں گے؟“ وہ بار بار
اسے اس موضوع کی طرف لار رہی تھی جتنا وہ اس سے
بدک رہا تھا۔

”ابھی سے میں کیا بتاؤں؟ بعد میں دیکھیں گے۔“
اس کی بے زاری نے زینی کو غصہ دلادیا۔ ”تمہارا
موڈ بولابلا سا ہے مار۔“

”ایسا نہیں ہے۔ شاید تھکا ہوا ہوں۔“
”اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میرے ساتھ سے
تمہیں تھکن نہیں محسوس ہونی چاہیے۔“

”زینی! یہ کیا بات ہوئی؟“
اس کے ماتھے کی ناگوار شکنیں زینی کو تاؤ دلا گئیں۔
”میں سمجھ گئی۔ یہ سب کارا آنٹی کی وجہ سے
ہے۔“

”زینی پلیز۔ مام کو درمیان میں مت لاؤ۔“
”میں نہیں لار رہی۔ وہ خود آرہی ہیں درمیان میں۔
جب سے وہ واپس آئی ہیں تم ایسے ہی پیش آرہے ہو۔
میرے ساتھ۔ لگتا ہے انہوں نے پھر سے تمہیں
میرے خلاف بھردیا ہے۔“

”وہ ایسا کیوں کریں گی زینی! تم بلا وجہ دہم کر رہی
ہو۔ مام ایسی نہیں ہیں۔“

”وہ ایسی ہی ہیں۔ میری ماما نے مجھے بتایا ہے کہ ان
کی نیچر ہی ایسی ہے۔“

”اؤہ گاڈ۔! مہر آنٹی کے ان کے بارے میں ایسے
خیالات ہیں۔ تب ہی تم ان کے لیے اتنی غلط رائے
رکھتی ہو۔“

”میری مام غلط نہیں کہتیں۔ تم بھی بہت جلد کارا
آنٹی کا اصل روپ دیکھ لو گے۔“ اس کی یہ بات مار کے
صبر کو دبانے تک لے آئی۔

”تمہیں تو ابھی میری مام ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔
تم اپنے دل میں ان کے خلاف اتنا کچھ بھر کے بیٹھی ہو۔
شادی کے بعد کیسے ایڈجسٹ کرو گی؟“

”تمہاری مام یہ شادی ہونے دیں گی۔ تب
تالا۔ میں جانتی ہوں۔ ان کی پوری کوشش ہے یہ شادی
نہ ہو۔“

”اور مجھے لگتا ہے اگر یہ شادی نہ ہوئی تو اس کی
سب سے بڑی وجہ تم ہو گی۔ اگر ہمارا بریک اپ ہوا تو
اس کی وجہ مام کا نہیں تمہارا رویہ ہو گا۔“

”بریک اپ؟ اب بھی تم کہتے ہو، کارا آنٹی کا
تمہارے اس بدلتے رویے سے کوئی تعلق نہیں ہے؟
کل وہ واپس آئی ہیں اور آج تم بریک اپ کی بات
کر رہے ہو۔ جارہی ہوں میں۔“

وہ جانے کے لیے پلٹی اور مار نے پیچھے سے پکار کر
کہا۔
”اس بار میں تمہیں منانے نہیں آؤں گا زینی!“

کوشش کر رہا تھا کیونکہ پر شکوہ خانم ایک ضخیم کتاب میں سے کچھ پڑھ کے اسے سنار ہی تھیں بالفاظ دیگر اس کی معلومات میں اصافہ کر رہی تھیں۔ جس کا وہ قطعی خواہش مند نہیں تھا۔

”تم دھیان سے کیوں نہیں سن رہے لڑکے؟“ آخر انہوں نے اس کی بے توجہی محسوس کر کے کہا۔

”آپ مجھے یہ سب سنا کیوں رہی ہیں؟“ وہ ناگوار تاثرات چھپانے کی رتی بھر بھی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

”تم بالکل میٹھا جیسے ہو۔ کہانیاں جتنی مرضی سنا دو اسے۔ بور نہیں ہوگی مگر کام کی بات بتانے لگو تو کانوں پر ہاتھ رکھ لے گی۔ بہت عادتیں ملتی ہیں تم دونوں کی۔“

”کاش عادتوں کے ساتھ ساتھ ستارے بھی ملتے ہوتے۔“

اس نے بے حد آہستگی سے زرب لپ کہا تھا۔ ان تک الفاظ تو نہیں پہنچ سکے مگر وہ اس کی نظروں کا مبہم مفہوم ضرور بھانپ گئیں۔ وہ نظریں جو دیوار پر آویزاں میٹھا کی تصویر پر مرکوز تھیں۔

پر شکوہ خانم کا ذہن ان نظروں سے الجھ سا گیا تھا۔

☆☆☆

زینی سے تلخ کلامی کر کے آنے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور گھر آتے ہی اپنے فون سے میٹھا کے گھر کا نمبر ملاتے ملاتے وہ ٹھنک کے رک گیا۔

”تو کیا میں زینی کی قربت سے اس لیے خائف ہو رہا تھا کہ اس کی ناراضی کے ڈر کی وجہ سے مجھے میٹھا سے گریز کرنا پڑ رہا تھا۔ کیا اس لیے دانستہ یا نادانستہ میں نے اسے خود سے دور کیا تاکہ میں کسی طرح دوبارہ میٹھا سے رابطہ کر سکوں۔“

وہ اپنی ادھیڑ بن سے تب نکلا جب فون کے دوسری جانب میٹھا کی آواز سنائی دی۔

”مار؟ خیریت؟“ اس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ وجہ وہ

جانتا تھا۔

”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ ملنا چاہتا ہوں۔“

”میرے لیے بغیر کسی وجہ کے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے مار! کئی پہلے ہوتے ہیں۔“

”مجھ سے ملنے کے لیے کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔“

اور یہ سن کے میٹھا کی وہ ساری دیواریں ڈھسے گئیں جو اس نے رومان کی ہدایت پہ اپنے ارد گرد کھڑی کی تھیں۔

”کہو۔“ وہ ہتھیار ڈالنے کے انداز میں بولی۔

”کیا ہم صبح مل سکتے ہیں؟“

”صبح؟ مشکل ہے۔“

”پلیز میٹھا! بس تھوڑی دیر کے لیے۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھتی ہوں کچھ۔“

اور اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ فون بند کرتے ہی اس کے چہرے پر خوشی بھری مسکراہٹ آگئی کچھ دیر کے لیے اس نے زینی کے وجود کو یکسر فراموش ہی کر دیا۔

علی الصبح وہ گھاٹی کے اوپر سے پھول توڑ کے لارہی تھی جب گھر کے بالکل سامنے مار کو اپنے انتظار میں پایا۔

”جنگل سے آ رہی ہو؟ ڈر نہیں لگتا اکیلے جانے سے؟“

”نہیں تو۔ لگتا تب بھی جاتی۔ اتنا پیار ہے مجھے ان پھولوں سے کہ ان کے لیے کہیں بھی جاسکتی ہوں۔“

”کیا کرتی ہوں ان پھولوں کا؟“

”سجاتی ہوں۔“

”کہاں؟“

مار نے اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی زینی کو دیکھ لیا تھا اس لیے بلا وجہ بات کو طول دینے لگا۔

”کہیں بھی۔ جہاں بھی یہ سجے ہوئے اچھے لگیں۔“

وہ مار کے اس سوال در سوال کا مقصد نہ جان پارہی تھی۔

”میں بتاؤں یہ پھول سب سے اچھے کہاں سج کے لگیں گے۔“

”ہاں! ستاؤ۔“ میٹھا کے کہنے پر مار نے اس کے ہاتھ میں کھینچی ٹوکری سے ایک پھول اٹھایا اور اس کے بالوں میں سجانے لگا۔

”یہاں۔۔۔ ان پھولوں کی اس سے اچھی جگہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔“

میٹھا کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع تھا اس لیے وہ اپنی بے ساختہ امنڈ آنے والی مسکراہٹ اور خوشی کو چھپانے

پائی۔ باوجود رومان کی سب ہدایتیں پلو سے باندھنے کے۔ بالکل اسی طرح جیسے زینی یہ چھپا نہیں پارہی تھی کہ وہ کتنی جل بھن رہی ہے۔ مار نے ایک بار پھر

کن اکھیوں سے زینی کو دیکھا اور میٹھا کا ہاتھ تھاما۔

”جھیل پہ چلیں۔“

”ہاں۔۔۔ چلو۔“

اور ابھی وہ اس کے ساتھ چند قدم ہی آگے چلا ہوگا کہ اس کے فون پر زینی کی کال آگئی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا

پھر بڑے اجنبی سے انداز میں پوچھا۔

”ہاں بولو زینی۔ کیا بات ہے؟“

”مار۔۔۔ تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے۔“

دوسری جانب سے وہ چلائی تھی۔

میٹھا نے ایک نظر مار کے چہرے کو دیکھا اور پھر خود کو اس گفتگو سے لا تعلق ظاہر کرتے ہوئے اپنی گود میں

رکھی ٹوکری کے پھول گننے لگی۔ یونہی بلا وجہ۔

”تم تو جیسے بہت ٹھیک کر رہی ہو اور میں نے کیا کیا ہے؟ بات کو تم نے بدھایا تھا زینی۔“

”تم مجھے غصہ دلا دیتے ہو تو میرے منہ سے بھی کچھ

الٹا سیدھا نکل جاتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم

اس وجہ سے میرے سامنے کسی اور کے ساتھ۔۔۔“

مار نے فون کان سے ہٹایا۔ مگر لائن کالے بغیر ہی

میٹھا سے کہنے لگا۔ صرف اور صرف زینی کو سنانے کے

لیے۔

”میٹھا! تم ڈسٹرب ہو رہی ہوگی ان بار بار آنے والی کالز سے۔۔۔ میں ایسا کرتا ہوں شام تک کے لیے فون

آف کر دیتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔“

”مار۔۔۔ تم شام تک اس کے ساتھ رہنے والے ہو؟“

دوسری جانب سے زینی کی چیخ سن کر مار کے اندر سکون سا اثر آیا۔

☆☆☆

”اتنا مزا آیا۔ اتنا مزا آیا۔ اس نے بتایا“ اسے میرا ساتھ کتنا اچھا لگتا ہے۔ میرے ساتھ باتیں کرنا اچھا

لگتا ہے۔ میں اچھی لگتی ہوں۔ اور جب زینی کو پتا چلا تو اس کا وہ حال ہوا کہ کیا بتاؤں۔ میں نے اتنی دور تک

اس کے چلانے کی آواز سنی تھی۔“

وہ رات کو مزے لے لے کر رومان کو بتا رہی تھی۔ جس کے چہرے پر تاسف صاف نظر آ رہا تھا۔

”اور اسے بتایا کس نے۔“

”ظاہر ہے! مار نے۔“ وہ بولی۔

”تمہیں پتا ہے میٹھا! تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

”ہاں پتا ہے۔ پیار ہو رہا ہے۔“ وہ آنکھیں میچ کے

کہہ رہی تھی۔ ”مجھے مار سے اور مار کو مجھ سے۔۔۔“

”حق لڑکی! جو تم مار کے ساتھ کرنے جا رہی تھیں،

وہ تمہارے ساتھ کر رہا ہے اب۔“

”وہی تو۔۔۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ وہ بھی اب مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔“

”ڈفر۔۔۔ تم بھول رہی ہو کہ میرے کہنے پہ تم اسے رقابت اور حسد کا مزا چکھانے والی تھیں یہ بتا کر کہ تم

کسی کو پسند کرتی ہو۔ تاکہ اس کے دل میں جھین پیدا

ہو۔ اور یہی وہ کر رہا ہے اب۔ زینی پہ یہ ثابت کر کے وہ

اس کے مقابلے میں تمہیں اہمیت دیتا ہے تاکہ زینی

مجبور ہو کے اس کے سامنے کھٹنے ٹیک دے۔ اور تم

کتنی آسانی سے کٹھ پتلی بن گئیں۔ میٹھا وہ زینی کو مٹانے

کے لیے تمہیں استعمال کر رہا ہے۔“

میشا منہ کھولے حیرت سے سنتی رہی۔ اس نے
رومان کی بات جھٹلانے کی کوشش بھی نہ کی۔ بس
ٹوٹے ہوئے لہجے میں اتنا کہا۔

”رومان! مجھے تو لگتا تھا۔ زینی بس مائر سے شادی کرنا
چاہتی ہے کسی بھی طرح۔ تو کیا وہ سچ مچ اس سے محبت
کرتی ہے۔“

”ایسا کیوں لگا تمہیں؟“

”دیکھو ناں! وہ مائر سے محبت کرتی ہے تب ہی تو اتنا
جلی مجھے اس کے ساتھ دیکھ کے۔ ابھی بھی مجھے ایسے
گھور رہی تھی جیسے کچا چبا جائے گی۔ گر زینی ساتھ نہ
ہو تیں تو وہ شاید مجھے مار ہی دیتی۔ نفرت تو وہ مجھ سے
پہلے بھی کرتی تھی مگر آج اس کی آنکھوں میں دس گنا
زیادہ نفرت تھی۔ اس لیے ناں کہ مائر اس کے بجائے
مجھ سے۔ نہیں رومان! یہ مائر سے اس کی محبت ہے
جو مجھ سے حسد کر رہی ہے۔“

”نہیں۔ یہ محبت نہیں ہے۔“

”کیوں۔ کیوں نہیں ہے؟“

”جس سے محبت کی جائے اس سے کسی کے ساتھ
دیکھ کے دکھ ہوتا ہے شاید حسد اور جلن بھی محسوس
ہوتی ہو مگر محبت کی جلن میں انسان اندر ہی اندر خود
جل کے بھسم ہو جاتا ہے۔ سو ہواں باہر نہیں نکالتا۔“
”میں سمجھی نہیں۔“ اس کے سر کے اوپر سے گزر
گئی رومان کی یہ منطق۔

”زینی! تمہیں مائر کے ساتھ دیکھ کے جلی۔ مگر اس
حسد میں دکھ ہوتا تو محبت ثابت ہوتی۔ اس کے حسد
میں صرف غصہ اور نفرت ہے۔ ہارنے کا غصہ۔ اور
پیچھے رہ جانے کی تلملاہٹ۔“

”اگر اسے سچی محبت ہوتی، تو کیا کرتی۔“

رومان بے ساختہ کہنے والا تھا۔

”وہی، جو میں کر رہا ہوں۔“

مگر بروقت اس نے خود کو روک لیا اور اپنے دل کی
آواز کو کچھ اور الفاظ کا پیرا بن پساندیا۔

”سچی محبت۔ جس سے سچی محبت ہو اس کے دل
میں کسی اور کی جگہ بننے دیکھ کے دل میں کسک تو ہوتی

ہے۔ دکھ بھی ہوتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے
ہیں۔ بے چینی سی ہوتی ہے۔ مگر لب سے آہ نہیں
نکلتی۔ بس سب کچھ برا برا سا لگنے لگتا ہے۔ کسی اور
سے تو نہیں۔ ہاں اپنے آپ سے ضرور نفرت ہو جاتی
ہے، ہم کیوں اس قابل نہیں کہ اس کی نظر میں سا
سکیں۔“

”مطلب جلن ہوتی ضرور ہوتی ہے۔“

”ہاں مگر بھسم کر دینے والی نہیں۔ میٹھی میٹھی سی
کسک۔ لگا لگا دھواں۔“

”تم کیسی فضول اور مشکل سی باتیں۔“

بے زاری سے منہ بناتے ہوئے میشا کہہ رہی تھی
جب رومان کی جیب سے جھانکتی چاکلیٹ پہ اس کی نظر
پڑی۔

”واؤ۔ چاکلیٹ۔ میرے لیے لائے تھے؟“

اس نے ہاتھ برہا کے اس کی جیب سے چاکلیٹ
نکال لی جو اگلے ہی پل رومان نے واپس اچکل۔

”اول ہوں۔ تمہارے لیے نہیں ہے۔ ادھر دو۔ یہ
میں امی کے لیے لایا تھا۔“

”امی کے لیے کیوں؟“ اسے برا لگا تھا۔

”کیونکہ اسے پسند ہے۔“

”مجھے بھی پسند ہے۔“

”تمہیں بھی لادوں گا۔ مگر یہ امی کی ہے۔ صرف
ایم کی۔“

اس نے چاکلیٹ دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ میشا کچھ
نہ بولی مگر دل میں ایک میٹھی میٹھی سی کسک اور جلن
ضرور تھی۔

اور آس پاس اٹھتا۔ لگا سا دھواں۔

اندر کہیں چھپ کے بیٹھی محبت اوٹ سے دیکھتی
مزے لیتی مسکرا رہی تھی۔

مرے مرے بو جھل قدموں کے ساتھ وہ گھر کے
اندر داخل ہوئی۔ اس کی سمجھ سے قاصر تھا کہ ایک ذرا
سی چاکلیٹ نہ ملنے پہ وہ اتنی افسردہ کیوں ہو رہی ہے۔

”اوسنہ۔ بڑا آیا چاکلیٹ نہ دینے والا۔ سمجھتا کیا
ہے خود کو۔“

”کہیں کا۔ مجھے کیا کمی ہے چاکلیٹ کی۔ ابھی مائر
سے کہوں تو ڈھیر لگا دے میرے سامنے۔“

اس نے تصور میں مائر کا لایا ڈھیر رکھنا چاہا۔ مگر دل
ہنوز اسی معمولی سی چاکلیٹ کے لیے ہمک رہا تھا جو
رومان نے اس سے واپس چھین لی تھی۔

اندر مہر زینی کے بھڑکانے پہ اس پہ برسنے کے لیے
تیار تھی۔ چاہ کے بھی وہ مائر والی بات زبان پہ نہیں لا
پا رہی تھی کہ اس میں سبکی تو اپنی بیٹی کی ہی تھی کہ سب
جانتے تھے مائر اسے پسند کرتا ہے اب کیسے سب کے
سامنے اعتراف کیا جائے کہ مائر اس کے بجائے میشا
کو۔ اس لیے دل کی بھڑاس اور طریقوں سے نکالی
جاری تھی۔

”سارا دن بھی تم گھر سے باہر رہتی ہو اور راتوں
کو بھی تمہارے چکر ہی ختم نہیں ہوتے۔ کیا کر رہی
تھیں تم اتنی رات کو باہر۔ اور خبردار جواب کوئی من
گھڑت بہانہ بنایا تو۔“

میشا اندر ہی اندر اتنی ابھی ہوئی تھی کہ مہر کو ترخ
سے جواب بھی نہ دے پائی۔ البتہ پر شکوہ خانم اس کی
مدد کو آگے بڑھیں۔

”تمہارے پاس بھی بہت سے بہانے ہوتے ہیں
مہر! کسی نہ کسی بات کو وجہ بنا کے میشا کو ڈانٹتی رہتی
ہو۔“

”اور آپ اسے شہہ دیتی رہتی ہیں۔ یہ میری کچھ
نہیں لگتی۔ مگر میرے گھر میں تو رہتی ہے۔ کچھ اونچ نیچ
ہو گئی تو باتیں مجھے بھی سننی پڑیں گی۔ اسے اتنی ڈھیل
مت دیں۔“

”اور جو ڈھیل تم نے زینی اور امی کو دے رکھی ہے
تمہیں نظر نہیں آتی۔ زینی سارا سارا دن مائر کے
ساتھ گھومتی پائی جاتی ہے اور امی چوبیس گھنٹے رومان
کے گرد منڈلائی رہتی ہے۔ مانا دونوں لڑکے اچھے اور
شریف ہیں مگر لوگ کیا کہیں گے؟“

ان دونوں کو بحث میں الجھا چھوڑ۔ میشا اپنے

کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔

”ان کی بات اور ہے۔ مائر اور زینی کی کچھ دن تک
متنگی ہو جائے گی۔“

مہر نے دانستہ میشا کو سنانے کے لیے کہا۔ اور اوپر
جاتے جاتے وہ پل بھر کے لیے ٹھنک کے رکی بھی۔
تلملاہٹ اور جھنجھلاہٹ نے اس کے پورے وجود کو
گھیرے میں بھی لے لیا تھا۔ مائر اور زینی کا نام ایک
ساتھ سننا ذرا برداشت نہیں ہوا۔

”ان کے لیے تو اچھا ہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے
ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں تاکہ ایک دوسرے
کو سمجھ سکیں۔“

میشا کا ٹھنک کے رکنا ہی مہر کو تسکین دے گیا۔ ابھی
تو اس نے میشا کے ملنے کی شکلیں اور نگاہوں میں لپکتے
شعلے بھی دیکھنے تھے۔ میشا ایک گہرا سانس لے کر خود کو
ٹھنڈا کرتی اگلا قدم زینے پہ رکھنے ہی والی تھی کہ مہر کی
اگلی بات نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

”امی اور رومان کے بارے میں بھی اعتراض کرنے
کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے لیے بھی
میں نے یہی سوچا ہے کہ ان کی شادی کر دی جائے۔“
وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔

اب ماتھے پہ شکنیں نہیں۔ پورے وجود پہ لرزہ
تھا۔ جھنجھلاہٹ یا تلملاہٹ نہیں۔ شکست خوردگی کا
احساس غالب تھا۔ اس کی ٹانگیں بے جان سی
ہو گئیں۔ جیسے آگے بڑھنے سے انکاری ہوں۔

وہ ساری رات اس نے ایک خالی پن کے ساتھ
گزاری۔

خالی خالی ذہن۔

خالی خالی دل۔

مائر صبح صبح زینی کو اپنے کمرے کے باہر دیکھ کے
حیران رہ گیا۔

زینی کو مہر نے پٹی پڑھا کے بھیجا تھا کہ اسے اتنی
جلدی ہار نہیں مانی چاہیے اور مائر کو میشا سے دور کرنے

کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔
”مجھے تم سے بات کرنی ہے مائر“ یکریدی ہوئی لگ رہی تھی۔

”مجھے کسی سے ملنے جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔“ بدل تو وہ بھی گیا تھا۔

”بس! تھوڑی دیر۔“

”اوکے! میں ایک کال کر کے بتا دوں اسے۔ جس سے مجھے ملنے جانا تھا ورنہ وہ پریشان ہوگی۔“

محض زینی کو مزید جلانے تڑپانے کے لیے اس نے سیف کالج کا نمبر ملایا۔ صفائی میں مصروف میٹانے ریسور اٹھایا اور خلاف توقع اکھڑے لہجے میں اس کی وارفتگی کا جواب دیا۔

”ہاں بولو۔ ذرا جلدی مجھے بہت سے کام ہیں۔“ اور مائر جس نے جان بوجھ کے زینی کے سامنے بہت زیادہ والہانہ پن سے اسے مخاطب کیا تھا۔ کچھ ٹھنک سا گیا مگر زینی کی موجودگی کی وجہ سے سوال نہ کر پایا۔

”تم تیار ہو سوری! تمہیں انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔ میں بس آ رہی ہوں۔“

”نہیں! تم مت آؤ۔ میں نہیں مل سکتی۔“ اس بار لہجہ صرف اکھڑا ہوا اور اجنبی ہی نہیں صاف صاف بے زار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

مائر چاہتے ہوئے بھی وجہ دریافت نہ کر پا رہا تھا اور اس کی کوشش تھی اس کی ایک طرفہ گفتگو سے زینی کو بس یہی اندازہ ہو کہ دونوں کے درمیان بہت دوستانہ اور بے تکلفانہ گفتگو ہو رہی ہے۔

”کیا ہوا“ مجھے تو بتاؤ۔ مجھ سے تو تم سب کچھ شیر کرتی ہو۔“

”نہیں! ابھی تم میرے لیے اتنے اہم نہیں ہو کہ میں تم سے سب کچھ شیر کروں۔“

اب تو مائر کو پختہ یقین ہو گیا کہ کچھ ہے ضرور۔ مگر اس نے کمال مہارت سے بات پلٹی۔

”ہاں بالکل۔ میرے لیے بھی تم بہت اہم... بہت خاص ہو میٹا۔“

جہاں زینی یہ سن کے اندر ہی اندر بھڑک کر خاک

ہو گئی وہیں میٹا ضبط نہ کر سکی اور تڑاخ سے کہا۔
”وہ تو مجھے اندازہ ہے۔ میں واقعی بہت اہم ہوں۔ میں نہ ہوں تو تم زینی کو اپنے تک پہنچ کے کیسے لاؤ گے؟“

اس نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔
اس بار تو مائر کے ہاتھوں کے توتے ہی اڑ گئے۔

حواس باختگی کو چھپاتے ہوئے اس نے دزدیدہ نظروں سے زینی کو دیکھا اور بمشکل مسکرا کے کہا۔

”ہاں۔ میٹا ملتے ہیں پھر۔“

”ہاں! ابھی ملتی ہوں تم سے۔ ہونہ۔“ وہ غصے میں تیز تیز ہاتھ چلاتی پوچھا لگ رہی تھی۔

”میں نہیں ملنے والی اس سے کبھی۔ سمجھ کیا رکھا ہے مجھے۔ میں کیا اتنی فالتو ہوں جو یہ مجھے زینی کو جلانے کے لیے استعمال کرے گا۔ میں بھی کیسے بدھو بن گئی

اس کے ہاتھوں۔ رومان ٹھیک کہتا تھا۔“

دل جو غصے سے ابل رہا تھا یکایک رومان کے نام سے بھر آیا۔ اور وہ سب وہیں چھوڑ کے بازوؤں میں منہ چھپا کے رو پڑی۔

وہ اپنے آنسوؤں کی وجہ خود نہیں جانتی تھی۔

زینی مہر کے سکھائے اسباق پہ پوری طرح عمل کرتے ہوئے کارا کے سامنے تابعدار سی بنی کھڑی تھی۔

”بتا نہیں آئی! مجھے کیا ہو گیا تھا ورنہ مجھے تو آپ ہمیشہ اپنی ماما جیسی لگتی ہیں۔ بلیومی! آپ کو ناراض کرنے کے بعد سے اب تک میں سو نہیں سکی۔ کچھ کھایا پیا۔ آپ جب تک مجھے معاف نہیں کریں گی

میں نہ یہاں سے جاؤں گی۔ نہ کچھ کھاؤں پیوں گی۔“

وہ لپچڑپن سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے کہ رہی تھی اور کارا ابھن کے عالم میں تھی کہ اس کی باتوں کا یقین کرے یا جھاڑ کے رکھ دے۔ اس نے اپنا

ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش بھی کی۔

”اوکے زینی۔ تم بہت زیادہ۔“
”نہیں آئی نہیں۔“ اس نے گرفت اور مضبوط کر دی۔ رونے بھی لگی۔ ”جب تک آپ کھلے دل سے معاف نہیں کرتیں۔ میں نہیں جاؤں گی یہاں سے۔ نہ آپ کے ہاتھ چھوڑوں گی۔ بلکہ میں تو پیروں میں بھی بڑ جاؤں گی۔“

اس کے رونے سے بالآخر کارا نرم پڑ گئی۔
”اچھا! ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ تم بھی سب بھول جاؤ۔“

”آپ جو کہیں گی۔ میں وہی کروں گی۔ بس آپ بتا دیں کہ آپ کو میری کون کون سی بات بری لگتی ہے، کون کون سی عادت ناپسند ہے۔ میں وہ سب چھوڑ دوں گی اور۔۔۔ اور آئی۔۔۔ آپ کو اگر مائر سے میری دوستی بھی پسند نہیں ہے تو میں وہ بھی چھوڑ دوں گی۔“

اس بار وہ کارا کو چونکا نے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

”جی آئی۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ بے شک آزما کے دیکھ لیں۔ مجھے وہ محبت نہیں چاہیے جو ایک ماں کے خواب توڑ کے یا اس کا دل دکھا کے ملے۔“

لوجی۔ اب تو کارا نے ڈھیر ہونا ہی تھا یہ معرکہ سر کرنے کے بعد وہ مائر کے سامنے تھی۔ اترا اترا کے کہتے ہوئے۔

”دیکھا تم نے زینی کا کمال۔“

مائر خود حیران تھا۔ اپنی مام کے یکسر بدلے خیالات دیکھ کے۔

”تم بہت عجیب ہو زینی۔“

”تمہارے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں مائر! ویسے بھی تمہاری مام میرے لیے اتنی ہی قابل احترام ہیں جتنی تمہارے لیے۔ مجھے تمہارے ساتھ ساتھ ان کی خوشی کا بھی خیال ہے۔“

”تم نے یہ سب میرے لیے کیا ہے لیکن اگر مام نے واقعی تم سے کہا کہ تم میرا خیال دل سے نکال لو۔ تو۔۔۔“

”تو میں سچ سچ ایسا ہی کروں گی۔ تم پہ یہ ثابت

کرنے کے لیے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ مگر میں جانتی ہوں کارا آئی کبھی ایسا نہیں کریں گی۔ وہ تمہاری مام ہیں۔ ان کو بھی تو تمہاری خوشی اور محبت کا خیال ہو گا۔ وہ مجھے تم سے دور کیسے کر سکتی ہیں۔“

”ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ابھی ابھی مام نے مجھ سے یہی کہا ہے۔“

”کیا کہا ہے؟“ زینی نے بے تابی سے پوچھا۔

”یہی کہ اب انہیں میری پسند پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ تمہیں بطور ہو قبول کر رہی ہیں۔“

یہ اطلاع دیتے ہوئے مائر کے انداز میں نہ کوئی خوشی تھی نہ بے شاشت۔ مگر زینی جیسے پھر سے جی اٹھی۔

”سچ! اور پھر کچھ سوچ کے اسے ٹولنے لگی۔“

”اور۔۔۔ اور وہ میٹا۔۔۔“

وہ بری طرح چونکا۔ ”میٹا؟“

”اسے کیوں لائے تم درمیان میں؟“

زینی کو گویا پھر سے سارے حقوق مل گئے تھے اس سے باز پرس کرنے کے۔

”ایسا کچھ نہیں ہے وہ کیوں آئے گی درمیان میں۔ وہ صرف ایک اچھی دوست ہے۔“

”میں جانتی تھی وہ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتی نہ کچھ اور ہونے کے قابل ہے۔“

وہ طمانیت سے مسکرائی۔ مائر کو میٹا کا ذکر اس انداز میں خاصا ناگوار گزر رہا تھا مگر وہ اچانک ہی پھر سے ناگواری کا اظہار کر کے کوئی تلخی اور بد مزگی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو لڑکی اس کی محبت میں اور اس کی ماں کی عزت و تکریم میں اتنا آگے جاسکتی ہو اس کے ساتھ درستی سے پیش آنا مائر کی نفیس طبیعت کو گوارا نہیں تھا۔

”ویسے ایک بات کہوں۔ وہ تمہاری دوست بننے کے لائق بھی نہیں ہے۔“

”ہم کیوں کسی اور کو ڈس کمس کر رہے ہیں؟“ مائر کو اس کا منہ بند کرنے کا اور کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ اس کا بازو تھام کے باہر لے جانے لگا۔

”اتنے عرصے بعد ہمارے دل ایک دوسرے سے صاف ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارنا چاہیے۔“

واپس آ کے زینی نے مزے لے لے کر اپنی اور مار کے کچھ عجیب کچھ جھوٹی باتیں سنائیں۔ مخاطب ایسی اور مرتھے۔ مگر درپردہ وہ یہ سب میٹھا کوسنا رہی تھی جو ذرا فاصلے پر بیٹھی پروں کی تریابی کر رہی تھی۔

”آپ یونہی فکر کر رہی تھیں ماما! میں نے کہا تھا ناں کہ مار میری محبت میں پوری طرح جاگل ہے۔“

”مجھے تم پہ بھی بھروسہ ہے اور مار کی محبت پہ بھی یقین ہے۔ بس کارا کی جانب سے دھڑکا تھا۔“

مرنے اس کی نظر اتارتے ہوئے کہا۔

”مار کے ساتھ ساتھ اب وہ بھی میری مٹھی میں ہیں۔“

زینی نے میٹھا کو گھورتے ہوئے کہا۔ جو بظاہر کام میں مگن تھی مگر کپکپاتے ہاتھ اور ڈبڈباتی آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں کہ اس پہ کیا گزر رہی تھی۔ زینی چاہتی تو اپنے اندر کی کھولن اس پہ نکالنے کے لیے اسے پیٹ کے رکھ دیتی۔ جلیہ بگاڑ دیتی اس کا۔ مگر مجبور تھی۔ نہیں چاہتی تھی اس کی کوئی بھی ایسی حرکت کارا یا مار کے علم میں آئے۔ جس سے اس کی حیثیت ان کی نظر میں کم ہو جائے۔

”اور مار کو اب میرے علاوہ کوئی اور نظر آئے گا بھی نہیں۔“ اس نے پورے وثوق سے کہا۔ بلکہ درپردہ میٹھا کو جلا یا۔

”پہلے تو نظر آیا تھا۔“ ایسی نے جل کے کہا۔ ”میں نے سنا ہے تمہاری چارون کی ناراضی میں اس نے کسی اور لڑکی سے ملنا شروع کر دیا تھا۔“

میٹھا کا ہاتھ ذرا سا کلپا اور سوئی اس کی انگلی کی پور میں چبھ گئی۔

”وہ لڑکی۔۔۔ وہ تو کوئی بہت ہی چپ اور چپکو لڑکی تھی۔ گھٹیا۔ ہوتی ہیں ایسی بھی۔ موقع کی تلاش میں

رہتی ہیں ہر وقت کہ کب کسی کے گلے کا ہار بنیں۔ وہ بھی زبردستی۔“

زینی کے لہجے اور نظروں میں میٹھا کے لیے تپش تھی۔ جسے میٹھا کا جو با آسانی محسوس کر رہا تھا۔

مار کو اکیلا پا کے خود اپنے آپ کو پیش کر رہی تھی۔ مگر مار کا یہ اسٹینڈر کہاں ہے کہ وہ ہر ایری غیر لڑکی کو منہ لگائے۔ وہ تو بس اس کی حماقت اور خوش فہمیاں انجوائے کر رہا تھا۔

میٹھا کب سے گود میں سر چھپائے روئے جا رہی تھی۔ اس کے حزن میں شریک مامم ہوتے الماس کے پتے اس کے ارد گرد گرتے جا رہے تھے۔

اپنے نزدیک آہٹ محسوس کر کے بھی اس نے سر نہیں اٹھایا۔ وہ اس آہٹ کو بخوبی پہنچاتی تھی۔

اور جیسے ہی رومان نے اس نے برابر بیٹھتے ہوئے اسے پکارا۔ ”میٹھا۔“

وہ سر اٹھائے بغیر آنسوؤں سے رندھی آواز میں بولی۔ ”مجھے رونے سے مت روکنا رومان۔“

”تم اس کے لیے رو رہی ہو جو کبھی تمہارا تھا ہی نہیں۔“ تم نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی۔ اور میں بھی یہی پتا تھا کہ تم خود کو اور اسے اچھی طرح آزمائو ماکہ نہیں یہ افسوس نہ رہے کہ تم اسے پانے کے لیے کچھ نہ کر سکیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جو آپ کے نصیب میں ہو وہ بنا کوشش کیے مل جاتا ہے۔ وہ تمہارا ہوتا تو میرے مشوروں پہ عمل کیے بنا ہی تم اس کو پالیتیں۔“

”میں اس لیے نہیں رو رہی کہ میں اسے پانے سکی۔ میں اس لیے رو رہی ہوں کہ میں نے اسے پانے کے لیے یہ سب کرنے کی کوشش ہی کیوں کی؟ میں نے کیوں خود کو اتنا گرایا؟ ایک شخص کے لیے خود کو بے عزت کیا؟“

”ایسا کیوں سوچ رہی ہو۔ تم نے جو کیا۔ محبت میں کیا۔ محبت میں سب چلتا ہے۔“

رومان کو مار کے لیے نہ اداس ہونے پہ ایک اطمینان ہوا۔ مگر محض اس شرمندگی سے اسے نکالنے کے لیے تسلی دینے لگا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے محبت میں نہیں۔ یہ سب خواہش میں کیا۔ ایک ہنڈسم سے لڑکے کی محبت اور توجہ پانے کی خواہش۔ ایک بڑے گھر کی ہو بننے کی خواہش، سازی زندگی عیش سے گزارنے کی خواہش سنڈریلا بننے کی خواہش۔“

”وہ تو تم ہو۔۔۔ سنڈریلا“ رومان مسکرایا۔ مگر وہ پھر سے رو پڑی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں ہوں میں سنڈریلا۔ میں سنڈریلا نہیں ہوں۔ میں چپ ہوں۔ چپکو ہوں۔ گھٹیا ہوں۔“

وہ خود کو کوئی جانی گئی تو رومان نے اس کا ہاتھ تھام کے اپنی جانب کھینچا۔

”مت کہو خود کو ایسے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“

”زینی ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے جان بوجھ کے مار کے گلے کا ہار بننا چاہا۔ موقع دیکھ کے اس کی قسمت کو اس سے چھیننا چاہا۔ میں بہت گندی۔ بہت بری ہوں۔“

روتے روتے وہ رومان کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔ رومان کو لگا اس نے کچھ دیر اور اس کی محبت کو اپنے اندر چھپانے کی سعی کی تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کے بال سہلاتے ہوئے اس نے کرا کے کہا۔

”میٹھا۔۔۔ مت روؤ۔۔۔ پلیز۔۔۔ مت روؤ۔ تمہارے آنسو مجھے ختم کر رہے ہیں۔“ اس کے لہجے میں کچھ تھا شاید۔

یا اس کے لمس میں۔۔۔

یا پھر اس کی دھڑکن میں۔ جو اس وقت میٹھا کی سماعتوں کے بے حد نزدیک تھیں۔

اس نے فوراً ”اپنا سر اس کے سینے سے اٹھا کے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ جواب فوراً ہی معمول کے مطابق تھا۔ اپنے مخصوص لا پرواہ انداز میں مسکراتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

”دیکھو ناں۔ اتنی سردی میں تم نے اپنے آنسوؤں سے میری شرٹ گیلی کر دی ہے۔ نمو تھیں سنے ختم ہو جاؤں گا میں۔ پلیز مت روؤ۔“

میٹھا شرمندہ سی ہو کے اس سے الگ ہوئی اور آنسو صاف کرتی گھر کے اندر کی جانب جانے لگی۔ رومان نے مسکرا کے اپنی شرٹ سے میٹھا کا بال اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔

زینی نے کارا کی رائے اپنے بارے میں کیا بدلی۔ دونوں گھروں میں شادی کی تاریخ کے بارے میں بھی مشورے ہونے لگے۔ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ پر شکوہ خانم کے دل میں فطری طور پہ زینی کے لیے بھی محبت تھی۔ بہر حال وہ بھی ان کی پوتی۔۔۔ ان کا خون تھی۔ مگر دانستہ انہوں نے خود کو ان سب تیاریوں اور گماگمائی سے الگ تھلگ رکھنا مناسب جانا۔ شاید میٹھا کی دل آزاری کے خیال سے۔

اس وقت بھی وہ مفصل سی نظر آتی گرینی کے پیروں کا مساج کر رہی تھی۔ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم مار اور زینی کی شادی کی وجہ سے پریشان ہو؟“

”نہیں تو گرینی۔“ مگر اس کا لہجہ چغلی کھا گیا۔

”تم کل بے بہت بچھی بچھی اور اداس ہو۔ بار بار تمہاری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔“

”وہ کسی اور وجہ سے ہیں۔“ اس نے منہ پھیر لیا۔

”میں سب جانتی ہوں میٹھا۔ مجھ سے کیا چھپانا میں تمہارے خوابوں سے بھی واقف ہوں اور اس بات سے بھی کہ تم نے اپنے وہ سب خواب مار کے حوالے سے سچے کرنے چاہے تھے لیکن بیٹا! قسمت پہ کوئی زور نہیں ہوتا۔ جس کا بندھن اوپر جڑ جائے۔ ہم نیچے والے اسے بدل نہیں سکتے۔“

”جی گرینی! اور میں نے انہیں بدلنے کی جو ناکام کوششیں کی تھیں۔ میں اصل میں ان پہ ہی شرمندہ اور دکھی ہوں۔ کاش میں نے یہ بات پہلے سمجھ لی

ہوتی۔“

”کیا تمہارے جذبات تم تک رہے یا تم نے انہیں
ماڑ تک بھی پہنچایا؟“
پتا نہیں ان کے لمحے میں کون سے خدشے چھپے
ہوئے تھے کہ میٹھا چونک گئی۔

”جی؟“

”میرا مطلب ہے۔ تم نے اس پہ اپنی محبت ظاہر
تو نہیں کر دی۔ اور کہیں اس نے اس سے فائدہ اٹھا
کے دل لگی کرنے کی کوشش تو نہیں کی۔“
”نہیں گریں۔ ایسا تو نہیں ہے۔“

”چلو پھر ٹھیک ہے ورنہ زینی کے حوالے سے اس کا
ہم سے اور تم سے بھی ایک رشتہ جڑنے والا ہے۔
کہیں کوئی عمر بھر کا مسئلہ نہ پیدا ہو جاتا۔ اور
سنو۔ کہیں تمہاری کسی بات سے اسے یہ تو نہیں لگا
کہ تمہارا دل ٹوٹا ہے۔ یا تم نے اس پہ جتانے کی
کوشش کی ہو کہ اس شادی سے یا اس کی بے توجہی
سے تم ہرٹ ہوئی ہو۔“

”نہیں گریں! اور کبھی ظاہر بھی نہیں کرنا چاہوں گی
میں۔ میں کبھی بھی اسے اس بات کا احساس نہیں دلانا
چاہتی۔“

یہ سن کے پر شکوہ خانم نے ایک طمانیت اور تشکر
بھرا سانس لیا۔

”شکر ہے۔ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔“

”کیسا اندازہ گریں؟“

”مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم کو ماڑ سے محبت تو نہیں ہو
گئی۔ محبت اور وہ بھی اس کم عمری کی محبت۔ اور پھر
ایک طرفہ محبت۔ تمہیں منہ بھرنے میں بہت وقت
لگتا۔ مگر شکر ہے، تمہیں اس سے محبت نہیں تھی۔
صرف وقتی کشش تھی۔ بالگاؤ۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟“ وہ ان کے دثوق
بھرے انداز پہ حیران ہوئی۔

”کیونکہ تمہیں اس سے اپنا دکھ اپنی تکلیف شیر
کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے جبکہ انسان جس
سے محبت کرتا ہے۔ ہمیشہ اسی کے کاندھے پہ سر رکھ

کے اپنے آنسو بہاتا ہے۔“

میٹھا کے ان کے پیروں پہ گردش کرتے ہاتھ تھم
سے گئے۔ وہ پل، وہ ساعت نظروں کے سامنے
جھللا اٹھی جب وہ رومان کے سینے پہ سر رکھے اپنے
اندر کے سب دکھ آنسوؤں کی صورت میں بہا رہی تھی۔

گھبرا کے وہ اٹھی اور باہر جانے لگی۔
”کیا ہوا میٹھا؟“

شوئی قسمت وہاں سے نکلتے ہی اس کی نظریا غیچے
میں خوش کیاں لگاتے رومان اور ایچی پہ جا پڑی۔
وہ سلگ کے رہ گئی۔

رومان کی مسکراہٹ۔ اور ایچی کی کھلکھلاہٹ
اسے زہر لگ رہی تھی۔

کچھ دیر کھڑی وہ کھا جانے والی نظروں سے ان دونوں
کو دیکھتی رہی پھر ایچی کے جاتے ہی رومان کے پاس آئی۔

”تمہیں اور کوئی کام نہیں ہے جو ہر وقت اس موٹی
کے ساتھ کھڑے گپیں لگاتے رہتے ہو؟“

”ہاں۔۔۔ اس وقت تو واقعی کوئی کام نہیں تھا۔
ویسے بھی فارغ وقت میں اگر میں کوئی نیکی کما لیتا ہوں تو
تمہارا کیا جاتا ہے۔“

”کون سی نیکی۔۔۔ کے بتا رہے ہو؟ تمہیں لگتا ہے
میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ مہرمانے سب کو بتا دیا ہے
تمہارے اور ایچی کے بارے میں۔“

”ایسا کیا بتا دیا ہے جو میں نہیں جانتا۔“

وہ ذرا حیران ہوا۔ اس انکشاف پہ نہیں۔۔۔ میٹھا
کی غیر معمولی ناراضی اور غصے پہ۔ ”اور کچھ بتایا بھی
ہے تو تم اتنی پریشان کیوں ہو اس بات پہ؟“

”میں کیوں پریشان ہوں گی پریشان تو مہرمانا اور ایچی
کو ہونا چاہیے جو تم سے شادی کے بارے میں سوچ
رہی ہیں۔“

اب رومان کو اس کی پریشانی کی وجہ جان کے ہنسی آ

گئی۔

”کیوں؟ کیا برائی ہے مجھ میں۔۔۔ مجھ سے شادی
کیوں نہیں ہو سکتی ایچی کی؟“

”یہ تم پوچھ رہے ہو؟ تم نہیں جانتے کیا کہ ایچی
ایک انسان ہے۔ ایک عام انسان اور تم پرے۔“

رومان سناتے میں آگیا۔ میٹھا اسے طعنہ دے کر
چلی بھی گئی اور وہ کتنی دیر یہی سوچتا رہا کہ وہ یہ بات
بھول کیسے گیا کہ اس نے میٹھا کو اپنے بارے میں کون سی
کہانی سنائی تھی۔

وہ بھول گیا تھا۔ مگر میٹھا نہیں بھولی تھی۔
”کیا پتا تھا یہ مذاق اتنا لمبا ہو جائے گا اور الٹا گلے پڑ
جائے گا۔ وہ تو واقعی مجھے انسان نہیں کسی اور دنیا کا سمجھ
رہی ہے۔ حد ہے معصومیت کی۔“

اس کی جس معصومیت پہ رومان فدا ہوا تھا وہ آج
اسے زہر لگ رہی تھی۔

”اب تو اسے اصل بات بتانا ہی ہوگی۔ چاہے کچھ
بھی ہو جائے۔“

اس کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیوں اتنی
بھڑک اٹھی تھی رومان پہ۔۔۔

”جس سے سچی محبت ہو اس کے دل میں کسی اور کی
جگہ بنتے دیکھ کے کسک تو ہوتی ہے دکھ بھی ہوتا ہے۔
آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے ہیں۔۔۔ بے چینی سی
ہوتی ہے مگر لب سے آہ نہیں نکلتی۔۔۔ بس سب کچھ
برا برا سا لگنے لگتا ہے۔ کسی اور سے تو نہیں۔۔۔ ہاں
اپنے آپ سے شکایت ضرور ہو جاتی ہے کہ ہم کیوں
اس قابل نہیں کہ اس کی نظر میں سما سکیں۔“

رومان کی باتیں یاد آنے پہ میٹھا نے اپنے دل پہ ہاتھ
رکھا اور خود سے سوال کیا۔

”اگر ایسی جلن صرف محبت میں محسوس ہوتی ہے
تو مجھے رومان کو ایچی کے ساتھ دیکھ کے یہ جلن اور
تکلیف کیوں ہوتی ہے۔“

اس بار جواب گریں نے دیا۔

”انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے کاندھے
پہ سر رکھ کے اپنے آنسو بہاتا ہے۔“

ایسا جواب جو اس کے اندر مزید سوال جگا گیا۔
”مجھے بھی ہر دکھ۔۔۔ ہر تکلیف میں ایک وہی کیوں
یاو آتا ہے؟ کیا میں اس سے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ ایسا
کیسے ہو سکتا ہے۔“

اسے خود سے بے زاری محسوس ہونے لگی۔ کیوں
سوچ رہی تھی وہ ایسا۔

”لما! آپ ایچی کے لیے اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہ
کریں۔ میری ماڑ سے شادی ہونے دیں۔۔۔ شاید کوئی
اچھی فیملی کالڑکا ایچی کو پسند کر ہی لے۔۔۔ دنیا میں کیا
نہیں ہوتا۔ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔“

اپنی جانب سے زینی نے مہر کو بڑے خلوص سے
مشورہ دیا تھا مگر ایچی تلملا اٹھی۔
”تمہیں کیا تکلیف ہے۔“

”بہن ہوں تمہاری۔۔۔ تمہیں رومان جیسے شٹ
پونچھے اور گھسیارے کے ساتھ زندگی گزارتے دیکھ
کے مجھے افسوس ہو گا۔“

”خبردار جو اس کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بولا؟“
”بس کرو تم دونوں جب دیکھو جو نہیں لڑاتی رہتی
ہو۔۔۔ ایچی تم یہی سوچ لو کہ زینی اب کچھ دنوں کی
مہمان ہے۔“

”اوہ رینی! کچھ دنوں کی مہمان! مرنے والی ہے یہ۔“

”شٹ اب۔۔۔ زینی دھاڑی۔“

”زینی! تم بھی اسے مت اکسایا کرو۔ اسے رومان
پسند ہے اور مجھے بھی اتنے اونچے خواب اسے مت
دکھاؤ جن کی تعبیر اسے نہیں مل سکتی۔“

مہر نصیحت کر کے چلی گئی۔ مگر زینی نے شغل
جاری رکھا۔

”ہاں۔۔۔ یہ بھی ہے۔ تمہیں رومان جیسے فٹ
پاتھیے، میم، مسکین کے علاوہ کس نے منہ لگانا ہے۔“

Scanned By PAKISTANIPEDIA 2012

www.PAKS

2012

شعبه

کے بجائے تم ہمارے کیوں نہیں اپنی زندگی سے دور۔
اور یہی سوچتے سوچتے اسے بالآخر ایک راہ سوجھ ہی گئی۔

مارگیٹ کے پاس گاڑی کھڑی کر کے تیزی سے اس کی جانب بڑھا مبادا وہ اسے دیکھ کے اندر نہ چلی جائے جبکہ وہ تو آیا ہی اس سے ملنے۔ بلکہ بات کرنے تھا۔
”یشا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے یشا۔ رکو۔“
وہ بادل خواستہ رکی۔

”جھوٹ یا سچ۔؟“ اس کے بے تاثر چہرے پہ بھی دو آنکھیں تاثرات سے برہم تھیں۔
”میں نے تم سے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا یشا۔“
اب کے وہ کچھ بولی تو نہیں۔ مگر اس کے ہونٹوں پہ بڑی بے ساختہ سی مسکراہٹ آئی تھی۔ کچھ جتنی ہوئی جس پہ مارچل سا ہو گیا۔

”مجھے احساس ہے کہ میں نے انجانے میں تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں کیا۔“
”اچھا۔؟ واقعی؟ مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔“
دل کی کسک کو چھپا کے اس نے بے اعتنائی ظاہر کی۔

”میں تمہارے جذبات کے ساتھ کھیلا۔“ اس نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔

”تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میرے جذبات کے ساتھ کھیلنا اتنا آسان نہیں ہے کہ کوئی بھی اس میں کامیاب ہو سکے۔ نہ ہی میرے جذبات کوئی راستے میں پڑے ہوتے ہیں۔“

”بہر حال۔۔۔ پھر بھی مجھے شرمندگی ہے میں نے جان بوجھ کے ایسا نہیں کرنا چاہا تھا مگر میں تم سے معافی مانگ کر دل ضرور ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔“

اس پر یشا نے بڑے ناز سے دونوں بازو سینے پہ باندھے اپنی صراحی دار گردن اٹھائی اور شہانہ انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ مانگو پھر۔“

”کیا؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔
”معافی۔۔۔ تمہیں معافی مانگنی ہے ناں تو مانگو۔“
وہ ہچکچا سا گیا۔۔۔ ساری عمر کبھی کسی سے معافی نہیں مانگی تھی۔ پھر اسی ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔
”سوری یشا! میری وجہ سے تم ہرٹ ہوئیں۔“

میں شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔“
یشا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ کل تک وہ اسے بہت خاص۔ بہت ہی خاص لگتا تھا اور اب اس کے سامنے چہرے پہ ندامت اور ہونٹوں پہ معذرت بھرے الفاظ لیے کتنا عام سا لگ رہا تھا۔

”جاؤ۔۔۔ معاف کیا۔“
اس نے سر دلچے میں کہہ کر قدم بڑھا دیے۔ مار اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا۔۔۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔ حالانکہ اس کے پاس کہنے کو اب اور کچھ نہیں رہا تھا۔ مگر اندر سے نکلتی ایسی زہنی اور مہر کو دیکھ کے وہیں رک گیا۔

یشا صنوبر کے تنے سے ٹیک لگائے ان تینوں کو مار کے ساتھ جاتے دیکھ رہی تھی رومان پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں یشا۔ کہ تمہارے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔“

”مگر میں خود نہیں سمجھ پا رہی کہ میرے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“
”مجھے بہت مایوس۔ بہت اداس بہت دکھی ہونا چاہیے تھا۔ مگر میں نہیں ہوں۔ جس سے شادی کرنے کے لیے میں مری جا رہی تھی۔ اس کی شادی کسی اور سے ہونے جا رہی ہے۔ جس سے مجھے محبت تھی وہ کسی اور کی زندگی میں شامل ہونے جا رہا ہے۔ مگر مجھے اپنے دل میں کسی خالی پن کا احساس کیوں نہیں ہو رہا دماغ۔“

اس کی بات سن کے رومان کے چہرے پہ خوشی کا تاثر اور ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تمہارا دل خالی نہ ہو۔“

اس میں کسی اور کی سلطنت ہو۔“

یشا نے چونک کے اسے دیکھا۔۔۔ رومان کی مسکراتی آنکھوں کے جگنو اس کے اندر پھیلے اندھیرے میں راستہ بنانے لگے۔ روشنی کی شعاعیں جسے خود اپنی جگہ بناتی ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے لگیں۔ جو اس اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مار رہے تھے۔ وہ اس روشنی کے پھوٹنے ہی پھر سے گھبرا اٹھی۔

اسے نہیں چاہیے تھے جواب۔۔۔
وہ ان سوالوں کو اندھیرے میں ہی رکھنا چاہتی تھی اس لیے گھبرا کے اندر کی جانب بھاگنے لگی۔ اور وہ جو تمہید باندھنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ ایسے کسی انداز میں بات شروع کرے جس سے یشا کی ناراضی کا اندیشہ کم سے کم ہو۔ اسے روکتا ہی رہ گیا۔

”لگتا ہے ان بچوں کا بندھن اوپر لکھا جا چکا ہے۔“
مہر نے مسکرا کے کارا سے کہا۔

”بالکل۔۔۔ ہم نے تو بس رسمی فرض ادا کرنا ہے ورنہ جہاں بچے خوش۔ وہاں ہم بھی خوش۔“

آج تو کارا بھی خوش دلی کے ریکارڈ توڑ رہی تھی بالکل ایسے جیسے زہنی شرمانے کے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔۔۔ سر جھکائے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے نیچی نظریں ایسی اس کے ڈرامے پہ لعنت بھیجتی چمکے سے ان سب کے درمیان سے اٹھی۔ اس کا رخ مار کے کمرے کی جانب تھا جو اوپر بیٹھانچے ہونے والے اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے سے لا تعلق نظر آ رہا تھا۔
”مار۔۔۔ مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔ بلکہ بتانی ہے۔“

”زہنی کے بارے میں؟“ مار نے اندازہ لگایا۔

”ہاں اور یشا کے بارے میں بھی۔ اب تم سوچو کہ وہ کون سی بات ہو سکتی ہے جو یشا اور زہنی دونوں کے بارے میں ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو امی؟“
”تم زہنی کو تب سے چاہتے ہو ناں جب اس سے

پہلی بار ملے تھے۔“

”ہاں۔“ اس اعتراف کے بعد اس کی الجھن اور بو جھیل بن، ہمیشہ کی طرح مزید بڑھ گیا۔ یہی گرہ تو کھل نہ پائی تھی ابھی۔

”پارٹی میں۔۔۔ یا ہمارے گھر؟“
”کیا تمہیں کبھی زہنی نے یہ نہیں بتایا کہ ہم پہلی بار جھیل پہ ملے تھے۔“

”اور لگتا ہے تمہیں کبھی زہنی نے یہ نہیں بتایا کہ تم جھیل پہ اس سے نہیں۔۔۔ یشا سے ملے تھے۔“

”یشا سے؟“
وہ بری طرح چونکا۔

”ہاں وہ لڑکی یشا تھی۔ جس کی تم صورت تو نہ دیکھ پائے۔ مگر اسے دل دے دیا اور زہنی نے تمہارے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ وہی اصل میں وہ لڑکی ہے۔ جبکہ اس رات۔۔۔“

”ایم! زہنی اندر آتے ہوئے زور سے چلائی۔“

یشا پر شکوہ خانم کے سامنے کھانا لگاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آپ کو کارا آنٹی کے ہاں جانا چاہیے تھا۔ شادی کی ڈیٹ فکس ہوتے ہوئے آپ کی موجودگی ضروری تھی گری۔“

”اتنی ضروری ہوتی تو میرے انکار کے بعد مہر ایک بار تو اصرار کرتی۔۔۔ ویسے بھی میں تمہیں اکیلا چھوڑ کے نہیں جانا چاہتی تھی۔“

”کیونکہ آپ کو ڈر تھا کہ میں صدمے سے خود کشی نہ کر لوں۔“ اس نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ ڈر میرے دل سے نکل چکا ہے۔“ وہ بھی طمانیت سے مسکرائیں۔

”کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔ بس اب یہ ثابت ہونا رہ گیا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو۔۔۔ وہ۔“ ان کی بات پوری

ہونے سے پہلے ہی بیشا گھبرا کے کہہ اٹھی۔
 ”میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں گرینی
 صرف آپ سے۔“
 وہ ہنس پڑیں۔ ”لیکن خوابوں میں تم مجھے تو سفید
 گھوڑے پر آتا نہیں دیکھتی ہوگی۔“
 خواب کے ذکر یہ بیشا کھوس گئی۔ پر شکوہ خانم نے
 اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ویسے رومان بہت اچھی ہارس رائیڈنگ کرتا
 ہے۔“
 بیشا نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اور ان کی
 پلیٹ میں میٹھا نکالنے لگی۔ پر شکوہ خانم نے بات مزید
 آگے بڑھائی۔
 ”بہت لکی ہوگی وہ لڑکی جو اس سے محبت کرے۔ جو
 اس کی محبت پائے جس سے رومان کی شادی ہو۔ ہے
 ناں۔“
 اب وہ برداشت نہ کر سکی اور تلخی سے بولی۔
 ”ایسی کوئی لڑکی کم از کم اس دنیا میں تو نہیں ہوگی۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ان کے پوچھنے پہ وہ ان کے قریب کھسک آئی اور
 کانوں کے پاس آگے رازداری سے کہا۔
 ”آپ کو نہیں پتا گرینی۔۔۔ رومان کیا ہے۔“
 وہ بے حد حیران تھیں۔ اس کی بات پہ بھی اور
 انداز پہ بھی۔
 ”کیا ہے رومان؟“
 ”وہ انسان نہیں ہے۔“ بیشا نے سرگوشی کی۔
 ”کیا؟ انسان نہیں ہے تو کیا ہے؟“
 ”پراس۔۔۔ پراس۔۔۔ پرستان سے آیا ہے اور پلیز
 گرینی! آپ نے یہ بات کسی کو بتائی نہیں ہے۔ رومان
 نے کہا تھا جتنے لوگوں کو یہ راز پتا چلتا جائے گا۔ اس کی
 جادوئی طاقتیں ویسے ہی ایک ایک کر کے کم ہوتی
 جائیں گی۔ بے چارہ۔ آج آپ کو پتا چلا ہے ناں تو اس
 کی ایک اور جادوئی طاقت چلی گئی ہوگی اور ہاں پلیز
 رومان کو بھی نہ بتائیے گا کہ اس کا راز میں نے آپ کو بتا
 دیا ہے۔ وہ ناراض ہو گا اور مجھے وعدہ خلاف بھی سمجھے

گا۔“
 پر شکوہ خانم۔ حیرت کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس
 سے ایک بھی سوال نہ کر سکیں۔



مار کا بکا کھڑا اپنے سامنے کھڑی ایچی اور زینی کو ایک
 دوسرے کے ساتھ جھگڑا دیکھ رہا تھا۔
 ”تم میری بہن نہیں ہو۔۔۔ دشمن ہو۔“
 ”اور تم نے جو میرے ساتھ کیا ہے وہ کوئی دشمن
 بھی نہیں کرتا۔ مار! تم اس کی بکواس پہ بالکل یقین
 کرتا۔“
 ”سچائی کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ مار! تم اس
 رات بیشا سے ملے تھے اسی کے بندے تمہارے پاس
 رہ گئے تھے اور اسی کی باتوں نے تمہارے دل میں محبت
 جگائی تھی۔ اسی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تم غلط لڑکی کے
 چکر میں پھنس گئے تھے۔“
 ایچی نے اس کی مٹھی سے اپنے بال چھڑاتے ہوئے
 کہا۔
 ”کیا یہ سچ ہے زینی؟“ بہت مشکل سے مار کچھ کہنے
 کے قابل ہو سکا۔
 ”جھوٹ بول رہی ہے یہ۔“ وہ بھڑکی۔
 ”تو ٹھیک ہے مار! تم اس سے وہ سب باتیں پوچھو
 جو تم دونوں کے درمیان اس رات ہوئی تھیں۔۔۔
 اس ڈریس کا کلر پوچھو جو اس لڑکی نے پہنا ہو گا۔ یہ کچھ
 نہیں بتائیگی اور پھر بیشا سے پوچھنا۔“
 ایچی کے کہنے پر آخر زینی چلا اٹھی۔
 ”ہاں۔۔۔ تھی وہ بیشا۔۔۔ میں نہیں تھی مگر اس سے
 کیا ثابت ہوتا ہے محبت تو تمہیں مجھ سے ہے مار!
 وعدے تو تم نے مجھ سے کیے ہیں شادی تو ہم دونوں کی
 ہو رہی ہے۔“

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میری زندگی تو فراق ہے وہ ازل سے دل میں یکس ہی
 وہ نگاہ رشوق سے دودھیں رگ جال سے لاکھ قریں ہی
 ہمیں جان دینی ہے ایک دن وہ کسی طرح وہ کہیں نہی
 ہمیں آپ کیپنچے دار پر جو نہیں کوئی، تو ہمیں ہی
 غم زندگی سے فرار کیا، یہ سکون کیوں یہ قرار کیا
 غم زندگی بھی ہے زندگی، جو نہیں خوشی تو نہیں ہی
 سرطورد ہو، سرحشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے
 وہ کہیں ملیں، وہ کہیں ملیں وہ کہیں ہی
 نہ ہو ان پہ جو مرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوش نہیں
 میں انہیں کا تھا میں انہیں کا ہوں وہ میرے نہیں تو نہیں ہی
 جو ہو فیصلہ وہ سناٹے، اسے حشر ہر نہ اٹھائیے
 جو کر س گے آپ ستم وہاں، وہ ابھی ہی وہ ہمیں ہی
 بسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
 وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں ہی

نصیر الدین نصیر

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی
 نہ تو تورا رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
 شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
 نہ خرد کی بجنہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دہری رہی
 چلی سمت میں ایک ہوا کہ جن ظہور کا جل گیا
 مگر ایک شاخ نہال غم، جسے دل کہیں سوہری رہی
 نظر تغافل یا رکا، گو کس زباں میں کروں بیاں
 کہ شراب مددِ آرزو غم دل میں ہے سو بھری رہی
 وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا دہری نسخہ عشق کا
 کہ کتاب عقل کی طاق میں جو دھری تھی توں ہی دھری رہی
 تیرے جوش حیرتِ حق کا اثر اس قدر میں یہاں ہوا
 کہ آئینہ میں جلا رہی، نہ پری کوں جلوہ گری رہی
 کیا خاک آتش عشق نے دل بے نولے سراج کوں
 نہ خطر رہا، نہ حشر رہا، مگر ایک بے خطری رہی

سراج افدنگ آبادی

لا علمی

”لا علمی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔“ ایک سائنس دان نے ایک خاص قسم کی مکھی پر لیکچر دیتے ہوئے کہا۔

”سائنسی نقطہ نظر سے اس مکھی کے پر اس کے جسم سے چھوٹے ہیں چنانچہ سائنس کی رو سے یہ مکھی اس قابل نہیں ہے کہ اڑ سکے، لیکن چونکہ مکھی کو اس اہم سائنسی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اس لیے وہ آسانی سے اڑتی ہے۔“

(آمنہ اجالا۔ ڈھری)

خفگی

ایک صاحب کے گھر میں ان کی تین بیویاں اور تقریباً دو درجن بچے تھے، ہر وقت لڑائی جھگڑے کا سماں بندھا رہتا تھا۔ ایک روز وہ صاحب اپنے دروازے کے باہر کھڑے گالیاں دے رہے تھے۔ محلے داروں نے وجہ پوچھی تو وہ صاحب بہت ہی غصے سے بولے۔

”کوئی ناخوار میرے گھر کے دروازے پر ایک نام لکھ کر چلا گیا ہے۔“

”ایسا کیا نام لکھ دیا ہے، جو آپ اتنے خفا ہو رہے ہیں؟“ ایک بڑوسی نے پوچھا۔

یہ سن کر ان صاحب نے دروازے کا پٹ سیدھا کر دیا۔ جس پر لکھا تھا۔

”اسمبلی ہال۔“

(غزل خان۔ میٹروول)

مجبوری

نو آموز سپاہیوں کا ایک دستہ بڑی دیر سے سخت چلچلاتی دھوپ میں پریڈ کر رہا تھا۔ ان سے بار بار غلطی سرزد ہو رہی تھی۔ سارجنٹ غصے سے خوب جھنجھلا رہا تھا۔ آخر تنگ آکر وہ دھاڑا۔

”اف! میرے خدا! اتنے نکتے لوگ۔۔۔ آخر! میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟“

گرمی اور دھوپ سے نڈھال سپاہیوں کی نظریں بے اختیار قریبی سایہ دار درختوں کی طرف اٹھ گئیں۔ سارجنٹ ان کا مقصد بھانپ گیا مگر جل کر بولا۔

”ہاں ہاں! میں سمجھتا ہوں۔۔۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس اتنی زیادہ رسیاں نہیں ہیں۔“

(مرست جبین۔ ڈیفنس)

اندازِ ہمدردی

بس میں بہت زیادہ رش تھا۔ ایک بزرگ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے ڈنڈا پکڑے کھڑے تھے۔ قریب ہی سیٹ پر ایک نوجوان کھڑکی پر سر ٹکائے سو رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے اس خیال سے اسے جگانے کی کوشش کی کہ کہیں اس کا اشاپ نہ نکل جائے۔ نوجوان آنکھیں کھولے بغیر بولا۔

”میں سو نہیں رہا، تم اپنا کام کرو۔“

”سو نہیں رہے تو پھر اس طرح آنکھیں بند کیے، یہوں بیٹھے ہو؟“ کنڈیکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

”میں بزرگ کو کھڑے ہو کر سفر کرتے نہیں دیکھ سکتا۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

(اقراء، نمبر۔ کراچی)

فیصلہ

تو اب ہم ایسا کرتے ہیں
محبت ترک کرتے ہیں
یہ شعر و شاعری کا سلسلہ، یہ پیاد کی باتیں
سب ہی کچھ چھوڑ دیتے ہیں
ہم اپنی سوچ کا، احساس کا رخ موڑ دیتے ہیں
کسی کو بے وفا کہنا، کسی کو کچھ ادا لکھنا
کبھی اپنی وفاؤں کے صلے کی آندو لکھنا
ہمیشہ دل کو جاہت کے لیے آبرو لکھنا
کسی عینی، کسی لیبی، کسی مول کی خاطر ہم
کسی سوہنی، کسی بھی، ہیر کے آجمل کی خاطر ہم
نہیں برباد ہوں گے اب
نہیں ناشاد ہوں گے اب
تو اب یہ فیصلہ کر لیں
ہم اپنی زلیست کی ناکامیاں تسلیم کرتے ہیں
ہم اپنی بے بسی کی خامیاں تسلیم کرتے ہیں
یہ شہرت ہے کہ بدنامیاں تسلیم کرتے ہیں
حقیقت مان لیتے ہیں
لیکھتے، دوڑتے، بڑھتے ہمارا پاؤں رہتا ہے
آدھرو کٹوں کے پتھروں سے کوئی انگلی بھی اٹھی ہے
ہماری عمر کی لمبی انگڑاؤ ختم ہوتی ہے
ستارے بجھ گئے ہیں اب
شرارے بجھ گئے ہیں اب
اکیلے بن کی اب کوئی نئی تدبیر کیا ہوگی
کسی بھی عشق کی پاؤں میں اب زنجیر کیا ہوگی
ستم پرورد بھلا اب اود بھی تقدیر کیا ہوگی
تو اب ہم ایسا کرتے ہیں
ہم اپنی خودکشی کا آپ خود اعلان کرتے ہیں
قلم کاغذ کو دھرتے ہیں
بہت کچھ لکھ لیا ہم نے
بہت دن جی لیا ہم نے
یہ رشتہ تو بند دیتے ہیں
سب ہی کچھ چھوڑ دیتے ہیں
اظہر جاوید

مہکارا نچل اڑتا جائے، بجتا جائے زیور بھی
دل کے اندر پھول کھلے ہیں، ایک پہاڑ ہے باہر بھی
سارے گھر میں پھیل رہی اس کی نظروں کی تنوخی
اس کے ہنسنے سے بدلا ہے موسم بھی اود منظر بھی
اس کے نام کی مہندی نے ہاتھوں کی ایسی دستک دی
جاگ اٹھا انگڑائی لے کر برسوں بعد مقتدر بھی
لوگ پھرتے وقت بچانے کیا کیا وعدے کرتے ہیں
میں تو بالکل بول نہ پائی، چپ تھی اس کے لب پر بھی
جیون کے اس دھوپ نگر کو ہنسنے لگتے پار کرو
اس کے پیاد کی چھاؤں میں ہر اس کے نام کی چاند بھی
حمید شاہین



ایک خوش حال تاجر کو کسی معمولی جرم میں دو ہفتہ قید کی سزا یا پانچ ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ تاجر نے قید بھگتنے کو ترجیح دی تو ان کا قریبی دوست حیران رہ گیا۔

”جرمانہ کیوں نہیں ادا کر دیتے۔ ایسی بھی کیا نجوسی؟“

”ارے بھئی! نجوسی کی بات نہیں ہے۔ دراصل آج ہی میرے باورچی نے چھٹی کر لی ہے۔ گھر پر ہوں گا تو بیوی کے ہاتھ کا کھانا کھانا پڑے گا۔“

تاجر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

(پروین اسلم۔ ہجرت کالونی جواز)

ایک معمولی شکل و صورت کی عورت نے اپنے خوب صورت شوہر سے کہا۔

”تم نے ہر طرف یہ جھوٹی خبریں پھیلا رکھی ہیں کہ میں لاکھوں کی جائیداد اور کاروبار کی تھم وارث ہوں۔“

شوہر نے جواب دیا۔ ”تم سے شادی کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز تو مجھے پیش کرنا ہی تھا۔“

(رقیہ اسماعیل۔ لودھراں)

مرد بمقابلہ مرد

ایک شخص اپنے دوست کی عیادت کے لیے اسپتال پہنچا اور اس کے زخمی ہونے کی وجہ پوچھی۔ دوست کراہتے ہوئے بولا۔

”بازار میں ایک آدمی ایک عورت کو مار رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے اسے لٹکا کر کہا۔“

”بزدل آدمی! شرم کرو، مرد ہو تو مرد سے مقابلہ کرو۔“

”پھر کیا ہوا؟“ دوست نے پوچھا۔

”کچھ یاد نہیں۔ ہوش میں آیا تو اسپتال میں تھا۔“ زخمی دوست نے کراہ کر جواب دیا۔

(شائستہ جاوید۔ ایف بی اریا)

ایک امریکی گوشت کا بیوپاری اسپین پہنچا تو اپنے میزبان کی دعوت پر اس نے سائڈ اور انسان کی لڑائی بھی دیکھی۔ جب آدمی نے سائڈ کو ختم کر کے مقابلہ جیت لیا تو میزبان نے اپنے امریکی مہمان سے پوچھا۔

”دلچسپ تماشا تھا نا۔ آپ کو پسند آیا؟“

”ہاں مگر۔۔۔ اس میں بکھیرا زیادہ تھا۔ ہمارے ملک میں تو یہ کام مشینوں سے کیا جاتا ہے۔“

امریکی نے سادگی سے جواب دیا۔

(نسرین صلاح الدین۔ میٹروپول)

”پروا نہیں“

ایک ملک میں بھیک مانگنا سخت جرم تھا۔ پندرہ سال قید یا مشقت کی سزا تھی۔ ایک بھکاری نے کسی دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک شخص نے باہر آکر پوچھا۔

”جی فرمائیے!“

بھکاری نے نظریں جھکاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

”جناب! میں کئی دن سے فاقے میں ہوں۔ آج کا دن بھوک کی حالت میں گزر گیا اور کل بھی۔“ اس کی زبان اچانک رک گئی۔ اس نے ایک سپاہی کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے تیزی سے گردن اکڑائی اور سینہ تان کر بولا۔

”اور کل بھی اگر مجھے کھانا نہ ملا تو کوئی پروا نہیں۔ میں کل بھی کھائے پیے بغیر رہوں گا اور آئندہ بھی بھوکا رہوں گا۔ میرا حوصلہ اب بھی بلند ہے۔“

(انیقہ اناس۔ چکوال)



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل۔

1۔ اس میں اہل خیر و صلاح کے ساتھ محبت رکھنے کی فضیلت کے علاوہ اللہ کے فضل و کرم کا بھی بیان ہے کہ وہ ان سے محبت رکھنے کی وجہ سے ان سے کم مرتبہ لوگوں کو بھی بلند تر درجوں پر فائز کر کے محبوبوں کے ساتھ ملا دے گا۔

2۔ اس میں یہ تربیب ہے کہ برے اور بدکردار لوگوں کے ساتھ خصوصی تعلق اور محبت نہایت خطرناک ہے کہ کہیں انسان کا حشر ان ہی کے ساتھ نہ ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا عمل و اخلاق،

حضرت شعبی بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بازاں تشریف لے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک نصرانی ایک زرہ بیچ رہا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس زرہ کو پہچان لیا اور فرمایا۔

”یہ میری زرہ ہے۔ چلو میرے اور تمہارے درمیان مسلمانوں کا قاضی فیصلہ کر لے گا۔“

ان دنوں مسلمانوں کے قاضی حضرت شریع تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ہی انہیں قاضی بنایا تھا۔

”اے شریع! میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کرو۔“

حضرت شریع نے کہا۔ اے امیر المؤمنین! آپ کیا کہتے ہیں؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔ ”یہ زرہ میری ہے۔ کافی عرصہ پہلے یہ کہیں گر گئی تھی۔“

حضرت شریع نے کہا۔ اے نصرانی! تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ امیر المؤمنین غلط کہہ رہے ہیں لیکن یہ زرہ میری ہے۔

حضرت شریع نے کہا۔ ”میرا فیصلہ یہ ہے کہ یہ زرہ اس سے نہیں لی جاسکتی۔ کیونکہ آپ کے پاس کوئی گواہ نہیں ہے۔“

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔ ”قاضی شریع نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔“

اس پر نصرانی نے کہا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ انبیاء و ائمہ فیصلے ہیں۔ امیر المؤمنین اپنے ماتحت قاضی کے پاس آئے اور اس قاضی نے امیر المؤمنین کے خلاف فیصلہ کیا۔

اے امیر المؤمنین! اللہ کی قسم! یہ زرہ آپ کی ہے۔ آپ کے پیچھے میں چل رہا تھا۔ آپ کے خاکی رنگ کے اونٹ سے گری تھی، جسے میں نے اٹھا لیا تھا۔

اس کے بعد اس نصرانی نے کلمہ شہادت پڑھا۔ اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔

”جب تم مسلمان ہو ہی گئے ہو تو اب یہ زرہ تمہاری ہی ہے۔“

اور پھر اسے ایک گھوڑا بھی دیا۔

توکل،

حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں۔ جب حضرت علی رضی کی زندگی کی آخری رات آئی تو انہیں قرار نہیں تھا۔

(کبھی اندھ جلتے کبھی باہر) گھروالوں کو خطرہ محسوس ہوا۔ کہ انہیں کچھ ہونہ چلے تو انہوں نے آپس میں چپکے سے

مشورہ کرنے کے سبب کیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو باہر نہیں جانا چاہیے۔ انہوں نے یہ بات ان کی خدمت میں اللہ کا واسطہ دے کر عرض کی۔ انہوں نے فرمایا۔
”ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے مقرر ہیں کہ جب تک تقدیر کے لمحے ہوئے کا وقت نہ آجائے۔ اس وقت تک وہ ہر بلا اس بندے سے دور کرتے رہتے ہیں اور جب تقدیر کا وقت آجائے تو پھر وہ دونوں فرشتے اس کے اوپر تقدیر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔“
پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد تشریف لے گئے جہاں انہیں شہید کر دیا گیا۔

غصہ پی جانا،

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
”کسی بندے نے غصے کے گھونٹ سے زیادہ بہتر گھونٹ وودھ یا شہد کا کبھی نہیں پیا۔“

برائی سے روکنا،

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں۔
”کسی جگہ اللہ کی نافرمانی کا کام ہو رہا ہو اور کوئی آدمی اس موقع پر موجود ہو لیکن وہ دل سے اسے بُرا سمجھتا ہو تو وہ ان لوگوں کی طرح شمار ہوگا جو اس نافرمانی کے موقع پر موجود نہیں ہیں۔ اور جو نافرمانی کے موقع پر موجود نہ ہو لیکن وہ اس نافرمانی پر دل سے راضی ہو تو وہ ان لوگوں کی طرح ہوگا جو اس نافرمانی کے موقع پر موجود ہیں۔“

گوشہ نشینی،

حضرت قاسمؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہؓ کی خدمت میں عرض کیا۔
”آپ مجھے کچھ وصیت فرمادیں۔“ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا۔
”تم اپنے گھر میں رہا کرو (باہر نہ جایا کرو) اور اپنی زبان کو (یعنی اولیٰ بے کار باتوں سے) روک کر رکھا

کر و اور اپنی خطائیں یاد کر کے رو یا کرو۔“
حضرت اسماعیل بن ابی خالدؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے بیٹے حضرت ابو عبیدہ کو تین وصیتیں کیں۔
”میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تم اپنے گھر میں رہا کرو اور اپنی خطاؤں پر رو یا کرو۔“

حضرت عمرؓ کے قول،

فتح و شکست کا دار و مدار فوج کی کمی بیشی پر نہیں ہوتا۔ اللہ کی مدد پر ہوتا ہے۔
اللہ تعالیٰ زمین کے ان حاکموں سے رضامند ہوتا ہے جن کے نفس اُن کے قابو میں ہوں۔
اللہ علم عمر کی کمی یا زیادتی پر منحصر نہیں ہوتا۔
زور باریہ خالد۔ لا ہود

انمول موتی،

جو نہیں ہے اس کا غم نہ کریں بلکہ جو ہے اس پر قناعت کریں۔
کبھی کسی سے توقعات نہ رکھیں بلکہ جو آپ سے بن پڑے وہی کریں۔
دنیا تمہیں اس وقت تک نہیں ہل سکتی جب تک تم خود نہ ہل جاؤ۔
اگر کسی نے تمہاری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں تو تم ان کانٹوں کو ہٹا دو کیونکہ اگر تم بھی جواب میں کانٹے بچھاؤ گے تو دنیا کانٹوں سے بھر جائے گی۔
رقیہ اسماعیل۔ یزمان

سلام کرنا،

حضرت طفیل بن ابی کعبؓ کہتے ہیں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں آیا کرتا۔ وہ میرے ساتھ بازاں جلتے۔ جب ہم بازاں جلتے تو حضرت عبداللہؓ کا جس کباڑے پر پہنچنے والے پر جس مسکین پر عرض یہ کہ جس مسلمان پر گزر ہوتا، اسے سلام کرتے۔ ایک دن

میں ان کی خدمت میں گیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بازار لے گئے۔ میں نے کہا۔
”آپ بازار کس لیے آتے ہیں۔ نہ تو آپ کسی بیچنے والے کے پاس دُکے ہیں اور نہ کسی سامان کے بارے میں پوچھنے ہیں اور نہ قیمت معلوم کرتے ہیں اور نہ بازار کی کسی مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ آئیے۔ ہم یہاں بیٹھ جلتے ہیں۔ کچھ دیر باتیں کرتے ہیں۔“

حضرت عبداللہؓ نے فرمایا۔ ”اے پیٹھا (میرا پیٹ بڑا تھا) ہم تو سلام کی وجہ سے بازار آتے ہیں لہذا جو ملتا جلتے۔ اسے سلام کرتے جاؤ۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ ہم تو سلام کی وجہ سے بازار آتے ہیں۔ اس لیے ہمیں جو ملے گا۔ ہم اسے سلام کریں گے۔“

حاصل مطالعہ،

اگر آپ کوئی نظریہ رکھتے ہیں تو اس کے اظہار میں اس لیے تاثر نہ کیجیے کہ وہ بظہر۔ اجماعاً معلوم ہوتا ہے۔
بیشتر نظریات جو آج کل تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ انہیں کسی زمانے میں اجماعاً تصور کیا جاتا ہے۔
طاہرہ ملک۔ پسرورد

موتی مالا،

محبت چہروں سے نہیں، دلوں سے، روحوں سے کی جاتی ہے۔ چہرے روپ بدل سکتے ہیں۔ چہرے ایک جیسے ہو سکتے ہیں لیکن روحوں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔
تم جسے چاہو، وہ تمہاری پروا نہیں کرتا اور جو تم پر جان دے اس کے لیے تم گشش محسوس نہیں کرتے۔
عشق تو دُور یوں کے جزوان میں لپٹا اچھا لگتا ہے ملتا ہے تو دُکھ بن جاتا ہے۔ بھی تو اللہ نے پسر کو رانجھے سے، سوہنی کو مہینوال سے اور سستی کو بنوں سے نہیں ملا یا۔
ہاں ایسا ہوتا ہے محض ایک شخص کے چلے جانے سے شہر کے شہر ویران ہو جاتے ہیں اور کسی ایک کو پالینے سے دو جہاں مل جاتے ہیں۔

جب بڑی خواہشیں پوری نہ ہوں تو پوری نہ ہونے والی چھوٹی چھوٹی تمنا میں بھی حسرت بن جاتی ہیں۔
برخوشی ایملس کے فوارے کی مانند ہے جس کا پانی حکایت کے مطابق محفوظ نہیں کیا جاسکتا ہے سو ہر لمحے کو اپنے ساتھ وہ تمام خوشیاں لے جانے دو، جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔
ارم کمال۔ فیصل آباد

خلیل جبران نے کہا،

ان افکار کو جن کو تم نے قول کے ذریعے مقید کر رکھا ہے، عمل کے ذریعے آزاد کر لو۔
جب تمہارا دل آتش فشاں ہے تو تم کو یہ توقع کیوں ہے کہ تمہارے ہاتھوں میں پھول کھلیں۔
غار میں اُگنے والا درخت پھل نہیں دیتا۔
جو زخم تمہیں دوسروں نے دیے ہیں، انہیں بھول جاؤ۔ جو زخم تم نے دوسروں کو دیے ہیں، انہیں یاد رکھو۔
اقراء عائشہ۔ گوجرہ

دُشوار امر،

ذات کے تمام عناصر میں مایوسی سے زیادہ تلخ عنصر کوئی نہیں۔ زندگی میں اس سے زیادہ کوئی دُشوار امر نہیں ہے کہ اپنی ذات سے کہا جائے۔
”تم شکست کھا چکے ہو۔“
بمقدس ظہور۔ فیصل آباد

عقل اور ہم،

ہمیں ہر اس چیز سے محبت کرنی چاہیے جو محبت کرنے کے لائق ہو اور ہر اس چیز سے نفرت کرنی چاہیے جو نفرت کرنے کے لائق ہو۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہمارے پاس دونوں میں فرق کرنے اور دونوں میں امتیاز کرنے کے لیے عقل کی دولت اور علم کی روشنی ہو۔
ذبیہ بیگ۔ جناح یونیورسٹی

مکمل سچی دین میرے دل کے لیے

سحرش خان بھٹو لادکانہ ملیحہ صدیقی کراچی

خواب پلوں پہ سجا کر نہ نکلتا باہر
یہاں پتھر اچھے سر بازار بہت ہیں
تشرش کبھی روکھ جائیں تو منانے میں صبریاں لگیں
سنا ہے اہل رعیت خوار بہت ہیں

آمنہ اجالا ڈہرکی
سبھی لوگ تو کبھی بھی اچھے نہیں رہتے
جن سے سچ سیکھا ہو وہ بھی سچے نہیں رہتے
اعتبار کی ٹوٹی دہلیز پر اکثر
جو بہت ہوں اپنے اپنے نہیں رہتے

نائلہ، شائلہ جونیاں
ہم میں سو عیب ہوں گے پرک خوبی ہے فراز
ہم رستے میں کسی کو تنہا چھوڑا نہیں کرتے
عالیہ بٹول حویلی بہادر شاہ

میں خود غرض نہیں میرے آسروں کو پرکھ کے دیکھ
فکر چن ہے مجھے، علم آشیاں نہیں
عابدہ نشار کراچی

کر رہے تھے تذکرہ کچھ اپنی دفاؤں کا
ہمیں دیکھتے ہی بات کا مومنوع بدل گئے

عروہ شہوار کالا گوجران
دمک رہے ہیں میرے حرف لب پہ آئے بغیر
سمجھ رہا ہے وہ بائیں میری بتائے بغیر
یہ دو چراغ ہیں اولاد ایک نوے روشن ہیں
دیا جلا نہیں کرتا لہو جلائے بغیر

صوبہ نذیر ہری پور
جس شام برستے ہیں تیری یاد کے بادل
اس شب کوئی ہجر کا تارا نہیں ہوتا
یونہی میرے پہلو میں چلا آنا ہے اکثر
وہ درد جسے ہم نے پکارا نہیں ہوتا

اب اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں
دوستی کا دعوا کیا عاشقی سے کیا مطلب
میں ترے فقیروں میں، میں ترے غلاموں میں

حناسلم اعوان آخون باندی
مہری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سونیا ربانی قاضیاں محلہ بالا
آنکھ ڈھونڈے گی مگر اس کو نہ پلٹے گی کہیں
وہ ان ہی گلیوں میں اک دن لاپتہ ہو جائے گا

طاہرہ ملک پسرود
فاصلے پیار کی پہچان ہوا کرتے ہیں
نہ جانے کیوں لوگ پریشان ہوا کرتے ہیں
یہ حقیقت ہے کہ جہاں لوٹ کے جا جائے
وہاں پچھڑنے کے امکان ہوا کرتے ہیں

آمنہ اجالا ڈہرکی
اسی سے جان گیا میں کہ بخت ڈھلنے لگے
میں تھک کے چھاؤں میں بیٹھا تو پیر جلنے لگے
میں دے رہا تھا سہارے تو اک ہجوم میں تھا
جو گر پڑا تو سب ہی راستہ بد لے لے لگے

نمرہ، اقرا کراچی
رہن ہو تو حاضر ہے متاع دل و جان بھی
دہر ہو تو منزل کا پتا کیوں نہیں دیتے
کیا بیت گئی اس کے فراز اہل چمن پر
یارانِ قصص مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

اقرا محمد اشرف حافظ آباد
راستہ پر خطر اور اندھیرے کا ڈر
دوشنی کے لیے اک دیا چاہیے
خواب دل تو نہیں لوٹ جائیں تو کیا
چشم حیراں مجھے سوچنا چاہیے

نورین ضیاء سادو کی تجارت
خواب جب آئینہ دکھاتے ہیں
ان گنت لوگ یاد آتے ہیں
تشنگی دل میں ہو محبت کی
لوگ دریا سے لوٹ جاتے ہیں

انیلا ڈہرکی
نہیں ہے سود مگر بخش زیاں بھی نہیں
جو عمر گزری ہے کچھ ایسی رائیگاں بھی نہیں

زہیرہ جھنگ
عشق میں خواہ سند بن جائے
کوئی نہیں ہے کامل پھر بھی
سب کچھ اجماع مل بھی جائے
کیا ہوتا ہے حاصل پھر بھی

ارم کمال فیصل آباد
خوشیوں میں بھی رکھنا ہے شعلگی کا سماں
کہ اس کی آنکھ کا لہجہ خطاب بھرا ہے
وہ درد جس کو کیا مددوں نظر انداز
کتاب دل کا وہی خاص باب بھرا ہے

ایمنہ انا چکوال
دیکھنا یہ جس کا عالم رہا تو ایک دن
اک بگولا آئے گا سب کچھ اڑائے جائے گا
مدتی رہ جائیں گے فریاد کرتے قتل پر
اور قاتل مسکراتا خون بہا لے جائے گا

اقرا، عائشہ گوجرہ
شمع طلب بچھلے بھی جاگے تمام ذات
ہم آج انتظار کی حد سے گزر گئے

غفران، صبیحہ
کھاؤں چھو کر خورد
کچھ سوچ کر ہی بنا تھا موج دریا کا خریف
قد نہ مجھے بھی پتا تھا عاقبت ساقل میں ہے

سندھو جین ساکنہ
تئے منظر سجانا چاہتی ہوں
میں خود کو آ زمانا چاہتی ہوں
میرے ہوتوں پہ اک خوف دہلے
اب اس کا فیض پانا چاہتی ہوں

ثمینہ طاہرہ لاہور
سفر میں ریت کے ٹیلوں پہ مت بھروسہ
کہ یہ نشان تو اکثر بدلتے رہتے ہیں
مشیت اس کی نہیں ہے کسی کی بھی محتاج
ستارے کب یہ مقدّر بدلتے رہتے ہیں

طاہرہ ملک پسرود
ہے تعلق تو ایک سادہ لفظ
پھر جو بھی ہے وہ تباہ میں ہے
ہم کسی تیسرے کی منزل ہیں
دل کسی دوسرے کی راہ میں ہے

خاکنول حویلی لکھا
اس کی یہ ضد ہے کہ پتھر پھینکے
اور پھر جھیل میں پھول بھی نہ ہو
دولت عشق خدا سب کو ہی دے
کوئی میری طرح پاگل بھی نہ ہو

شیبا گل کراچی
ایک خوشبو کے دھند جانے سے
کچھ بھی باقی جہان میں نہ رہا
کون سے موڑا اور کیا کردار
تو، نبی جب داستان میں نہ رہا

عمارہ منیر گوجران
دو نیم کر گئی کیوں دل کو گفتگو اس کی
وہ جس کے دست ہنر میں گلاب دیکھتے تھے

مقدس رباب چکوال
بدلا ہے کتنی بار میرے دل نے فیصلہ
مرد کوں اسے، پکاروں، کہوں کچھ مگر نہیں
میں کس کے آگے جا کے رکھوں دل کا سلسلہ
ہمد نہیں، رفیق نہیں، چارہ گر نہیں



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت، عافیت، سلامتی اور
خوشیوں کے لیے دعائیں۔
رب کریم آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے
حفظ و امان میں رکھے اور جو لوگ پاکستان کے خلاف
سازشیں کر رہے ہیں ان کو ان کے ناپاک ارادوں کو ہمیشہ
ناکام و نامراد رکھے۔ آمین

پہلا خط چکوال سے انیقہ انا کا ہے لکھتی ہیں
آپ نے انیلا قیصر کو لکھا کہ ڈھائی سال پرانی کہانی کے
بارے میں کچھ بتانا مشکل ہے۔ تو جناب میں نے تول ہی
تھام لیا اور دل میں جو موہوم سی امید تھی کہ شاید کبھی آپ
پرانی فائلیں نکالیں اور کسی ایک آدھ خبر پر آپ کی نظر
گرم ہو اور آپ نوک پلک سنوار کر شائع کر دیں (آپ ہی
نے کہا تھا نا آئی! کہ نوک پلک سنوار کر...) شاید کہ آپ کو
یاد ہونہ ہو۔ مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا... اب جب آپ
نے اسے وہ جواب دیا تو... (بڑے دکھی دل سے) میں نے
اپنی تمام تحاریر پر فاتحہ پڑھ لی۔
بہر کیف... اب دل کہہ رہا ہے!
آنکھیں سلامت تو خواب بہت...

نمرہ نے باقی تحاریر کی طرح اب بھی اپنا معیار برقرار
رکھا اور ایک خوب صورت ناول لکھا۔ ہمارے اس ناول
میں کتنے برس کی ہوگی؟
"ابن آدم" صائمہ کا گزشتہ ماہ شائع ہوا ناول، مجھے خوب
گلے تھے صائمہ سے، لیکن مذکورہ ناول پڑھ کر تو سارے کے

سارے گلے، سمندر کے جھاگ کی طرح غائب ہو گئے۔
بہت بہت اچھا لکھا۔ کئی کئی جملوں پر تول فدا ہو گیا۔ جیسے
"ہم وہ دیکھتے ہیں جو ہمارا دل ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔" واہ...!
عائشہ نصیر نے پرانے موضوع کو بھی نہایت خوب
صورتی سے تحریر کیا۔ زین کا کردار بہت پسند آیا۔
فرحانہ ناز، ایک طویل مدت کے بعد جلوہ گر ہوئیں اور
ایک خوب صورت سے ناول سمیت واہ...!

فائزہ نے شکر ہے اپنے قارئین کو نوازا تو سہی...
رومان کا کردار اور اس کے لیے "پرا" کی اصطلاح خوب
مزے کی لگی۔ ویسے اس بار فائزہ نے خوابوں کا یہ شہر کس
دیس میں بسایا ہے؟ باقی میثا کا ماضی، بہت پر اسرار سا ہے۔
اس کے علاوہ فی الحال تو کہانی اچھی جا رہی ہے۔
پیاری انیقہ! آپ کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی، آپ نے
جب بھی خط لکھا۔ ہم نے شائع کیا، پچھلے ماہ بھی آپ کا خط
شائع تھا۔ انیقہ! آپ نے ایک خوب صورت جملہ لکھ کر
گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔
آنکھیں سلامت تو خواب بہت...

آپ ہمیں نئی کہانیاں لکھ کر بھجوائیں اس بار آپ سے
بالکل پکا وعدہ ہے، آپ کی تحریروں موصول ہوتے ہی فوراً
پڑھیں گے اور نوک پلک سنوار کر شائع کرنے میں پہلے کی
طرح تاخیر نہیں ہوگی۔ اپنا فون نمبر ضرور لکھیے گا تاکہ آپ
سے رابطہ کر سکیں۔

نمرہ کے ناول میں ہمارے کی عمر 9 سال ہے۔
صالحہ اور اقصیٰ نے میرپور آزاد کشمیر سے لکھا ہے

آپ ہمارے خط تو شائع کرتی ہیں لیکن اس میں
ساری لائٹیں کٹ کر صرف چند لائٹیں شامل کر دیتی
ہیں۔ آمنہ ریاض کو نہ پا کر بہت مایوسی ہوئی لیکن جب ان
کی بیٹی کی خبر پڑھی تو دل سے بے ساختہ دعائیں نکلیں کہ
اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی بیٹی کو صحت و تندرستی عطا
فرمائے۔ "دیوار شب" بڑی خوب صورتی سے اختتامی
مراحل پر رواں دواں ہے "جنت کے پتے" میں پاشا نے
حیا کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا، یہ جان کر حیرت
ہوئی لیکن حیا کی شادی اگر میجر احمد سے کر دی جائے تو؟ ابن
آدم بھی اچھا ناول تھا۔ لیکن ارفع کو خضر کے بجائے کسی
اور سے شادی کرنی چاہیے تھی تاکہ خضر کو اپنے فیصلے پر
پچھتاؤ نہ پڑے، عائشہ نصیر کا ناول بھی اچھا تھا "علینہ اور میں"
بھی اچھا تھا، لیکن اسد کے گھر والوں کو اسد سے توبات کرنی
چاہیے تھی، بشریٰ احمد کا افسانہ حقیقت پر مبنی تھا۔ صا
اسلام کا افسانہ ہمارے معاشرے کا اک کڑوا سچ تھا۔ باقی
دونوں افسانے بھی ٹھیک تھے۔ رخسانہ نگار کب آئیں
گی۔ چائلڈ آرٹسٹ کا بھی انٹرویو شائع کیا کریں۔
صالحہ اور اقصیٰ! ہم چاہتے ہیں قارئین شعاع کی

تحریروں پر تفصیلی تبصرہ کریں تاکہ ہم ان کی رائے سے آگاہ
ہو سکیں مگر ہم ان کے خط پورے شائع نہیں کر پاتے اور
مختصر کر کے شائع کرتے ہیں۔ اچھی بہن یہ ہماری مجبوری
ہے کیونکہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں زیادہ
سے زیادہ قارئین کے خط شامل ہوں اگر ہم پورا خط شائع
کریں تو پھر چند ہی خطوط شامل ہو سکیں گے اور دیگر
قارئین کو شکایت ہوگی۔ رخسانہ نگار کی تحریر آپ جلد پڑھ
سکیں گی۔ انٹرویو کے لیے شاہین تک فرمائش پہنچائی جا رہی
ہے۔

مسز شمیم امجد نے گاؤں پنڈ گجراں تحصیل و ضلع ہری
پور سے لکھا ہے

سب سے پہلے بات کروں گی "جنت کے پتے" کی نمرہ
احمد واہ میں آپ کی کیا تعریف کروں۔ شروع کی دو تین
اقساط میں تو مجھے یہ لگا یہ ناول تو صرف گلیمرس ہے
لیکن اس قسط میں واضح ہو گیا کہ نمرہ احمد کوئی ایسا ناول نہیں
لکھتیں۔ جس میں اصلاح نہ ہو چہرے کا حجاب "واجب یا
مستحب؟ اتنے واضح الفاظ میں تفصیل سے بتایا کہ کسی
شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی اور آپ نے جو گھر بیٹھے
ترکی کی سیر کروائی اس کے لیے بھی شکریہ۔

"دیوار شب" عالیہ بخاری نے زیادہ لمبا کر دیا ہے۔ مجھے
اس ناول میں آپاگل کا کردار بہت ہی عجیب لگتا ہے کیا کوئی
شادی شدہ بیٹی اتنی خود غرض ہو سکتی ہے "اک نئی
سنڈریلا" میں میثا نے زین کو خوب اپنی انگلیوں پر نچا رکھا
ہے۔ رومان نے جو مائر کو تھالی کا بیگن کھا ہے بالکل ٹھیک کہا
ہے۔ صائمہ اکرم کے ابن آدم میں اگر میں ارفع عزیز کی
جگہ ہوتی تو اپنی زندگی خوار کر لیتی ساری زندگی جدائی کا زخم
سہتی لیکن دوبارہ خضر حیات کی زندگی میں کبھی نہ جاتی۔ یہ
کوئی تک بستی ہے کیا ہم لڑکیاں اتنی ارزاں ہوتی ہیں جب
جی چاہا اپنا لیا جب جی چاہا دھتکار دیا۔ بشریٰ احمد کا افسانہ
بہت اچھا تھا یہی تو فرق ہے پہلے کی زندگی اور شادی شدہ
زندگی میں تبدیلی صرف لڑکیوں کی زندگی میں آتی ہے
لڑکوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

شیم! دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جو
لوگ خود غرض اور بد فطرت ہوتے ہیں وہ کسی کے نہیں
ہوتے۔ آپاگل اپنی بہن کے لیے ہی خود غرض نہیں ماں کے
ساتھ بھی ان کا رویہ ایسا ہے۔ سسرال والوں کی برائی کا کوئی
موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں اور زندگی میں کبھی کوئی
موقع آیا تو شوہر اور اولاد کے ساتھ بھی اسی خود غرضی اور
بد فطرتی کا مظاہرہ کریں گی۔ آپ تھوڑا سا غور کریں تو آپ
کو ایسے کردار اپنے ارد گرد بھی نظر آئیں گے۔
صائمہ اکرم کے ناول کو آپ سمجھ نہیں پائیں ارفع

اعتذار
عالیہ بخاری علالت کی وجہ سے "دیوار شب" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس ماہ ان کے ناول کی قسط شامل اشاعت
نہیں ہے۔ آئندہ ماہ آپ ان کی قسط پڑھ سکیں گی۔ ان شاء اللہ

عزیز نے اسے خضر حیات کا نہیں قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ اسے خضر حیات سے محبت تھی، جب زندگی نے اسے ایک بار پھر اپنی محبت کو پانے کا موقع دیا تو وہ انکار کر کے کفرانِ نعمت کیوں کرتی۔

صرف انا کی خاطر زندگی تباہ کرنا تو دانش مندی نہیں ہے۔

صائمہ ریاض چکوال سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے اکتوبر کا پورا شمارہ زبردست تھا۔ سب سے پہلے نمرہ احمد کا ناول ”جنت کے تے“ بڑھا۔ پردے کے بارے میں بہت اچھا لکھا تھا کہ واقعی قیامت کے دن جب ہم چھوٹی چھوٹی نیکیاں ڈھونڈ رہے ہوں گے تو ہم واقعی سوچیں گے کہ ہم یہ نیکی کر لیتے تو کیا تھا۔ میرا سا جن بھی اچھی تحریر تھی۔ زن اور بادی کی باتیں کافی دلچسپ اور مزاحیہ تھیں اور تعبیر کا کردار بھی بہت اچھا تھا۔ ”علینہ اور میں“ بھی اچھی تحریر تھی۔ افسانے سارے ہی زبردست تھے۔ بساط بھی اچھی تحریر تھی۔ مگر سب سے اچھی بشریٰ احمد کی پھر یوں ہوا اور بات تو سچ ہے تھی۔ ”بات تو سچ ہے“ میں کاش طبع کی ماں بہت کرتی تو اسے دارالامان جانے کا فیصلہ نہیں کرنا پڑتا۔ ”ایک ہی زندگی“ بھی اچھی تحریر تھی۔ اتفاق کا کردار اچھا تھا۔ لیکن اتفاق کی ماں کا رویہ کچھ عجیب لگا بھلا اس سب میں اتفاق کا کیا قصور؟ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتیں بھی بہت اچھا سلسلہ ہے۔ بہت کچھ سمجھنے کو ملتا ہے۔ فائزہ افتخار کا ”اک نئی سنڈریلا“ ٹی وی پر دیکھ کر اچھا لگا۔ میثا کی حرکتیں نہایت دلچسپ ہیں۔ ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

پیاری صائمہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

صبور شریف ضلع گجرات سے علی گوٹروی نے لکھا ہے آپ کے رسالہ میں کچھ تصحیح مطلوب تھی (شعاع اکتوبر 2012ء کے ”شاعری سچ بولتی ہے“ میں محترمہ کرن شبیر صاحبہ نے یہ شعر نصیر ترابی صاحب کا لکھا ہے جو کہ ان کا نہیں بلکہ یہ شعر ”حضرت پیر سید نصیر الدین نصیر گوٹروی“ کا ہے۔

جو ہو فیصلہ وہ سنائے اسے حشر پر نہ اٹھائے جو کریں گے آپ ستم دہاں وہ ابھی سہی وہ ہمیں سہی

یہ شعر پیر صاحب کے مجموعہ کلام ”پیان شب“ میں سے ہے۔ پوری غزل لکھ کر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ علی صاحب! بہت شکریہ۔ آپ نے ہماری غلطی کی نشان دہی کی اور ہمیں پوری غزل بھجوائی۔ غلطی کی تصحیح کی جا رہی ہے اور پوری غزل بھی شامل اشاعت ہے۔

مسز عاشق علی نارنجو نے مکملی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سارا کا سارا شعاع ہی لا جواب تھا۔ میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں میرا نام نور ہے اور میں میٹرک پاس ہوں۔ مجھے اردو بالکل بھی لکھنا نہیں آتی تھی۔ لیکن آپ کے رسالے پڑھنے کے بعد تھوڑا بہت لکھ لیتی ہوں۔ آپ شاید یقین نہ کریں۔ لیکن جب میں اسکول پڑھنے جاتی تھی اس وقت میرے ساتھ ہمارے گاؤں کی تین لڑکیاں اور ہوتی تھیں۔ اب تو اللہ عزوجل کا شکر ہے کہ سب اپنی لڑکیوں کو پڑھنے بھیجتے ہیں۔ لیکن میں آگے نہ پڑھ سکی۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

بھائی نے کہا کہ کوئی بھی ہمارے خاندان کی لڑکی نہیں پڑھی، ہم نے دس پڑھی ہیں وہ بھی بہت ہیں۔ میں بہت روٹی تھی۔ آپ سمجھ رہے ہیں میں کوئی 20-25 سال پہلے کی بات کر رہی ہوں تو ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میری عمر 25 سال ہے اور میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں میرے دو پیارے بچے بھی ہیں۔ آپ کے رسالے صرف میں نہیں پڑھتی بلکہ میری چھوٹی بہنیں ناہید۔ نغمہ، نائلہ بھی بہت شوق سے سنتی ہیں۔ میرے شوہر جب بھی کراچی جاتے ہیں تو میں ان سے پرانے ڈائجسٹ بھی منگوائی ہوں مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق نہیں بلکہ ان سے عشق ہے جنون ہے۔

پیاری نور! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہماری دیہی علاقوں میں جہاں لڑکیوں کے لیے نہ تو اسکول ہیں اور نہ ہی انہیں پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ آپ کے بھائی قابل قدر ہیں کہ انہوں نے اس ماحول میں آپ کو میٹرک تک تعلیم دلائی۔ آگے آپ — تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکیں۔ اس کا افسوس نہ کریں۔ تعلیم صرف ڈگری حاصل کرنے کا نام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تا تو آج بڑے بڑے اعلا ڈگری یافتہ لوگوں کے ذہن ایام جاہلیت کی طرح

مختلف تعصبات میں نہ جکڑے ہوتے۔ آپ کو علم حاصل کرنے کا شوق ہے تو آپ گھر بیٹھے بھی یہ سلسلہ جاری رکھ سکتی ہیں۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ انسان کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ ذہن کو روشن کرتا ہے۔

یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کو ایسے شریک حیات ملے ہیں جو آپ کے شوق کا خیال رکھتے ہیں اور آپ کو ہر ماہ رسالے لا کر دیتے ہیں۔ آپ ہماری جانب سے ان کا شکریہ ادا کر دیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ کی اردو اچھی نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔ اب ہمیں ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ ایک ضروری بات آپ نے لکھا ہے آپ کی بہنیں سنتی ہیں۔ کیا وہ پڑھنا نہیں جانتیں؟

ثوبیہ، صوفیہ، سمیعہ، سدرہ اور صفیہ نے سعادت پور سرانے عالم گیر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ وائٹ فرائڈ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ پیارے نبی کی پیاری باتوں سے فیض یاب ہو کر سیدھے پہنچے ”جنت کے تے“ تک۔ بہت خوب صورت موضوع، بہت خوب صورت فقرے، جملے، بہت خوب صورت منظر نگاری ہر چیز لا جواب لیکن حیا سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ وہ جہان کو معافی کا ایک موقع تو دیتی۔ لیکن خیر اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں نمرہ کا اتنا خوب صورت لکھنا واقعی حیرت انگیز ہے۔

”اک نئی سنڈریلا“ کی فائزہ کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

جس کمائی نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے ”ابن آدم“ صائمہ اکرم چوہدری نے زبردست لکھا۔ یہ ناول رسالے کی جان تھا۔ موضوع بھی مختلف تھا۔ لیکن اتنا اچھا ناول لکھتے ہوئے صائمہ نے ایک غلطی کی وہ یہ ہے کہ معید اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ لیکن صائمہ نے 2، 3 جگہ معید کے ساتھ نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، ہمیں بہت تکلیف پہنچی ہے۔

سب سے مزے کا ناول ”علینہ اور میں“ زبردست فرحانہ کے جملوں کی برجستگی بہت اچھی لگی۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ عائشہ نصیر نے بھی اچھا لکھا کیا یہ نئی رائٹریں۔ اس کے علاوہ تو سارے ہی سلسلے زبردست تھے۔

ستمبر کے شعاع میں شازیہ قیصر نے خط لکھا تھا نروال شریف سے تو ان سے میں یہ پوچھنا چاہوں کہ شازیہ آپ واقعی نروال سے ہیں یا نریال سے کیونکہ نروال میرا انھیالی گاؤں ہے اس لحاظ سے میں پورے گاؤں کو جانتی ہوں لیکن آپ کا نام پہلی دفعہ سنا ہے۔

شاہن آبی سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ آبی جونیوز کے شو ”خبرناک کے اینکر“ آفتاب اقبال کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں پلیز ورنی۔

اور آخر میں راحت آبی، فاخرہ آبی، نایاب جیلانی، نبیلہ عزیز، مریم عزیز، نبیلہ ابرار، ام مریم سب کہاں غائب ہیں پلیز تشریف کے نوکرے لے آئیں۔ ثمنہ عظمت، انیسہ سلیم اور تمام رائٹرز جن کی وجہ سے شعاع مہکتا ہے یہ شعاع کے پھول کدھر غائب ہو گئے ہیں۔

ثوبیہ، صوفیہ، سمیعہ، سدرہ اور صفیہ! آپ سب بہنوں کو شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ اللہ

سانحہ ارتحال

معروف نعت خواں اور حبیب آئل ملز کی میجر پر موشن محترمہ تائبہ لاری کی والدہ گزشتہ روز قضائے الٰہی سے وفات پانگئیں۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ ان کی ناگہانی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین

بدلی آب سب کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔
نام کے سلسلے میں آپ نے ہماری غلطی کی نشان دہی
کی۔ بہت شکریہ۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ مصنفین سے
بھی درخواست ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام جو اسماء الحسنی
کہلاتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں استعمال نہ کریں۔
عائشہ نصیر احمد نئی رائٹرز ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیت دیکھ
کر لگتا ہے کہ بہت جلد ان کا شمار بہت اچھی رائٹرز میں
ہوگا۔

عدیلہ شہزاد نے لیہ سے لکھا ہے

زندگی نے کئی رخ پلئے، یہ ڈائجسٹ ہمیشہ ایک اچھے
استاد کا کردار ادا کرتے رہے۔ ہمیں سے میں نے زندگی کو
سمجھنے اور رشتوں کو برتنے کا فن سیکھا۔ ”جنت کے پتے“
شانداز طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے امید ہے نمبر جی حیا
سلیمان اور جہان سکندر کے ساتھ برائیاں نہیں کریں گی۔ اب
کچھ اپنے گاؤں کے بارے میں بتاؤں گی۔ ضلع لیہ میں
(ساؤتھ پنجاب) ارد گرد پھیلے چکوں میں سے چک 90 ایم
ایل سے میرا تعلق ہے۔ میرے گاؤں میں ہر سہولت
موجود ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ
گورنمنٹ انگلش میڈیم ہائی اسکولز، دوپرائیویٹ ایک مل
اور ہائی اسکول اکیڈمیز، گورنمنٹ وین ڈگری کالج، ہیلتھ
سینٹر، پوسٹ آفس، یوسی آفس، ہر طرح کی شاپس ہیں۔
یہی وجہ ہے اس گاؤں کے لوگ شاذ ہی شہروں کی طرف
شغف ہوئے ہیں۔ بلکہ آئے روز آبادی بڑھ رہی ہے۔
اس گاؤں نے پاک فوج کے شہیدوں میں اپنے جوانوں کا
نام بھی لکھوایا ہے۔

پاری عدیلہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید حیرت
ہے۔ اتنے طویل ساتھ کے باوجود آپ نے بھی خط لکھ کر
ہمیں اپنی رائے سے آگاہ نہیں کیا۔ اب باقاعدگی سے خط
لکھتی رہیں گے۔

آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔
آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کے گاؤں میں یہ تمام
سہولیات مہیا ہیں۔ خصوصاً ”جنونی پنجاب کے گاؤں میں
جس کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ ایک پسماندہ علاقہ
ہے اور وہاں کے رہنے والے ضروری سہولیات سے محروم
ہیں۔

نوٹی بٹ جو پہلے علی پور چٹھہ سے لکھتی تھیں اب
لاہور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

گردش ماہ و سال بھی ہماری محبتوں کی راہ میں حائل
نہیں ہو سکے۔ جو دار فتنگی، جنون پہلے دن تھا سواب بھی ہے
بھلے میکے کی گلیوں سے پیادیں سدھارے بھی عرصہ ہوا
ہے اس ڈرامے کی تین اور مکمل اقساط بھی ہو چکیں

(الفاف احمد، ابراہیم احمد اور تبلیہ احمد)

اب شمارہ بہت لیٹ ملتا ہے پہلا گلہ نوٹ فرما لیجیے ذرا
یہ کہ بہت پیاری پیاری سی رائٹرز جن کی تحریروں نے کچھ
رہنا سکھایا تھا، وہ ہمیں ملتیں اگرچہ بہت سی نئی لکھاری
جنہیں بھی کسی طرح کم نہیں ہیں آج تو سرفہرست نمبر احمد
ہیں اتنی خوب صورت برائے اور دلچسپ انداز میں ایسی
گہری باتیں جن کی آج کی جنریشن کو از حد ضرورت ہے
بیان کرتی ہیں عالیہ بخاری نے دل و دماغ میں ساڑھے پانچ
سال سے جھکڑ چلا رکھے ہیں خدا را اتنی لمبی تحریریں نہ دیا
کریں افسانے سب ہی اچھے ہیں فرحانہ ناز نے ہٹ کر
تحریر لکھی ہے اچھی لگی۔ صائمہ اکرم نے ابن آدم کو واقعی
لفظوں کے رنگ دیے ہیں اتنی بے ساختہ محبت اور
اپنائیت میں اللہ کے حکم کا ماننا بہت اچھا لگا۔

تاریخ کے جھروکوں سے دل جھوم اٹھا اور اک نئی آس
جاگی شاید ہمارے ملک میں بھی کوئی ایسا حکمران آجائے جسے
اس بات کا احساس ہو کہ اللہ نے جو رتبہ اسے دیا ہے وہ
اسے کس طرح نبھنا ہے۔

پاری نوٹی! 14 سال کی طویل مدت بعد آپ کے دل
میں شعاع میں شرکت کی خواہش جاگی اور آپ نے ہمیں
یاد کیا۔ بہت شکریہ۔ زندگی کی مصروفیات اپنی جگہ لیکن
اپنوں کے لیے تو وقت نکالنا چاہیے۔ بہر حال یہ خوشی کی
بات ہے کہ زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے
مصروفیات کے باوجود شعاع سے آپ کا تعلق قائم رہا
ہے۔ پرانی کچھ رائٹرز تو اب بھی لکھ رہی ہیں یہ اور بات
ہے کہ اب پہلے کی طرح باقاعدگی سے نہیں لکھتیں آہستہ
آہستہ نئے لوگ بھی جگہ بنا رہے ہیں۔

انٹرویو کے لیے آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔
تھوڑا انتظار کر لیں۔

عطیہ طارق اور صبا طارق نے ڈا ہر انوالہ سے لکھا ہے

صائمہ اکرم چوہدری کی ”ابن آدم“ کا آغاز بہت اچھا
تھا۔ لیکن یہ کیا صائمہ جی! آخر میں بالکل وہی پرانی کہانی کہ
ارفع بی بی سب کچھ بھول کر خضر حیات کی ہمراہی میں چل
دیں۔ کچھ مزا نہیں آیا۔ سدرہ سحر عمران کا افسانہ اچھا لگا۔
صبا اسلام کا ”بات تو سچ ہے“ اور ثریا انجم کا ”ایک ہی زندگی“
بھی اچھے تھے۔ ناولٹ ”علینہ اور میں“ میں علینہ کا
نٹ کھٹ سا انداز اچھا لگا۔ ”شاعری سچ بولتی ہے“ میں
کرن شبیر کا انداز اور انتخاب دونوں اچھے لگے۔ ”زاویہ“ پر
آمنہ زریں کا تبصرہ اچھا لگا۔ آمنہ ریاض کو ننھی پری کی آمد
پر مبارکباد۔

عطیہ اور صبا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے
پہنچائی جا رہی ہے۔ ارفع بی بی کو خضر حیات سے محبت تھی تو
ان کے ساتھ ہی جانا چاہیے تھا۔ آپ کو یہ بات کیوں اچھی
نہیں لگی؟

فرح مقصود نے فیصل آباد سے لکھا ہے

شعاع میں ہر کہانی بہت زبردست ہوتی ہے نمبر احمد
بہت خوب صورت اور اچھا لکھ رہی ہیں اور سنڈریلا، فائزہ
افتخار بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں آپ سے درخواست تھی
کہانی لکھنے کا اور بھیجئے کا طریقہ بتادیں۔

فرح! صفحہ کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں اور بذریعہ
ارجنٹ میل سروس ہمیں بھیجوا دیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

الفت زہرہ ہراج نے داؤد والا قلعہ خانیوال سے لکھا
ہے

”شعاع کے ساتھ ساتھ“ کا سلسلہ مجھے اچھا لگتا ہے
پلیز اسے بند نہ کرنا اور اس کے علاوہ افسانوں میں سدرہ سحر
کا افسانہ اچھا تھا عالیہ بخاری کا ناول دیوار شب مجھے بہت
پسند ہے اور اس وقت بہت مزا آیا جب جو یا نے اس الوکی
آنکھوں والے منگیتر کو تھپڑ مارا۔ مریم عزیز اور ماہا ملک
کہاں ہیں۔ آپ فرحان علی (مشہور نعت خوان) کا انٹرویو
شائع کریں۔

الفت شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی

فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

مائے مشعل نے حویلی لکھا، تحصیل دیپالپور، ضلع
اوکاڑہ سے لکھا ہے

مائے مشعل بہت اچھا لگا فائزہ افتخار جی! آپ کے قلم سے نکلا
ہر لفظ براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک بہن نے
لکھا تھا کہ ”یشاکا کردار اچھا نہیں لگتا ہے“ پڑھ کر بہت
حیرت ہوئی کیونکہ اس ناول کی جان ہی یشاکا کردار ہے۔
”دیوار شب“ پڑھا۔ عالیہ بخاری جی نے آخر کار

زر تاج بیگم کی تباہی کا آغاز کر ہی دیا۔ ویل ڈن عالیہ جی!
”ابن آدم“ صائمہ اکرم جی نے بڑا ہی زبردست لکھا۔
خوشگوار سا اختتام سب کو خوش کر گیا ہے۔

فرحانہ ناز ملک جی نے بھی اچھا لکھا۔ شائستہ بیگم کی
سوچ بھی درست ہی تھی۔ مگر اس نے واقعی سگا بن کے
دکھایا۔ افسانوں میں ”پھروں ہوا“ حقیقت سے قریب تر
لگا۔ ”بساط دل“ کا اختتام عم زوہ کر گیا۔ علی نے جو کما سچ کر
دکھایا۔ باقی سارے سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح بہت ہی
زبردست تھے۔

نبیلہ عزیز جی! کرن کو ایسی پیاری ہوئیں کہ ہمیں بھول
ہی گئیں اور نایاب جیلانی جی کہاں عائب ہیں؟ پلیز تشریف
لائیے نا۔۔۔۔۔

مائے! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔
نایاب جیلانی کی تحریر آپ جلد ہی پڑھیں گی۔ نبیلہ عزیز
بھی شعاع کے لیے ناول لکھ رہی ہیں۔ متعلقہ مصنفین
تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

رقیہ اسماعیل نے یزمان سے لکھا ہے

مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح فرسٹ کلاس
تھا۔ مائے مشعل۔ ماڈل اور اس کا ڈریس دونوں بہت زبردست
لگے ”ستارہ شام“ کو نہ پا کر مایوسی تو ہوئی لیکن آمنہ ریاض
کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوئی یہ سن کر بہت خوشی ہوئی
مبارک! ”دیوار شب“ بھی میری موسٹ فیورٹ تحریر ہے
پلیز جو یا اور معاذ کو جد امت کیجئے گا۔ نمبر احمد نام کی طرح
منفرد ناول لے کر آتی ہیں ”جنت کے پتے“ کی اس قسط نے
تو ہیپنا ٹائز کر دیا حجاب کے بارے میں ”غزوہ خندق کے

دستک نہ دو

مصطفیٰ الطاف فاضل
تبصہ آئینہ ذہین

رہتی ہے۔
تو الطاف فاطمہ نے نہایت سادگی اور نرم روی سے اپنے قلم اور کرداروں کے ذریعے یہ بات واضح کر کے قاری تک پہنچادی کہ کبھی بھی اپنی روح کو مادیت کی دیواروں میں قید کرنے کی غلطی نہ کریں۔ اس کے نتائج یاس، رنج اور شکست خوردگی کے علاوہ کچھ نہیں۔
تو چلیے۔ دیکھیے کہانی کا پہلا منظر:

”اس دوپہر ہی شام کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ جنوری کا سب سے زیادہ گرم آلود دن تھا۔ مالی نے اسی شام کیاریوں کی گڑائی کی تھی کہ شاید آج برکھا ہو جائے۔ سنہرے سنہرے سرکنڈوں کے سہارے لہلہاتے ہوئے سوٹ پی کے پودوں میں سفید آسمانی آدوے اور گلابی پھول اپنے جوں پر تھے۔ سرد اور دھندلی فضا میں ہر طرف جھینسی جھینسی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دل کی وضع کی کیاریوں میں نیلے اور بنستی پھول منہ لٹکائے گہری سوچوں میں غرق نظر آ رہے تھے۔ اندر سے باہر تک خاموشی تھی اور صرف چمنیوں سے بل کھاتا ہوا دھواں نظر آ رہا تھا۔“

اس کے ساتھ ہی آپ ایک ایسے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں کے مکین خوب صورت ماحول اور خوشحال زندگی سے لطف اندوز تو ہو رہے ہیں مگر مزاجوں کا اختلاف کیوں اور کیسے کا سفر اس طرح طے کرے گا کہ آپ خود کو ان ہی کے ساتھ پا جائیں گے۔ کہانی کے آغاز کا وقت تقریباً 1930ء کا بتا ہے قدیم زمانے میں موجود جدتیں، تمدن، ادب، آداب

تخلیق اپنے خالق کی مظهر ہے!
کہانی بھی تخلیق کی صنف سے تعلق رکھتی ہے اور یہ تخیل کی روح ہے جو الفاظ، مناظر اور کردار کو پڑھنے والے کے لیے جسم کر دیتی ہے۔
اور واقعہ یہ ہے کہ انسان کا اپنی مختصر سی زندگی میں اس کائنات کی بیشتر چیزوں سے صرف لطف اندوز ہونے کا تعلق رہتا ہے سو ایک کہانی بننے والا ذہن تخلیقی جو ہر سے مالا مال ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا اعتراف بہر حال کرنا چاہیے۔

ادب میں شامل کچھ بے ادب تحریریں بھی یقیناً تخلیق ہیں مگر ہر تخلیق پسندیدہ ٹھہرے یہ ممکن نہیں۔

طبقاتی امتیاز ہر دور کی جیتی جاگتی حقیقت رہی ہے۔ اسے قائم رکھنے والے مٹ بھی جائیں یہ رائج رہتی ہے، مگر حاصل شدہ نعمت کو حق سمجھ کر کم نعمت یافتہ طبقے سے جلتا ہوا فاصلہ اختیار کرنا معاملے کی نوعیت کو حساس بناتا ہے اور مسئلہ تو کھڑا ہی تب ہوتا ہے جب ایک دوسرے کی حیثیت اور رائے کا احترام ختم ہو جائے۔

”دستک نہ دو“ کا تانا بانا اسی طبقاتی امتیاز سے بنا گیا ہے۔ اور پھر سچ سچ۔۔۔ منظر منظر قلم کی صورت گری ہمیں یہ دکھاتی ہے کہ انسان کا سکون فطری سادگی میں مضمر ہے۔ تصنع اور تکلف کی کشافت سے اظہار پر روک لگ جاتی ہے، مگر روح تشنگ کا شکار ہو جاتی ہے۔ پھر جسم عارضی خوشیوں اور ظاہری آسروں کی تلاش میں بھٹکا پھڑکے۔۔۔ تو پھرے، روح لاعلاج

ام برہان! شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکر یہ رخسانہ نگار عدنان ہمیں بھی بے حد پسند ہیں اور ان کی کمی ہم بھی اسی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ رخسانہ مال بننے کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ اس لیے اتنا عرصہ نہ لکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش و خرم، صحت مند رکھے اور ان کے فرزند کو دو جہاں کی کامیابیاں اور خوشیاں عطا فرمائے اور وہ ہمارے لیے بہت سارا لکھیں۔

آپ جلد ہی رخسانہ کا ناول شعاع میں پڑھیں گی قرآنی آیات کا ترجمہ شائع کرتے ہوئے ہم پوری احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں اور قرآن پاک سے ویکھ کر نقل کرتے ہیں۔ ممکن ہے نمبر نے صحیح ترجمہ لکھا ہو لیکن پروف پڑھتے ہوئے سمجھا ”یہ الفاظ رہ گئے ہوں آپ نے ہماری غلطی کی نشان دہی کی۔ بہت شکریہ۔“

سندس اسلام نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں اے لیول کی طالب علم ہوں اور ڈائجسٹ پڑھ کر ہی میں نے اپنی اردو اس معیار تک پہنچائی ہے۔ شعاع ہاتھ میں آئے تو سب سے پہلے نظر نمبر احمد کا مکمل ناول ”جنت کے پتے“ کی طرف بڑھتی ہے۔ ہر قسط نئے موڑ پر ختم ہوتی ہے۔ مجھے جہاں کا کردار بہت پسند آیا۔ افسانے اچھے تھے اور سلسلہ وار ناول کے بارے میں میں کہنا چاہوں گی کہ پلیز کہانی کا نیچو تھوڑا تیز کریں۔ فائزہ افتخار نے کمال کا ناول لکھا ہے۔ وہ ہمیشہ مزاح اور مقصدیت ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ رومان اور ماردونوں اچھے کردار ہیں اور ہم کسی بھی ایک کے ساتھ نا انصافی نہیں دیکھ سکتے۔

سندس! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ ایک کے لیے آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

بارے میں عائشے گل کی باتیں، نمبر جی کیپ اٹ اپ، ہم آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں پلیز۔
پاری رقیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ام برہان نے کراچی سے لکھا ہے
السلام علیکم شاید 95 یا 96 سے آپ کے رسالے شعاع اور خواتین پڑھ رہی ہوں ہمیشہ سوچتی کہ بتاؤں مجھے رخسانہ نگار عدنان کتنی پسند ہیں کہ میں سب کہانیاں چھوڑ کر پہلے انہیں پڑھتی ہوں۔ وہ کہاں غائب ہیں پلیز رخسانہ آپ واپس آجائیں، میری خاطر ہی سہی اور بھی بہت سی بہنیں ہیں جو آپ کو پڑھنا چاہتی ہوں گی مجھے رخسانہ، فائزہ فرحت، نمبر، آسیہ رزاقی، عمیرہ، سیما، بہت عاصم، کاشفہ حسین، قانتہ، رابعہ اور بھی سب راسخز بہت پسند ہیں اور رخسانہ اور نمبر تو بہت ہی زیادہ۔

دوسری بات نمبر کے ”مصنف“ کی ہے۔ نمبر آپ نے کیا ہی خوب لکھا کہ سیدھا دل میں اترا اور جب قرآن پاک کی کوئی آیت بطور دلیل بیان کرتیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے کہ یارب ساری زندگی ترجمہ پڑھایا اور پڑھا لیکن اس کا ایسا مطلب تو سوچا ہی نہیں۔ اس پہلو سے تو اس آیت کو سمجھا ہی نہیں یہاں میں ایک چھوٹی سی غلطی کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جس دن محل کی ماں کا انتقال ہوا اور اس سے پہلے اس نے کلام مجید کو کھولا تو یہ آیت کھلی ”ہم تمہیں ضرور آزما میں گے“ اس آیت میں آزمائش کے لیے کچھ چیزوں کا ذکر تھا اور وہ تھا ”خوف“ بھوک مال کی کمی جان کی کمی اور پھلوں کی کمی، لکھتے ہوئے نمبر پھلوں کا ذکر کرنا بھول گئیں بہر حال نمبر آپ مبارکباد کی مستحق ہیں ”مصنف“ پر بھی اور اب ”جنت کے پتے“ پر بھی اور ہاں نمبر آپ نے قرآن مجید کی تفسیر کہاں پڑھی ہے کیا ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے اداروں سے؟ بہر حال خوش رہیں۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت پر ڈراما، ڈرامائی تخیلی اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

اقدار شادی بیاہ کی رسمیں کھانے پینے اور لباس کے رجحانات، خاندانی تعلقات کی اہمیت اور نوعیت جاننے کے لیے ”دستک نہ دو“ ٹائم مشین بن جاتی ہے اور انسانی ذہن کا ایک کمال یہ بھی تو ہے کہ وہ تخیل کی سواری کا سوار ہے۔

اس گھر کے سربراہ جہانگیر مرزا ہیں۔ جبکہ اولاد اور خاندانی معاملات کو ہنر سے چلانے والی ان کی بیگم ہیں پہلے ہی منظر میں نمودار ہونے والا صفدر لیوچو حالات کے جبر کے نتیجے میں پردیس میں مزدوری کرنے والا چینی مسلم باشندہ ہے جو پھیری لگا کر اپنے وطن کی بنی ہوئی اشیاء فروخت کرتا ہے۔

”اور جب نفاست کے ساتھ ناک بھوں چڑھاتی ہوئی بیگمیں برآمدے میں بڑے ہوئے موندھوں پر آکر بیٹھ جاتیں تو وہ اپنا گھڑ گھول کر چینی دست کاری کے بیش بہا نمونے ان کے قدموں میں بکھیر دیتا۔ پلنگ پوش، سلک کے ٹائٹ سوٹ اور ڈریسنگ گاؤن، میز پوش، ٹی کوزیاں۔ سامان کیا ہوتا، فائن آرٹ کی نمائش ہوتی۔“

”اور جب وہ اپنا گھڑ دوبارہ سائیکل پر لادتا تو یہ سوچ کر اس کا دل کڑھ کر رہ جاتا کہ یہ بیگم لوگ اس کی چیزوں کو معمولی اور نکما بتاتی ہیں، ان کو کیا معلوم یہ چیزیں اس کے نزدیک کتنی پیاری اور بے بہا ہیں۔ یہ اس کے ملک کی فاقہ کش عورتوں کی دست کاری ہیں جن کو سخت محنت اور دیدہ ریزی کے بعد بھی شکم سیری نصیب نہیں ہوتی۔“

صولت آرا اس گھر کی بڑی بیٹی ہیں جن کی شادی کے سلسلے میں صفدر سے خریداری کا سلسلہ جاری ہے۔

طبقاتی امتیاز کو ہر صورت (حکومتی رٹ کی طرح) قائم رکھنے کا ذہنی اور عملی رجحان رکھنے والی اماں بیگم جن کے خیال میں یہ کئے نائے کے لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ ہر وقت ان کو گھسیایا جائے۔ وہ دولت کو سب سے بڑی قدر جانتی تھیں۔ ہر دکھ کا وہ اواس۔ ہر

رنج کی تسکین۔ اور مزے کی بات یہ کہ پہلے اس کی خاطر دل توڑ پھراس کے سہارے بلند معیار زندگی کا مزہ لگاتے رہے۔ (عجیب!) خیر! اپنی ذہنی روش کو درست جانتے ہوئے (آمرانہ خصوصیت) انہوں نے اپنی کم عمر خوب صورت ترین بیٹی کو اس کی مرضی، بلکہ پورے خاندان کی مرضی کے خلاف، عمر رسیدہ کرئل سے بیاہنے میں ذرا بھی ہرج نہ سمجھا۔

وہ صولت آرا، جس کو شادی کا تحفہ دینے کی غرض سے آئے صفدر لیوچو نے دیکھ کر سوچا۔ ”جیسے کسی نے گنگن کے تارے چرا کر چاول کے آٹے میں ملا دیے ہوں اور اس کو دودھ سے خوب گوندھ کر یہ دلہن بنائی ہو۔“

مگر وقت نے ثابت کیا کہ دل اپنے روندے جانے کے عمل کو یوں ہی نہیں جانے دیتا، صولت آرا بیگم جو شادی سے پہلے خاموش طبع اور مدبر سمجھی جاتی تھیں، جذباتی، نفسیاتی شکست و ریخت کا بری طرح شکار ہوئیں۔ اپنے رد عمل کو منجھد کر کے انہوں نے سمجھا تھا، زندگی کا کیا ہے، جیسے چاہے گزار دو۔۔۔ مگر زندگی تو اکثر ہماری مرضی کے برخلاف کھڑی ہوئی ملتی ہے۔

لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح سب ہی کرداروں کے ظاہر و باطن تک رسائی بدلتے ہوئے زمینی حالات کے مطابق منفی یا مثبت ذہنی رجحان کو بڑھنے والے کے فہم تک سہولت سے پہنچانے والے باجمال تخیل اور قلم کو داد دینا، خود اپنے آپ کو لطف پہنچانا ہے۔

نہی صولت اپنی متروک محبت زبیر کی شادی اپنی چچا زاد عصمت سے طے ہونے کی اطلاع پا کر اسے ”تخیل جو کہ“ قرار دیتی ہیں اور پھر شادی میں شرکت کا فیصلہ کرتے ہوئے خود گلای کرتی ہیں۔

”اماں بیگم بھی بس مجھ کو چھوٹی موٹی ہی سمجھتی رہیں۔ دل نہ ہوا، شیشہ ہو گیا۔ ارے! اب میں وہ کوئی

پہلی سی ناخبرہ کار اور سادہ دل صولت جہانگیر ہوں؟ اماں بیگم! یہ بیگم صولت آصف جاہ ہے، جو اب اپنے فیصلے خود کرتی ہے اور جس کے دل کے جذبات سے خود آصف جاہ تک کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ میری ٹھوکر میں زبیر ایسے دس انسان رہتے ہیں اور کیا مجال آصف جاہ کی جو سانس بھی لے سکے۔ ماڈرن سوسائٹی کا بس ایک یہی توفاندہ ہے۔“

صولت نے اپنی ماں کے ذہنی رجحان کا ورثہ سنبھال لیا اور اپنی خود مختار روش میں ان سے بہت آگے نکل گئیں۔

اپنے ساتھ ہونے والی زبردستی کو تسلیم کر کے اور اسی تسلیم کو اپنی ذات کے انکار کو جواز بنا کر پہلے بھائی اور پھر بہن کی خوشیوں کا سفاکی اور صفائی سے قتل کیا۔ بے وطنی کے شدید احساس میں گھرا ہوا، وطن ماں کی یاد کے سوز میں مبتلا، محنت مزدوری کے شب و روز، ایثار اور محبت سے پر دل اور قدیم چین کے اسرار میں لپٹی روح۔۔۔ صفدر لیوچو۔

صفدر مزدور طبقے کا نمائندہ ہے جو مسائل اور وسائل کی تقسیم کا اور اک رکھتا ہے، مگر اس پر شکوہ کناں نہیں، بلکہ قانع اور مصروف عمل ہے۔ (قوموں کی کامیابی کا راز)

”ارے ہٹاؤ! مجھے کیا معلوم۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے چین کے ہوں، اٹلی کے یا ہندوستان کے۔“

”سچ کہتا ہوں۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”بالکل ایک جیسی نیک چڑھی اور مغرور بیگمیں، زن مرید مرد، مرگھے کلرک، ٹونڈل اور عیار و کان دار، فاقہ کش، نیم برہنہ مزدور، بھگتے ہوئے فقیر، آوارہ کتے اور بچے اور ہسپتالوں میں ترپتے ہوئے مریض اور ان کے خون کا آخری قطرہ تک چوسنے والے خبیث ڈاکٹر۔“

کچھ حقیقتیں زمان و مکان کی قید سے آزاد۔ رانج اور قائم رہتی ہیں۔

صفدر کی بے وطنی کے احساس کو کم کرتی ہوئی گیتی

کی چینوں جیسی شکل، دن بدن بڑھتی ہوئی انیسیت اور زندگی بھر مختلف مقامات پر ہونے والا قدرتی میل اس تعلق کو آفاقیت عطا کرتے ہیں جو لیوچو اور گیتی کے درمیان تھا۔

انسان کے بنیادی مسائل اور دکھوں کا اشتراک اسے زمینی فاصلوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور یہ انسانی عظمت کا گہرا اور اک ہے، جو رنگ، نسل اور خطہ مختلف ہونے کے باوجود اپنائیت کا احساس عطا کرتا ہے۔

قدیم اور پر اسرار۔۔۔ تہذیب و تمدن کا امین۔۔۔ چین۔ وچسپ اور عجیب ہے کہ یہ کتاب ہماری اور چین کی آزادی سے پہلے کے دور کو بیان کرتی ہے، مگر محبت، دوستی کا وہی لازوال اور انمٹ نقش قائم کرتی ہے، جو بعد میں آنے والے دور کی سب سے بڑی سیاسی تاریخ اور زمینی حقیقت بنا!

ایک دلچسپ رخ اس کہانی کا یہ بھی ٹھہرا کہ خوب صورت چہروں کو مرکزی اہمیت دینے کے رجحان کے برخلاف، الطاف فاطمہ نے ”موٹی گدبدی گیتی“ کو ہماری آنکھوں کا تارا بنادیا۔

گیتی۔۔۔ بے ساختگی کے جوہر سے آراستہ، فطری سادگی سے بھرپور، شفاف آئینے جیسا دل رکھنے والی، جہاں کدورت تل بھر کو نہیں ٹھہرتی تھی، ماں کی ناپسندیدہ، باپ کے دل کے قریب، وادی کے لیے ہیرا، ارجمند کے لیے دل جلی، لیوچو کے لیے ”جونہ کرے تھوڑا ہے“ اور مسعود سوچ رہا تھا۔ ”بھئی! عجیب ہے یہ گیتی تو بالکل بلا ہی ہے۔“

حساس اور ہمدرد، تکبر اور خود نمائی سے مبرا۔۔۔ جس کے متعلق صفدر یا سین نے سوچا۔ ”تمہارے وجود اور شخصیت میں کیا بات ہے تم جہاں کہیں ہوتی ہو، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہاں سکون، طمانیت اور معصومیت کے سوا کچھ نہیں۔“

اور جب صولت اور اماں نے مل کر گیتی کے علم میں لائے بغیر، اس کے دل کی خوشیوں کا قصہ تمام پاک

کیا۔ معلوم ہونے پر اپنا غم غلط کرنے والی کے کوارٹر میں چلی آئی ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا گرم گرم پھلکا اور آلو ساگ کھایا۔ اور کچھ سوچتے سوچتے ہار سٹھار کے پیڑ تلے گورے بان کے کھٹوے پر سو رہی۔

”ماں نے دیکھ کر سوچا۔ ”یہ تو ساہو منہت بٹیا ہے۔ اس کے شریر میں تو جیسے گوتم مہاتما کی بے چین آتما برا جتی ہے۔ جیس۔ محلوں اور داسیوں سے بے زار سدھار تو اسی چنیا جیسی بٹیا کے شریر میں آسا ہوا۔ گیتی اور صفدر کے بعد جس کردار سے ہمیں محبت محسوس ہوتی ہے وہ ابامیاں ہیں۔ جن سے گیتی کو بے پناہ محبت ہے۔ وضع داری، آنکساری، حلیمی لے ہوئے دور و نزدیک کی قربت داری کا خیال رکھنے والے۔ ملازموں اور عام انسانوں کا اکرام کرنے والے، فیاض اور نرم دل، نفیس اور وجہ ابامیاں۔ اپنے بڑے بیٹے کے دور دیس جا بیٹھنے سے اس قدر مضطرب ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے!

ان کی موت نے جہاں گیتی کی زندگی میں زلزلہ بپا کیا۔ ماں بیگم کے طنطنے کے زوال کی اطلاع بھی کی۔

ابامیاں۔ جو اپنے اور اولاد کے درمیان خلیج کاغذ دار ماں کو سمجھتے تھے اور ان کے بے جا سخت رویے سے نالاں بھی تھے، لیکن گھر کے ماحول کو اختلاف اور جھگڑوں کی پرچھائیں سے بچانے کے لیے صبر کیے رہے۔ آخر کار۔ ان کا دل ان کا ہاتھ چھوڑ گیا۔ ”اے کاش! مجھے یہ سب کچھ میسر نہ ہوتا، مگر میرے بچوں اور ان کی ماں کے درمیان مفاہمت ہوتی۔ اے کاش! میں ان کے لیے اجنبی کا درجہ نہ رکھتا۔ کتنی سچی بات کسی ہے بیگم نے، گھٹلی کی خرابی کا مطلب یہ سمجھئے کہ جڑ میں روگ ہے اور جڑ کی خرابی کی بہت سی وجہ ہو سکتی ہیں۔“

اب یہ ان کی فطری آن بان اور خاندانی تمکنت تھی کہ وہ اپنی پسائی اور شکست کو بڑی بہادری اور خوبی سے نبھا رہے تھے۔ ان کے ہنسنے بولنے اور اپنے

مشاغل میں محویت دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس شخص کے آئینہ دل میں ایک بہت بڑی دراڑ پڑ چکی ہے۔ اس کے خواب بکھر گئے ہیں اور اس کی زندگی میں ایک شدید خلا اور بے اعتباری پیدا ہو گئی ہے۔

”بڑا بٹیا ہی تو انسانی زندگی کا سنگ میل ہوتا ہے وہ کھرا اور کھٹکھٹاتا ہوا اسکے جو بازار میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ جو کھوٹے پیسے کی طرح صندوقچے میں پڑا وقت پر کام آنے کا انتظار نہیں کرتا۔ اور جو وہی وجہ اور سبب بتائے بغیر روٹھ جائے تو انسان کی کمر نہ ٹوٹ جائے دل نہ بیٹھ جائے“ ان کی روشن اور غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ انہوں نے کھڑکی کے باہر دیکھا اب کوئلوں نے کوئنا شروع کر دیا تھا اور آموں پر بور آ رہا تھا۔ جامنیں کالی ہو چکی تھیں اور بیلا چنبیلی پھول رہے تھے۔ ان کا دل اس دنیا سے سرد ہوتا جا رہا تھا۔ ایک مغموم سی خاموشی اور سپردگی ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔“

ابا کے اچانک انتقال نے ہر فرد اور ہر ذہن کو الگ طرح سے متاثر کیا اور سب نے اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق اس صدمے کو سہا۔ صولت آرائے گھر کا انتظام سنبھال لیا کہ ماں بیگم بالکل ہی کمزور ہو گئیں۔ گیتی کی ذہنی تنہائی اور اعصابی دباؤ کی لفظی صورت گری۔ انتہائی خوب!

دل کو گداز کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت رکھنے والی اس خوب صورت روائی کے کیا کہنے! بختیار، شہریار کا چھوٹا بھائی۔ جو ابھی زیر تعلیم تھا۔ بھائی کا دور دیس ہوتا، باپ کی داغی جدائی اس اچانک صدمے نے اسے بڑا اور ذمے دار کر دیا۔ چند ہی دنوں میں اسے ذہنی بلوغت کے مدارج قبل از وقت طے کرنا پڑے۔ جو یقیناً ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ بختیار نے اپنے ابا کی وضع داری، نرمی اور محبت کا ورثہ سنبھال لیا۔ دیکھیے! اس کی ایک خود کلامی۔

”ہر ایک چیز سے زیادہ اہمیت ان کاغذوں ہی کو دی جا رہی ہے۔ نہ مرنے والے کے متعلق سوچو اور نہ

زندوں کی طرف دیکھو۔ ان سے زیادہ ضروری اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ یہ ابامیاں کے بنک کے کاغذات ہیں۔ ان کے باغوں اور اراضی کے فائل اور ہمارے ناموں کی پالیسیوں کے کاغذات اور واقعی ہر زندہ اور مردہ انسان سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ تو انسان کو دوسروں کی نظر میں اہم بناتے ہیں۔“

اور کاغذات پر توجہ دینے کو صولت نے عین اس وقت کہا، جب بختیار، بلکتی، چلاتی ہوئی گیتی کو تسلی دے رہا تھا۔

”پچھتاوے اور غور و فکر اسی وقت کار آمد ہوتے ہیں جب وہ انسان کی زندگی میں غلط اقدامات سے پہلے آئیں اور صلاح دیں۔ یہ تھوڑی کہ وہ انسان کے پاس اس وقت آئیں جب جھکا جھک کر ہوئی ریل اس کو گھر سے پانچ اسٹیشن آگے پھینچ لائے۔ اس وقت پچھتاوے، نتائج اور ہوش مندی یکے بعد دیگرے ملا متوں کے طوق لیے آگے بڑھیں تو یہ انسان کو دیوانہ ہی بنانا ہوتا!“

یہ گیتی ہے۔ جو ماں بیگم کے بمبئی جانے پر صولت کی بڑھتی ہوئی سختی، بے مہری اور حد یہ کہ اس اکبر سے میل ملاپ شروع کرنے لگی، جس نے گیتی کے متعلق غلط سلط باتیں پھیلا کر گھر کا ماحول مکدر کر دیا تھا۔ تب آن کی آن میں گیتی نے بغیر اطلاع کے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور لاہور کی طرف چل دی، جہاں اس کا کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ یہ دور گیتی کے لیے صبر آزما، کشن اور سنجیدہ ہو جانے کا سبب ثابت ہوا۔

”لوگوں نے تو انسانوں کی زندگیاں تلخ کر رکھی ہیں۔ عجیب بونے ہوتے ہیں۔ ان کو در حقیقت اچھائی یا برائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ تو صرف اس بات سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ انہوں نے جن باتوں کو اچھایا برا قرار دیا ہے، افراد ان پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔“ یہ گیتی ہے جو صفدر لہوچو کے کچھ سمجھانے پر اپنی

رائے دے رہی ہے۔ ”لاہور میں یا سٹل کے علاوہ وہ چاچا جی کے ہاں ٹھہرنے کی مجاز تھی۔ چاچا جی گیتی کو کیوں پسند تھیں؟ یہ وہ خود نہیں بتا سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ تو اپنے مراق میں مبتلا رہتی تھیں۔ دن رات ہر ہر چیز کو پاک کیا کرتیں۔ دھنیا مرچ تک دھو ڈالتیں۔ نوکر کی جان بھی غضب میں رکھتیں اور جب چیزوں کو دھونے پاک کرنے سے فرصت ملتی تو وہ اپنے مفروضہ امراض کی فکر میں گھلنا شروع کر دیتیں یا پھر جانماز پر بیٹھی کلام پاک کی تلاوت کیا کرتیں۔ گیتی کبھی کبھی سوچا کرتی۔ اگر چاچا اپنے مراق میں اس درجہ مبتلا نہ ہوتیں تو ان کا گھر کبھی اتنا پرسکون نہ ہوتا۔ ان کو بھی تیرے میرے قصوں سے فرصت نہ ملا کرتی اور یہ بھی بڑی مین میخ نکالنے والی عورت ہوتیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوش مند ہونے سے تو اچھا ہے کہ انسان تھوڑا سا جگہ سے کھسکا ہوا ہو۔“

اوسر، بختیار کو گھر پہنچنے پر پتا چلا کہ گیتی گھر سے غائب ہے۔ بغیر اطلاع کے۔ تو وہ ہتھ سے اکھڑ گیا۔ ”یہ تو میں نہیں جانتا کہ کس وجہ سے؟ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس معاملے میں مجرمانہ حد تک بے پروائی برتی گئی ہے۔“

ماں سے سوال جواب کے دوران اس نے محسوس کیا کہ ماں بہت کمزور محسوس کر رہی ہیں تو وہ چپ ہو رہا۔

”ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخیں مار مار کر روئیں اور اس سے کہیں کہ تم اس طرح میرا لحاظ کر کے خاموش نہ ہو۔ میں بجا طور پر تمہاری ملا متوں کی مستحق ہوں۔ میں نے تم میں سے کسی ایک کو بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ میں نے صولت سے لے کر ہر ایک کے ساتھ نا انصافی کی ہے اور مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدرت نے یا خود صولت نے مجھ سے اس کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کا انتقام لیا ہے۔“

غلط فیصلوں اور ساتھی کی بے وقت جدائی نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور شاہی طنطنے

سے لے کر ان کی ذہنی شکست خوردگی کا احوال کس خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر وہی کہ لفظوں میں روح پھونک دی ہے۔

جلنے۔ کچھ منظر بھی دیکھ لیجئے۔ اور منظر نگاری تو ہر جگہ ہر قدم پر خوب ہے۔ کمروں، برآمدوں کے نقش، اجلی سفید چاندنیوں کے تذکرے۔ پاندان، گھونچ، تخت، کیاریاں غرض کہ ہم ہر جگہ خود کو محسوس کر سکتے ہیں۔

”مولسوی اور چمپا کی بھینی بھینی خوشبو سے باغ بسا ہوا تھا۔ کامنی کی چھتھار جھاڑیوں پر ستارے سے دیک رہے تھے۔ مولسوی کے گھنے سائے تلے بھینی بھینی کٹوریوں جیسے نازک پھولوں کا پھوٹا ہوا تھا اور بانس کے جھنڈ میں بے شمار پستی پستی کوئلیں پھوٹ رہی تھیں۔ دور کہیں پیہا بول رہا تھا۔“

”پوریج کے خوب صورت دروں کے نازک نازک کھنبوں پر گلابی رنگ کے نازک اور خوب صورت پھولوں کی جھومر سے لٹک رہے تھے اور ان کے عقب میں لان کا سبزہ چمک رہا تھا جو اس گرمی میں بھی شاداب اور نرم نظر آ رہا تھا۔ آم اور پچی کے مضبوط پیڑ گرم ہوا میں جھوم رہے تھے۔ بھیکے ہوئے تھالوں میں کھڑے ہوئے قطار در قطار گلابوں میں سفید زرد اور گلابی پھول کھل رہے تھے۔ پھانک پر چڑھی ہوئی زرد چنبیلی میں اتنے پھول آئے تھے کہ پتوں کی کاپی کاپی سی ہریالی ان کی زردی میں چھپی سی جا رہی تھی جیسے کالی رات میں ستارے جگمگا رہے ہوں۔“

یہ منظر محض منظر نگاری کا حصہ نہیں بلکہ دل کو گداز کر دینے والی، اختیار کی سوچ کا منظر بھی ہے۔ جو اخراجات میں تخفیف کی خاطر اس کے پیش نظر ہے۔ مالی کی محبت، خدمت اور اس کے عیال کی اس گھر سے وابستگی کا گہرا احساس اسے ایسا سوچنے سے بھی روک دیتا ہے کہ وہ کسی ملازم کو محض اخراجات میں کمی کی خاطر فاریع کر دے۔

اختیار نے گیتی کو ڈھونڈ نکالا اور گیتی گھر واپس بھی آئی۔ اسی دوران جنگ عظیم بند ہونے کے ساتھ ہی

شہر یار کی موت کی تصدیق بھی ہو گئی اماں اپنے پیارے بیٹے کا انتظار ہی کرتی رہ گئیں جس کی سب ہی فرمائشیں پوری کرتی تھیں۔ لیکن بیوہ چچی کی بیٹی عصمت کو بھونانے سے مطلق انکار نے شہر یار کے دل کو ایسا گھائل کیا جس کا شاخسانہ ابا کی دل گرفتگی اور پھر شہر یار کے دنیا سے منہ موڑ لینے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی فسادات شروع ہوئے اور خوف و ہراس، دہشت کی فضا میں لگتے ہوئے گھر سے گیتی اور اماں کو مالی نے بمشکل پاکستان کی طرف روانہ کرنے کے لیے جیب میا کی۔ مالی کے ہندو ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال بھی دل گداز رہی۔ بغیر کسی غیر معمولی اظہار کے اپنی سلاست کو جاری رکھتے ہوئے الطاف فاطمہ نے تقسیم کے وقت کے مسائل کو جس خوبی سے قلبند کیا۔ وہ

ان ہی کا خاصہ ہے۔ بے سرو سامانی، بھائی بہن کے آسروں کے بغیر گیتی نے نئی زندگی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی کہ فسادات نے بھائی بہنوں، رشتے داروں کو بھی تقسیم کر دیا۔ یہی وہ دور تھا جب اماں اور گیتی کا ذہنی بعد دور ہوا۔

اسی شہر میں صفدر لیو جو بھی موجود تھا۔ صفدر کے پاس چین کے کسی فلسفی کی کتاب تھی۔ جس کو پڑھ کر وہ اپنی روح کو شانت کرنے کی سعی کرتا رہتا تھا۔ اس کتاب سے دلچسپ اقتباسات کتاب کا حصہ ہیں اور کتاب کی شان کو چار چاند لگاتے ہیں۔

ایک چینی نظم کا ترجمہ آپ بھی پڑھیے۔ مجھے اپنے نوشتہ تقدیر کو

بہر نوع برداشت کرنا چاہیے
بفرض و عناد سے شکستہ دل بیمار کی ساری رنجوریاں
بالآخر سکون پذیر ہو ہی جاتی ہیں
موت، کلفتیں اور ان کا مداوا

بھی اپنے اپنے وقت ہی سے آتے ہیں
جلے۔ صفدر کی خود کلامی کی طرف اور خود کلامی اس کتاب کے سب ہی کرداروں کا حصہ ہے۔ جس کے ذریعے ہمیں اس کے احساس تک رسائی ملتی ہے

خود کلامی۔ ذات کی پہچان کا راستہ خود کلامی۔ کردار نگاری کا خوب صورت ترین حصہ۔! ”جب تم چھوٹی سی تھیں، اس وقت سے لے کر میں نے تم سے نہ جانے کتنی بے شمار باتیں کی ہیں، لیکن فقط ایک جملہ کہنے کے لیے میں ہمیشہ تر سنا رہا ہوں۔ تمہارے سامنے کہنا تو ایک طرف میں نے اس جملے کو کبھی باضابطہ اور منظم طور پر سوچنے کی بھی ہمت نہیں کی اور اس جملے کو تنہائی میں کبھی خود سے بھی نہ دوہرایا لیکن آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آج میں خود سے بھی کہوں گا اور اس صفحے پر لکھوں گا بھی۔ کو کو! مجھے تم سے محبت ہے!“

مجھے تم سے محبت بھی ہے اور میں انسان بھی ہوں۔ جب ہی تو اس دن کافی ہاؤس کے دروازے پر تمہیں اس بے حد شان دار اور عمر رسیدہ فوجی کے ساتھ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے دنیا کی ہر چیز دھیرے دھیرے دور سرکتی جا رہی ہو جیسے زمین نے اپنا محور چھوڑ دیا ہو اور پیروں تلے سے نکل بھاگی ہو۔

مارگریٹ نے دستک دی، اس لیے کہ وہ باریابی کی آرزو مند تھی اور رسائی نہ پائی۔ میں نے دستک نہیں دی، لیکن اس لیے نہیں کہ میں رسائی چاہتا تھا۔ مجھے اپنا مقوم معلوم تھا۔ رسائی کے اور میرے درمیان دیوار چین سے بھی زیادہ سنگین اور طویل دیوار حائل تھی۔ انسان کو اپنی کسی بات اور چیز پر اختیار نہیں ہوتا حتیٰ کہ دل جیسی پناہ اور کمزور شے بھی اس سے سر تابی کرتی ہے۔“

تو یہ تھا صفدر۔ حساس دل اور باشعور ذہن جس کے ضبط کا امتحان بن کر رہے۔

اور اس نے دستک نہیں دی!
اس کا رکھ رکھاؤ، فکری شعور اور سب سے بڑھ کر مثالی ضبط دل۔ ہمارے دل میں اس کے لیے ہمدردی محبت اور پھر عزت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

آمنہ مفتی نے جب کہا تھا میں نے دستک نہ دو

چالیس بار پڑھی ہے۔ مجھے حیرت تو ہوئی تھی، لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ واقعی ایہ کتاب چالیس مرتبہ بھی پڑھی جاسکتی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ شائستگی، بیان کی روانی۔۔۔ یعنی سادگی اور پرکاری، میٹھی اردو۔۔۔ ریل کا سفر، خطوط کی اہمیت، باوجود نوکر چاکر کے تمدن۔۔۔ سلامی کڑھائی اور کھانے پکانے کی سوجھ بوجھ رکھنے والی لڑکیاں، نماز کی باقاعدگی، اپنے خدمت گاروں کا احترام اور ان کی وفا۔۔۔ خوب صورت مناظر اور فطری کردار نگاری سے جی یہ کتاب آج بھی تازہ فکر کی مانند متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں ماحول کی خوشبو، اپنائیت کا گہرا احساس اور احساس کی فطری سادگی رچی بسی ہے۔

نام مشین، آپ کے تخیل کے سوار ہونے کی منتظر ہے!

فصل غم کا گوشوارہ

وضعہ جمیل

تقریباً 300 روپے



مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ جو دل میں آتا ہے، کر ڈالتی ہیں اب اس کی زد میں کوئی آتا ہے تو آئے۔ کوئی ناراض ہوتا ہے تو بھلے سے ہو۔ خواہ وہ اس کا محسن ہی کیوں نہ ہو۔

جرار رضوی کا شمار بھی میرا کے محسنوں ہی میں ہوتا ہے۔ میرا کی پہلی فلم ”چیف صاحب“ تھی، مگر اس میں کامیابی کا سارا کریڈٹ خوب اداکارہ نیلی لے گئیں تو پھر یہ جرار رضوی ہی تھے جنہوں نے میرا کو کئی مرتبہ چانس دیا اور شہرت کی بلندیوں پر لے گئے۔ یہی جرار رضوی ایک بیوی پارلر کا افتتاح میرا کے ہاتھوں کرانا چاہتے تھے پارلر ان کی ایک قریبی دوست کا تھا اور اس کی افتتاحی تقریب کے انتظامات جرار رضوی ہی نے سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرا کو مہمان خصوصی بننے کی دعوت دی۔ میرا نے یہ دعوت قبول کر لی۔ پارلر کے افتتاح والے دن سارے مہمان آگئے، مگر میرا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ موسم کے تیور خراب ہو گئے اور بارش برسنے لگی۔ جرار رضوی نے میرا کو فون کیا تو میرا نے تقریب میں مہمان خصوصی بننے کے لیے پیسوں کا مطالبہ کر دیا۔ (پرائڈ آف پرفارمنس ملنے کے بعد ”پراؤڈ“ تو ہونا ہی ٹھانا!) جرار رضوی نے میرا کو سمجھایا کہ مہمان خصوصی پیسے نہیں لیتے۔ (بلکہ دیتے ہیں۔) خیر! میرا بغیر پیسے لیے اپنا قیمتی وقت دینے پر راضی ہو گئیں اور کہا کہ ”تھوڑی دیر میں پہنچتی ہوں۔“

میرا کا انتظار کرتے خاصا وقت گزرا تو مہمانوں کے تیور موسم سے زیادہ خراب ہو گئے اور وہ بادلوں سے زیادہ گر جے برسنے لگے۔ جرار رضوی نے ایک مرتبہ



افتتاح

معروف اداکارہ میرا کو پرائڈ آف پرفارمنس ملے اب تو خاصا وقت گزر چکا ہے، مگر وہ ابھی تک ہواؤں میں اڑ رہی ہیں۔ ان دنوں وہ بھارت میں مقیم ہیں اور سنا ہے کہ وہ وہاں بدنام زمانہ بھارتی پروگرام ”بگ باس“ میں شرکت کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ (ہائیں! تو ”بگ باس“ کا اگلا سیزن مزاحیہ ہے کیا؟) یعنی یوں سمجھیے! کہ ریمہ کی شادی کے بعد اب میرا نے ویٹا کے نقش قدم پر پاؤں دھر دیے ہیں۔ (گویا جو ویٹا کرتی ہیں وہی میرا کرتی ہیں۔) ویسے من موچی اور موڈی میرا چھی بس اپنے مزاج کی ہی ہیں۔ لالباہی پن تو جیسے ان کے

پھر میرا کو فون کیا۔ اس مرتبہ فون کسی شخص نے اٹھایا اور گاڑی خراب ہونے کا بہانہ بنا کر فون رکھ دیا۔ جرار رضوی نے میرا سے قطع تعلق کا اعلان کیا اور پارلر کا افتتاح دردانہ رحمان اور صلہ حسین سے کرا لیا۔ (گویا میرا اتنی بھی لالباہی نہیں، بلکہ خاصی ذہین واقع ہوئی ہیں۔ جانتی ہیں کہ پارلر کا افتتاح کرتے اتنی شہرت کہاں ملنی تھی، جو پارلر کا افتتاح نہ کر کے ملی ہے۔)

انکار

بھارتی فلم ساز ہمیش بھٹ کی دور کی نظر کچھ زیادہ ہی تیز ہے شاید! جب ہی تو ان کی نظریں ہماری اداکاراؤں پر گڑی رہتی ہیں۔ (اداکاری کرانے کے لیے بھی۔۔۔ آپ بھی ناں بس!) کبھی انہوں نے میرا پر نظر جمائی تو کبھی مونالیزا کی آنکھوں میں کجرا ڈالا۔ (فلم ”کجرارے“ میں بھی۔۔۔ آپ کی سوچ کو ایک بار پھر سلام ہے۔) لیکن جناب! ضروری نہیں کہ ہمیش بھٹ ہر مرتبہ کامیاب ہو ہی جائیں۔ معروف اداکارہ نادیہ خان کو فون اداکاری سے ”بندھن“ توڑے ایک مدت گزر گئی، مگر ان کی



اداکاری ہمیش بھٹ نے جانے کہاں دیکھ لی کہ ان کو ایک فلم کی پیش کش کر ڈالی۔ (ان کے گھر گئے ہوں گے) نادیہ خان نے ان کی یہ پیش کش فوراً ”ٹھکرا دی اور کہا کہ میری فیملی کی روایات مجھے فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتیں۔ (ہاں! صرف لی وی شوژ کو فلم سمجھنے کی اجازت ہے۔) نادیہ نے مزید کہا کہ میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی، جو میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتی۔ (تو پھر اپنے بعض پروگرام گھر والوں کے ساتھ ”کھڑے“ ہو کر دیکھے ہوں گے۔)

یوں نادیہ نے ہماری ان اداکاراؤں کے لیے ایک مثال قائم کی ہے، جو ہر بھارتی آفر پر دوڑی دوڑی جاتی ہیں۔

(میش جی بھی نوٹ کر لیں کہ ہماری ہر چیز قابل فروخت کا ٹیک نہیں لگا ہوا۔)

ہدایت

ثقافتی و جغرافیائی لحاظ سے دنیا کئی قوموں کا مجموعہ ہے، تاہم ہمارے خیال میں دنیا میں صرف دو قومیں رہتی ہیں۔ ایک مسلم، دوسری غیر مسلم۔ (آپ چاہیں تو ہمیں مفکرین میں شمار کر لیں۔ ہماری کیا مجال جو ہم برا مانیں۔) غیر مسلم ہمیشہ سے مسلمانوں کو مٹانے کے



موسم کے پیکوان

خالدہ جیلانی

حسب ذائقہ
حسب ضرورت

نمک
تیل

ترکیب :

قیمے کو سل پر بہت باریک پیس لیں۔ تمام مسالے کوٹ کر اس میں ملا دیں۔ انڈے بھی پھینٹ کر ڈال دیں۔ اچھی طرح مکس کر کے تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ پندرہ منٹ دوبارہ گوندھیں اور ہتھیلی پر رکھ کر چوڑے اور بڑے کباب بنائیں اور گہرے تیل میں تل لیں۔

رانتے کے ساتھ مزے دار پشوری چلی کباب پیش کریں۔

دھواں کباب

پشوری چلی کباب

ایک کلو
ایک کھانے کا چمچہ
دو عدد
دو عدد
دو عدد
ایک کپ
ایک کھانے کا چمچہ
دو کھانے کے چمچہ
ایک کھانے کا چمچہ
آدھا چائے کا چمچہ
آدھا چائے کا چمچہ

اجزا :
قیمہ
لسن پیسٹ
انڈے
پیاز
نمک
کارن فلور
ثابت دھنیا
اناروانہ
سرخ مرچ
میٹھی دانہ
جا نقل جاوتری

ہیں۔“
(اب یہی صدا ہر ڈرون حملے کے وقت ہمارے مفاد پرست ٹولے کی طرف سے آتی ہے۔ کاش! تھوڑی سی ہدایت اس ٹولے کا نصیب بھی ٹھہرے۔ آمین)
کچھ ادھر ادھر سے

ہیلری کلنٹن نے رحمان ملک کے بیان کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ رحمان ملک کو ہیلری کلنٹن سے صرف ہیلو کہنے کا موقع دیا گیا۔ 2 منٹ کے دوران یہ میں رحمان ملک سے عافیہ یا ڈرون حملوں کے بارے میں کوئی مذاکرات نہیں ہوئے۔

(منظر اعجاز۔ قلم رو)

ایک فون کال پر ڈھیر ہو جانے والے جنرل مشرف کس قدر بہادر تھے۔ یہ دنیا نے دیکھ ہی لیا ہے۔ البتہ وہ ابن الوقت بہت تھے۔ نواز شریف کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کے ابا جی کے حضور پیش ہوئے تھے۔ سو تو اس قدر ابن الوقت تھے کہ ترقی پانے کے لیے جنرل ناصر جب وہ این ڈی یو میں تھے، کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ دوسری جانب صورت یہ تھی کہ افطاری کے وقت کھجور ہاتھ میں پکڑ کر کہتے تھے کہ مذہب کے ساتھ اتنا ہی ہے۔

(میاں منیر احمد۔ پکھری)

ہم ملالہ کا رونا رو کر اپنا ریاستی فالج چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ریاست اور ریاست کی پارلیمنٹ بلال کھر اور فاخرہ جیسے واقعے پر خاموش رہے گی تو پھر طالبان کو ملالہ یوسف زئی کو کوئی مارنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

کیا ان دونوں واقعات میں صرف کراچی اور سوات اور کلین شیواور داڑھی کا فرق نہیں؟
(جاوید چوہدری۔ زیر پوائنٹ)



درپے ہیں۔ (نادان نہیں جانتے کہ اسلام مٹنے کے لیے نہیں آیا۔) اس ضمن میں وہ مسلمانوں کو باطل اور وحشت گرد قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی ڈراما تیار کرتے رہتے ہیں، تاہم اس کا اسکرپٹ اتنا کمزور ہوتا ہے اور اس میں اتنے جھول ہوتے ہیں کہ وہ ڈراما ہمارے ہاں کے میر جعفر اور میر صادق کی ہر ممکن و غیر ممکن مدد کے باوجود بھی بری طرح فلاپ ہو جاتا ہے۔ ایک اسکرپٹ کا تب تقدیر بھی لگھتا ہے جس میں کوئی جھول نہیں ہوتا اور اسے کامیاب کرانے کے لیے کسی میر جعفر، میر صادق کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

معروف فرامیسی گلوکارہ دیام سن کی ایک دوست مسلمان ہیں۔ ایک دن وہ دیام سن کے ساتھ تھیں۔ ایسے میں نماز کا وقت ہو گیا تو انہوں نے دیام سن سے کہا کہ میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ دیام سن نے بھی ان کے ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دیام سن نے اپنی مسلم دوست کے ساتھ سجدہ کیا تو پھر انہیں دیگر ہزاروں سجدوں سے نجات مل گئی۔ دیام سن سکون کی تلاش میں منشیات اور مسکن دواؤں کا استعمال کرتی تھیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ اس سجدے سے قبل انہیں اس قدر سکون کسی اور شے میں نہیں ملا تھا اور نہ ہی کبھی اتنا خوش گوار احساس ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد دیام سن نے قرآن شریف اور دیگر اسلامی کتب کا مطالعہ کیا۔ انہیں احساس ہوا کہ اسلام ایک سچا اور امن و روا داری کا مذہب ہے، چنانچہ دیام سن نے اسلام قبول کر لیا۔ (سبحان اللہ!) آج دیام سن تمام شرعی احکامات پر خندہ پیشانی سے عمل کرتی ہیں اور باقاعدہ حجاب بھی لیتی ہیں۔

(بے شک! اللہ جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ اور جس کی قسمت کھوٹی ہو، وہ رگوں میں مسلمان خون لیے پھرنے کے باوجود بھی مسلمانوں پر ڈرون حملے کراتا ہے۔ اوباما کے پر سر اقتدار آنے پر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور بعض پاکستانی علاقوں سے صدا گونجی تھی ”مقدم بڑھاؤ اوباما! ہم تمہارے ساتھ

اجزا :

قیمہ
پیار بڑی
لہسن اور ک پیسٹ دو کھانے کے چمچے
زیرہ
ثابت دھنیا
کٹی سرخ مرچ
بیس
ہری مرچ
نمک
تیل

ترکیب :

قیمہ مشین سے باریک نکال لیں۔ زیرہ اور دھنیا کوٹ کر، بیس بھون کر پیاز تیل میں نرم سی فرائی کر کے قیمہ میں ملا دیں۔ نمک، کٹی سرخ مرچ، لہسن اور ک پیسٹ اور ہری مرچ بھی کوٹ کر قیمہ میں اچھی طرح مکس کر کے رکھ دیں۔ قیمہ پر کوئلہ دھکا کر رکھیں اور ڈھکن بند کر دیں۔ بیس منٹ بعد اس کے کباب بنائیں۔ (قدرے کوٹنے کی شکل میں) اور فرائی کر لیں۔
رانتے یا اہلی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

بہاری مسالا بونی

اجزا :

گوشت
لہسن اور ک پیسٹ
پیاز
ہرا دھنیا
ہری مرچ
دہی
بہاری بونی مسالا
سجری پاؤڈر
نمک

ایک کلو

دو کھانے کے چمچے
دو عدد
تھوڑا سا
چھ عدد
آدھا کپ
چار کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
حسب ذائقہ

تیل
ترکیب :

گوشت کی بونیاں بنالیں اور دھو کر اچھی طرح خشک کر لیں۔ پیاز، ہری مرچ اور ہرا دھنیا باریک کاٹ کر اور یقہ تمام مسالے گوشت میں مکس کر کے تین سے چار گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں، پھر سینوں پر چڑھا کر کوئلوں پر سینکھیں۔ تھوڑا تھوڑا تیل لگاتے جائیں یا ہلکے تیل میں فرائی کر کے کوئلہ کا دم دے دیں۔
لچھے دار پیاز اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ہریانہ کی یخنی بریانی

اجزا :

گوشت
چاول
ثابت گرم مسالا
لہسن کے جوے
ثابت اور ک
سونف اور زیرہ
سونف
زرور رنگ
بریانی مسالا
نمائز
پیاز
ہری مرچ
نمک
تیل

ڈیڑھ کلو

ایک کلو
تین کھانے کے چمچے
دس عدد
دو انچ کا ٹکڑا
دو کھانے کے چمچے
ایک کھانے کے چمچے
دو چٹکی
دو کھانے کے چمچے
چار عدد
چار عدد
چار عدد
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

ترکیب :

ململ کے کپڑے میں پیاز سمیت تمام ثابت مسالے ڈال کر بوتلی بنالیں، پٹیلی میں گوشت، پوٹلی اور نمک ڈال کر رانتے پانی میں چڑھا میں کہ گوشت گل جائے اور چار گلاس یخنی بھی بچ جائے۔ بعد میں گوشت اور یخنی الگ کر لیں۔ دوسری پٹیلی میں تیل

گرم کر کے دو پیاز سلائس میں کاٹ کر سنہری کر لیں۔ الگ کیا ہوا گوشت اور لہسن اور ک پیسٹ ڈال کر کچھ دیر بھونیں، پھر باریک کٹے ہوئے نمائز، دہی، بریانی مسالا اور ہری مرچ ڈال کر بھونیں۔ یخنی ڈال کر بھیکے ہوئے چاول شامل کریں۔ درمیانی آنچ پر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ دم پر رکھ کر زرد رنگ ڈال دیں۔ چاہیں تو بریانی اسپنس کے چند قطرے بھی ڈال سکتی ہیں۔

ایرانی تکه

اجزا :

گوشت
پیاز گرم مسالا
پیاز دھنیا
لیموں کا رس
سرکہ
نمائز کچیپ
پیاز
پسی سرخ مرچ
نمک
تیل

ایک کلو

آدھا چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
دو کھانے کے چمچے
آدھا کپ
ایک کھانے کا چمچ
ایک عدد
ایک کھانے کا چمچ
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

ترکیب :

ایک پیالی میں لیموں کا رس، گرم مسالا اور دھنیا ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ فرائنک پین میں تیل گرم کر کے پیاز مل کر نکال لیں۔ پھر اسی تیل میں اوپر والا سرکہ پھر نمک اور سرخ مرچ ڈال کر بھونیں۔ نمائز کچیپ ڈال کر ساتھ ہی تلی ہوئی پیاز بھی شامل کر کے تھوڑی دیر بھونیں اور جو لمبے سے اتار لیں۔ گوشت کی پسندے بونی بنالیں اور اچھی طرح دھو کر سرکے اور اوپر والے مسالے میں مکس کر کے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر یخنی میں پرو کر کوئلے پر سینکھیں۔ ہلکا ہلکا تیل لگاتے جائیں۔
لچھے دار پیاز اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

اسپیشل چانپ

اجزا :

چانپ
کارن فلیکس
کارن فلور
انڈے
میدہ
پسی کالی مرچ
ہری مرچ
ثابت لہسن
ثابت اور ک
اجینو موتو
نمک
تیل

ترکیب :

چانپوں میں لہسن اور ک، کالی مرچ، ہری مرچ اور نمک ڈال کر ابالیں۔ چانپیں گل جائیں تو ٹھنڈی ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں کارن فلور، اجینو موتو، انڈے، میدہ، نمک اور ایک کھانے کا چمچ تیل ڈال کر گاڑھا پیسٹ بنالیں۔ کارن فلیکس کو چورا کر لیں۔ چانپوں کو آمیزے میں ڈبو کر کارن فلیکس کا کوٹ کر لیں اور گرم تیل میں مل لیں۔
مزے دار اسپیشل چانپ تیار ہے۔ رانتے کے ساتھ پیش کریں۔

ہانڈی گولا کباب

قیمہ

کٹی لال مرچ
سیخ کباب مسالا
کچا پیٹنا
ہری مرچ پسی ہوئی
بریڈ سلائس
بھنے ہوئے جینے

آدھا کلو

ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
چھ عدد
دو عدد
دو کھانے کے چمچے

حضرت ہاجرہ علیہ السلام نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

یہ خوش خبری آپ علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے کیونکہ عربوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے سرداری کا مقام حاصل ہوا اور مشرق و مغرب کے سب ممالک ان کے قبضے میں آئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو وہ علم نافع اور عمل صالح عطا فرمایا جو پہلے کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس امت کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام رسولوں سے افضل و اشرف ہیں۔ یہ آپ کی رسالت کی برکت اور آپ کی شریعت کے کمال کی وجہ سے ہے اور اس لیے بھی کہ آپ تمام جہان والوں کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔

جب حضرت ہاجرہ علیہ السلام واپس آئیں تو ان کے ہاں ”اسماعیل علیہ السلام“ پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیالیس (86) سال تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام (اپنے بھائی) اسحاق علیہ السلام سے تیرہ سال پہلے پیدا ہوئے۔

جب ہاجرہ علیہ السلام کے ہاں اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اس سے سارہ علیہ السلام کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ انہوں نے حضرت خلیل علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ انہیں ان کے سامنے نہ رکھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں اور ان کے بیٹے کو لے کر چلے گئے۔ انہیں وہاں ٹھہرا دیا جہاں آج کل مکہ مکرمہ کا شہر آباد ہے۔ اسماعیل علیہ السلام اس وقت دودھ پیتے بچے تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت

اہل کتاب کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پاک باز اولاد کی دعا فرمائی۔ اللہ نے آپ کو اس کی خوشخبری دی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت المقدس میں رہتے بیس سال ہو گئے تو سارہ علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا۔ ”رب نے مجھے اولاد سے محروم رکھا ہے، آپ میری لونڈی (ہاجرہ علیہ السلام) کے پاس جائیں شاید اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے اولاد عطا کر دے۔“

جب انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو وہ (ہاجرہ علیہ السلام) دے دیں تو ابراہیم علیہ السلام ان کے پاس گئے اور وہ امید سے ہو گئیں۔ حضرت سارہ کو ان کی کوئی بات بری لگی اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا۔ ”تم جو چاہو کرو۔“

حضرت ہاجرہ علیہ السلام خوف زدہ ہو گئیں اور بھاگ کر ایک چشمہ کے پاس چلی گئیں۔ انہیں ایک فرشتہ ملا۔ اس نے کہا۔

”خوف نہ کر، تیرے ہاں جو بیٹا پیدا ہونے والا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بہت خیر و برکت عطا فرمائے گا۔“

اس نے انہیں واپس جانے کا حکم دیا اور خوش خبری دی کہ

”ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا اور وہ اس کا نام ”اسماعیل“ رکھیں گی، وہ گور خر کی طرح آزاد مرو ہو گا، اس کا ہاتھ سب پر ہو گا اور سب کے ہاتھ اس کے ساتھ ہوں گے اور وہ اپنے بھائیوں کے سارے ملک کا مالک ہو گا۔“

ترکیب :

دودھ کو پکنے کے لیے رکھ دیں۔ ابال آجائے تو پھٹکری ڈال دیں۔ دودھ پھٹ جائے تو اتار لیں اور نتھار کر پیئر بنالیں۔ اب اس میں کھویا اور میدہ ملا کر ایک گھنٹہ تک خوب مکس کریں۔ جتنا زیادہ اچھا مکس کریں گی، اس کا رس اتنا ہی نرم ہو گا۔ رس گلوں کا شہب دیں درمیان میں سبز الائچی کے دانے ڈالتے جائیں۔ چینی میں پانی ملا کر گاڑھا سا شیرہ بنالیں۔ پھر رس گلے ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ پھول جائیں تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر پیش کریں۔

لیمن آئس ٹی

آدھا چائے کا چمچ
ایک عدد
آدھی بوتل
حسب مرضی
ایک چٹکی
چار کپ
چند عدد

اجزا :

سبز قہوہ
لیموں
سوڈا وائر
شکر
نمک
پانی
پودینے کے پتے

ترکیب :

پانی میں جوش آجائے تو گرین ٹی ڈال کر اتار پکائیں کہ صرف رنگ تبدیل ہو جائے، پھر چھان کر پیالے میں نکال لیں۔ شکر، نمک اور لیموں کا رس ڈال کر رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو گلاسوں میں نکال کر اوپر سے برف کچل کر ڈالیں، پھر سوڈا وائر ڈال کر پودینے کے پتوں سے سجاوٹ کریں اور پیش کریں۔



ایک چائے کا چمچ
چار عدد
ایک کھانے کا چمچ
دو کھانے کے چمچے
چار عدد
دو چائے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
دو چائے کے چمچے
حسب ذائقہ
حب ضرورت

کالا زیرہ
چھوٹی الائچی
خشخاش
کچی پیاز پیسی ہوئی
نمائر
لال مرچ
بھنایا ہوا زیرہ
ہلدی
اورک، لہسن کا پیسٹ
نمک
تیل

ترکیب :

بھنے چنے، کالا زیرہ، چھوٹی الائچی اور خشخاش کو ملا کر پیس لیں، پھر قہوہ میں ملا کر کباب بنا کر تیل لیں۔ اور الگ رکھ دیں۔ مٹی کی ہانڈی میں تیل گرم کر کے پیاز اور تمام مسالا ڈال کر بھوئیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو تیلے ہوئے کباب احتیاط سے ڈال دیں۔ اوپر سے باریک کٹی ہوئی اورک، ہری مرچ اور ٹھوڑا سا لیموں کا رس شامل کر دیں۔ مزے دار ہانڈی گولا کباب تیار ہیں۔

رس گلے

ایک کلو
ایک چھٹانک
آدھا ماؤ
آدھا گلو
بارہ دانے
ایک چٹکی

اجزا :
خالص دودھ
کھویا
میدہ
چینی
سبز الائچی
پھٹکری

حضرت ہاجرہ علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام مکہ میں

مکہ میں کوئی انسان نہیں رہتا تھا اور وہاں پانی بھی نہیں تھا۔ آپ نے انہیں وہاں اتارا اور ان کے پاس کھجوروں کا ایک تھیلا اور پانی کا ایک مشکیزہ رکھ دیا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام واپس چل پڑے۔ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ بھی ان کے پیچھے چلیں اور کہا۔

”ابراہیم! آپ ہمیں اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ یہاں کوئی سا بھی (یا ہمسایہ) ہے نہ (ضرورت کی) کوئی چیز؟“

انہوں نے کئی بار یہ بات کہی، لیکن آپ ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔

(آخر) انہوں نے کہا: ”کیا آپ کو اللہ نے یہ حکم دیا ہے؟“

انہوں نے فرمایا ”ہاں!“

وہ بولیں ”تب وہ ہمیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔“ اور پلٹ گئیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے چلتے جب ثنیمہ (گھائی) پر پہنچے، جہاں سے وہ لوگ نظر نہیں آرہے تھے تو انہوں نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ہاتھ اٹھا دیے اور یہ دعا مانگی۔

”اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت (وادے) والے گھر کے پاس لا بسائی ہے۔ اے پروردگار! تاکہ یہ نماز پڑھیں، سو تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف جھکے رہیں اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ (تیرا) شکر کریں۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ان کو دودھ پلاتی تھیں اور خود اس پانی میں سے پی لیتی تھیں حتیٰ کہ جب مشکیزہ کا پانی ختم ہو گیا تو انہیں پیاس لگی اور

ان کے بیٹے کو بھی پیاس لگ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ بچہ (پیاس کی وجہ سے) بے چین ہے۔ وہ اسے (ترہنہ) نہ دیکھ سکیں، اٹھ کر چل دیں۔

انہیں اپنے قریب کی زمین میں سے صفائے سب سے قریب معلوم ہوا۔ وہ اس پر چڑھ گئیں۔ پھر وادی کی طرف منہ کر کے دیکھا کہ کیا کوئی انسان نظر آتا ہے؟ کوئی نظر نہ آیا۔ وہ صفائے اتریں۔

جب وادی کے نشیب میں پہنچیں تو قیص کا دامن جو زمین تک پہنچتا تھا (اٹھا کر اس طرح بھائیں جس طرح کوئی پریشان اور مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے حتیٰ کہ وادی کو پار کر لیا۔

وہ مروہ تک پہنچیں تو اس پر چڑھ گئیں اور دیکھا کہ کیا کوئی نظر آتا ہے؟ کوئی نظر نہ آیا۔ انہوں نے سات بار اسی طرح کیا (ایک پہاڑی سے دوسری تک دوڑتی رہیں)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لوگ اسی وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں (صفاء اور مروہ) کے درمیان دوڑتے ہیں۔“

جب وہ (آخری چکر میں) مروہ پر پہنچیں تو انہیں کوئی آواز محسوس ہوئی۔ انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔

”چپ!“ پھر غور سے سنا تو دوبارہ آواز سنائی دی۔ انہوں نے کہا۔

”تو نے آواز سنا دی ہے“ اگر تو مدد کر سکتا ہے (تو ہماری مدد کر)۔

اجانک انہوں نے دیکھا کہ زمزم کے مقام پر

پانی نکل آیا۔ آپ اسے حوض کی صورت دیکھنے لگیں اور اپنے ہاتھ سے اس طرح (رکاوٹ) بنانے لگیں اور چلو بھر بھر کر مشکیزے میں ڈالنے لگیں۔ ان کے چلو بھرنے کے بعد پانی پھر نکل آتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان

کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحمت نازل فرمائے! اگر وہ زمزم کو بہنے دیتیں۔“ یا فرمایا ”اگر وہ پانی سے چلو نہ بھرتیں۔“ تو وہ ایک بستے ہوئے چشمے کی صورت اختیار کر لیتا۔“

راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر ہاجرہ نے پانی پیا اور بچے کو دودھ پلایا۔ فرشتے نے ان سے کہا۔

”آپ ہلاکت کا اندیشہ نہ کریں، یہاں اللہ کا گھر ہے جس کی تعمیر یہ بچہ اور اس کا والد (دونوں مل کر) کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔“

اس وقت بیت اللہ کی زمین ایک بلند ٹیلے کی صورت میں تھی۔ سیلاب کا پانی آتا تو انہیں بائیں سے گزر جاتا۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ وہاں سے بنو جرہم کا ایک قافلہ یا ایک خاندان گزرا۔ وہ کداء کی طرف سے آئے اور مکہ کے نشیبی حصے میں ٹھہرے۔ انہیں ایک پرندہ منڈلا تا نظر آیا تو بولے۔

”یہ پرندہ تو پانی پر منڈلایا کرتا ہے۔ ہم تو جب اس وادی سے گزرتے ہیں تو یہاں پانی نہیں ہوتا۔“

انہوں نے دو آدمی حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے بھیجے تو انہیں پانی نظر آیا۔ انہوں نے جا کر پانی کی موجودگی کی اطلاع دی۔ وہ سب لوگ آگئے۔ چشمہ زمزم کے پاس حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ موجود تھیں۔ ان لوگوں نے کہا۔

”کیا آپ ہمیں اجازت دیتی ہیں کہ ہم یہاں خیمہ زن ہو جائیں؟“

انہوں نے فرمایا ”ہاں! لیکن اس چشمے کی ملکیت پر تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔“

انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اپنے اپنے گھروالوں کو بھی وہاں بلا لیا، حتیٰ کہ وہاں کئی گھربس گئے۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظیم قربانی

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک اور آزمائش اتاری اور انہیں برہائے میں عطا ہونے والے اکلوتے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے یہ حکم ربانی بیٹے کو سنایا تو فرماں بردار بیٹا فوری تیار ہو گیا۔ اس آزمائش پر پورا اترنے کا انعام جنت سے قربانی کی صورت میں ملا اور پھر یہ سنت ابراہیمی باقیامت مسلمانوں پر مقرر کر دی گئی۔

انہوں نے اپنے بیٹے کے سامنے یہ معاملہ رکھا، تاکہ وہ بھی خوشی سے اس عمل میں شریک ہو اور اس کی تعمیل ان کے لیے آسان ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا۔

”بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں، لہذا تم نہ کھو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟“

بردار بیٹا بھی کردار میں اپنے والد کا عکس ثابت ہوا۔ اس نے فوراً کہا۔

”اے ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہی کیجیے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“

جب دونوں نے حکم مان لیا تو باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے کے حلق پر چھری پھیری، لیکن کچھ نہ کٹ سکا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی۔ ”اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔“

یعنی آپ کا جو امتحان مقصود تھا، وہ پورا ہو چکا ہے۔ آپ کی اطاعت اور فوری تعمیل ظاہر ہو چکی ہے۔ جس جمہور علماء فرماتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ بڑی آنکھوں والا اور سینکڑوں والا سفید مینڈھاؤں کا ہوا تھا۔

علمائے نسب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی نے گھوڑوں پر سواری کی اس سے پہلے آزاد جنگلی جانوروں میں شامل تھے، آپ نے انہیں پالتو بنایا اور ان پر سواری فرمائی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش



یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب سائٹ
آپ کیلئے جاری رکھ سکیں۔

پاکستانیوں کی ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com

LIBRARY FOR PAKISTAN



آپ کی جلد چکنی ہے تو کسی لیمن کریم کا انتخاب کریں۔ اگر جلد خشک یا نارمل ہے تو کوئی کونڈ کریم لگائیں۔ اس کے بعد دس منٹ تک خوب اچھی طرح مساج کریں۔ مساج گردن سے شروع کریں۔ اس دوران ہاتھوں کی حرکت نیچے سے اوپر کی طرف ہونی چاہیے۔ پھر چہرے کا مساج کریں۔ چہرے کا مساج کرتے وقت ہاتھوں کی حرکت اندر سے باہر کی طرف ہونی چاہیے۔ پانی میں اسفنج بھگو کر اس سے چہرہ اور گردن صاف کر لیں۔ پھر چہرے اور گردن پر اسکرپ لگائیں اور دوبارہ دس منٹ تک مساج کریں۔ مساج کے دوران ہاتھ گیلے کرتی رہیں۔ اسکرپ نہ ہو تو دہی میں شہد اور چینی ملا کر اس سے مساج کریں۔ پھر گیلے اسفنج کی مدد سے چہرہ اور گردن صاف کر لیں۔

اب بلیک ہیڈ ریموور کی مدد سے ناک، تھوڑی اور رخساروں پر سے بلیک اور وائٹ ہیڈز صاف کریں۔ ریموور کا باریک سرا بلیک ہیڈز کے پاس رکھ کر دبائیں۔ بلیک ہیڈز ابھر آئیں گے۔ انہیں چپے سرے کی مدد سے صاف کر لیں۔

اب چہرے اور گردن پر عرق گلاب کا اسپرے کریں۔ سب سے آخر میں ماسک لگائیں۔ بازار میں بنے بنائے ماسک عام دستیاب ہیں۔ اگر گھر میں ماسک تیار کرنا چاہیں تو حسب ذیل طریقے سے تیار کر لیں۔ نارمل جلد کے لیے تھوڑے دودھ میں دو چائے کا چمچے میدہ ملائیں اور ابال لیں۔ جب یہ مخلول نیم گرم ہو جائے تو اس میں تھوڑا سا عرق گلاب شامل کر لیں۔ پھر چہرے اور گردن پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔

جلد چکنی ہو تو ٹالکم پاؤڈر اور کارن فلور (مکئی کا آٹا) برابر مقدار میں لے کر تھوڑا سا عرق گلاب شامل کر لیں۔ یہ پیسٹ چہرے پر بیس منٹ لگائیں۔ گیلے اسفنج کی مدد سے صاف کر لیں اور پھر چہرے پر اسٹرنجنٹ لگا کر خشک کر لیں۔



چہرے کی دلکشی و رعنائی روشن اور چمک دار جلد کی مرہون منت ہے۔ جلد کی چمک اور خوب صورتی کے لیے جلد کی صفائی کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ جلد کی صفائی کے لیے صرف کسی اچھے صابن یا فیس واش منہ دھولینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے مہینے میں دو بار یا کم از کم ایک مرتبہ فیشل کرنا از حد ضروری ہے۔ فیشل سے جلد کے مردہ خلیات علیحدہ ہو جاتے ہیں اور مساج سے خون کی روانی تیز ہو جاتی ہے جس سے چہرہ روشن اور چمک دار دکھائی دیتا ہے۔

فیشل کے لیے ضروری اشیا

کلینزنگ ملک، اسٹرنجنٹ، اسکرپ، کریم، عرق گلاب، بلیک ہیڈ ریموور، ڈیٹول یا کوئی جراثیم کش محلول، ہیڈ ہینڈ، اسفنج یا روئی، نمک اور ایک بڑا تولیہ۔

طریقہ کار

☆ سب سے پہلے اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح دھولیں۔ بالوں کو پیچھے کر کے سر پر ہیڈ ہینڈ یا پھر کوئی چھوٹا کپڑا باندھ لیں تاکہ بال چہرے پر نہ آئیں۔ ایک بڑا تولیہ کندھوں پر پھیلا لیں۔ اس سے آپ کے کپڑے خراب ہونے سے محفوظ رہیں گے۔ نگ میں پانی لیں۔ چند قطرے ڈیٹول ملا کر پاس رکھ لیں۔ جب ابھی اسفنج گیلیا کرنا ہو تو اسی پانی میں گریں۔

چہرے اور گردن پر کوئی معیاری کلینزنگ ملک لگا کر تھوڑی دیر ملیں، پھر گیلی روئی یا اسفنج کی مدد سے چہرہ صاف کر لیں۔ کلینزنگ ملک نہ ہو تو دہی بھی استعمال کیا جاسکتا ہے یا پھر کچے دودھ میں صاف روئی بھگو کر اس سے چہرہ اور گردن صاف کر لیں۔ اس کے بعد چہرے اور گردن پر کوئی بھی معیاری کریم لگائیں۔ اگر